آثار شبلی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

آثارِ شبلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آثار شبلی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
رفیق اعزازی

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

سلسلہ دارالمصنّفین نمبر۔

کتاب	:	آثارِ شبلی
مصنف	:	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
صفحات	:	۷۵۲
طبع اول	:	جنوری ۲۰۱۳ء
ناشر	:	دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
مطبع	:	معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
قیمت	:	۴۰۰/روپے
باہتمام	:	عبدالمنان ہلالی

ISBN:

AASAR-E-SHIBLI

Dr.Mohammad Ilyas Azmi

Darul Musannefin Shibli Academy
Post Box No 19,Shibli Road-Azamgarh-276001-UP
E-mail : shibli_academy@rediffmail.com
website:www.shibliacademy.org

ترتیب

○ باب سوم

○ باب چہارم

باب پنجم

باب ششم

○ باب ہفتم

پیش لفظ

علامہ شبلی نعمانی ایک عبقری، عہد ساز اور کثیر الجہات شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی خدمات، علم و ادب اور تحقیق و تصنیف تک محدود نہیں ہیں جو ان کا اصل میدان کار تھا بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ مسلمانوں کی علمی، فکری، ملی، دینی، سماجی اور سیاسی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جو ان کی مختصر زندگی میں کسی نہ کسی وقت ان کی توجہ کا مرکز نہ بنا ہو۔ علم و تحقیق کے میدان میں انہوں نے ایک ایسی روایت کی طرح ڈالی جو مغرب میں رائج معیار تحقیق سے ہم آہنگ تھی اور اس وقت تک بر صغیر کے علمی حلقوں میں معروف نہیں تھی۔ ان کے قلم سے سیرت النبیؐ اور الفاروقؓ جیسے شہ پارے نکلے جن کی اہمیت، معنویت اور ندرت ایک صدی بعد بھی ویسے ہی قائم ہے۔ علم و ادب، تحقیق و تصنیف اور تعلیم کے فروغ اور توسیع کے میدان میں ان کی خدمات غیر معمولی حیثیت کی حامل ہیں اور ان میں متعدد کو علمی دنیا میں اولیات کا درجہ حاصل ہے۔ تحقیق و تصنیف کے میدان میں ان کے کارناموں میں بڑا تنوع ہے۔ یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اتنے مختلف اور متنوع موضوعات پر یہ شاہ کار تصنیفات ایک ہی مصنف کے قلم سے نکلی ہیں۔ مسلسل بیماریوں اور بے شمار موانع و مشکلات کے باوجود ایک مختصر زندگی میں انہوں نے جو کچھ کر دکھایا اسے غیر معمولی ہی کہا جا سکتا ہے۔

دار المصنّفین نے اپنے محدود وسائل کے باوجود علامہ شبلی کے مشن اور ان کے وژن کی جس طرح تکمیل کی وہ کسی بھی ادارہ کے لئے قابل فخر ہے۔ البتہ اکیڈمی علامہ کے مشن کی تکمیل اور ان کے خوابوں کو تعبیر آشنا کرنے میں اس حد تک مصروف و منہمک رہی کہ اسے خود ان کے اوپر توجہ دینے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ اب جب کہ اکیڈمی کی تاسیس اور اس کے موسس کی وفات پر ایک صدی پوری ہونے والی ہے اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ مشن

کے ساتھ ساتھ خود موسس کی خدمات پر توجہ مرکوز کی جائے، ان کے علمی اور فکری ورثہ کی مختلف جہات کا گہرائی سے مطالعہ و تجزیہ کیا جائے اور ان کی خدمات، اثرات اور عہد حاضر میں ان کی معنویت کا تعین کیا جائے ۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کے علمی، فکری اور تہذیبی ورثہ کی تشکیل میں علامہ شبلی کا کردار اساسی اہمیت کا حامل ہے۔

علامہ شبلی کے شاگرد رشید اور دارالمصنّفین کے معمار علامہ سید سلیمان ندوی نے ان کی دستیاب باقیات کو مدون اور شائع کر دیا تھا۔لیکن اس کے بعد بھی تسلسل سے علامہ کی غیر مطبوعہ اور غیر مدون تحریریں سامنے آتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔اسی طرح علامہ شبلی کے علمی اور فکری اکتسابات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ان میں عقیدت مندانہ، مادحانہ، ناقدانہ اور معاندانہ ہر طرح کی نگارشات شامل ہیں۔اس پس منظر میں ایک ایسی تصنیف کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی جس میں علامہ شبلی کی تمام معلوم نگارشات کا احاطہ کیا جائے۔ساتھ ہی اس وسیع لٹریچر کا بھی مطالعہ و تجزیہ کیا جائے جو ان کے تعلق سے معرضِ وجود میں آیا ہے۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اس اہم ضرورت کی تکمیل کا سامان کیا۔

''آثار شبلی'' میں بڑے تفحص اور دیدہ ریزی سے علامہ شبلی کے آثار کا استقصاء کیا گیا ہے۔اس کے آئینہ میں علامہ کے علمی ورثہ کی ایک بھرپور تصویر سامنے آجاتی ہے۔اس میں کئی گوشے ایسے ہیں جو اس سے پہلے پوری وضاحت اور صراحت سے اہل علم کے سامنے پیش نہیں کئے جاسکے تھے۔ چنانچہ شبلیات کے میدان میں ''آثار شبلی'' کو ایک اہم پیش رفت کی حیثیت حاصل ہے۔ خاص طور سے اس لئے بھی کہ اس میں علامہ شبلی اور ان کی تصنیفات کے تعلق سے سامنے آنے والے لٹریچر کے احاطہ کا بھی پورا اہتمام کیا گیا ہے۔اس سے نہ صرف علامہ شبلی کے علمی اور فکری ورثہ کی بعض نئی جہات سامنے آئیں گی بلکہ کئی غلطیوں اور غلط فہموں کا ازالہ بھی ہو سکے گا۔

اشتیاق احمد ظلی
(ڈائرکٹر)

۲۳ر نومبر ۲۰۱۲ء

دیباچہ

علامہ شبلی نعمانی کے جاوداں کارناموں بالخصوص ان کی بلند پایہ تصانیف سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ان کی عظمت اور قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ایک صدی سے ارباب علم و دانش کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنی ہوئی ہیں۔ان میں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور تحقیق و تدقیق کی نکتہ آفرینیاں بھی۔زبان و بیان کی حلاوت بھی ہے اور ادب و انشا کی دلآویزی بھی۔واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کے افکار و نظریات گذشتہ ایک صدی سے ہمارے اذہان و قلوب پر اثر انداز ہیں اور آج قوم و ملت بلکہ عالم اسلام جن حالات اور مسائل سے دوچار ہے، ان میں علامہ شبلی کے افکار و نظریات کی معنویت اور اہمیت دو چند ہوگئی ہے۔

۲۹ رسال کی عمر میں ان کے قلم سے المامون نکلی۔جس کی داد اپنے عہد کے سب سے بڑے دانشور اور عالی دماغ مصلح سر سید احمد خاں نے دی اور شبلی کے علم و معلومات، مورخانہ بصیرت، سلیقہ تصنیف و تالیف اور سادہ و پرکار نثر کی تحسین و ستائش نے نوجوانی ہی میں انہیں ہندوستان کے نامور مصنّفین کی صف اول میں لا کھڑا کیا۔پھر یکے بعد دیگرے تحقیقات و تصنیفات شبلی نے اس عہد کے ارباب علم و دانش کو اعتراف کمال پر مجبور کر دیا۔سر سید احمد خاں نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ ''اگر وہ نعوذ باللہ اپنے رسالہ جزیہ کے بارے میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ کہیں کہ فاتو بسورۃ من مثلہ. تو کچھ تعجب نہ ہوگا۔''

علمی، تحقیقی اور تاریخی کارناموں کی بدولت ان کا آوازہ و شہرہ ان کی زندگی ہی میں ہندوستان کی سرحدوں کے پار عالم اسلام تک پہونچا۔دولت عثمانیہ نے اعتراف علم و دانش میں انہیں تمغہ مجیدیہ سے نوازا۔افغانستان نے کابل میں دارالترجمہ قائم کرنا چاہا تو اس کی نظر انتخاب

علامہ شبلی پر پڑی۔ جامع از ہر مصر کی تعلیمی اصلاحات کے لئے ہندوستان کے علماء میں علامہ شبلی کو منتخب کیا گیا۔ مدینہ یونیورسٹی کے قیام کا خاکہ تیار ہوا تو اس کے بام و در سنوارنے کے لئے علامہ شبلی اور ان کے شاگرد عزیز مولانا حمید الدین فراہی کا نام تجویز ہوا۔ پادری جان ملکم نے ہندوستانی مصنّفین کا تجزیہ کیا تو اس نتیجے پر پہونچا کہ ''مغرب کے محققانہ و عالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر دیسی تصانیف تحقیق و تدقیق کا پایہ رکھتی ہیں تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں۔'' غرض ہندوستان سے روم و مصر و شام تک شبلی کی عظمت اور ان کے علمی و ادبی اور تعلیمی کارناموں کا غلغلہ بلند ہوا۔ ان کی تصنیفات کے انگریزی، عربی، فارسی، ترکی، سندھی اور پشتو زبانوں میں ترجمے ہوئے اور یہ ترجمے ایران، ترکی، مصر، افغانستان اور سندھ کے اہل قلم نے کئے۔ ان کی شخصیت، سوانح، تصنیفات اور افکار و نظریات کے مطالعہ پر مضامین و مقالات کے علاوہ مستقل کتابیں لکھی گئیں اور یہ سلسلہ ابتک قائم ہے۔

مستقل کتب و رسائل کے سوا ایک درجن سے زائد تجزیاتی اور موضوعاتی مطالعات میں شبلی کی خدمات اور ان کے فکر و فن سے بحث کی گئی ہے۔ ان میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب سرسید اور ان کے نامور رفقاء [مطبوعہ: ۱۹۶۰ء] اور ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی کی کتاب شبلی ایک دبستاں [ڈھاکہ ب ت] خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں علامہ شبلی کی تصانیف اور ان کے علمی، ادبی، تنقیدی اور تعلیمی افکار و نظریات کا بڑی گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ و تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور ان کے کام کی مجموعی قدر و قیمت واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ماہنامہ ادیب علی گڑھ اور کریسنٹ لاہور کے ''شبلی نمبر'' کا یہاں ذکر اس لئے ضروری ہے کہ یہ دونوں خصوصی شمارے کسی مستقل تصنیف سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ شبلی کی شخصیت کے بیشتر پہلوؤں پر مشتمل مطالعات کا مجموعہ ہیں۔ بہر حال ذخیرہ شبلیات بلاشبہ علم و ادب اور تحقیق و تدقیق کا بڑا قیمتی سرمایہ اور اہل علم و کمال کی جانب سے شبلی کو زبردست خراج عقیدت ہے۔ اس کا بیشتر حصہ راقم کی نظر سے گذر چکا ہے۔ مجموعی طور پر سرمایہ شبلیات کو تین حصوں تاثراتی، سوانحی اور فکری مطالعات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس میں غالب حصہ تاثراتی اور سوانحی ہے۔ بقیہ کتابوں میں شبلی کی ہشت پہل شخصیت کے کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً کسی نے اردو ادب میں

علامہ شبلی کے مقام ومرتبہ کی تعیین کی کوشش کی ہے تو کسی نے تنقید میں۔اسی طرح کسی نے تعلیم کو موضوع بنایا ہے تو کسی نے تاریخ نویسی اور سوانح نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔البتہ دو کتابیں اس سے استثنا ہیں۔مولانا سید سلیمان ندوی [م:۲۲رنومبر ۱۹۵۳ء] کی ’’حیات شبلی‘‘ جو علامہ شبلی کی ایک جامع ،مبسوط اور مستند سوانح ہے۔بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مطالعات شبلی کی بیشتر کوششیں اسی کتاب کی مرہون منت ہیں۔دوسری کتاب شیخ محمد اکرام کی ’’یادگار شبلی‘‘ ہے۔جس کا پہلا ایڈیشن ’’شبلی نامہ‘‘ کے نام سے شائع ہوا تھا۔اس میں علامہ شبلی کی شخصیت اور علمی وادبی کارناموں کے مطالعہ میں محنت اور دیدہ ریزی کے باوجود تنقیص شبلی میں کوئی دقیقہ اٹھانہیں رکھا گیا ہے۔مگر بعد میں شیخ محمد اکرام اعظم گڑھ آئے۔دارالمصنّفین کو دیکھا۔مزار شبلی پر حاضری دی۔شبلی کے وطن بندول گئے۔ندوہ،دارالمصنّفین اور شبلی کالج اور دیگر علمی وتعلیمی خدمات کا بچشم خود مشاہدہ کیا تو ان کے نقطہ نظر میں کسی قدر تبدیلی آئی اور اس قلب ماہیت کی بدولت انہوں نے ’’شبلی نامہ‘‘ کو ’’یادگار شبلی‘‘ بنادیا مگر

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

اسی طرح حیات شبلی محض سوانح عمری ہے یہی وجہ ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی کے نوسو صفحات کے بعد علامہ شبلی کی تصانیف کے تعارف وتجزیے پر مشتمل اس کا دوسرا حصہ لکھنے کے آرزومند تھے۔[مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر ص ۴] مگر افسوس کہ گردش ایام نے اس کی مہلت نہ دی اور ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوسکی۔اس لئے ضرورت تھی کہ ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں علامہ شبلی کی تمام تصنیفات وتالیفات کا یکجا مفصل اور مکمل تعارف وتجزیہ ہو اور جس میں دکھایا جائے کہ علامہ شبلی کی جامع کمال شخصیت کے کتنے پہلو اور کتنے گوشے تھے اور انہوں نے کیسے کیسے کارہائے نمایاں انجام دئے اور وہ علم وفضل کے کس بلند مقام پر فائز تھے۔زیر نظر کتاب اسی احساس کا نتیجہ اور اسی ضرورت کی تکمیل کی ایک ادنیٰ کوشش ہے۔اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر واحسان ہے کہ اس نے اس کام کو پیش نظر کتاب کی شکل میں پایۂ تکمیل تک پہونچانے کی توفیق بخشی۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے خامہ عنبریں سے اگر یہ کتاب نکلی ہوتی تو بلاشبہ ہمارے تحریری سرمائے میں ایک گراں قدر کتاب کا اضافہ ہوتا۔راقم ایک معمولی طالب علم ہے،سید

صاحب تو کیا دبستان شبلی کے کسی اہل قلم کی خاک پا کے برابر بھی نہیں۔ نہ وہ علم ومطالعہ ومعلومات اور نہ وہ طرز و اسلوب نگارش، تاہم جہاں تک ممکن تھا آثار شبلی کی تلاش وجستجو اور تحقیق وتدقیق کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔

علامہ شبلی نے مختلف موضوعات پر داد تحقیق وتصنیف دی۔ اس لیے ان کے کارناموں کے تعارف وتجزیے میں وہی شخص کامیاب ہوسکتا ہے جس کی نظر ان علوم وموضوعات پر ہو، اس لحاظ سے بھی راقم کی یہ کوشش حرف آخر نہیں کہی جاسکتی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ علامہ شبلی کی کوئی تحریر نظر انداز نہیں کی گئی ہے اور ان کی پہلی تصنیف اسکات المعتدی سے سیرۃ النبیؐ تک تمام کتابوں اور رسالوں کا احاطہ کیا گیا ہے اور گذشتہ صدی میں علامہ شبلی کی شخصیت اور افکار ونظریات پر جو اعتراضات ہوئے یا نقد وجرح کی گئی، ان کا معروضی جائزہ لے کر ان کی حقیقت وحیثیت واضح کی گئی ہے۔ عموماً علامہ شبلی کی چند مشہور کتابوں کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے، لیکن ان کی بہت سی علمی وادبی کاوشیں ایسی ہیں جن سے عام طور سے واقفیت نہیں۔ مثلاً یہ کہ علامہ شبلی الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو تھے اور انھوں نے اس کی بعض نصابی کتابیں بھی تیار کی تھیں، اسی طرح ماہنامہ الندوہ کی ادارت سے عام واقفیت ہے مگر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کے مدیر کی حیثیت سے انہوں نے جو خدمات انجام دیں، ان کا ذکر نہیں ملتا۔ تذکرہ گلشن ہند کی ترتیب وتدوین کا تو شاید ہی کسی کو علم رہا ہو جو اردو میں متنی تحقیق کی پہلی کوشش ہے۔ روداد ندوہ اور رسالہ وقف علی الاولاد کا بھی ذکر نہیں کیا جاتا۔ ان کے فارسی مجموعہ ہائے کلام، مجموعہ نظم، دیوان شبلی، دستہ گل، بوئے گل اور برگ گل کو تو گویا دنیائے شعروادب بھول ہی گئی ہے۔ اسی طرح مثنوی صبح امید اور نالہ شبلی کا بھی اب ذکر نہیں ہوتا۔ غرض یہ کہ اس کتاب میں علامہ شبلی کی تمام علمی، ادبی، شعری، تنقیدی، تعلیمی اور تاریخی کاوشوں کا بالتفصیل ذکر آ گیا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے عہد کے قومی، ملی، تعلیمی اور سیاسی مسائل سے بھرپور دلچسپی لی اور ان کے حل کے لئے مسلسل جدوجہد کی۔ شیخ محمد اکرام نے سچ لکھا ہے کہ ''قلیل مدت حیات اور کمزور صحت کے باوجود شبلی نے جو کچھ کر دکھایا وہ ایک معجزے سے کم نہیں۔''

یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب توقیت شبلی ہے۔ جس میں علامہ شبلی کی

تاریخ پیدائش (۴رجون ۱۸۵۷ء) سے تاریخ وفات (۱۸رنومبر۱۹۱۴ء) تک کی ان کی زندگی کی اہم تاریخوں کی تعیین کی گئی ہے۔اس سے ان کی شخصیت اور کارناموں کا ایک اجمالی مرقع سامنے آجاتا ہے۔ دوسرے باب میں ان کی پہلی تصنیف اسکات المعتدی سے سیرۃ النبی تک کی تمام کتابوں کا بالتفصیل تعارف وتجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ان کی قدر و قیمت بیان کی گئی ہے اوران پر جو اعتراضات تھے، ان کا معروضی مطالعہ و جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اس باب میں علامہ شبلی کی ۱۷/ کتابوں اور کتابچوں کا ذکر ہے۔تیسرے باب میں تالیفات ،رسایل اور روداد کا تعارف وتجزیہ ہے۔تالیفات میں بدء الاسلام، گلشن ہند[تدوین وتحقیق]الہ آباد یونیورسٹی کی چند نصابی کتابیں [انٹرنس کورس فارسی وغیرہ] رسایل میں محمڈن اینگلواورینٹل کالج میگزین علی گڑھ اور ماہنامہ الندوہ لکھنواور روداد ندوہ شامل ہیں۔رسالہ وقف علی الاولاد کا بھی ذکراسی باب میں ہے۔چوتھے باب میں علامہ شبلی کے فارسی مجموعہ ہائے کلام اور’’ کلیات شبلی‘‘ کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اسی طرح پانچویں باب میں ان کے اردو مجموعہ ہائے کلام اوران کی اردو شاعری کا مفصل جائزہ ہے۔چھٹے باب میں’’رسائل شبلی‘‘ مرتبہ علامہ شبلی نعمانی اور’’ مقالات شبلی‘‘ مرتبہ سید سلیمان ندوی کے علاوہ ان سے پہلے اور بعد کے تمام مجموعہ ہائے مقالات شبلی کا ذکر اور ان پر نقد وتبصرہ ہے۔ساتویں باب میں مکاتیب شبلی اور خطوط شبلی کا مطالعہ ہے۔آٹھویں باب میں پہلے علامہ شبلیؒ کی غیر مدون تحریروں [مقالات ،مقدمے، دیباچے ،تقریظات اور خطوط وخطبات] کا ذکر ہے۔ پھر چند غیر مطبوعہ تحریروں اوران کے مشمولات کی تفصیل ہے۔آخر میں خاتمہ کے عنوان سے پوری کتاب کا خلاصہ اور ماحصل بیان کیا گیا ہے۔جس سے علامہ شبلی کی جامع کمالات شخصیت کے تقریباً تمام جلوے نگاہوں میں آجاتے ہیں۔

علامہ شبلی نے مسلمانوں کی ترقی کے لئے متعدد منصوبے بنائے اور قوم کے سامنے پیش کئے۔مثلاً علم الکلام کی تدوین کا منصوبہ،حفاظت واشاعت اسلام کا منصوبہ،سیرۃ النبی کا منصوبہ وغیرہ۔ان کے اس طرح کے تمام منصوبوں اور عہد حاضر میں ان کی معنویت کا ذکر بھی اس کتاب کا ایک اہم حصہ ہے۔

تصنیفات شبلی کے تعارف وتجزیے میں اصل مباحث کے علاوہ ان کا پس منظر، سنہ

تصنیف، سال اشاعت اوراس کے بعد کی تمام معلوم اشاعتوں کی تفصیلات بھی درج کی گئی ہے۔ علامہ کی بیشتر کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ ان کے مترجم، سنہ اشاعت اور مقام اشاعت کی بھی تفصیلات دیدی گئی ہیں۔آخر میں اشاریہ وکتابیات ہے۔ان سب تفصیلات کا مقصد آثارشبلی اور اس کی اہمیت واضح کرنااورافکاروخیالات شبلی کی افادیت سے روشناس کرانا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے استاذ کے ایک ایک حرف کو محفوظ کرنے کی کامیاب کوشش کی۔انھوں نے علامہ شبلی کے مقالات وخطبات اور مکاتیب کی گیارہ جلدیں مرتب کر کے شائع کیں۔آثارشبلی میں ان سب کا مفصل ذکر ہے۔تلاش وجستجو اور تحقیق وتدقیق کا کارواں ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے۔سید صاحب کے بعد قدیم رسائل وجرائد کی فائلوں میں علامہ شبلی کی متعدد تحریروں کا انکشاف ہوا۔جن کا ایک مجموعہ جناب مشتاق حسین [سابق ناظر کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ] نے ''باقیات شبلی'' کے نام سے ۱۹۶۴ء میں شایع کیا تھا۔باقیات شبلی کے بعد بھی متعدد تحریریں دستیاب ہوئیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔اس طرح کی تمام تحریروں کا ذکر بھی اس کتاب میں آگیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کا نام ''آثارشبلی'' رکھا گیا۔

علامہ شبلی کی ہمہ جہت شخصیت کے نقوش اور فکرونظر کے تمام جلوے ان کی تصانیف کے اس مفصل جائزے سے ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اوراس سے اس خیال کی کہ وہ محض ادیب وانشاء پرداز، شاعراور مورخ تھے، تردید ہوجاتی ہے اور یہ واضح ہوجاتا ہے کہ وہ علوم مشرقیہ کے یگانۂ روزگار عالم تھے۔مفکرو مصلح تھے۔دانشور تھےاورسب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے سینے میں ایک ایسا درد مند دل تھا جو ہمہ وقت قوم وملت کی صلاح وفلاح کے لیے دھڑکتا رہتا تھا۔ان کی ساری تگ ودو، جدوجہداورکوشش وکاوش کا محور ملت اسلامیہ کی عظمت وسربلندی اوراعلائے کلمہ حق تھا۔اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے توان کی زندگی ناانصافیوں کے خلاف بالخصوص مستشرقین کے ناروا اعتراضات کے جواب میں ایک جہد مسلسل کی داستان ہےاوران کی تصنیفات وتالیفات اس داستان کا مرکزی حصہ ہیں۔جن کے مطالعے سے آج بھی حرارت ایمانی میں وہی ترقی ہوتی ہے جوعہد شبلی میں محسوس کی گئی تھی۔ان سے آج بھی وہ کام لیا جا سکتا ہے، جوعہد شبلی میں لیا گیا۔شبلی کی تحریروں نے نسلوں کی ذہنی تربیت اور دماغی اصلاح کا کام کیا ہےاوراس کی یہ افادیت اب بھی باقی ہے۔

راقم کوعلامہ شبلی سے عقیدت ہے اوراسی عقیدت نے ان کی تصانیف اوران کے افکار وخیالات کے مطالعہ کا داعیہ پیدا کیا اور واقعہ یہ ہے کہ انہی کی تصانیف کے مطالعہ نے میرے اندر تصنیف وتالیف کا ذوق پیدا کیا اور میرا سرمایہ علم ومعلومات دراصل انہی کی تصانیف کا فیضان ہے۔اس لیے آثار شبلی میں عقیدت کے پہلوؤں کا درآنا ناممکن نہیں، حالانکہ دانستہ طور پر اس سے احتراز کیا گیا ہے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ علم وادب کا گہوارہ اور عالم اسلام کا مایہ ناز علمی وتحقیقی اور تصنیفی ادارہ ہے۔اس کی مجلس انتظامیہ نے اس ناچیز کو آنزیری فیلو بنا کر بڑا اعزاز بخشا ہے۔اس ذرہ نوازی کے لئے میں دارالمصنّفین کے ارباب حل وعقد بالخصوص گرامی قدر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب ڈائرکٹر دارالمصنّفین کا بے حد ممنون وشکر گزار ہوں۔انہوں نے اس کتاب سے ذاتی طور پر بڑی دلچسپی لی۔اس کا بغور مطالعہ کیا۔بیش قیمت اور مفید مشوروں سے نوازا۔حقیقت یہ ہے کہ ان کی رہنمائی کی بدولت کتاب میں بڑے اہم اور مفید علمی مباحث کے اضافے ہوئے۔ دارالمصنّفین سے اس کی طبع واشاعت بھی انہی کی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔اللہ تعالیٰ صحت وعافیت کے ساتھ ان کا سایہ شفقت دراز فرمائے۔

اس کتاب کی تصنیف میں میرے مربی وکرم فرما ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی مدظلہ کی مسلسل حوصلہ افزائی وسرپرستی حاصل رہی، میں ان کے لئے خاص طور پر دعا گو ہوں۔ان کے علاوہ پروفیسر خورشید نعمانی، ڈاکٹر ابرار اعظمی، پروفیسر عبدالحق [سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی] ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی، ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی اور پروفیسر اصغر عباس [سابق صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ] کی بھی محبت شامل حال رہی۔اس کے لیے میں ان بزرگوں کا بے حد شکرگذار ہوں۔احباب میں برادر مکرم ڈاکٹر شکیل اختر [جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی] ڈاکٹر عطا خورشید [مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ] مولانا عمیر الصدیق ندوی [دارالمصنّفین] ڈاکٹر محمد عبداللہ [شیخ زاید اسلامک سینٹر، لاہور] ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی [رضا لائبریری، رام پور] ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی [مدیر: ادبی گزٹ مئو] ڈاکٹر جمشید احمد ندوی [مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ] ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں [رامپور] ڈاکٹر تبسم صابر [رضا لائبریری رام پور] کی محبتوں اور عنایتوں کا شکریہ نہ ادا کرنا ناسپاسی

ہوگی۔میرے یہ احباب اور کرم فرما سرمایہ ناز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کا تعاون کتاب کو پایہ تکمیل تک پہونچانے میں مشعل راہ رہا۔خاص طور پر ڈاکٹر عطا خورشید صاحب جو خود اچھے اہل قلم ہیں، ان کی بدولت علامہ شبلی کی بعض کم یاب کتابوں تک رسائی ہوئی۔اس کے لئے میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔برادرم سلیم جاوید اعظمی ناظر کتب خانہ دارالمصنّفین اور ڈاکٹر مظفر عالم ندوی صاحب [خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ] کے تعاون کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے کہ انہوں نے کسی موقع پر تعاون سے گریز نہیں کیا۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام مخلصین و معاونین اور احباب کو اچھا صلہ دے اور ''آثار شبلی'' کو مفید و کارآمد بنائے۔

محمد الیاس الاعظمی

۲۳ر ستمبر ۲۰۱۲ء

ادبی دائرہ اعظم گڑھ

باب اول

توقیت شبلی

علامہ شبلی نعمانی

تذکرہ ماہ وسال

۱۸۵۷ء

- ۴؍جون کو آبائی وطن موضع بندول، ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔اسی دن انقلابیوں نے اعظم گڑھ جیل کا پھاٹک توڑ کر قیدیوں کو آزاد کرایا تھا۔
- ان کے والد شیخ حبیب اللہ (ف:۱۲؍نومبر ۱۹۰۰ء)اعظم گڑھ کے مشہور وکیل اور زمیندار تھے۔

۱۸۶۳ء

- تعلیم کا آغاز ہوا۔ابتدائی تعلیم حکیم عبداللہ (پ:۱۸۴۳ء-ف:۱۸۹۰ء) اور مولوی شکراللہ (ف:۱۸۹۷ء) سے حاصل کی۔

۱۸۷۳ء

- مولانا فاروق چریاکوٹی (ف:۲۸؍اکتوبر ۱۹۰۹ء) سے تحصیل علم کے لئے مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور بھیجے گئے۔
- علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ نے اعظم گڑھ شہر میں ایک عربی مدرسہ قائم کیا۔جس میں پہلے مولوی فیض اللہ مئوی (ف:۲۰؍جولائی ۱۸۹۸ء) سے اور پھر مولانا فاروق چریاکوٹی سے تعلیم حاصل کی؛ جنہیں شیخ حبیب اللہ نے مدرسہ عربیہ اعظم گڑھ میں استاذ مقرر کیا تھا۔
- چندروز مدرسہ حنفیہ جون پور میں بھی زیر تعلیم رہے۔

۱۸۷۴ء

- رام پور کا تعلیمی سفر کیا اور مولانا ارشاد حسین رام پوری (ف: ۱۰؍نومبر ۱۸۹۳ء) سے فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم حاصل کی۔
- لاہور گئے اور مولانا فیض الحسن سہارن پوری (م: ۱۸۸۷ء) سے عربی ادب کی تعلیم حاصل کی۔
- اسی سال دارالعلوم دیوبند گئے، تقریباً ایک ماہ قیام کیا۔ لیکن تعلیم میں شریک نہیں ہوئے۔ البتہ اس کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔ علم فرائض سے یہیں دلچسپی پیدا ہوئی۔

۱۸۷۶ء

- سہارن پور گئے اور مولانا احمد علی محدث سہارن پوری (ف: ۱۱؍اپریل ۱۸۷۹ء) سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔
- اسی سال ۱۹؍سال کی عمر میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔
- مدینہ منورہ کے کتب خانوں سے استفادہ کیا اور روضۂ اقدس پر اپنا منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا:

اے بہ کرم کار جہاں کرد ساز
مرہمہ را پیش تو روئے نیاز
چوں بہ درت آمدہ ام با امید
از کرم خویش مکن نا امید
چوں بہ درت آمدم امید وار
سایہ لطفے زسرم برمدار

۱۸۷۷ء

- روس نے ترکی پر حملہ کیا، جس سے عالم اسلام میں ایک آگ سی لگ گئی۔ ترکوں کی ہمدردی

اورتعاون کے لئے مسلمانان اعظم گڑھ نے جو کمیٹی تشکیل دی ،مولانا شبلی اس کے سکریٹری مقرر رہوئے۔انہوں نے اس زمانہ میں تین ہزار روپئے جمع کر کے ترکی سفیر حسین حبیب آفندی (بمبئی) کے ذریعہ دارالخلافہ قسطنطنیہ بھیجا۔

۱۸۷۸ء

- اعظم گڑھ میں درس وتدریس کا فریضہ نجی طور پر انجام دیتے رہے۔مولانا حمیدالدین فراہی (ف:۱۱رنومبر ۱۹۳۰ء صاحب تفسیر نظام القرآن) مولوی محمد سمیع (ف:۱۹۱۶ء) اورمولوی محمد عمر (بیناپارہ)وغیرہ اسی دور کے شاگرد تھے۔
- مناظرے کا شغل اسی زمانہ میں رہا اور متعدد کامیاب مناظرے کئے۔

۱۸۷۹ء

- وکالت کا امتحان دیا لیکن ناکام رہے۔

۱۸۸۰ء

- وکالت کا دوبارہ امتحان دیا اور کامیابی حاصل کی۔
- پہلی عربی تصنیف **اسکات المعتدی علی انصات المقتدی** مطبع نظامی کان پور سے شائع ہوئی۔جس کی طباعت کے اخراجات ان کے چچا شیخ مجیب اللہ نے ادا کیے۔
- صاحبزادے حامد حسن نعمانی پیدا ہوئے۔

۱۸۸۱ء

- اعظم گڑھ میں وکالت کا شغل اختیار کیا۔
- رسالہ **ظل الغمام فی مسئلة القرأة خلف الامام** مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا۔
- علی گڑھ کا سفر کیا اور سرسید احمد خاں (ف:۱۸۹۸ء) کی خدمت میں عربی قصیدہ پیش کیا جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۵راکتوبر ۱۸۸۱ء (ج ۱۶ نمبر ۸۲ ص ۱۱۷۵) میں شائع ہوا۔یہ قصیدہ مع اردو ترجمہ حیات شبلی میں شامل ہے۔

۱۸۸۲ء

- والد کی خواہش پر قائم مقام قرق امین کے عہدہ پر چند ماہ ملازمت کی۔
- والد کے نیل کے کاروبار کی نگرانی کی۔
- وکالت کے لئے ضلع بستی گئے۔
- ایک انگریزی نظم کا منظوم اردو ترجمہ ''رزمیہ کابل وقندھار'' کے عنوان سے کیا۔

۱۸۸۳ء

- جنوری میں ایم۔اے۔او کالج، علی گڑھ پہونچے۔ فارسی کے پروفیسر اور عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔فروری میں درس وتدریس کا آغاز ہوا۔
- سالار جنگ اول حیدرآباد کے انتقال پر فارسی مرثیہ لکھا اور تعزیتی جلسے میں پیش کیا۔ یہ مرثیہ سرسید احمد خاں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۷رفروری ۱۸۸۳ء (ص ۲۲۹) میں شائع کیا۔
- ۲۰رجون کو نیشنل اسکول اعظم گڑھ کی بنیاد رکھی۔ جواب شبلی نیشنل پی جی کالج کے نام سے ملک کا ایک اہم تعلیمی ادارہ ہے۔اس کے پہلے سکریٹری خود مولانا شبلی رہے۔
- اپنے وطن موضع بندول میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی۔
- قصیدہ عیدیہ اسی سال کی یادگار ہے۔
- اعظم گڑھ کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے مجلس موازنہ ''ترقی قومی'' قائم کی۔
- پروفیسر آرنلڈ سے جدید علوم وتحقیقات کی واقفیت حاصل کی اور آرنلڈ کو عربی پڑھائی:

  آرنلڈ آں کہ رفیق است وہم استاذ مرا

- اکبرالہ آبادی سے روابط قائم ہوئے۔

۱۸۸۴ء

- تاریخ بنی عباس کا آغاز کیا۔ معتصم باللہ کے حالات تک پہونچ کر طوالت کے سبب

اسے موقوف کر کے نامور فرماں روایان اسلام کا انتخاب کیا۔

۱۸۸۵ء

- سرسید احمد خاں اور تحریک علی گڑھ کی حمایت میں مثنوی صبح امید لکھی۔
- اپریل میں چھوٹے بھائی مہدی حسن تعلیم کے لئے انگلینڈ گئے۔ شیخ حبیب اللہ نے اس مناسبت سے ایک تقریب کی جس میں مولانا شبلی نے فارسی نظم پیش کی۔
- اکٹوبر میں نواب ضیاءالدین خاں نیر نے وفات پائی تو ان کا مرثیہ کہا۔

۱۸۸۶ء

- ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے پہلے اجلاس میں شرکت کی۔
- مارچ میں خلیفہ سید محمد حسن ریاست پٹیالہ کے وزیرالدولہ علی گڑھ تشریف لائے تو سید محمود کی فرمائش پر قصیدہ پیش کیا۔
- مولانا شبلی کی والدہ قائمہ بی بی نے وفات پائی۔
- مثنوی صبح امید شایع ہوئی۔

۱۸۸۷ء

- سرسید احمد خاں کی خواہش پر رسالہ ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' لکھا اور لکھنؤ کی شاہی بارہ دری میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں پیش کیا۔
- المامون'' اسی سال پایہ تکمیل کو پہنچ کر ایم.اے.او.کالج علی گڑھ کی طرف سے شائع ہوئی۔
- مامون کے انتخاب پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اختلاف کیا جس کا علامہ شبلی نے جواب لکھا۔ یہیں سے ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔
- ایم.اے.او.کالج میں درس قرآن کا آغاز کیا۔ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، سید سجاد حیدر یلدرم اور شیخ محمد عبداللہ معروف بہ پاپا میاں وغیرہ کو علامہ شبلی سے اسی زمانہ میں شرف تلمذ حاصل ہوا۔

- قصیدہ بہاریہ لکھا۔
- مولانا فیض الحسن سہارن پوری نے وفات پائی۔ فارسی میں ان کا بڑا پر درد مرثیہ لکھا۔
- مشہور مقالہ ''تراجم'' بھی اسی سال لکھا گیا۔
- نیشنل اسکول اعظم گڑھ ترقی کر کے مڈل اسکول ہوا۔
- سرسیدؒ کے ساتھ نینی تال کا سفر کیا۔
- فارسی کلام کی بیاض کا ایک حصہ چوری ہوا۔
- برادر اصغر محمد جنید کو تعلیم کے لئے علی گڑھ بلایا۔

۱۸۸۸ء

- قصیدہ ''بہاریہ'' لکھا۔
- ۸؍ اکتوبر کو مسٹر مہدی حسن تکمیل تعلیم کے بعد انگلینڈ سے وطن لوٹے، اس خوشی میں شہر اعظم گڑھ میں جشن مسرت منعقد ہوا، جس میں مولانا شبلی نے استقبالیہ نظم پڑھی۔
- نواب سر آسماں جاہ بہادر وزیر اعظم حیدر آباد علی گڑھ تشریف لائے تو سرسید احمد خاں کی فرمائش پر رودکی کے مشہور قصیدہ پر قصیدہ لکھ کر پڑھا۔
- جنرل عظیم الدین خاں رام پور کی فرمائش پر کتب خانہ رام پور کا معائنہ کیا اور کتب خانہ کی ترتیب و تنظیم سے متعلق سفارشات پیش کیں۔ بعد میں انہیں خطوط کی روشنی میں کتب خانہ کی از سر نو تنظیم کی گئی۔

۱۸۸۹ء

- سرسید احمد خاںؒ کے دیباچے کے ساتھ المامون کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔
- رسالہ ''الجزیہ'' لکھا۔
- محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چوتھے اجلاس علی گڑھ میں شریک ہوئے اور فارسی ترکیب بند پیش کیا۔
- دسمبر میں ''سیرۃ النعمان'' کا پہلا حصہ مکمل ہوا۔

۱۸۹۰ء

- ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں شرکت کی اور خطاب کیا۔

۱۸۹۱ء

- ''تاریخ بدءالاسلام'' مرتب کی جو عرصہ تک کالج کے نصاب میں شامل رہی۔
- اسی سال علی گڑھ کالج کے لئے سرسید احمد خاں کے ساتھ حیدرآباد کا سفر کیا۔ میر محبوب علی خاں نظام حیدرآباد نے کالج کے لئے ۲ر ہزار سالانہ کی امداد منظور کی۔ اس خوشی میں شہر میں ایک جلسہ تہنیت منعقد ہوا، جس میں علامہ شبلی نے فارسی قصیدہ پیش کیا۔
- ستمبر میں فلک نما میں بزم شعروادب سجی اور مولانا شبلی نے قصیدہ پیش کیا۔
- حیدرآباد سے واپسی کے دوران سرسید احمد خاں کے ساتھ بیگم بھوپال کی خواہش پر بھوپال میں قیام کیا۔

۱۸۹۲ء

- علی گڑھ کالج کی طلبہ یونین کے مباحثہ میں گذشتہ طرز تعلیم کی حمایت میں تقریر کی۔
- امام ابوحنیفہ کی سوانح عمری ''سیرۃ النعمان'' لکھی جو علی گڑھ کالج کی طرف سے شائع ہوئی۔ مولانا شبلی نے اپنی جملہ تصنیفات سے حاصل ہونے والی آمدنی کو کالج کے لئے وقف کر دیا تھا۔
- سیرۃ النعمان کے دیباچے میں نامور فرماں روایان اسلام کی سوانح عمریوں کا خاکہ پیش کیا۔
- اسی سال ان کا مقالہ ''کتب خانہ اسکندریہ'' چھپا۔
- سرسید احمد خاں نے صیغہ اغلاط تاریخی کی تصحیح قائم کر کے مولانا شبلی کو اس کا سکریٹری بنایا اور ان کے تاریخی مقالات کو اس صیغہ میں شامل کیا۔
- تاریخ اسلام کی نادر کتابوں کی تلاش وجستجو میں ۲۶ر اپریل کو روم ومصروشام کے سفر پر روانہ ہوئے۔ ۷ر مئی کو عدن اور ۲۳ر مئی کو قسطنطنیہ پہنچے۔ ۱۹ر جون کو رسم سلاملق کا

مشاہدہ کیا۔

- ترکی ادباوشعراءاورارباب کمال بالخصوص شیخ عبدالفتاح اورشیخ طبیان سے ملاقات کی۔
- نادر کتابوں کی تلاش وجستجو میں قسطنطنیہ کے کتب خانے کھنگالے۔
- جنگ روم روس کے فاتح غازی عثمان پاشا سے ملاقات کی۔
- پروفیسرانطون ایڈیٹر ہفتہ وارالبشیر ترکی نے علامہ شبلی پر اداریہ لکھا۔
- شیخ عبدالباسط الانسی کے ذریعہ شیخ ظاہر مغربی سے ملاقات کی۔
- خلافت عثمانیہ کی طرف سے ۸راگست کو''تمغہ مجیدیہ'' سے سرفراز ہوئے۔
- شیخ ظاہر مغربی ملاقات کے لئے علامہ شبلی کی قیام گاہ پرتشریف لائے۔
- جولائی میں بیروت، اگست میں بیت المقدس اوراکتوبر میں قاہرہ پہونچے۔
- جامع ازہر کا معائنہ کیا۔
- کتب خانہ خدیود یکھنے گئے۔
- نومبر میں علی گڑھ واپس آئے۔
- اسٹوڈنٹ یونین کی طرف سے ۶ردسمبر کو استقبالیہ دعوت کی ایک تقریب منعقد کی گئی۔
- مشہور مقالہ حقوق الذمیین اسی سال مولانا کے قلم سے نکلا۔
- تحقیقی مقالہ''اسلامی کتب خانے''رسالہ''حسن'' حیدرآباد میں شائع ہوااوررسالہ کی طرف سے ایک اشرفی انعام میں ملی۔
- اعظم گڑھ شہر میں اپنے باغ میں''شبلی منزل''تعمیر کی۔

۱۸۹۳ء

- ایک علمی رسالہ المعارف کا خاکہ تیار کیااورسرمورگزٹ ناہن میں اس کا اشتہار شایع کیا۔
- ''مجموعہ نظم فارسی''مطبع نامی کان پور سے شائع ہوا۔
- انگریزی حکومت نے شک کی نظر سے دیکھا۔
- انگریزی حکومت سے''تمغہ مجیدیہ''کے استعمال کی اجازت مانگی جونامنظور ہوئی۔

- ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہوئے اور ایک اردو ترکیب بند پڑھا۔

۱۸۹۴ء

- حکومت نے ''شمس العلماء'' کے خطاب سے نوازا۔ اس خوشی میں کالج میں ایک شاندار جلسہ ہوا، جس کی صدارت نواب محسن الملک نے کی۔ اس میں کالج کی تمام اہم شخصیات نے شرکت کی اور مبارک باد پیش کی۔
- ۱۷ر فروری کو اسٹریچی ہال میں جلسہ منعقد ہوا۔ مسٹر ہونگٹن کمشنر میرٹھ نے شمس العلماء کی سند کے ساتھ عمامہ، عبا اور تمغہ عطا کیا۔ علی گڑھ کی تاریخ میں مولانا شبلی پہلے پروفیسر تھے جنہیں شمس العلماء کا خطاب ملا۔
- علامہ شبلی کی قائم کردہ طلبہ کی تنظیم لجنۃ الادب اور اخوان الصفا نے بھی ۱۹ر جنوری کو تہنیتی جلسہ منعقد کیا۔ اس کے ممبر اور علامہ کے عزیز شاگرد مولانا حمید الدین فراہی نے عربی میں اور مولانا ظفر علی خاں نے فارسی میں تہنیتی قصیدہ پیش کیا۔
- علی گڑھ کالج کی سالانہ نمائش میں شریک ہوئے اور قومی مسدس 'تماشائے عبرت' پیش کیا۔
- سفر نامہ روم و مصر و شام شائع ہوا۔
- اسی سال علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے سب ایڈیٹر اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کے شعبہ اردو کے ایڈیٹر منتخب ہوئے۔
- مقالہ ''اسلامی حکومتیں اور شفا خانے'' اسی سال لکھا گیا۔
- تحریک ندوۃ العلما کے پہلے اجلاس منعقدہ مدرسہ فیض عام کان پور میں شریک ہوئے اور مجلس ندوۃ العلماء کا دستور العمل تیار کیا۔

۱۸۹۵ء

- انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں سرسید احمد خاںؒ کے ساتھ شریک ہوئے۔
- پہلی بیوی مجیدن بی بی کا انتقال ہوا۔
- الہ آباد یونیورسٹی نے بورڈ آف اسٹڈی کا رکن اور فیلو منتخب کیا۔

- نیشنل اسکول ترقی کر کے ہائی اسکول ہوا۔
- ندوہ کے دوسرے اجلاس لکھنؤ میں شریک ہوئے ،نصاب تعلیم کے موضوع پرتقریر کی اورعلوم جدیدہ کے اضافے کی تجویز پیش کی۔ یہ تقریر مولوی ابومحمد ابراہیم،مولوی محمد اعظم حسین اورمولوی شاہ سلیمان پھلواروی کی تقاریر کے ساتھ ''مضامین اربعہ'' کے نام سے یکجا شائع ہوئی۔
- الہ آباد یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈی کی میٹنگ میں شریک ہوئے اورنصاب فارسی برائے امتحانات الہ آباد یونیورسٹی مرتب کرنے کی تجویز منظور کی۔

۱۸۹۶ء

- تحریک ندوۃ العلماء کے تیسرے سالانہ اجلاس منعقدہ بانس بریلی میں شرکت کی۔
- سیدعلی بلگرامی کی خواہش پرحیدرآباد گئے۔میرمحبوب علی خاں نظام حیدرآباد نے سوروپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا اور مولانا کی آئندہ تصنیفات کوسلسلہ آصفیہ میں شامل کرنے کا اعلان ہوا۔
- امرائے حیدرآباد نے مولانا شبلی کے اعزاز میں سماپولیٹن ہوٹل [کوٹھی نواب محسن الملک] میں جلسہ منعقد کیا۔جس میں مولوی عزیز مرزا نے سپاس نامہ پیش کیا۔
- حیدرآباد میں اعجازالقرآن کے موضوع پرتقریر کی۔
- محمڈن اینگلواورینٹل کالج میگزین میں قدیم اورنادر کتابوں کی اشاعت کی تجویز پیش کی۔
- مولانا عبدالحق حقانی نے دارالعلوم ندوہ کے قیام کی تجویز پیش کی جومولانا شبلی کی تائید سے منظور ہوئی۔اورانہوں نے مجلس دارالعلوم ندوہ کے قواعد تیار کئے۔
- ندوہ کے وفد کے ساتھ کان پوراورغازی پورتشریف لے گئے اورتعاون کے لئے جابہ جا تقریریں کیں۔
- آرمینیا میں شورش برپا ہوئی اور یورپ نے ترکوں کومورد الزام ٹھہرایا تو علامہ شبلی نے 'آرمینیا' کے عنوان سے مضمون لکھ کرترکی کی انصاف پروری اور یورپ کی دروغ

گوئی واضح کی۔

- آغا خاں علی گڑھ تشریف لائے تو علامہ شبلی نے فارسی میں قصیدہ پیش کیا۔

۱۸۹۷ء

- محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کی ایڈیٹری کو خیر باد کہا۔
- ۲۹؍جون کو منجھلے بھائی مہدی حسن بیرسٹر منصف کان پور نے وفات پائی۔
- تحریک ندوۃ العلماء کے چوتھے اجلاس میں شریک ہوئے اور دارالعلوم کی ضرورت پر پرزور تقریر کی۔
- ندوۃ العلماء کے اجلاس میرٹھ میں شرکت کے لئے میرٹھ گئے۔
- دارالعلوم ندوہ قائم کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنی اور مولانا شبلی کو اس کا رکن نامزد کیا گیا۔
- ندوہ کا دستورالعمل بنایا۔

۱۸۹۸ء

- حامد نعمانی کا نکاح ہوا۔
- بیگم بھوپال نے عربی مدارس کی تنظیم نظارۃ المعارف کا رکن نامزد کیا۔ ۲۷؍فروری اور ۲؍مارچ کی میٹنگ میں شریک ہوئے اور ''دستورالعمل وہدایات برائے مدرسین''۔ نصاب تعلیم اور نظام الاوقات تیار کیا۔ یہ ہندوستان کی تاریخ میں مدارس کی اصلاح کا پہلا تاریخی نقشہ تھا۔
- بیمار ہوئے اور کالج سے رخصت لے کر اعظم گڑھ آئے۔
- نواب محسن الملک عیادت کے لئے اعظم گڑھ تشریف لائے۔ تین دن شبلی منزل میں قیام کیا
- ۲۷؍مارچ کو سر سید احمد خاںؒ نے وفات پائی۔
- مئی میں علی گڑھ کی ملازمت سے مستعفی ہوئے۔ ماہ جون میں اعظم گڑھ آئے اور شبلی منزل میں قیام کیا، یہی شبلی منزل اب دارالمصنّفین ہے۔
- الٰہ آباد کا سفر کیا۔

- اسی سال ''الفاروق''، مکمل ہوئی۔ ''جس کا غلغلہ وجود میں آنے سے پہلے تمام ہندوستان میں بلند ہو چکا تھا''۔ اس کا خاتمہ کشمیر میں لکھا گیا۔
- تاریخی تحقیقات کا مجموعہ ''رسائل شبلی'' اسٹیم پریس امرت سر سے شایع ہوا۔
- نیشنل اسکول اعظم گڑھ میں والدہ مرحومہ کی یاد میں ایک ہال ''صدر المنازل'' کے نام سے تعمیر کرایا۔
- وفد ندوہ میں پٹنہ گئے اور متعدد مقامات پر ندوۃ العلماء کی اہمیت اور ضرورت پر تقریریں کیں۔
- ۸،۹/ مارچ کو تحریک ندوہ کے پانچویں اجلاس کان پور میں شرکت کی۔
- سخت علیل ہوئے، صحت کی غرض سے کشمیر کے سفر پر گئے۔

۱۸۹۹ء

- شیخ رشید رضا نے جامع از ہر مصر کی اصلاح کے لئے دیگر علماء کے ساتھ ہندوستان سے علامہ شبلی کا نام پیش کیا۔
- جنوری میں ''الفاروق'' شائع ہوئی۔
- انٹرنس کورس فارسی برائے امتحانات الہ آباد یونیورسٹی تیار کیا۔
- امیر عبد الرحمٰن والی کابل (افغانستان) نے دار الترجمہ کی نظامت کی پیش کش کی۔
- شعر العجم کا خاکہ تیار کیا۔
- علاج کے لئے گونڈہ تشریف لے گئے۔
- ندوہ کے نصاب میں انگریزی شامل کرنے کی تجویز پیش کی۔
- مئی میں سخت علیل ہوئے۔
- پھر کشمیر کا سفر کیا اور قصیدہ کشمیریہ لکھا۔
- مولانا اقبال سہیل نے علامہ سے حماسہ پڑھی۔
- اورینٹل کانفرنس اٹلی میں شرکت کا ارادہ کیا مگر شریک نہ ہو سکے۔

- اسی سال ایران کے سفر کا عزم کیا مگر یہ خواب بھی پورا نہ ہو سکا۔
- والی کابل نے ابن خلدون کے ترجمے کی خواہش کی مگر مولانا نے منظور نہیں کیا۔

۱۹۰۰ء

- اعظم گڑھ میں قیام کیا۔
- اسی سال انٹرنس کورس فارسی برائے امتحانات یونیورسٹی آف الہ آباد شائع ہوا۔
- جون میں مولوی محمد سمیع کی ماموں زاد بہن سے جو موضع خاص ڈیہہ کی رہنے والی تھیں علامہ شبلی کا دوسرا نکاح ہوا۔
- علی گڑھ کالج کی دینیات کمیٹی کے ممبر نامزد ہوئے۔
- ۱۲ر نومبر کو مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل نے وفات پائی۔ شبلی نے بڑا پر درد مرثیہ لکھا۔
- امیر کابل نے دوبارہ دار الترجمہ کی سربراہی کی پیش کش کی۔ جسے مولانا شبلی نے بوجوہ منظور نہیں کیا۔ یہ دار الترجمہ کلکتہ میں قائم ہونا تھا۔

۱۹۰۱ء

- لفٹنٹ گورنر سر اوڈ برن نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کو مفید بنانے کے لئے کلکتہ آنے کی درخواست کی۔
- کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب سے فارسی کے خارج کئے جانے کی مخالفت اور فارسی زبان وادب کی حمایت میں زبردست تقریر کی، جس سے فارسی کا اخراج ملتوی ہو گیا۔
- ۲۲ر مئی کو ناظم سر رشتہ علوم وفنون سرکار آصفیہ حیدر آباد کے عہدہ پر تقرر ہوا۔
- جدید علم کلام کی تدوین کا خاکہ تیار کیا۔

۱۹۰۲ء

- اگست میں امام غزالی کی سوانح عمری ''الغزالی'' مطبع نامی کان پور میں طبع ہوئی۔
- علامہ اقبال کی پہلی کتاب ''علم الاقتصاد'' کی زبان کی اصلاح کی۔

- ''علم الکلام'' پایۂ تکمیل کو پہونچی۔
- ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ منعقدہ امرت سر میں شرکت کی۔ ندوۃ العلماء کی ضرورت اور ختم نبوت کے موضوع پر تقریر کی۔
- منشی اطہر علی نے ندوہ کے جلسوں میں علامہ شبلی کی تقریروں پر پابندی عائد کرنے کی تجویز پیش کی۔ جسے ارکان نے نامنظور کر دیا۔

۱۹۰۳ء

- جنوری میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری منتخب ہوئے اور اس کا دستورالعمل تیار کر کے متعدد اہل علم کے پاس بھیجا۔
- مطبع مفید عام آگرہ سے ''علم الکلام'' شائع ہوئی۔
- ندوہ کے نصاب تعلیم میں اصلاح کی کوشش شروع کی اور انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا۔
- ماہنامہ ''الندوہ'' لکھنو کا خاکہ پیش کیا۔
- ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے کئے امرت سر گئے۔
- مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نے ندوہ کی نظامت کی پیش کش کی مگر علامہ شبلی نے نامنظور کر دیا۔

۱۹۰۴ء

- مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے ساتھ ماہنامہ ''الندوہ'' کے ایڈیٹر منتخب ہوئے۔ اگست میں پہلا شمارہ شائع کیا۔
- پروفیسر آرنلڈ کو جب وہ واپس انگلینڈ جا رہے تھے، الوداع کہنے حیدر آباد سے بمبئی گئے۔
- سلسلہ کلامیہ کی تصنیف ''الکلام'' شائع ہوئی۔
- مدراس گئے اور ندوہ کے چوتھے اجلاس کی صدارت کی۔
- دہلی میں ''اسلام کی بے تعصبی'' کے موضوع پر لکچر دیا۔
- دوسری صاحبزادی رابعہ نے کم عمری میں وفات پائی۔

- والد نے جو قرض چھوڑا تھا وہ اس سال ادا ہوا۔
- دوسری بیوی سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔
- موازنہ انیس و دبیر پایہ تکمیل کو پہنچی۔

۱۹۰۵ء

- کم سن بیٹے نے انتقال کیا۔
- فروری میں سررشتہ علوم وفنون کی نظامت سے مستعفی ہو کر اعظم گڑھ آئے
- ۲۳ / اپریل کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم منتخب ہوئے۔
- ندوہ میں جدید نصاب تعلیم نافذ کیا۔
- مولانا عبداللہ العمادی کو ندوہ کا سب ایڈیٹر مقرر کیا۔
- مولانا ابوالکلام آزاد کو ندوہ بلایا۔
- اکتوبر میں مولانا ابوالکلام آزاد کو ماہنامہ ''الندوہ'' لکھنو کا سب ایڈیٹر بنایا۔ وہ تقریباً آٹھ ماہ علامہ شبلی کی صحبت میں رہے۔
- دوسری بیوی نے انتقال کیا۔
- مولانا ابوالکلام آزاد مولانا شبلی کے ساتھ اعظم گڑھ آئے۔
- نواب محسن الملک نے علی گڑھ کالج کی سنٹرل کمیٹی کا رکن نامزد کیا۔
- سلطان جہاں بیگم سے ملاقات کی اور ندوہ کے لئے امداد حاصل کی۔
- بیگم بھوپال نے بھوپال میں قیام کی خواہش ظاہر کی۔

۱۹۰۶ء

- ندوہ میں درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا اور علامہ حمید الدین فراہی سے اس میں حصہ لینے کی فرمائش کی۔ چنانچہ انہوں نے تعطیلات میں دو سال یہ فریضہ انجام دیا۔
- مولانا کے صاحب زادے حامد حسن نعمانی تحصیلدار مقرر ہوئے۔ ان کی پہلی تقرری دیوگام میں ہوئی، پھر جون پور تبادلہ ہوا۔

- اگست میں ''سوانح مولانا روم'' شائع ہوئی جو دورِ جدید میں مولانا روم پر پہلا تحقیقی کام ہے۔
- ''مونس الارواح'' از جہاں آراء بیگم کا نادر نسخہ سو روپئے میں پنساری کی دوکان سے خریدا، جو آج کتب خانہ دارالمصنّفین کی سب سے قیمتی کتاب ہے۔
- نواب سلیم اللہ خاں ڈھاکہ کی فرمائش پر ڈھاکہ کا سفر کیا اور میرزا شجاعت علی خاں ایرانی کونسلر کی صدارت میں ''تاریخ اسلام'' پر ڈھاکہ میں لکچر دیا۔
- ڈھاکہ جاتے ہوئے کلکتہ میں قیام کیا۔ یہاں اورنگزیب عالم گیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن، داراشکوہ اور زیب النساء کی تحریریں دیکھیں۔ ''مسلمان اور فن تاریخ'' کے موضوع پر لکچر دیا۔
- اسی سال ندوہ کے اجلاس بنارس میں شریک ہوئے اور ایک علمی نمائش کا اہتمام کیا جس میں شاہی فرامین خاص طور سے جمع کئے گئے تھے۔
- ندوہ کی امداد کے لئے بمبئی کا سفر کیا۔
- اپنے شاگرد مولانا محمد علی جوہر کی خواہش پر بڑودہ گئے۔
- انہی کی خواہش پر دسمبر ۱۹۰۶ء میں ماہنامہ الندوہ میں ''مضامین عالمگیر'' لکھنے کا آغاز ہوا۔
- مولانا سید سلیمان ندوی کو ماہنامہ ''الندوہ'' کا سب ایڈیٹر مقرر کیا۔
- مولانا عبدالسلام ندوی کے پہلے مضمون تناسخ کو تعریفی نوٹ کے ساتھ ماہنامہ الندوہ لکھنو میں شائع کیا اور انعام دے کر حوصلہ افزائی کی۔

۱۹۰۷ء

- اپنا ذاتی کتب خانہ ندوہ پر وقف کیا۔
- ۷ ارمئی کو بھری بندوق چل جانے سے حادثہ گزندپا ہوا جس پر مولانا حالی، مولانا اقبال احمد خاں سہیل، نواب علی حسن خاں، خواجہ عزیز الدین عزیز، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا سید سلیمان ندوی نے رباعیاں لکھیں۔

- اسی مہینے میں ''موازنہ انیس و دبیر'' شایع ہوئی۔
- ڈھاکہ، مظفر پور اور حیدر آباد کا سفر کیا اور وہاں کے جلسوں میں شریک ہوئے۔
- لکھنؤ میں ''اسلام اور بے تعصبی'' کے موضوع پر لکچر دیا۔
- نواب محسن الملک نے جو مولانا شبلی کے بڑے مداح تھے، شملہ میں وفات پائی تو ''ہائے محسن الملک'' کے عنوان سے الندوہ میں تعزیتی نوٹ لکھا۔
- پاؤں بنوانے کے لئے بمبئی کا سفر کیا۔
- شعر العجم کا پہلا حصہ مکمل ہوا۔

۱۹۰۸ء

- مدرسۃ الاصلاح سرائمیر قائم ہوا۔ علامہ شبلی نے اس کی سرپرستی قبول کی۔ اس کے نظام تعلیم و تربیت کا ایک خاکہ تیار کیا اور مولانا حمید الدین فراہی سے اس میں شرکت کی فرمائش کی۔
- وقف علی الاولاد کے لئے تحریک برپا کی۔
- رسالہ وقف علی الاولاد سپرد قلم کیا۔
- وقف علی الاولاد کے متعلق ہندوستان کے علماء سے فتاوی منگوائے اور اسے کتابی صورت میں ''فتاوی علمائے ہندوستان'' کے نام سے شایع کرایا۔
- وقف علی الاولاد کی حمایت میں چالیس ہزار افراد سے دستخط حاصل کئے اور حکومت کو پیش کیا۔
- فارسی غزلوں کا مجموعہ ''دستہ گل'' شائع ہوا۔
- شعر العجم کا پہلا حصہ شائع ہوا۔
- حکومت حیدر آباد نے علوم مشرقیہ کی یونیورسٹی قائم کرنی چاہی تو اس کے نصاب کی تیاری علامہ شبلی کے سپرد کی۔ نظامت کی بھی پیش کش کی گئی تھی مگر انہوں نے معذرت کی۔
- جامعہ عثمانیہ کا نصاب تیار کیا۔

- سلسلہ مضامین عالم گیر پایہ تکمیل کو پہنچا۔
- اسی سال ندوہ میں ہندی اور سنسکرت کا شعبہ قائم کیا۔
- اشاعت وحفاظت اسلام کا منصوبہ بنایا۔
- مارچ میں کرنل عبدالمجید خاں کی دعوت پر راجپوت کانفرنس پٹیالہ میں شرکت کی۔
- ندوہ کے لئے ریاست بہاول پور سے پچاس ہزار روپے حاصل کئے۔
- بمبئی کا سفر کیا اور دولت مند تاجروں کو ندوہ کی طرف مائل کیا۔
- حکومت سے ندوہ کی تعمیر کے لئے ۳۲ ربیگھہ زمین حاصل کی اور اس پر دارالاقامہ تعمیر کرایا۔اس میں خود مزدوروں کی طرح کام کیا۔اس موقع پر بڑی پراثر تقریر کی۔

۱۹۰۹ء

- ندوہ میں درجہ تکمیل قائم کیا۔
- ریاست بھوپال سے ندوہ کے لئے امداد حاصل کی۔
- مضامین عالمگیر کتابی صورت میں امرت سر سے شائع ہوا۔
- مارچ میں ندوہ کے لئے سرحد کے اضلاع پشاور وغیرہ کا مختصر دورہ کیا۔محمڈن کلب کے ہال میں ندوہ کے مقاصد پر تقریر کی۔یہاں سے راول پنڈی گئے اور تقریریں کیں۔
- اہل کوہاٹ نے مدعو کیا تو مولوی غلام محمد شملوی کے ساتھ کوہاٹ گئے اور اسلام کی جامعیت کے موضوع پر لکچر دیا۔
- اکتوبر میں ان کے استاذ مولانا فاروق چریا کوٹی نے وفات پائی۔
- شعرالعجم حصہ دوم شائع ہوا۔
- ۲۴ رمئی کو شعرالعجم حصہ سوم پایہ تکمیل کو پہنچا۔
- ۲۸ رمئی کو کلکتہ کے سفر پر روانہ ہوئے۔
- سید افتخار عالم مارہروی نے سوانح عمری لکھنے کی خواہش ظاہر کی۔
- ۴ رجون کو ضلع ''گیا'' گئے۔

- ۱۷ستمبر کو دہلی تشریف لے گئے اور کئی لکچر دئے۔
- بڑی صاحبزادی فاطمہ خانم نے انتقال کیا۔
- ۳/اکتوبر کو بمبئی پہنچے۔
- فارسی غزلوں کا دوسرا مجموعہ ''بوئے گل''، مطبع احمدی علی گڑھ میں طبع ہوا۔
- نواب جنجیرہ کی دعوت پر ۷/اکتوبر کو جنجیرہ پہنچے۔لکچر دیا اور انجمن اسلام مروڈ کا معائنہ کیا۔

۱۹۱۰ء

- مدرستہ الاصلاح سرائے میر کے جلسہ میں شرکت کی۔
- ندوہ میں صیغۂ تصحیح اغلاط تاریخی قائم کیا اور مولانا سید سلیمان ندوی کو اس کا سکریٹری بنایا۔
- شعرالعجم کا تیسرا حصہ شائع ہوا۔
- مشرقی بنگال وآسام میں اصلاح مدارس کی کمیٹی کے رکن نامزد ہوئے۔
- انگریزی ترجمہ قرآن کی تجویز پیش کی۔
- مولانا کی خواہش پر سرآغا خاں ندوہ تشریف لائے تو منظوم سپاس نامہ پیش کیا۔
- زمرۂ مصنّفین کی دائمی خدمت کے جذبہ سے دارالمصنّفین کے قیام کی تجویز پیش کی۔
- قانون وقف علی الاولاد کے سلسلے میں مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں شریک ہوئے۔
- مولانا عبدالسلام ندوی کو ماہنامہ ''الندوہ'' کا سب ایڈیٹر بنایا۔
- ڈاکٹر سید محمود نے ''مضامین عالم گیر'' کا خلاصہ لندن میں شائع کیا۔
- ندوہ کے سالانہ اجلاس میں مجلس برائے اشاعت اسلام کی تجویز پیش کی۔
- نومسلموں کو ارتداد سے بچانے کے لئے حفاظت واشاعت اسلام کا خاکہ پیش کیا۔اور اس سلسلے میں شاہ جہاں پور اور رائے بریلی وغیرہ مقامات کا دورہ کیا۔
- ندوہ کی امداد کے لئے پنجاب، صوبہ سرحد اور بہار کے بعض شہروں کا دورہ کیا۔
- ندوہ کے لئے ریاست رام پور سے پانچ سو روپے سالانہ کی امداد منظور کرائی۔

- دہلی کے اجلاس ندوہ میں شریک ہوئے اور ندوہ کے زیر اہتمام ''اشاعت اسلام'' کی تجویز پیش کی۔
- نومسلموں کی مردم شماری کی تجویز پیش کی۔
- نومسلموں کو دوبارہ ہندو ہو جانے سے بچانے کی تدابیر پیش کیں۔

۱۹۱۱ء

- قانون وقف علی الاولاد کے سلسلے میں محمد علی جناح سے بمبئی جا کر ملاقات کی۔
- شعرالعجم کو ۱۹۱۰ء کی بہترین کتاب قرار دیتے ہوئے پنجاب یونیورسٹی لاہور نے طلبہ کو اس کے مطالعے کی ہدایت دی اور مصنّف کو ڈیڑھ ہزار روپے کے انعام سے نوازا۔
- محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی میں شریک ہوئے۔ اسی اجلاس میں علامہ اقبال سے ملاقات ہوئی اور انہیں کانفرنس کی طرف سے ''ترجمان حقیقت'' کے خطاب ملنے پر پھولوں کا ہار پہنایا اور غالب ثانی ہونے کی پیشین گوئی کی۔
- عیسائی مورخ جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال مصر کی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی کے رد میں عربی تصنیف الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی لکھی جو اسی سال ہندوستان اور مصر سے شائع ہوئی۔
- کثرت مطالعہ کے سبب ایک آنکھ میں پانی اتر آیا۔
- تمغہ مجیدیہ غائب ہوا۔
- ایم۔اے۔او۔ کالج علی گڑھ کو یونیورسٹی بنانے کے لئے تحریک میں شامل ہوئے اور اس کے متعدد اجلاسوں میں شرکت کی۔
- یونیورسٹی وفد کے ساتھ وزیر تعلیم سے ملنے شملہ گئے۔
- مشرقی کمیٹی شملہ کے رکن نامزد ہوئے۔

۱۹۱۲ء

- سیرت نبویؐ کی تالیف کا اعلان کیا اور مجلس تالیف سیرت نبویؐ قائم کی۔

- ندوہ میں بھاشا کی تعلیم کا آغاز کیا۔
- بانکی پور پٹنہ کے عظیم الشان جلسے میں شرکت کی۔
- انجمن خدام الدین کی بنیاد ڈالی۔
- مجلس برائے اشاعت وحفاظت اسلام قائم کی اور مولانا سید سلیمان ندوی کو اس کا سکریٹری بنایا۔
- لکھنؤ سے اخبار مسلم گزٹ جاری کرایا۔ مولوی وحیدالدین سلیم کو اس کا ایڈیٹر منتخب کیا۔
- ارتداد کے فتنے سے متاثر ہوکر نومسلموں کی مردم شماری کے لئے فارم تیار کیا اور متعدد مقامات بدایوں، بیاور، اجمیر، جے پور، جودھ پور، کشن گڑھ، الور، باندی کوئی اور ریواڑی وغیرہ کی مردم شماری کرائی۔ یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔
- اسی سال سیرت اکیڈمی قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔
- شعرالعجم کا چوتھا حصہ شائع ہوا، ضخیم ہوجانے کی وجہ سے چوتھے حصے کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ پانچواں اور آخری حصہ ان کی وفات کے چار سال بعد ۱۹۱۸ء میں دارالمصنّفین نے شائع کیا۔
- سیرۃ النبی کا آغاز اسی سنہ میں جون کے مہینہ میں ہوا۔
- ندوہ کے اجلاس لکھنؤ میں شیخ رشید رضا مصری کو مدعو کیا اور انھوں نے اجلاس کی صدارت کی۔
- ورنا کولر اسکیم الٰہ آباد کی مخالفت کی اور اردو کو ناگری ہونے سے بچایا۔
- تحریک چلا کر تعطیل جمعہ منظور کرائی۔
- مجلس علم کلام کی تجویز پیش کی، جس میں علماء اور جدید تعلیم یافتہ دونوں کو شرکت کی دعوت دی۔
- وقف علی الاولاد کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر کیا۔
- تعطیل جمعہ کے سلسلے میں پٹنہ کا سفر کیا۔
- اکتوبر میں جنجیرہ تشریف لے گئے۔

- اسی سال مشہور سیاسی مقالہ ''مسلمانوں کی پولیٹکل'' کروٹ لکھا۔ اس کی مخالفت میں فیض آباد اور راول پنڈی میں تحریک برپا ہوئی۔
- شاہ منیر عالم صاحب غازی پوری نے مولانا شبلی کے حالات پر مشتمل مضمون لکھا جو مسلم ریویو الہ آباد۔ اگست ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا۔
- بمبئی کا سفر کیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کو دفتر سیرت میں شامل کیا۔
- ماہنامہ الندوہ کی ادارت سے مستعفی ہوئے۔
- شہر آشوب اسلام لکھی۔ جس کا آغاز اس شعر سے ہوا ہے۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

۱۹۱۳ء

- اگست میں مچھلی بازار کان پور کی مسجد کا وضوخانہ حکومت نے منہدم کرادیا۔ مولانا شبلی نے اس پر اپنی نظموں میں شدید ردعمل ظاہر کیا جس کے پورے ملک پر اثرات مرتب ہوئے
- اردو میں اخلاقی اور تاریخی نظموں کی داغ بیل ڈالی۔
- اردو کلام کا مجموعہ ''نالہ شبلی'' کے نام سے مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا۔
- عطیہ فیضی کے شوہر مسٹر سیموئل رحمین نے علامہ شبلی کی تصویر بنائی جو ۱۹۱۳ء کی پیرس کی نمائش میں کمال مصوری کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ٹھہری۔
- مولانا عبدالسلام ندوی کو دفتر سیرت میں مددگار بنایا اور ان کو ساتھ لے کر بمبئی گئے۔
- ماہنامہ الندوہ میں مولوی عبدالکریم نے حکومت مخالف مضمون لکھا۔ حکومت کے عتاب سے بچنے کے لئے تمام ارکان ندوہ نے مل کر انہیں معطل کر دیا اور جب ان کی معطّلی کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو اس کی تمام تر ذمہ داری علامہ شبلی کے سر ڈال دی اور ان کے خلاف ایک طوفان برپا کیا، جس سے دل برداشتہ ہو کر ندوہ کی معتمد تعلیم کے عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔

- حکومت نے نظموں کا ایک مجموعہ ضبط کیا جس میں علامہ شبلی کی بھی ایک نظم شامل تھی۔
- اکتوبر میں حیدر آباد کا سفر کیا اور وظیفہ حیدر آباد میں دو سو روپئے کا اضافہ ہوا۔
- جولائی میں ندوہ سے مستعفی ہوئے۔
- لکھنؤ میں درس بخاری کا سلسلہ شروع کیا۔ جس میں بعض ارکان ندوہ نے طلبہ کو شرکت سے روکا۔
- تالیف سیرت کے لئے سلطان جہاں بیگم بھوپال نے دوسو(۲۰۰) روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔ اسی موقع پر علامہ شبلی نے یہ اشعار کہے تھے:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہرصورت کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

- نواب حمید اللہ خاں بھوپال نے سیرت نبوی سے متعلق کتابیں خریدنے کے لئے یک مشت دو ہزار روپئے دینا منظور کیا۔
- اسی سال مدینہ یونیورسٹی کے قیام کی تجویز سامنے آئی اور درس وتدریس کے لئے ہندوستان سے علامہ شبلی نعمانی اور ان کے عزیز ترین شاگرد علامہ حمید الدین فراہی کا نام پیش کیا گیا۔
- مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کی طرف متوجہ ہوئے۔ نیشنل اسکول، دار المصنفین اور مدرسۃ الاصلاح کو ملا کر ایک وسیع جامعہ اسلامیہ کا خیال پیدا ہوا بلکہ اب ان کی تمام آرزوؤں کی تکمیل کا مرکز یہی ادارے ٹھہرے۔

۱۹۱۴ء

- جنوری میں اپنے وطن اعظم گڑھ آئے اور شبلی منزل میں قیام کیا۔
- اوقاف اسلامی کے تحفظ کے لئے تحریک شروع کی۔

- خواجہ حسن نظامی کے حلقہ مشائخ میں تصوف کے موضوع پر تقریر کی۔
- فروری میں سیرۃ النبیؐ جلد اول پایہ تکمیل کو پہنچی اور دوسری جلد کی تصنیف کا آغاز ہوا۔
- مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے رکن نامزد ہوئے اور لکھنو کے کئی اجلاسوں میں شرکت کی۔
- مارچ میں دارالمصنّفین کا خاکہ مرتب کیا جو الہلال کلکتہ میں شائع ہوا اور اس کے لئے اعظم گڑھ میں اپنا باغ، بنگلہ اور اعزہ کی جائدادیں وقف کیں۔
- سیرت نبوی کا وظیفہ بند کرانے کے لئے مولانا عبدالشکور فاروقی نے سیرت پر بے سروپا تنقید لکھ کر کتابچے کی شکل میں بیگم بھوپال کو بھیجا۔
- دہلی میں ندوہ کی اصلاحی کمیٹی کے جلسے میں مولانا شبلی پر چار فتوی تکفیر تقسیم ہوئے۔ ان میں ایک فتوی مولانا عبدالحق حقانی کا تھا۔ یہ فتاوے بیگم بھوپال کو بھیجے گئے۔
- ۷؍ مارچ کو علامہ شبلی کی حمایت میں طلبائے ندوہ نے تاریخی اسٹرائک کی۔ مولانا مسعود علی ندوی نے ان کی قیادت کی۔
- لکھنؤ میں مولانا شبلی کا صندوقچہ چوری ہوا۔
- رسالہ معارف جاری کرنے کا خیال آیا۔ مولانا عبدالسلام ندوی اس کے ایڈیٹر قرار پائے۔ مگر ان کے الہلال میں جانے کی وجہ سے جاری نہ ہوسکا۔
- ناگ پور یونیورسٹی کے قیام کا اعلان ہوا اور علامہ شبلی سے تعاون کی درخواست کی گئی۔
- ۱۵؍ اگست کو منجھلے بھائی مولوی محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ الہ آباد نے انتقال کیا۔ علامہ شبلی نے ایک خط میں لکھا ''میرا سب کچھ جاتا رہا، اِناللہ''۔
- مرثیہ اسحاق لکھا جو ''نوحہ اسحاق'' کے نام سے مطبع مفید عام آگرہ سے شایع ہوا۔
- اسی ماہ میں اسہال کے سبب سخت علیل ہوئے۔
- ۱۵؍ نومبر کو مولوی عبدالحکیم بندولی سے جو سیرۃ النبی کے مسودہ نویس تھے، ایک موٹا کپڑا منگوا کر مسودہ سیرت بندھوایا اور پھر ایک صندوق میں مقفل کرادیا اور تاکید کی کہ اسے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حمیدالدین فراہی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے علاوہ

کسی کو نہ دینا، حتیٰ کہ بیگم بھوپال کو بھی۔ پھر مولانا ابوالکلام آزاد کو کلکتہ، مولانا فراہی کو حیدرآباد اور مولانا سید سلیمان ندوی کو کلکتہ، پونہ اور دیسنہ کے پتے پر تار بھیجے۔

- ۱۸ر نومبر کو سیرت، سیرت کہتے ہوئے اپنے مالک حقیقی کے حضور جا پہنچے۔

اناللہ وانا الیہ راجعون.

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہاہوں سیرت پیغمبرؐ خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

- اسی دن احاطہ شبلی منزل میں تدفین عمل میں آئی۔
- ۲۱ر نومبر کو ان کے تلامذہ نے مجلس اخوان الصفا قائم کی۔ مولانا حمیدالدین فراہی اس کے صدر، مولانا سید سلیمان ندوی سکریٹری، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا شبلی متکلم اور مولوی مسعود علی ندوی ممبر نامزد ہوئے اور علامہ شبلی کے عزائم اور علمی و تحقیقی منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہونچانے کے لئے دارالمصنّفین کے کاموں کا آغاز ہوا۔ یہ علامہ شبلی اور ان کے نامور تلامذہ کے خلوص کی برکت ہے کہ دارالمصنّفین اب تک نہ صرف قائم ہے بلکہ اس کا شمار عالم اسلام کے عظیم علمی، تحقیقی اور تصنیفی اداروں میں ہوتا ہے۔

باب دوم

تصنیفات شبلی

اسکات المعتدی علی انصات المقتدی

علامہ شبلی نعمانی کے قلم سے جو پہلی تحریر نکلی وہ عربی زبان میں "اسکات المعتدی علیٰ انصات المقتدی" ہے۔(۱) بڑی سائز کے ۲۴ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ محرم ۱۲۹۸ھ مطابق دسمبر ۱۸۸۰ء میں محمد عبدالرحمٰن بن الحاج محمد روشن خاں کے زیر اہتمام مطبع نظامی کان پور میں طبع ہوا۔ اس کی طباعت کے اخراجات مصنف کے چچا شیخ مجیب اللہ نے ادا کئے۔(۲)

اس رسالہ میں علامہ شبلی نے ثابت کیا ہے کہ امام کے پیچھے قرأت فاتحہ نہ صرف یہ کہ واجب نہیں بلکہ مکروہ ہے۔ خواہ نماز جہری ہو یا سری۔ دونوں حالتوں میں مقتدی کو خاموش رہنا ہے۔ اپنے موقف کی تائید میں علامہ شبلی نے قرآن مجید کی یہ آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا . پیش کی ہے اور اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ مطلوب قرآن کا سننا اور خاموش رہنا ہے۔ قرآن کا سننا تو جہری نمازوں ہی میں ممکن ہے، سری میں نہیں اور خاموش رہنا دونوں میں ممکن ہے۔ علامہ شبلی نے اپنے موقف کی تائید میں قدمائے حنفیہ کے متعدد دلائل کا بھی احاطہ کیا ہے۔

قرأت فاتحہ خلف الامام کی اصل بحث سے پہلے علامہ شبلی نے سنت رسولؐ کی اہمیت بیان کی ہے، پھر صحابۂ کرامؓ اور فقہائے عظام کی خدمات کا تفصیل سے ذکر بھی کیا ہے۔

علامہ شبلی نے اس میں غیر مقلدین کے ساتھ معتدل رویہ رکھنے والے حنفی عالم مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحئ فرنگی محلی [۱۸۴۸ء-دسمبر ۱۸۸۷ء] پر خلف الامام کے سلسلے میں ان کے موقف کی تردید کی ہے۔(۳) مولانا عبدالحئ فرنگی محلی زبردست عالم تھے۔ ان کا موقف شبلی کے برعکس تھا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"ائمہ احناف کے نزدیک امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا نہ پڑھنا متفق علیہ نہیں،

جیسا کہ سمجھا جاتا ہے بلکہ بعض پڑھنے کے بھی قائل ہیں اور کم از کم یہ کہ مقتدی پر فاتحہ کا پڑھنا نہ حرام ہے نہ مکروہ، بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ وہ شافعیوں کی طرح اس کا پڑھنا ہر حال میں واجب نہیں سمجھتے۔ آخر میں مولانا عبدالحئ صاحب نے اپنی تحقیق یہ ظاہر فرمائی تھی کہ جہری میں امام کے سکتات میں یعنی سورۂ فاتحہ پڑھنے میں جہاں جہاں امام چپ ہو اور سری میں عام طور سے مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھے۔''(۴)

مولانا عبدالحئ فرنگی محلی نے اپنے ان خیالات کا اظہار **امام الکلام فی مایتعلق بالقرأة خلف الامام** (مطبع مصطفائی دہلی، ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ء) میں کیا تھا۔ علامہ شبلی نے ''**اسکات المعتدی**'' میں اسی کا تعاقب کیا ہے۔ اس تعاقب کی وجہ سے اسکات المعتدی خاص طور سے موضوع بحث رہی۔ چنانچہ اس کے متعدد جوابات لکھے گئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کی تفصیل ''حیات شبلی'' میں لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ رسالہ جب مولانا عبدالحئ صاحب اور ان کے شاگردوں تک پہنچا تو انھوں نے اس کے جوابات لکھے اور چھپوائے۔ ان میں سے پہلا جوابی رسالہ مولانا عبدالحئ صاحب کے شاگرد مولانا نور محمد صاحب ملتانی نے لکھا اور رسالہ کا نام ''تذکرۃ المنتھی فی رد اسکات المعتدی'' ہے۔ ان ہی کا دوسرا مختصر رسالہ ''الافادات فی رد الاسکات'' ہے اور تیسرا ''التنبیہات علی ھفوات الاسکات'' ہے۔ چوتھا رسالہ ''الایماضات الی اغلاط مصنف الاسکات'' حافظ ملا شعیب حنفی کابلی باجوری کا ہے۔ یہ مجموعہ ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۰ء) میں مطبع انوار محمدی لکھنؤ میں چھپا۔ اس کے آخر میں حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری کے ایک شاگرد عزیز کی مدحیہ تاریخ ہے۔ گو خود مولانا عبدالحئ صاحب نے اس رسالہ کا براہ راست جواب نہیں دیا لیکن چند سال کے بعد انھوں نے اپنے رسالہ ''الکلام'' کو دوبارہ چھپوایا تو غیث الغمام (مطبوعہ: مطبع علوی لکھنو، ۱۳۰۳ھ/۸۶-۱۸۸۵ء) کے نام سے اس پر ایک حاشیہ لکھا جس میں منجملہ دوسری باتوں کے مولانا سے تعرض

کئے بغیر ان کے اعتراضوں کے جوابات دیے ہیں۔'' (۵)

علامہ شبلی ان رسائل کے جوابات لکھنے کا بھی ارادہ رکھتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''انشاء اللہ دراندک زمانے از عہدہ رد تذکرہ بدرمی آیم۔ مردمان گویند کہ ایماضات وددرسالہ دیگر ہم از حافظ صاحب است تا حال بر علم واستعداد حافظ صاحب اعتمادے داشتم اکنوں آں ہم برخاست .... انشاء اللہ درقریب وقتے بہ غازی پورمی رسم....... وددریں اغلاط وپا لغزہائے مصنف تذکرہ وایماضات ہمہ باز خواہم گفت۔'' (۶)

اس کے بعد علامہ شبلی کی مولانا عبدالحیؒ صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے علمائے احناف کی خانہ جنگی پر افسوس کا اظہار کیا۔ چنانچہ اس اشارہ کو علامہ شبلی نے اپنے اوپر محمول کیا اور نادم ہوئے۔ (۷) اور غالباً اسی بنا پر اس کی طرف پھر کبھی توجہ نہ دی۔

اسکات المعتدی سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کو فقہ وفتاویٰ کے ساتھ عربی زبان وادب پر بڑا عبور حاصل تھا اور وہ بڑی انشا پردازانہ زبان استعمال کرتے تھے۔ ''اسکات المعتدی'' کی زبان مسجع اور انداز تحریر متکلمانہ، مناظرانہ اور کسی قدر واعظانہ ہے۔ اس کی ابتداء میں انھوں نے جو حمد وثنا بیان کی ہے، وہ ان کے انداز نگارش اور عربی زبان پر ان کی دست رس کا نمونہ ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

"الحمدللہ المفیض الوسمی المذلل الامی المسیل الاذی بسطوتہ وسلطانہ رافع العنان باسط الدجان سابق الظمان فھو اجر الطلب ومعمعانہ والصلوٰۃ علی رسولہ الھادی صاحب اللھی والایادی احمس من خضب تیامور الاعادی ومھج المعادی شفار القواضب وسنان الھواری وافضل من امتطأ سنام الیعامل واقتعد غوارب الخواری وعلی آلہ واصحابہ ولاۃ الدول کماۃ الملل ھداۃ السبل ماانھمر السواری وانسکب الغوادی علی بقاع العمران وعراص البوادی." (۸)

مولانا سید سلیمان ندوی نے "اسکات المعتدی" کی دوخصوصیتوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس رسالہ میں بھی وہ دو باتیں جوان (مولانا شبلی) کے فضل وکمال کا طرۂ امتیاز تھیں، موجود ہیں۔ ایک منطقیانہ ترتیب وحسن استدلال اور دوسری عربی انشا پردازی۔ اسی لئے جن لوگوں نے اس کے جواب لکھے، انھوں نے بھی اپنے جوابی رسالوں میں ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھا۔"(۹)

اسکات المعتدی کے مطالعہ سے یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ علامہ شبلی ابتدائی دور میں عربی زبان میں طبع آزمائی بھی کرتے تھے۔ اس رسالہ میں انھوں نے جابجا اشعار نقل کئے ہیں۔ اس میں خود ان کی صراحت کے مطابق یہ تین اشعار ان کے ہیں:

وهل ذاك الا موعظات ورحمة	ونور هدى للعالمين مسائله
وقد جاء يهدى للتى هى اقوم	ويغنيك عما كنت دهراً تداوله
لعمرك طل منه يشفى غليلهم	فكيف اذا ماجاد للناس وابله

یہ رسالہ اب تقریباً نایاب ہے۔ باوجود تلاش بسیار کے مطبوعہ نسخہ راقم کی نظر سے اب تک نہیں گذرا۔ البتہ مطبوعہ نسخہ کی ایک نقل کتب خانہ دارالمصنّفین میں موجود ہے، جو ۱۹۴۰ء میں اصل سے نقل کی گئی ہے۔ اس کے کاتب حافظ سید واجد حسین رام پوری ہیں۔ آخر میں مشہور محقق امتیاز علی خاں عرشی مرحوم (ف: ۲۵رفروری ۱۹۸۱ء) کا ۱۹رنومبر ۱۹۴۰ء کا یہ نوٹ بھی ہے کہ "میں نے اور مولوی عبداللہ صاحب نے اس کا اصل سے مقابلہ کرلیا ہے۔"(۱۰)

علامہ شبلی کے اس ابتدائی رسالہ کی شہرت ومقبولیت ملک کی سرحدوں سے نکل کر دوسرے اسلامی ممالک تک جا پہنچی۔ رسالہ اہل علم اور علماء کی نظر میں قابل وقعت ٹھہرا۔ ۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے روم ومصر وشام کا سفر کیا تو بعض علماء نے اس رسالہ کے مصنف کی حیثیت سے ان کی بڑی قدر ومنزلت کی۔ اس کی تفصیل خود علامہ شبلی کے قلم سے ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک دن شیخ علی ظبیان جن کے والد ایک مشہور صوفی ہیں، شیخ عبدالفتاح سے ملنے آئے۔ میں بھی اس وقت موجود تھا اور اتفاق سے رسالہ "اسکات المعتدی"

جو میری قدیم تصنیف ہے اور عربی زبان میں ہے، سامنے رکھا ہوا تھا۔ انھوں نے اٹھا کر دیکھا اور کہا کہ اہا! یہ رسالہ مدت ہوئی میں نے دمشق میں اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا تو انھوں نے اس کے مصنف کی نسبت کہا تھا ''**شکر الله مساعیه** .'' شیخ ظبیان کو جب معلوم ہوا کہ وہ رسالہ میری ہی تصنیف ہے تو اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے ملے اور نہایت لطف و مہربانی سے پیش آئے۔ مجھ کو اس بات سے کہ میری ناچیز تصنیف یہاں تک پہنچی اور لوگوں نے اس کو نگاہ قبول سے دیکھا، نہایت مسرت ہوئی اور سفر کی کسمپرسی میں اتنا ذریعہ تعارف بہت غنیمت معلوم ہوا۔''(۱۱)

مقتدیٰ خاں شروانی (ف: ۶ر دسمبر ۱۹۶۸ء) کا خیال ہے کہ 'اسکات المعتدی' کی وجہ سے علامہ شبلی کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اس (ابتدائی) زمانہ کے ایک رسالہ نے جو عربی زبان میں اسکات المعتدی کے نام سے تھا، عربی بولنے والے ممالک میں اتنی شہرت حاصل کی تھی کہ جو سالہا سال بعد مولانا نے روم و مصر و شام کا سفر کیا تو وہاں ان کی شہرت ''اسکات المعتدی'' کی راہ سے بہت پہلے سے پہنچی ہوئی تھی۔ وہاں ان کی عزت اہل دنیا میں علی گڑھ اور اہل علم میں ''اسکات المعتدی'' کے ذریعہ ہوئی۔''(۱۲)

بہر حال علامہ شبلی کی یہ پہلی تحریر اہل علم اور ارباب دانش کی نظر میں قابل قدر ٹھہری اور ہندوستان سے قسطنطنیہ اور دمشق تک اس کی پذیرائی ہوئی۔ ان کی اس یادگار کی حفاظت ضروری ہے۔

حوالے

(۱) مکاتیب شبلی جلد۲ ص ۲۳۵

(۲) ایضاً جلد۲ ص ۲۵۵

(۳) ملاحظہ ہو اسکات المعتدی علی انصات المقتدی، مطبوعہ نظامی کان پور ۱۲۹۸ھ

(۴) حیات شبلی ص ۱۰۵

(۵) ایضاً ص ۱۰۵-۱۰۶

(۶) مکاتیب شبلی جلد ۲ ص ۲۴۷ - ۲۴۸

(۷) حیات شبلی ص ۱۰۷

(۸) مخطوطہ اسکات المعتدی ص ۱

(۹) حیات شبلی ص ۱۰۷

(۱۰) اسکات المعتدی علی انصات المقتدی ص ۲۴، مطبع نظامی کان پور ۱۲۹۸ھ

(۱۱) علامہ شبلی ۔ سفرنامہ روم ومصروشام ص ۳۰ ۔ دارالمصنّفین اعظم گڑھ ایڈیشن ۱۹۹۹ء

(۱۲) محمد مقتدی خاں شروانی ۔ البصیر شبلی نمبر ص ۱۵۱ ۔ اسلامیہ کالج چنیوٹ، ۱۹۵۷ء

ظل الغمام فی مسئلۃ القرأۃ خلف الامام

علامہ شبلیؒ کا ابھی عنفوان شباب ہی تھا کہ ان کے علاقے میں مولانا سلامت اللہ جیراج پوریؒ [۱۸۰۱ء-۱۵/جون ۱۹۰۴ء] کے وعظ وتبلیغ سے تقلید اور عدم تقلید کی گرم بازاری شروع ہوگئی۔ حتی کہ خود علامہ شبلی اوران کے قرابت داروں میں بھی تفرقہ کی نوبت آگئی۔ علامہ شبلی حنفی تھے اور تازہ تازہ مولانا فاروق چریا کوٹی (ف:۲۸/اکتوبر۱۹۰۹ء) کے درس سے فارغ ہوئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بھی اس معرکہ آرائی میں حصہ لیا۔ اس کی تفصیل مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس زمانہ میں مولانا (شبلیؒ) کا دوسرا کام غیر مقلدوں کا رد تھا۔ اس رد میں جوان کو غلو تھا اس کی پرورش میں ان کے استاذ مولانا فاروق چریا کوٹیؒ کا خاص ہاتھ تھا۔ بندول اور جیراج پور دونوں گاؤں بالکل ملے جلے ہیں۔ بیچ میں شاید ایک میل سے بھی کم کا فصل ہو۔ بندول مولانا شبلی کا اور جیراج پور مولانا سلامت اللہ صاحب کا وطن تھا۔ مولانا سلامت اللہ صاحب نے پہلے جون پور کے مدرسہ میں جاکر مفتی محمد یوسف سے علوم کی تکمیل کی، پھر بنارس میں پڑھا اور پھر دہلی پہنچ کر مولانا سید نذیر حسین صاحب سے حدیث پڑھی اوراس کے بعد نہایت انہماک کے ساتھ اپنے وطن واپس آکر ترک تقلید اور آمین بالجہر، رفع یدین اور قرأت فاتحہ خلف الامام وغیرہ مسائل کی اشاعت کے لئے وعظ وتبلیغ شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اعظم گڑھ کے اطراف میں تقلید وعدم تقلید اوران فقہی مسائل کا شور مچ گیا۔ خود مولانا شبلی کے حقیقی ماموں اور مولانا حمیدالدین

> صاحب کے عم محترم مولوی سلیم صاحب جو ''پھریہا''، ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے اور مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی ، قاضی شیخ محمد صاحب مچھلی شہری اور مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری کے شاگرد تھے، پورے غیر مقلد تھے۔ ان کے سبب سے گویا یوں کہئے کہ خود مولانا شبلی کے خاندان میں آکر تفرقہ پڑ گیا۔
>
> غرض یہ اسباب تھے جن کی بنا پر مولانا شبلی نے غیر مقلدین کے رد کے لئے کمر ہمت چست باندھی۔ سنا ہے کہ جب یہ سن پاتے کہ فلاں گاؤں میں کوئی غیر مقلد ہوا ہے یا آیا ہے تو گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچ جاتے اور مناظرے کا چیلنج دیتے۔ مناظرانہ تقریروں کے علاوہ اس راہ میں تحریری خدمت بھی انجام دی۔ اپنے اور اپنے عزیزوں اور شاگردوں کے ناموں سے تحریریں اور رسالے لکھے، جن میں بعض چھپے اور بعض قلمی رہے۔ ادھر سے مولانا سلامت اللہ صاحب اور رواں ضلع اعظم گڑھ کے مولوی اسداللہ صاحب المتوفی ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۰ء) جو مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری کے شاگرد تھے مقابلہ کو نکلے۔ دونوں طرف سے رسالے لکھے گئے، مناظرے ہوئے ،اشتہارات ہوئے اور وہ سب کچھ ہوا جو ہونا چاہئے۔''(۱)

علامہ شبلی کی دوسری تصنیف ظل الغمام فی مسئلۃ القرأۃ خلف الامام اسی مناظرانہ فضا کی دین ہے۔ سید صاحب نے علامہ شبلی کے اس سلسلہ کے متعدد رسالوں کا ذکر کیا ہے اور یہ صراحت کی ہے کہ اس میں بعض عزیزوں اور شاگردوں کے نام سے چھپے اور بعض قلمی رہے، مگر اب تک اس طرح کے ایک بھی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ رسالے کی نشاندہی نہیں ہو سکی ہے۔ سوائے ظل الغمام کے، جس کا خود علامہ شبلی نے ذکر کیا تھا اور جو ملک کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہے۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ کتب خانہ دارالمصنّفین میں بھی موجود ہے جو ۱۲۹۹ھ [۱۸۸۱ء] میں مطبع نظامی کان پور سے طبع ہوا ہے اور راقم کے پیش نظر ہے۔ اس کا سنہ طباعت سید صاحب نے حیات شبلی میں

۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) لکھا ہے۔(۲) اوراسی سنہ اشاعت کی بنیاد پر سید صاحب نے ظل الغمام کو علامہ شبلی کی پہلی تصنیف قرار دیا ہے ۔حالانکہ اس کے سرورق پر سنہ طباعت ۱۲۹۹ھ لکھا ہوا ہے۔اس لحاظ سے بھی یہ ان کی دوسری اوراسکات پہلی تصنیف قرار پاتی ہے۔خود علامہ شبلی نے بھی ''**اسکات المعتدی**''ہی کو اپنی پہلی تصنیف بتایا ہے۔(۳)

شیخ محمد اکرام کو شبہہ ہے کے یہ علامہ شبلی کا رسالہ ہے۔ان کا خیال ہے کہ شاید یہ ان کے کسی استاذ کی تصنیف ہے۔اس کے انہوں نے درج ذیل وجوہ بھی لکھے ہیں:

۱۔اس زمانے میں شاگردوں کے نام سے [بالخصوص اختلافی مسائل میں] رسالے شایع کرنا عام بات تھی۔

۲۔رسالے کی طباعت کے وقت شبلی کی عمر ۱۶؍سال تھی اوران کے قلم سے یہ رسالہ بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ایجاز واختصار کا جو شبلی کے طرز تحریر کی شروع سے خصوصیت رہی ہے اس رسالے میں سراغ نہیں۔بلکہ طرز تحریر بالکل اس کے برعکس ہے۔

۴۔اورسب سے بڑھ کر یہ کہ جب شبلی سے ایک زمانے میں پوچھا گیا کے ان کی سب سے پہلی تصنیف کون سی ہے تو انہوں نے ایک عربی رسالہ اسکات المعتدی کا حوالہ دیا۔قرین قیاس ہے کہ اگر مسئلہ قراۃ خلف الامام والا رسالہ شبلی کا اپنا ہوتا تو وہ اس کا ذکر ضرور کرتے۔

[یادگار شبلی ص۶۱]

شیخ محمد اکرام نے اپنے موقف کی تائید میں جو وجوہ بیان کی ہیں،ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے رسالہ ظل الغمام سرے سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ان کی معلومات کا ذریعہ شاید حیات شبلی ہے،جس میں ظل الغمام کا سنہ اشاعت ۱۲۹۹ھ کے بجائے ۱۲۹۲ھ درج ہے اوراسی بنیاد پر سید صاحب نے اسے شبلی کی پہلی تصنیف قرار دیا ہے اوراسی بنیاد پر شیخ اکرام نے علامہ شبلی کی عمر ۱۶؍سال بتائی ہے۔حالانکہ اس کا صحیح سنہ اشاعت ۱۲۹۹ھ ہے۔اس لحاظ سے اس وقت علامہ شبلی کی عمر ۲۴؍سال ہوتی ہے۔

شیخ اکرام محقق نہیں اوردعوے بڑے بڑے کرتے ہیں۔اس زمانے میں بعض علماء نے

اختلافی رسائل اپنے شاگردوں کے نام سے ضرور لکھے تھے جیسے مولانا سلامت اللہ جیراجپوری وغیرہ، مگر علامہ شبلی نعمانی پر اس طرح کا قیاس اس لئے نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس زمانہ میں علامہ شبلی اگر سن پاتے کہ فلاں گاؤں میں کوئی اہل حدیث عالم آیا ہے تو وہ وہاں پہنچ جاتے اور اس سے مناظرہ کرتے۔ جو شخص علانیہ مناظرہ کرتا ہو، اس کا تلامذہ کے نام سے رسالہ تحریر کرنا کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

رہا یہ دعویٰ کہ خود علامہ شبلی نے اپنی پہلی تصنیف اسکات المعتدی کو قرار دیا ہے تو بے شبہ اسکات ان کی پہلی اور ظل الغمام ان کی دوسری تصنیف ہے۔

چالیس صفحات پر مشتمل یہ رسالہ ظل الغمام فی مسئلۃ القرأۃ خلف الامام، رسالہ میزان الحق کے جواب میں ہے۔ ''میزان الحق'' اصلاً مولانا سلامت اللہ جیراج پوریؒ کی تصنیف ہے جو ان کے کسی شاگرد کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ (۴) چونکہ اس کے اصل مصنف کا نام معلوم نہیں اس لئے تلاش نہیں کیا جاسکا۔

ظل الغمام کی تمہید میں علامہ شبلی نے اس کے سبب تالیف پر روشنی ڈالی ہے۔ اور لکھا ہے:

> ''کیا عبرت کا مقام ہے۔ کیا افسوس کا وقت ہے۔ زمانے کا دور آخر ہے۔ اہل بزم اٹھتے جاتے ہیں، محفل برہم ہو چلی، سحر ہونے کو آئی، وہ روشن اور بزم افروز شمع اسلام سنبھالا لے رہی ہے، ادھر باد مخالف کے جھونکے چلنے لگے۔ اب تک تو خیر تھی کیوں کہ وہ شمع ہنوز حمایت علماء کی فانوس میں اغیاروں کے دست ستم سے محفوظ تھی۔ لیجئے اب اپنے بیگانے ہو گئے۔ خود محفل والوں میں سے حضرات غیر مقلدین چاروں طرف سے اس کے گل کرنے کو دوڑے۔ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ. جمعیت اسلام برہم ہو چکی تھی۔ اعدائے دین کو بے کس و بے چارہ سمجھ کر دست تعدی دراز کر رکھا تھا، وقت یہ تھا کہ ہم سب ایک بنتے دینی عزت کو دنیاوی جاہ ووقار کے ساتھ حاصل کرتے۔ ملحدوں کے تیر باراں اعتراضات کو استدلال واحتجاج کی سپر پر روکتے۔ جس طرح اسلام ہمیشہ مظفر ومنصور رہتا آیا ہے، آج بھی اس کے نقارۂ فتح وظفر کی صدا غنیم کے لشکر میں گونجتی مگر بے دردوں کو اس سے کیا غرض۔ انھوں نے نام ونمود کے پیچھے جمعیت

اسلام کو درہم برہم کیا۔ جماعت اسلامی کے تمام ارکان ہل گئے اور اس کی مضبوط و پائدار بنا متزلزل ہوگئی۔ جمعہ، جماعت میں تفرقہ پڑ گیا۔ سب وشتم سے گذر کر طعن وضرب کی نوبت پہنچی۔ رفتہ رفتہ گورنمنٹ کو دخل دینا پڑا اور ہماری مذہبی نزاع جس میں علماء اور مجتہدین کے فیصلے نا قابل تسلیم قرار دیے گئے تھے۔ اب حکام انگریزی نے فیصل کئے فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَار.

غیر مقلدین اگر اپنے استنباطات کو صحیح سمجھتے اور اس پر کار بند ہوتے، مگر یہاں تو یہ مثل ہے ع

میں تو ڈوبا ہوں ولے تم کو بھی لے ڈوبوں گا

اشتہار جاری ہوئے، رسالے چھپے، آخر اس پر دم لیا کہ ہم مذہب حنفی پر اعتراضات رکھتے ہیں جو جواب دے وہ انعام لے۔ علمائے حنفیہ کو اول تو درس وتدریس ودیگر مشاغل علمی سے فرصت کہاں؟ دوسرے وہ سمجھے کہ قلم اٹھایئے تو کس پر؟ جواب لکھئے تو کس کا؟ اس تمام فرقۂ جدیدہ میں دو ایک کے سوا کسی نے درس نظامی کی پوری کتابیں بھی نہیں پڑھیں، نہ کسی کا اعتداد علماء میں ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا احمد علی محدث مرحوم وجناب مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس دیوبند وجناب مولانا محمد عبدالحئی صاحب وغیرہم کو بہت کم اس بارے میں لکھنے کا اتفاق ہوا۔ ادھر یہ بھی خیال کہ کس سے مقابلہ کیجئے، مسلمانوں سے ع

راز معشوق نہ افشا ہو جائے
ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں

حضرات غیر مقلدین اس سے بے التفاتی اور عدم اعتناء کو داخل عجز سمجھے اور بھی تیز ہوئے، خم ٹھونک کر میدان مناظرہ میں کود پڑے، مگر علمائے حنفیہ ان چھوٹی جوڑوں کے مقابل آنے کیوں لگے، تاہم اگر کسی عالم حنفی نے عنان التفات اک ذرا ادھر پھیر دی تو مدتوں کے لئے فرصت ہوگئی۔ ایک انتصار الحق کا جواب

مر پٹ کر الٹا سیدھا آٹھ دس برس میں تیار ہوا، سوبھی کیا، کاغذ بازی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، ہر چند اس شور وفتنہ انگیزی پر ہم کو خانہ جنگی سے احتراز رہا مگر صرف اس خیال سے کہ: (شعر سعدی)

چوں با سفلہ گوئی بہ لطف وخوشی
فزوں گردش کبرو گردن کشی

مناسب معلوم ہوا کہ تھوڑی سی دارو گیر کر دی جائے۔ اس پر بھی اگر باز نہ آئے تو پھر پوری خبر لی جاے۔'' (۵)

سببِ تالیف کی اس تفصیل کے بعد رسالہ کے مقصد تالیف اور اس کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:

''واضح ہو کہ اس فرقہ نو کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم قرآن وحدیث کے پیرو ہیں اور بمقابلہ حدیث نبویؐ کسی امام ومجتہد کے قول کو سند نہیں لاتے۔ اس رسالہ میں بہ ضمن مسئلۃ القرأۃ فاتحہ خلف الامام دو باتوں کا ثابت کرنا منظور ہے۔ ایک یہ کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب، مذہب قرآن وحدیث سے صاف صاف ثابت ہے۔ پس غیر مقلدوں کا یہ بیان کہ چوں کہ امام صاحب کا مذہب احادیث سے خلاف ہے، اس لئے ہم اس پر عمل نہیں کرتے، بالکل از راہ فریب ومکر ہے۔ دوسرے حضرات غیر مقلدین حدیثوں میں کذب وافتراء کو کام میں لاتے ہیں اور عوام کو دام فریب میں پھنساتے ہیں۔ اے برادران اسلام! اس رسالہ کو خوب غور وفکر سے دیکھو اور جب تم پر ثابت ہو جائے کہ یہ لوگ حدیثوں کی سند میں فریب اور کذب اختیار کرتے ہیں تو ان سے بیزار ہو جاؤ اور پھر ان کے دام فریب میں نہ آؤ۔ (٦)

اس کے بعد علامہ شبلیؒ نے ترک قرأۃ فاتحہ خلف الامام کو قرآن واحادیث سے ثابت کیا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علامہ نے نہایت مدلل بحث وتحقیق کی ہے۔ اس سے اس دور شباب میں علامہ کی قرآنی بصیرت اور احادیث پر گہری نظر کا پتہ چلتا ہے۔ فقہ اور فقہی مسائل ومباحث

اوران کی جزئیات پر بھی ان کی کس قدر وسیع نظر تھی، ان مباحث سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور فن اسماء الرجال سے ان کی عمیق واقفیت بھی معلوم ہوتی ہے۔

آخر میں مولانا سلامت اللہ جیراج پوریؒ کے اعتراضات کا مفصل جائزہ لیا ہے اور قرآن واحادیث اور فقہ سے ان کے موقف کی غلطی اور غلط بیانی کی پردہ دری کی ہے۔ ایک اعتراض اور اس کا جواب ملاحظہ ہو۔ مولانا سلامت اللہ جیراج پوری نے قرأۃ فاتحہ خلف الامام کی تائید میں اپنے رسالہ ''میزان الحق'' میں لکھا ہے کہ:

> ''جابر بن عبداللہ جو موؤل اس حدیث کے ہیں، وہ خود امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے اور مقتدیوں کے قرأت نہ کرنے سے عدم جواز صلوٰۃ کا فتویٰ دیتے تھے۔'' (۷)

مولانا شبلی اس کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ کتنا صریح جھوٹ ہے۔ جابرؓ بن عبداللہ کا قول تو بہ سند صحیح خود ترمذی میں مذکور ہے۔ چنانچہ وہب بن کیسان نے جابر بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ ''**من صلی رکعة لم یقرأ فیها بام القرآن فلم یصل الا ان یکون وراء الامام**'' اور اس حدیث کو ترمذی نے حسن صحیح لکھا ہے۔ (ترمذی شریف مطبوعہ احمدی، بار ثانی، جلد اول ص۴۴) یعنی جابرؓ بن عبداللہ نے کہا کہ جو شخص کوئی رکعت بغیر الحمدللہ کے پڑھے تو نماز نہ ہوگی، مگر جب کہ امام کے پیچھے ہو یعنی جب امام کے پیچھے نماز پڑھے تو بغیر الحمدللہ کے بھی نماز صحیح ہوگی، بلکہ اور صحابہ سے تو دونوں قسم کی باتیں منقول ہیں، مگر حضرت جابرؓ سے تو بالاتفاق ثابت ہے کہ وہ قرأت فاتحہ خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ قاضی عبدالبر نے اس کو بتصریح لکھا ہے۔ (دیکھو تعلیق مجد ص۹۵) باقی جو عبارت میزان الحق میں ترمذی سے نقل کی ہے، اس میں قرأۃ خلف الامام کا مذکور ہی نہیں۔ وہ تو عام طور کے وجوب کی نسبت ہے۔ چنانچہ ترمذی شریف کے صفحہ ۵۳ میں جو باب باندھا ہے اور جس کے نیچے یہ اقوال لکھے ہیں، وہ یہ ہے: **باب ماجاء انه**

لاصلوٰۃ الابفاتحۃ الکتاب یعنی باب اس کا کہ نماز بے الحمدللہ نہیں ہوتی۔ اس میں مقتدی کا کہاں ذکر ہے بلکہ اس حدیث کا تو مطلب جابر بن عبداللہ نے بتایا کہ یہ حکم تنہا آدمی کے واسطے ہے جیسا کہ اصل رسالے میں ہم نے ترمذی سے نقل کیا ہے۔ معلوم نہیں اس جھوٹ سے بجز فریب دہی عوام کے اور کیا فائدہ نکلا''۔(۸)

علامہ شبلی نے بڑی متانت، سنجیدگی اور سلجھے ہوئے علمی انداز میں بحث کی ہے اور بڑے مرتب انداز میں جائزہ لیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں لہجہ ذرا تند و تلخ ہو گیا ہے۔ مثلاً یہ عنوان کہ سلامت اللہ کا پہلا جھوٹ، سلامت اللہ کا دوسرا جھوٹ وغیرہ۔ بہرحال رسالہ کی زبان مناظرانہ اور واعظانہ ہے جو اس دور کے مناظر اور فقہا کا عام طرز تحریر تھا۔

موضع چاند پٹی ضلع اعظم گڑھ کے ایک عالم مولانا حیدر حسن خاں نے اس کی تردید کی میں ایک رسالہ ''ضرب الخیام فی الرد علی ظل الغمام'' لکھا تھا مگر اب وہ کہیں دستیاب نہیں۔

یہ موضوع مسلمانوں میں ایک عرصہ سے باعث نزاع ہے۔ اس پر کثرت سے مضامین اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور اب بھی رہ۔رہ کر حضرات اہل حدیث اور حنفیوں کے درمیان معرکہ آرائی شروع ہو جاتی ہے، مگر مولانا شبلی کے اس رسالہ کی خوبی یہ ہے کہ اصل مسئلہ کی توضیح کے ساتھ ان کی قومی دردمندی اور اخلاص و اتحاد کی آرزو بھی جھلکتی ہے۔ انہیں اس نزاع میں قومی ضیاع نظر آتا ہے اور یہ واقعہ بھی ہے۔

''ظل الغمام'' سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کے قلم میں شروع ہی سے بڑی متانت، وقار اور سنجیدگی تھی۔ بات کہنے اور لکھنے اور اپنی بات کو سلیقہ سے پیش کرنے کا ہنر آتا تھا۔ تحریر میں انشاء پردازی اور ادبیت تھی، البتہ زبان آسان نہیں بلکہ ثقیل اور عربی کے مشکل الفاظ کا استعمال کرتے تھے۔

بہرحال علامہ شبلی کی یہ ابتدائی تحریر آج بھی قابل اعتنا ہے، گو موضوع پسندیدہ نہیں، تاہم اپنے موضوع پر یہ ایک اہم اور مدلل رسالہ ہے۔ اس موضوع پر لکھنے اور مناظرہ کرنے والوں کے لئے یہ آج بھی افادیت سے خالی نہیں۔ ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں یہ رسالہ پہلی بار شائع ہوا

تھا۔اب اس کی دوسری اشاعت اس لئے ضروری ہے کہ یہ محفوظ رہے۔

حوالے

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی۔حیات شبلی ص۱۰۰-۱۰۱۔دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۱۹۸۳ء

(۲) ایضاً

(۳) مکاتیب شبلی جلد۲ص ۲۳۵

(۴) علامہ شبلی۔ظل الغمام فی مسئلۃ القرأۃ خلف الامام ص۳۵۔مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۹ھ

(۵) ایضاً ص۲-۴

(۶) ایضاً ص۴

(۷) میزان الحق ص۹-بحوالہ ظل الغمام ص۸۳

(۸) ظل الغمام ص۳۸-۳۹

مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کا سرورق

مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم

یہ علامہ شبلی کا ایک مختصر رسالہ ہے جو ان کے جدید طرز تصنیف کا اردو میں پہلا نمونہ ہے۔ یہ دراصل وہ گراں مایہ مقالہ ہے جو انھوں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۷ء کو قیصر باغ لکھنؤ کی شاہی بارہ دری میں پڑھا تھا۔ ۱۸۸۸ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا اور اب مقالات شبلی جلد سوم میں شامل ہے۔ علامہ شبلی نے اسے اپنی جدید طرز کی پہلی تصنیف قرار دیا ہے۔(۱)

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس میں علامہ شبلی نے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم اور ان کے علمی و تعلیمی کارناموں کا تاریخی مرقع پیش کیا ہے۔ یہ ایک بڑا ہی وسیع موضوع ہے۔ اس کے ضمن میں مسلمانوں کی ہر طرح کی علمی و تعلیمی کوششیں اور کاوشیں قلم بند کی جا سکتی ہیں۔ خود علامہ شبلی کو بھی اس کا احساس تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ ایک ایسا وسیع موضوع ہے کہ اگر اس کے ذیل میں مسلمانوں کے تمام علمی کارنامے بیان کئے جائیں تو شاید ناموزوں نہ ہوگا۔''(۲)

مگر علامہ شبلی نے اس میں اختصار کے ساتھ صرف یہ دکھایا ہے کہ مسلمانوں نے علوم دینیہ اور بعض دوسرے علوم وفنون کی تحصیل کس طرح کی اور اس میں کس قدر محنت و جانفشانی سے کام لیا اور پھر ان علوم وفنون میں انھوں نے کیا کیا اضافے کئے اور ان علوم کا فیضان دنیا کی دیگر قوموں کے لئے کس طرح عام کیا اور مسلمانوں نے کن علوم فنون کی بنیاد رکھی۔

تحصیل علوم اور اشاعت علوم ان دونوں مباحث پر علامہ شبلی اس رسالے کو مواد ومعلومات کے اعتبار سے وسیع اور مکمل شکل میں پیش کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے معیار پر مطلوب

موادکی کمی کی وجہ سے غالباً اختصار روا رکھا گیا، علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ:

”میں افسوس کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ ان دونوں بحثوں کی تفصیل کے لئے جس قسم کے ضروری حالات درکار ہیں یعنی فلسفہ یونانی وغیرہ کے ترجمے، مترجموں اوران کی تصنیفات کے نام، اسلامی دارالعلوم اور مدرسوں کی تفصیل، طریقہ درس، نصاب تعلیم، غرض اس قسم کے حالات مجھ کو کسی مستقل تصنیف میں نہیں ملے اور شاید لکھے بھی نہیں گئے۔“ (۳)

مگراس صورت حال کے باجود موضوع سے متعلق معلومات کو تاریخ کی مستند کتابوں سے جمع کر دیا گیا ہے۔ اس میں مسلمانوں کے خاص علوم، ان کی ابتدائی تاریخ اوران کے ایجاد کا سبب وغیرہ بیان کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے علوم میں ادب، فقہ، فرائض، قصص، علم کلام، حدیث، اسماء الرجال، علم درایت، علم نحو، علم بیان وغیرہ شامل ہیں۔ مختلف ادوار میں ان کی ترقی اوراس کے اسباب کے بیان کے بعد علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ ان علوم کا اصل سرچشمہ قرآن مجید ہے اوراسی کے زیر اثر ان علوم نے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ اثنائے بحث حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت انسؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت جابرؓ، ابوالاسود الدؤلی، خلیل بن احمد بصری، ابن جریج، امام مالک، امام اوزاعی، ابن ابی عروبہ، حماد، معمر، سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ، ابن اسحاق، یحییٰ برمکی وغیرہ کی کاوشوں کا بھی ذکر ہے اوران علوم کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو مسلمانوں نے دوسری قوموں سے حاصل کئے۔ ان میں منطق، ہندسہ، طبعیات، طب، ہیئت اور ریاضی وغیرہ شامل ہیں۔ پھر ان ترجموں کا ذکر ہے جو مسلمانوں نے یونانی، سریانی اور سنسکرت زبانوں سے عربی میں کئے۔ علامہ شبلی کا خیال ہے کہ اکثر ترجمہ کرنے والے عیسائی تھے۔ علمائے اسلام میں صرف فارابی، بوعلی سینا اور ابن رشد وغیرہ یونانی اور سریانی زبانوں سے واقف تھے۔

خلفاء وسلاطین نے ان تراجم سے جس قدر دلچسپی لی اوراس سلسلہ میں جو شاہانہ فیاضیاں کیں ان کی بھی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ تراجم کے صحت وعدم صحت پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ عام خیال ہے کہ ترجمے کی بنیاد ابوجعفر منصور نے ڈالی، مگر علامہ شبلی نے دکھایا ہے کہ اس سے پہلے حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں ابن آسامی نامی ایک عیسائی طبیب نے بعض یونانی کتابیں عربی

میں منتقل کیں۔ خالد بن یزید کی کوششوں سے بھی ترجمے ہوئے۔ مروان بن الحکم کے عہد میں بھی ترجمے کا کام ہوا۔ البتہ منصور عباسی نے اس کام کو بام عروج پر پہنچایا۔

دوسرے خلفاء کے عہد میں ترجمے کا جو کام ہوا اس کا بھی اس میں ذکر ہے۔ ترجموں کی ایک طویل فہرست درج کی گئی ہے۔ اس کے بعد عہد بنوامیہ سے لے کر تر کی خلافت تک جو اہم مدارس قائم ہوئے، علامہ شبلی نے ان کی ایک مختصر مگر جامع تاریخ قلم بند کی ہے۔ اس میں سیکڑوں مدارس کا ذکر اس طرح آ گیا ہے کہ ان کی خصوصیات، بانیوں کے نام، طلبہ و اساتذہ، اخراجات، انتظام اور ان کی خدمات کی ایک تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے علوم وفنون کی ترویج وترقی میں دنیا کی کسی اور قوم سے کم حصہ نہیں لیا۔ آخر میں تعلیم و تعلم کی وسعت، طرز تعلیم، مختلف ممالک اسلامیہ میں تعلیم، ان کی خصوصیات اور ان پر مذہبی وتمدنی اثرات وغیرہ موضوعات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے اسباب زوال اور قدیم تعلیم کی بعض کمیوں کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کا یہ مختصر مرقع گو قدیم تعلیم کی تصویر پیش کرتا ہے لیکن اس میں علامہ شبلی کے قلم نے جدید رنگ و آہنگ اس طرح آمیز کر دیا ہے گویا یہ تعلیم جدید سے الگ کوئی فرسودہ کہانی نہیں بلکہ جدید تعلیم اسی تسلسل کا ایک حصہ ہے جو مسلمانوں نے دور اول سے دنیا کو ایک نعمت کی شکل میں پیش کیا تھا۔ اختر وقار عظیم نے لکھا ہے کہ:

> ''اس مضمون میں شبلی نے قدیم زمانے کے طریقہ کار کا ذکر کچھ اس عمدگی سے کیا ہے کہ اسے پڑھنے میں یہ محسوس ہوتا ہے جیسے شبلی قدیم طرز تعلیم کے بارے میں گفتگو نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان کے پیش نظر اس طریقہ کا ذکر ہے جس سے ہم آپ آج فیض پا رہے ہیں۔'' (۴)

علامہ شبلی نے جب یہ مقالہ لکھا تھا، اس وقت یہ موضوع بالکل اچھوتا تھا اور اس موضوع پر کوئی تحریر موجود نہیں تھی۔ انھوں نے قدیم مراجع ومصادر سے اس کے لئے مواد فراہم کیا۔ ہر کار آمد جزیئے پر ان کی نظر پڑی اور گویا ریزہ۔ ریزہ سمیٹ کر انھوں نے یہ مقالہ پیش کیا۔ خود انہیں کے الفاظ میں ''غالبًا یہ پہلی تحریر ہے جس میں اس قدر واقعات جمع کئے گئے ہیں۔'' (۵)

اس کا مقصد تحریر یہ تھا کہ مسلمانوں کے قلب ونظر پر یورپ کا جو رعب گھر کر گیا ہے، اس کا ازالہ کیا جائے اور انھیں یہ باور کرایا جائے کہ تمہارے اسلاف کس بلند مقام پر تھے اور یہ کہ وہ علوم وفنون کی ایجاد اور ترویج واشاعت میں دنیا کی کسی اور قوم سے فروتر نہ تھے۔علامہ شبلی کو اپنے مقصد میں کامیابی ملی۔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی ''مسلمانوں کے کانوں میں اپنے بزرگوں کے کارناموں کی یہ پہلی آواز آئی اور سارے ملک میں اس خطبہ کی دھوم مچ گئی۔'' (٦) جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن (ف:١٨/نومبر ١٩٨٧ء) نے لکھا ہے کہ جب یہ مضمون پڑھا جارہا تھا تو انگریزی تعلیم یافتہ سامعین میں کچھ لوگ اٹھ۔اٹھ کر پوچھتے تھے کہ ''مولانا کیا ہمارا علمی ماضی ایسا ہی شاندار تھا جیسا کہ آپ بیان کررہے ہیں۔'' (٧) ضیاء الحسن فاروقی (ف:٣٠/جولائی ١٩٩٦ء) سابق پرنسپل جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے اسے ایک بے نظیر مرقع قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''مصنف نے اپنے انداز نگارش کے سہارے مسلمانوں کی علمی خدمات کی ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کردی ہے۔ایسی تصویر کہ اس طرح کا کوئی مرقع کسی ایک تصنیف میں نہیں ملتا۔'' (٨)

مسلمانوں کے علمی وتعلیمی کارناموں کی اس مختصر سرگذشت کے سلسلے میں علامہ شبلی کا یہ احساس بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ:

> ''میں نے اس آرٹیکل میں اس بات سے قصداً پرہیز کیا ہے کہ سلف کے کارنامے زیادہ آب وتاب سے لکھوں۔قوم کی آج یہ حالت ہے کہ جتنا لکھا گیا یہ بھی اس کے چہرے پر نہیں کھلتا۔سلف کے مفاخر کا ہم کیا ذکر کرسکتے ہیں۔ہم نے جب خود کچھ نہیں کیا تو اس سے کیا حاصل کہ سلف نے بہت کچھ کیا تھا۔'' (٩)

البتہ اس رسالے کے متعلق بعد میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ اس میں تنقیدی جائزے کی کمی محسوس ہوتی ہے، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے لکھا کہ ''اس میں علامہ شبلی نے تنقیدی نقطۂ نظر سے کام نہیں لیا ہے اور یہ واضح نہیں کیا ہے کہ جب تقلید کا عام رواج ہوگیا تھا اور لوگ فلسفہ کی تعلیم سے گھبرانے لگے تھے تو اس سے مسلم معاشرے کو کتنا نقصان پہنچا۔یا یہ کہ مسلمان اپنی علمی ترقی اور علوم وفنون کے ساتھ گہری دلچسپی کے باوجود پستی وتنزل کا شکار کیوں ہوگئے۔'' (١٠)

اسی طرح ان کا یہ بھی اعتراض ہے کہ اس میں تعلیم سے دلچسپی وانہماک کی داستان تو ہے، لیکن اس بات کا مطلق ذکر نہیں کہ نصاب تعلیم کیا تھا، کون کون سی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اور ان کا معیار کیا تھا۔(۱۱)

ضیاءالحسن فاروقی کے یہ اعتراضات آج کے دور میں بے جا بھی نہیں، لیکن سوا سو سال پہلے کے ہندوستان کے علمی حالات اور تحقیقات کو اگر مدنظر رکھا جائے تو ان اعتراضات کی حیثیت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ جہاں تک نصاب تعلیم اور معیار تعلیم کا سوال ہے اولاً تو یہ مباحث سرے سے علامہ شبلی کے موضوع ہی سے خارج تھے۔ ثانیاً بقدر ضرورت ضمناً ان کا ذکر آ گیا ہے۔ فاروقی صاحب کا خیال ہے کہ علامہ شبلی اگر قیاس واجتہاد سے کام لیتے تو ان کے اصولوں کی روشنی میں کوئی خاکہ پیش کیا جا سکتا تھا۔ یہ سچ ہے مگر راقم الحروف کے خیال میں اس مقالے کو سپرد قلم کرتے وقت مصنف کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ ہندوستان میں مغرب سے مرعوبیت کا جو دور دورہ ہے اور جو لوگ اپنے اقدار وروایات سے بے خبر، بیزار اور مغرب کی ہر اچھی بری ادا پر جان دیتے ہیں، ان کے کانوں میں ان کے اسلاف کی عظمت وبلند پائیگی اور ان کے قابل فخر کارناموں کی گونج سنائی دے۔ اس لئے ساری بحث اسی محور کے گرد رہی۔ مذکورہ اعتراضات یا سوالات کی تشفی کے لئے ایک الگ اور ضخیم تصنیف کی ضرورت تھی۔ بعد میں اس موضوع پر اردو زبان میں ایک ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ جس کی تفصیل ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ بہرحال اس رسالہ کی تعلیمی اور تاریخی حیثیت مسلم ہے۔ قدر دانوں نے اسے وقعت کی نظر سے دیکھا۔ سرسید احمد خاں (ف:۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء) نے بے ساختہ ایک خط میں یہ لکھ کر داد دی کہ:

> ''مولانا شبلی نے تاریخانہ مضمون گذشتہ تعلیم مسلمانان پر اختیار کیا۔ وہ رسالہ مرسل ہے۔ میں سمجھتا ہوں نہایت عمدہ اور مفید چیز تیار ہو گئی ہے۔''(۱۲)

اس رسالہ کے بعد ملک میں علامہ شبلی کی شہرت کی دھوم مچ گئی اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی ''یہی وہ مطلع ہے جس سے علامہ شبلی کی شہرت کا آفتاب سب سے پہلی دفعہ طلوع ہوا۔''(۱۳) اس کتابچہ کے بارے میں مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی [ف:۲۴/دسمبر ۱۹۲۶ء] نے لکھا ہے کہ ''جب اس رسالہ پر ماہنامہ دلگداز [اگست ۱۸۸۸ء] میں ریویو ہوا تو کوئی ایسا نہ تھا جو اس کے دیکھنے کا

مشتاق نہ ہو گیا ہو۔'' (۱۴) اور سچ یہ ہے کہ آج بھی اس کی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔

برسوں بعد [۱۹۰۴ء-۱۹۰۵ء میں] مصر میں جرجی زیدان نے تاریخ التمدن الاسلامی کی تصنیف کا آغاز کیا تو اسی رسالے کی مدد سے وہ ان مصادر تک پہنچ سکا جس کی اسے تلاش تھی، اس کا خود اس نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں اعتراف کیا ہے۔ (۱۵) جرجی زیدان کیا، بیسویں صدی کی ابتدا میں اس موضوع پر جو بھی کتابیں وجود میں آئیں سب پر اس کے اثرات مرتب ہوئے۔

حوالے

(۱) مکاتیب شبلی جلد۲ ص ۲۳۵

(۲) مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ص ۱

(۳) ایضاً

(۴) اختر وقار عظیم۔ شبلی بحیثیت مورخ ص ۴۸۔ اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۹ء

(۵) مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ص ۲

(۶) حیات شبلی ص ۱۷۱

(۷) سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر ص ۱۵، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۵ء

(۸) اشخاص و افکار ص ۸۷

(۹) مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ص ۸۷

(۱۰) اشخاص و افکار ص ۸۵-۸۶

(۱۱) ایضاً

(۱۲) خطوط سر سید ص ۱۳۶، مرتبہ سر راس مسعود۔ بدایوں ۱۹۳۱ء

(۱۳) حیات شبلی ص ۱۷۱

(۱۴) حیات شبلی ص ۱۷۱

(۱۵) جرجی زیدان۔ تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳ مقدمہ ص ۳-۴۔ مطبوعہ الہلال مصر ۱۹۰۴ء

المامون

المامون علامہ شبلی کی پہلی مستقل تاریخی تصنیف اوران کے سلسلہ نامور فرماں روایان اسلام کا پہلا حصہ ہے۔ یہ ان کے قیام علی گڑھ کی یادگار ہے اور وہیں سے پہلی بار ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی اور اس قدر مقبول ہوئی کہ پہلا ایڈیشن صرف تین ماہ میں ختم ہوگیا۔ ۱۸۸۹ء میں اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ ہندو پاک سے اب تک اس کے مندرجہ ذیل ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

[۱]	▪ مطبع العلوم، علی گڑھ،	۱۸۸۷ء		
[۲]	▪ انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ	۱۸۸۷ء		
[۳]	▪ قومی پریس، دہلی	۱۸۸۹ء	۱۸۴ص	
[۴]	▪ کانگریس پریس، دہلی	۱۸۸۹ء	۱۴۰ص	
[۵]	▪ افضل المطابع، دہلی	۱۸۸۹ء	۱۴۴ص	
[۶]	▪ مطبع مفید عام، آگرہ	۱۸۹۲ء	۲۶۱ص	
[۷]	▪ رنگین پریس، دہلی	۱۹۰۲ء	۱۲۶ص	
[۸]	▪ رحمانی پریس، دہلی	۱۹۰۶ء	۱۵۲ص	
[۹]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۲۶ء	۲۴۴ص	
[۱۰]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۴۷ء	۲۳۸ص	
[۱۱]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۵۷ء	۲۳۸ص	طبع دوم
[۱۲]	▪ مکتبہ جاوید، لاہور	۱۹۶۰ء	۲۶۰ص	
[۱۳]	▪ حامد اینڈ کمپنی، لاہور	۱۹۸۲ء		

[۱۴]	▪ اسلامی اکیڈمی، لاہور	۱۹۸۵ء	۲۳۸ص
[۱۵]	▪ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد	۱۹۸۹ء	۲۲۷ص
[۱۶]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۹۲ء	ص۲۴۴+۴
[۱۷]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۰۹ء	۱۸۶ص
[۱۸]	▪ شیخ مبارک علی، لاہور	غیر مورخہ	۱۸۸ص
[۱۹]	▪ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد	غیر مورخہ	۲۴۴ص

اس کتاب میں دولت عباسیہ کے گل سرسبد مامون الرشید کے حالات اور کارنامے اوراس کے عہد حکومت کے سیاسی، علمی، مذہبی، اخلاقی اور تمدنی حالات لکھے گئے ہیں، جن سے دولت عباسیہ کے عروج وزوال اوراس کے اسباب کا پورا مرقع سامنے آجاتا ہے۔

اس کے دوسرے ایڈیشن میں سرسیداحمد خاںؒ کے قلم سے ایک قیمتی دیباچہ بھی ہے، جس میں انھوں نے علامہ شبلی کی تاریخی ژرف نگاہی اوراس بلند پایہ کتاب اوراس کے مصنف کی تعریف وتحسین کی ہے۔ نیز معیاری تاریخ نویسی کے فن پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

یہ کتاب دوحصوں پر مشتمل ہے۔ شروع میں ایک تمہید ہے جس میں وجہ تالیف اورفن تاریخ کی خوبیوں، خامیوں اوراس کے اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد مامون الرشید کی ولادت، تعلیم وتربیت، ولی عہدی، تخت نشینی، اس کے عہد کی بغاوتیں، خانہ جنگیاں، فتوحات ملکی اور مامون کی وفات تک کے حالات لکھے گئے ہیں اوران واقعات کوعلامہ شبلی نے اس طرح قلم بند کیا ہے کہ تاریخ میں سوانح عمری کا لطف پیدا ہوگیا ہے۔

دوسرے حصہ میں مامون کے نظام حکومت، طرز سلطنت، وسعت سلطنت، فوجی نظام، آمدنی، خراج، آبادی، امور خانہ، زمین کی پیمائش، اس عہد کے عام حالات، تہذیب وتمدن، مذہب، طرز معاشرت نیز مامون کے اخلاق وعادات، علمی ذوق، فضل وکمال اس کی علمی مجالس، اراکین دربار، ملکی عہدے، غرض ان تمام حالات وواقعات اورخصوصیات وامتیازات کا ذکر ہے جن کی وجہ سے اس کا عہد عموماً شاہان عالم کے درمیان علمی حیثیت سے ممتاز تسلیم کیا جاتا ہے۔

وجہ تصنیف

کسی کتاب کے جائزہ میں اس کی تالیف وتصنیف کی غرض وغایت خاص اہمیت رکھتی ہے۔المامون کی تصنیف کے اسباب ومحرکات کیا تھے؟ ذیل میں اس کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

اردو میں قومی تاریخ خصوصاً اسلامی حوصلہ مندیوں،فتوحات،سیاسی عروج،تمدنی ارتقاء اورعلمی کارناموں کے واقعات کی کمی نے علامہ شبلی کواسلامی حکومتوں کی ایک مفصل اور بسیط تاریخ لکھنے پر آمادہ کیا تھا مگر چونکہ یہ کام اپنی وسعت اور پھیلاؤ کے اعتبار سے تنہا ان کے بس کا نہ تھا،اس لئے انھوں نے ہر مسلم حکمراں خاندان کے ایک-ایک بطل عظیم اور نمایاں ترین شخص کا انتخاب کیا اوران کے عہد کی تاریخ لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ان کا مشہور نامور فرمانروایان اسلام کا سلسلہ اسی سعی وکوشش کا نتیجہ ہے۔انھوں نے اس کی ابتداء المامون سے کی۔اگرچہ خلفائے بنوامیہ میں ولید بن عبدالملک ، ہشام بن عبدالملک اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ بھی اس صف کے اہل تھے ۔خود خلفائے بنوعباس میں ہارون الرشید کا مرتبہ کم نہیں۔اس لئے یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان سب کونظر انداز کر کے علامہ شبلی نے مامون کا ہی انتخاب کیوں کیا؟ میرے نزدیک اس انتخاب میں اورعوامل کے ساتھ علامہ شبلی کا ذوق سب سے زیادہ موثر اور مرجح رہا۔

المامون کی تصنیف کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ علامہ شبلی عباسی خلفاء پر مورخین یورپ کے الزامات کا جواب دینا چاہتے تھے۔چنانچہ المامون میں متعدد مقامات پر یہ محرک واضح طور پر نظر آتا ہے۔خاص طور سے مسٹر پامر کی کتاب ہارون الرشید کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔مسٹر پامر نے اپنی کتاب میں ہارون الرشید اوران کے عہد حکومت پر متعدد لغو اور بے سروپا الزامات لگائے تھے، جس کو پڑھ کر علامہ شبلی کے دل میں خیال آیا کہ المامون لکھ کر مسٹر پامر کے زہر کا تریاق بھی پیش کیا جائے ۔(۱) چنانچہ علامہ شبلی نے المامون میں جابجا مسٹر پامر کے الزامات اوران کی غلط فہمیوں کا جواب دیا ہے اوران کی غلط بیانیوں کی پردہ دری کی ہے۔(۲)

المامون: علامہ شبلی کے اصول تاریخ نویسی کی روشنی میں

علامہ شبلی کے اصول تاریخ کی روشنی میں اگر المامون کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ

ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے وضع کردہ اصول وضوابط کا بڑا پاس ولحاظ رکھا ہے اور کہیں بھی ان سے انحراف نہیں کیا ہے۔ بعض نقادوں نے جو اعتراضات کئے ہیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ جانبدارانہ مطالعہ اور پہلے سے قائم کردہ نظریات کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً علامہ شبلی نے مورخ کے لئے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ جس عہد کی تاریخ لکھے اس کے تمام حالات واقعات یعنی تہذیب وتمدن، طرز معاشرت، مذہب، اخلاق وعادات وغیرہ کو مفصل اور لازماً تحریر کرے۔ صرف سیاسی امور، فتح وشکست، تخت نشینی، خانہ جنگی، فتوحات ملکی اور بغاوتوں کا تذکرہ نہ کرے۔ چنانچہ المامون میں خود علامہ شبلی نے اس عہد کے واقعات میں جہاں مامون کی ولی عہدی، تخت نشینی، فتوحات ملکی اور اس کے عہد کی بغاوتوں کا تذکرہ کیا ہے; وہیں انھوں نے نظام حکومت، فوجی نظم ونسق، عدالتی اصول وضوابط، وسعت سلطنت، عمال کے عزل ونصب، عام طرز معاشرت، تہذیب وتمدن اور اس عہد کے علماء وفضلاء علوم وفنون اور عام اخلاق وعادات وغیرہ کی تفصیلات قلم بند کی ہیں۔ المامون شاید اردو میں پہلی تصنیف ہے جو جدید ترین اصول تاریخ نویسی کی روشنی میں لکھی گئی ہے۔

علامہ شبلی نے واقعات کی صحت وصداقت کے لئے تحقیق واقعہ پر بہت زور دیا ہے۔ اس کے لئے روایت ودرایت دونوں اصولوں سے واقعہ کو پرکھنا ضروری قرار دیا ہے۔ المامون میں روایتیں نقل کرتے وقت عملی طور پر وہ اپنے اس اصول پر کاربند نظر آتے ہیں۔ روایتیں ثقہ، مستند اور اصل راویوں سے نقل کی ہیں۔ مثلاً امین کے قتل کا واقعہ امین کے غلام احمد ابن سلام سے روایت کیا ہے جو بذات خود امین کے قتل کے وقت موجود تھا۔ (۳) اسی طرح مامون کے خراج کی تفصیل مقدمہ ابن خلدون سے اس لئے نقل کی ہے کہ یہ تفصیلات مامون کے سرکاری کاغذات سے تیار کی گئی تھیں اور علامہ ابن خلدون نے ان کاغذات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ (۴)

علامہ شبلی نے واقعات کے اسباب اور ان کی تحقیق پر بہت زور دیا ہے اور اس کے ذریعہ مفید تاریخی نتائج مستنبط کرنے کو تاریخ کی روح اور جان قرار دیا ہے۔ المامون میں اس اصول کو بھی پوری طرح مدنظر رکھا گیا ہے اور نہایت خوبی واحتیاط سے نتائج مستنبط کئے ہیں۔ سرسید نے لکھا ہے کہ:

''پہلے حصہ میں انھوں نے تاریخانہ واقعات لکھے ہیں اور نہایت خوبی واختصار سے لکھا ہے کہ خلافت کا سلسلہ کیوں کر اور کیوں خاندان بنوامیہ کو برباد کرکے

عباسی خاندان میں پہنچا اور کیا اسباب جمع ہوئے جس سے امین اس کا بھائی
مقتول اور خود مامون تمام مملکت اسلامی کا مالک الملک لاشریک لہ بن
گیا۔''(۵)

علامہ شبلی نے تاریخ نویسی کے لئے ایک نظریہ یہ بھی پیش کیا ہے کہ تاریخ اور انشا پردازی کی حدیں جدا جدا ہیں اور مورخ کو انشاء پردازی سے احتراز کرنا چاہیے۔ المامون میں اس اصول کو بھی برتا گیا ہے اور کہیں بھی بے جا انشا پردازی سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اختر وقار عظیم نے لکھا ہے کہ:

''فنی لحاظ سے المامون کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ شبلی نے ایک بڑے انشا پرداز
اور مزاجاً شاعر ہونے کے باوجود کہیں بھی بلاضرورت اپنی رنگین بیانی کے جوہر
دکھلانے کی کوشش نہیں کی۔''(۶)

علامہ شبلی نے تاریخ میں حوالے اور استناد کو لازم قرار دیا ہے۔ اردو مصنفین میں علامہ شبلی پہلے شخص ہیں جنھوں نے حوالے اور مآخذ و مراجع کی نشاندہی پر نہ صرف زور دیا بلکہ عملی طور پر اسے پیش کیا۔ چنانچہ المامون میں بھی انھوں نے اس کا پورا پورا خیال رکھا ہے اور ہر واقعہ کو مستند مآخذ اور معتبر حوالوں سے نقل کیا ہے۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے لئے مستند مآخذ سے حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کی داد سر سید احمد خاں نے بھی دی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

''مصنف نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی جس کا حوالہ معتبر مآخذ سے نہ دیا ہو۔
ہر ایک جزئی بات پر بھی اس کتاب کا جس سے وہ بات لی گئی ہے، حوالہ دیا ہے۔
اس کے حاشیوں پر جس قدر کتابوں کے حوالے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے
کہ اس کتاب کے لکھنے میں کس قدر جانکاہی ہوئی ہوگی اور مصنف کو کتنے
ہزاروں ورق الٹنے پڑے ہوں گے۔''(۷)

علامہ شبلی بلند پایہ مورخ ہونے کے ساتھ ایک بڑے سوانح نگار بھی ہیں۔ ان کے اکثر تاریخی کارنامے سوانح ہی کے ذریعہ وجود میں آئے۔ انھوں نے سوانح نگاری میں صاحب سوانح کے محاسن و معائب دونوں کے ذکر کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا وہ قول بھی یہاں نقل

کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے مآثر رحیمی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اس کتاب میں تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ خانخاناں کی خوبیاں ہی خوبیاں گنائی گئی ہیں۔ نکتہ چینی کا نام نہیں، حالانکہ آج کل کے مذاق عام کے موافق سوانح عمری اور لائف کی یہ ضروری شرط ہے۔''(۸)

چنانچہ انھوں نے المامون میں مامون کی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو پیش کیا ہے اور خوبیوں کے ساتھ خامیوں کو بھی بیان کیا ہے۔ مامون الرشید ان کا ہیرو تھا اور اس کے فضل وکمال کے ذکر میں ان کا قلم حالت وجد میں نظر آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اسلام کو آج تیرہ سو برس سے کچھ اوپر ہوئے، اس وسیع مدت میں ایک تخت نشیں بھی ایسا نہیں گزرا جو فضل وکمال کے اعتبار سے مامون کی شان یکتائی کا حریف ہوسکتا۔ افسوس کہ سلطنت کے انتساب نے اس کو خلفاء وسلاطین کے پہلو میں جگہ دی، ورنہ شاعری، ایام العرب، ادب، فقہ، فلسفہ، کون سی بزم ہے جہاں فخر وشرف کے ساتھ اس کا استقبال نہ کیا جاتا۔(۹)

اس کی دلیرانہ فتوحات نے دنیا کے ممتاز حصوں میں اپنی جاندار اور محسوس یادگاریں چھوڑی ہیں۔ بہادری کے معرکوں میں اس کی تیز دستیاں دیکھ کر یقین نہیں آسکتا کہ ان ہاتھوں نے تلوار کے سوا کبھی قلم بھی چھوا ہے۔ اس کے ذاتی اخلاق بھی ایسے پاک اور برگزیدہ ہیں کہ سلاطین تو کیا فقراء اور درویشوں میں بھی دو چار ہی ایسے فرشتہ خو گزرے ہوں گے۔''(۱۰)

تاہم مامون کے اس فضل وکمال کے باوجود علامہ شبلی نے اس کے معائب پر پردہ نہیں ڈالا، بلکہ اس کی جو بے اعتدالیاں تھیں، انھیں جوں کا توں قلم بند کر دیا۔ لکھتے ہیں:

''ان سب خوبیوں کے ساتھ شخصی حکومت کے اقتدار میں بعض ایسی بے اعتدالیاں بھی اس سے سرزد ہوگئی ہیں، جن کے خیال کرنے سے دل کانپ جاتا ہے اور دفعتاً اس کی تمام خوبیاں آنکھوں سے چھپ جاتی ہیں۔''(۱۱)

علامہ شبلی نے مامون کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں پر تنقید کی ہے۔ امین کے قتل پر جس

طرح وہ خوش ہوا اس کا ذکر ناپسندیدگی سے کیا اور امین کو مظلوم قرار دیا۔(۱۲) اس کے مذہبی جنون پر تنقید کی اور لکھا کہ جس چیز نے اس کی تمام خوبیاں غارت کردیں، وہ یہی اس کا مذہبی جنون تھا۔(۱۳) اس کے غیر معتدل رحم پر یہ لکھ کر نکتہ چینی کی کہ یہ شان خلافت کے شایان شان نہ تھا۔ (۱۴) غرض یہ کہ علامہ شبلی نے مامون کی زندگی کے دونوں پہلوؤں کو پیش کیا ہے اور تاریخ نویسی میں اپنے اصول سے انحراف یا چشم پوشی نہیں کی ہے۔

علامہ شبلی نے مورخ کو حقیقت نگاری کے ساتھ غیر جانبداری کی بھی تلقین کی ہے۔ ایسی غیر جانبداری جس سے مورخ کے مذہب اور ذاتی اعتقادات کا بھی اندازہ نہ ہو۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اس تصنیف میں غیر جانبدار رہنے کی کوشش کی ہے۔ امین الرشید کی شکست اور اس کے قتل کی تصویر انھوں نے جس طرح کھینچی ہے، اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کتاب کا یہ حصہ مامون کے بجائے امین کی سوانح کا حصہ ہے اور جس سے مامون کے بجائے امین سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور امین کی تقصیریں قابل عفو و درگذر اور مامون کی تدبیریں نفرت انگیز معلوم ہوتی ہیں۔ یہ حصہ علامہ شبلی کے بحیثیت مورخ غیر جانبدار ہونے کا کھلا ثبوت ہے۔ امین کے قتل کی منظر کشی اس طرح کی ہے:

> ''امین گو عیش پرست اور نازک اندام تھا مگر اس کے ساتھ نہایت شجاع اور قوی بھی تھا۔ اس بے کسی میں بھی قاتلوں کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ آگے بڑھیں۔ ہر شخص دوسرے پر ٹالتا تھا۔ امین نے بجائے سلاح جنگ کے ہاتھ میں ایک تکیہ اٹھا لیا اور یہ کہتا جاتا تھا کہ میں تمہارے نبی کا ابن عم ہوں۔ ہارون الرشید کا فرزند ہوں۔ مامون کا بھائی ہوں۔ میرا خون کسی طرح حلال نہیں۔ بالآخر ایک شخص تلوار لے کر بڑھا اور امین کے سر پر ماری۔ اس گستاخی اور جرأت نے امین کو یقین دلا دیا کہ اس کی دردناک فریاد ان سنگ دلوں پر کچھ اثر نہیں کرسکتی۔ وہ مرنے کے لئے تیار ہوا مگر ایسا ہی مرنا جیسا کہ ایک عباسی شہزادے کو سزاوار تھا۔ اب اس کی نزاکت غضبناک جرأت سے بدل گئی۔ دلیرانہ بڑھا اور چونکہ تنہا تھا چاہا کہ حریف کی تلوار چھین کر ہاشمی جرأت کے جوہر دکھائے۔ یہ

دیکھ کر گروہ کا گروہ دفعتاً اس پر ٹوٹ پڑا۔ ایک شخص نے کمر پر تلوار ماری، پھر سب نے مل کر پچھاڑا اور الٹی طرف سے ذبح کیا۔ طاہر کے پاس سر لائے تو اس نے حکم دیا کہ ایک برج پر لٹکا دیا جائے۔ تمام بغداد یہ عبرت انگیز تماشہ دیکھنے آیا۔ طاہر یہ کہہ کر لوگوں سے اپنی کارروائی کی داد چاہتا تھا کہ یہ خلیفہ معزول کا سر ہے۔ طاہر نے مامون کو ان دلچسپ اور مختصر لفظوں میں نامہ فتح لکھا: ''میں امیر المومنین کے حضور میں دنیا اور دین دونوں پیش کرتا ہوں۔'' دنیا سے مظلوم امین کا سر مراد تھا اور دین سے چادر اور خاتم خلافت۔ ذوالریاستین نے امین کا سر ایک سپر پر رکھ کر مامون کے سامنے پیش کیا۔ اس غیر متوقع فتح کی خوشی نے مامون جیسے رقیق القلب شخص کو بھی ایسا سنگدل بنا دیا کہ اس نے اپنے بھائی کے خون آلود سر کو مسرت کی نگاہ سے دیکھا اور جوش خوشی میں سجدہ شکر ادا کیا۔ قاصد کو مژدہ فتح کے صلے میں دس لاکھ درہم انعام دیے۔ اسی تقریب سے ایک بڑا دربار منعقد کیا اور تمام اراکین دولت وافسران فوج مبارک باد دینے کو حاضر ہوئے۔''(۱۵)

اسی طرح ہارون الرشید کا ذکر اور اس کی خوبیاں اور اس کے فضل وکمال کا تذکرہ بھی علامہ شبلی کے غیر جانبدار قلم کا شاہد عدل ہے۔ مامون الرشید یقیناً ان کا ہیرو اور ممدوح ہے۔ وہ چاہتے تو کتاب کے یہ حصے مامون کی مدافعت، تاویلوں اور مفروضوں سے پر ہو سکتے تھے۔ مگر ان کی مورخانہ دیانت اور غیر جانبداری نے اسے قبول نہیں کیا اور جو حق تھا اسے ادا کیا۔ ہارون الرشید کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''ہارون الرشید بڑی عظمت وشان کا خلیفہ گذرا ہے۔ شہزادگی کے زمانے میں روم پر لشکر کشی کی۔ پے در پے فتح کرتا ہوا قسطنطنیہ تک پہنچ گیا۔ سریر خلافت پر بیٹھا تو اسلام کے ملکی حدود اس قدر وسیع کر دیے کہ دولت عباسیہ میں کبھی نہیں ہوئے تھے۔ قیصر روم نے چند بار خراج دینے سے انکار کیا مگر اس نے ہر بار شکست دی۔ قیصر کے پایہ تخت کو برباد کر دیا اور بزور یہ شرط لکھوائی کہ پھر کبھی آباد

نہ کیا جائے گا۔ شاہانہ شان وشوکت اور علم وہنر کی سرپرستی نے ہارون رشید کی شہرت کو اور بھی چمکایا، اس کی قدردانی کی ندائے عام نے دلوں میں وہ شوق اور حوصلے پیدا کردیے کہ زمانے کے تمام اہل کمال دربار میں کھنچ آئے اور آستانہ خلافت علوم وفنون کا مرکز بن گیا۔ خود بھی نہایت طباع اور قابل تھا۔ اس کی علمی مجلسیں ادبی تصنیفات کی جان تھیں۔'' (۱۶)

غرض علامہ شبلی نے پوری دیانتداری اور غیر جانبداری سے یہ کتاب لکھی اور غالباً اسی بنیاد پر اختر وقار عظیم نے لکھا ہے کہ:

''اگر کوئی جانبدار مورخ ہوتا تو ان واقعات کے ذکر کے بجائے انھیں کلیتاً غائب کر جاتا اور ان میں ایسی تاویلیں کرتا کہ یہی داستان مامون کی گراوٹ کے بجائے اس کی عظمت کی منہ بولتی تصویر بن جاتی۔ لیکن شبلی کے غیر جانبدار قلم سے ایسی توقع ناممکن تھی۔ انھوں نے جھوٹ بولنے پر ہمیشہ سچائی کو ترجیح دی۔'' (۱۷)

ڈاکٹر سید عبداللہ [ف: ۱۴/اگست ۱۹۸۶ء] نے لکھا ہے کہ ''وہ نظریہ کی حد تک درست چلتے ہیں، مگر عمل میں ان کا نظریہ زیادہ دیر تک ان کا ساتھ نہیں دیتا۔'' (۱۸) افسوس کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس رائے کی تائید وحمایت میں کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ اس لئے ان کی جلالت علمی کے اعتراف کے باوجود یہ کہنے میں مضائقہ نہیں کہ ان کی یہ رائے درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی نعمانی نے اپنے اصولوں کا پوری طرح پاس ولحاظ رکھا ہے اور ان سے کہیں انحراف نہیں کیا ہے۔

بعض اعتراضات اور ان کی حقیقت

المامون جب شائع ہوئی تو بقول مولانا سید سلیمان ندوی ''اہل علم کی نگاہوں میں اعتبار کے قابل ٹھہری۔'' (۱۹) مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ ''ان کی دوسری تصنیف المامون علی العموم پسند کی گئی اور اس کتاب نے پہلے پہل پبلک کو بتایا کہ مولانا شبلی کس قسم کے مصنف ہیں اور یہ کہ وہ آئندہ کیسے ثابت ہونے والے ہیں۔'' (۲۰) مگر بعض لوگوں نے اس پر سخت تنقیدیں بھی

کیں۔اخبارآزادلکھنؤ[ایڈیٹر:شوق قدوائی] میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اس کتاب پرتبصرہ کرتے ہوئے یہ اعتراض کیا کہ دولت عباسیہ میں مامون کے بجائے ہارون رشید انتخاب کے لائق تھااوروہ مامون سے ہرطرح بہتراور برتر تھا۔اس تبصرہ میں ہارون و مامون کا موازنہ بھی کیا گیا تھااور مامون کی کمزوریاں اورخامیاں گنا کر ہارون کی برتری ثابت کی گئی تھی۔(۲۱)

یہ سوال واقعی دلچسپ ہے کہ علامہ شبلی نے سلسلہ فرماں روایان اسلام میں ہیروز کے انتخاب میں کن اوصاف کو پیش نظر رکھا؟

علامہ شبلی نے ہیروز میں مامون کا انتخاب نہایت غور وفکر اور وسیع تر پس منظر میں کیا تھا۔ یقیناً ہارون الرشید خلافت عباسیہ کے سلسلہ زریں میں واسطۃ العقد کی شان رکھتا ہے لیکن کیا علامہ شبلی کی اس دلیل کا جواب اس کے مداحوں کے پاس ہے کہ اس کا دامن انصاف برامکہ کے خون سے رنگین تھا۔(۲۲)

اس سلسلہ میں بعض علمی حلقوں کی جانب سے جب تنقید واعتراض کی لے بڑھنے لگی تو اخبارآزادلکھنو کے ایڈیٹر نے ان تنقیدوں کے جواب کے لئے علامہ شبلی کو متواتر خطوط لکھے۔ان کے مسلسل اصرار پر علامہ شبلی نے ایک مختصر مراسلہ ایڈیٹر آزاد[شوق قدوائی] ہی کے نام لکھا۔ یہ مراسلہ اخبارآزاد میں ۲۲رفروری ۱۸۸۹ء کے ایڈیشن میں شائع ہوا۔ یہاں یہ ذکر کرنا بھی مناسب ہے کہ علامہ شبلی کی یہ واحد تحریر ہے جو انھوں نے اپنی کسی تصنیف پر تنقید کے جواب میں لکھی ہے۔

اس مراسلہ میں انھوں نے مامون کے انتخاب پر جو اعتراضات کئے گئے تھے ان کا مسکت و مدلل جواب دیا۔ان کا لہجہ اس میں ذرا سخت نظرآتا ہے جو شاید بعض معترضین کے اعتراض برائے اعتراض کے رویہ کے پیش نظر بے جا بھی نہیں کہا جا سکتا۔انھوں نے لکھا کہ ''جن لوگوں نے اس بات کو طول دیا ہے کہ دولت عباسیہ میں ہارون انتخاب کے لائق تھا نہ کہ مامون۔اس اعتراض کا تصفیہ وہ شخص کرسکتا ہے جس نے نہایت وسعت کے ساتھ تاریخی معلومات فراہم کئے ہوں اور ساتھ ہی باریک بیں اورتاریخی اصولوں کا نکتہ شناس بھی ہو۔'' (۲۳) اس کے بعد انھوں نے ہارون رشید کے انتخاب نہ کرنے کے متعدد اسباب بیان کئے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''اگرچہ مجھ کو زیبا نہیں کہ مرحوم ہارون الرشید کی فردقرارداد جرم تیار کروں لیکن

اگر ہمارے دوستوں کے خزانہ معلومات میں المامون اور تاریخ الخلفاء کے سوا اور بھی کچھ ہے تو خیال کریں کہ وہ کون تھا جس نے سرحدی شہروں کے تمام گرجے بعض بیجا تعصب سے منہدم کرا دیے؟ کون تھا جس نے اپنے قید خانہ کو بعض شبہ کی بناء پر حضرت موسیٰ کاظم سے آباد کیا تھا؟ کون تھا جس کے درباری اس کی بدمزاجی سے اس قدر خائف رہتے تھے کہ اکثر اس کے پاس کفن پہن کر جاتے تھے؟ کون تھا جس نے حضرت یحیٰی بن عبداللہ کو معاہدہ صلح لکھ دیا جس پر تمام علماء اور بنو ہاشم کے دستخط تھے۔ پھر بے وجہ ان کو قید کر دیا؟ اور گو امام محمد صاحب نے کہا بھی کہ یہ بالکل اسلام کے خلاف کارروائی ہے مگر باز نہ آیا۔ کون تھا جس کے عہد میں عمال اور عہدہ داران ملکی اعلانیہ ظلم کرتے تھے اور سال بھر میں ایک بار بھی مظلوموں کی فریاد سننے کو دربار نہیں کرتا تھا؟ کون تھا جس کو قاضی ابو یوسف نے نہایت حسرت اور تمنا سے کتاب الخراج میں یوں مخاطب کیا:

''اگر اے امیر المومنین تو خدا کا تقرب اس طرح حاصل کرتا کہ رعایا کی فریاد سننے کے لئے مہینہ بلکہ دو مہینہ میں ایک اجلاس بھی کرتا جس میں تو مظلوم کی فریاد سنتا اور ظالم سے باز پرس کرتا تو مجھ کو امید تھی کہ تیرا شمار ان لوگوں میں نہ ہوتا جو رعایا کی حاجتیں نہیں سنتے اور غالباً تو دو ایک ہی اجلاس کرے گا ملک میں یہ چرچا پھیل جائے گا کہ تو برس دن میں ایک بار بھی لوگوں کی حاجت روائی کے لئے اجلاس کرتا ہے تو وہ لوگ ان شاء اللہ ظلم سے باز رہیں گے۔'' کون تھا جس کے عہد میں اکثر واقعہ نویس عمالوں سے سازشیں رکھتے تھے اور بالکل جھوٹ اور فساد انگیز خبریں ہارون الرشید کو لکھتے تھے؟ جس کی وجہ سے قاضی ابو یوسف نے مجبور ہو کر کتاب الخراج میں اس کا ذکر کیا۔ کون تھا جس کے عہد میں ملک کی تباہی کا یہ حال تھا کہ سواد کے علاقہ میں حضرت عمرؓ نے جو خفیف رقم مقرر کی تھی رعایا اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی اور آخر قاضی ابو یوسف صاحب کو وہ مقدار جمع گھٹا کر اس کی توجیہ کرنی پڑی۔ کون تھا جس کا خزانہ اس طرح معمور کیا

جاتا تھا کہ جب کسی پر کچھ شبہ ہوا تو اس کا کل مال ومتاع ضبط کر کے خزانہ شاہی میں داخل کر دیا گیا؟ علی بن عیسیٰ سے دس کروڑ درہم چھین کر جو خزانہ میں داخل کئے گئے کیا جائز حق سے لئے گئے۔ کون تھا جس نے اسلام میں یہ نئی بدعت ایجاد کی کہ خلافت کے چند ٹکڑے کئے اور اپنے بیٹوں میں اس کو موروثی جائیداد کی طرح تقسیم کیا؟ کیا ان باتوں کے ہم پلہ مامون کی تاریخ میں بھی مل سکتی ہیں .... فتوحات کے لحاظ سے رشید کو کیا ترجیح ہے؟ مختصر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ رشید نے کوئی نیا ملک فتح نہیں کیا لیکن مامون کے عہد میں صقلیہ اور کریٹ کی جو فتحیں ہوئیں، وہ خاص لحاظ کے قابل ہیں۔ علم وقابلیت کے لحاظ سے سب جانتے ہیں کہ ہارون رشید صرف ادب، فقہ، حدیث میں کمال رکھتا تھا لیکن مامون ان علوم کے علاوہ فنون حکمت کے مختلف شعبوں میں ایک حکیم تسلیم کیا جاتا تھا۔''(۲۴)

اس کے بعد علامہ شبلی معترضین پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''افسوس ہے کہ نہ لوگوں کو تمام حالات سے اطلاع نہ واقعات کے موازنہ کرنے کی قابلیت۔ یہ امور جو میں نے لکھے ہیں شاید لوگوں کو چیستاں معلوم ہوں اور تاریخی دفتروں میں اس کے حوالے بھی نہ ڈھونڈ سکیں۔''(۲۵)

ایڈیٹر آزاد کو مخاطب کر کے لکھا کہ:

''رشید کی برائیاں میں نے کم گنائیں۔ رنج ہوتا ہے کہ سیکڑوں برس کے دبے فتنے آج ابھارے جائیں۔ خیر رشید جو کچھ تھا خوب تھا۔ ان طرف داروں سے اس کا حق مجھ پر زیادہ ہے۔ میں نے کچھ سمجھ کے اس کو نہیں لیا۔ مامون پر جو نکتہ چینیاں کی گئی ہیں، وہ اسی طرح تفصیل طلب ہیں جس طرح رشید و مامون کا موازنہ۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے اوقات کو ان فضول باتوں میں صرف کروں؟ آپ یقین فرمائیں کہ مجھ کو عام لوگوں کی تحسین سے نہ خوشی ہوئی، نہ ان کے اعتراض سے رنج۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ اعتراض کریں آپ

کا جی چاہے تو ان کے جواب کی طرف متوجہ ہوں۔ مجھ کو چھوڑ دیجئے کہ رائل ہیروز کے باقی حصے پورے کروں۔

رسی آنکہ بدرد من کہ چو من
خانہ گیری و حرف بنگاری(۲۶)

اس مراسلہ سے ہمیشہ کے لئے یہ برحق فیصلہ ہوگیا کہ مامون کے انتخاب پر جو انگشت نمائی کی گئی تھی وہ کسی طرح درست نہ تھی۔

المامون پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی چند اعتراضات وارد کئے ہیں۔ ان کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس میں علامہ شبلی نے مامون کی ایک رخی تصویر پیش کی ہے۔ اس کے محاسن کا تذکرہ تو کیا ہے، لیکن معائب کو دھندلا کر کے بیان کیا ہے۔(۲۷) اس اعتراض کی حقیقت ہماری اس بحث میں اوپر گزر چکی ہے۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب جیسے صاحب نظر کی نظر اس واضح حقیقت پر کیوں نہ پڑی کہ مامون کو فطرت نے گوناگوں اوصاف سے متصف کیا تھا۔ اس کی خوبیوں کے مقابلہ میں اس کی خامیاں بہرحال کم ہیں، اس لئے ان کا ذکر بھی نسبتاً کم ہوا۔ اب اگر کسی صاحب فضل وکمال کی خوبیاں اس کی خامیوں پر غالب آجائیں اور اس کی بعض بشری کوتاہیاں دھندلا کر رہ جائیں تو کیا کسی فرض شناس مورخ کا یہ کام ہے کہ وہ اپنی طرف سے اضافہ کر کے تصویر کے دونوں رخ یکساں کردے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے المامون پر تبصرہ کرتے ہوئے چند اور سوالات قائم کئے ہیں۔ مثلاً:

''سوال یہ ہے کہ مامون کی کون سی بے اعتدالیاں ہیں جن سے شبلی کا دل کانپ اٹھایا، جن سے دفعتاً تمام خوبیاں آنکھوں سے چھپ گئیں۔ شبلی فرماتے ہیں کہ مامون کی سب سے بڑی کمزوری اس کی حد سے بڑھی ہوئی فیاضی تھی۔ اس پر اگر ہم کچھ الزام لگا سکتے ہیں تو یہی کہ اس کا رحم وانصاف حد سے متجاوز تھا۔ (المامون حصہ اول ص۱۱۳) مگر یہ کمزوری بھی بڑے مزے کی کمزوری ہے لیکن شبلی اس میں معذور ہیں۔ انھیں ایک ہیرو کی زندگی اور اس کے تمام کارناموں کی سرگزشت لکھنا ہے، اس لئے عیوب بھی وہی بیان ہونے چاہئیں جن پر

محاسن قربان کئے جاسکتے ہوں۔''(۲۸)

ڈاکٹر سید عبداللہ کا یہ اعتراض بظاہر طاقت ور معلوم ہوتا ہے مگر کیا کیا جائے کہ انھوں نے پہلے ہی یہ رائے قائم کر لی کہ ''مامون الرشید علامہ شبلی کا ہیرو ہے اور المامون کا مقصد عہد اسلامی کے قابل فخر کارناموں کو پیش کرنا ہے۔'' ان کی اسی رائے کی وجہ سے ان کی نظر ان واقعات پر نہیں پڑی جہاں علامہ شبلی نے انتہائی دیانتداری سے مامون کی وہ تقصیریں بلکہ جرائم گنائے ہیں جن سے دل کانپ اٹھتا ہے اور دفعتاً مامون کی تمام خوبیاں آنکھوں سے چھپ جاتی ہیں۔ خود امین کے قتل کے واقعہ پر گہرائی و گیرائی سے نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہوا وہ مامون کی بے تدبیری کی وجہ سے ہوا۔ علامہ شبلی نے امین کی شکست اور پھر اس کے قتل کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے مامون کے بجائے امین سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور مامون سے نفرت، لطف یہ ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ:

> ''کتاب کے اس حصے کو دیکھ کر بعض اوقات دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ مامون کی لائف سے کہیں زیادہ امین کی لائف ہے۔ پڑھنے والے کو امین سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔............اس کی لغزشیں کچھ پیاری پیاری معلوم ہوتی ہیں اور شبلی کی مامون نوازی کے باوجود اس سے نفرت نہیں پیدا ہوتی۔ اس کے مصائب پر رحم آتا ہے۔ اس کے قتل کی تصویر اور اس وقت اس کے اضطراب و بے بسی کا نقشہ شبلی کے چھپے ہوئے غم کی غمازی کرتا ہے۔ .... فاتح مامون کے مقابلہ میں مفتوح امین کی تصویر کچھ روشن تر ہو گئی ہے۔''(۲۹)

اسی بنیاد پر اختر وقار عظیم نے لکھا ہے کہ:

> ''مامون سے عقیدت کے باوجود انھوں نے مامون کے بے موقع گن کبھی نہیں گائے، بلکہ بعض موقعوں پر یوں اظہار خیال کیا کہ مامون کی عظمت کا نقش بہت ہلکا ہو جاتا ہے اور اس کے دشمنوں سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔''(۳۰)

اب رہا رحم و انصاف کا حد سے متجاوز ہونا تو علامہ شبلی نے نہایت بلیغ پیرایہ میں اسے مامون کی ''بے اعتدالیوں'' میں شمار کیا ہے لیکن ڈاکٹر سید عبداللہ نے شاید اس کو کسی اہمیت کے لائق

نہیں سمجھا۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی چیز کا حد سے متجاوز ہونا بذات خود ایک بڑی خرابی اور بے اعتدالی ہے اور اکثر برائیوں کی جڑ بھی ہے۔ اس سے وزراء وعمال اور عہدیداران حکومت خود سر اور بدمزاج ہوتے جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ خودسری کا بازار گرم ہوجاتا ہے اوراس کے ذریعہ بڑے بڑے حادثات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس اہم کمزوری وخامی کو جس سرسری اور ہلکے انداز میں لیا ہے، وہ خود ان کے اعتراض کی کمزوری کی نشانی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ علامہ شبلی نے مامون کے غلط اور غیر منصفانہ اعمال وافعال کے سلسلے میں تاویل سے کام لیا ہے اوراس کی مثال میں مامون پر سادات کے قتل عام کے الزام کے سلسلے میں علامہ شبلی نے جو رائے قائم کی ہے، اسے پیش کیا ہے۔ یہاں ہم پہلے علامہ شبلی کی اس رائے کو پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''خاندان عباسیہ پر عموماً سادات کے قتل کا الزام لگایا جاتا ہے۔ جو لوگ حجروں میں بیٹھ کر اعتراض کے لئے قلم اٹھاتے ہیں، وہ معذور ہیں۔ لیکن جو شخص پولیٹیکل ضرورتوں کا اندازہ داں ہے، اس اعتراض کو مشکل سے تسلیم کرے گا۔ سادات اور علویین کو دودن کے لئے زور ہوگیا تو ملک میں قیامت برپا ہوگئی۔ عباسی خاندان ان کی جانب سے کبھی مطمئن نہیں رہ سکتا تھا اور جو کچھ ان سے برتاؤ ہوا، اسی ضرورت سے ہوا۔'' (۳۱)

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے طاہر اور امام رضا کے زہر دینے کے واقعہ کا حوالہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''طاہر اور امام رضا کو زہر دیا گیا، شبلی کے نزدیک امام رضا کو زہر دینے کا واقعہ غلط ہے۔ لیکن طاہر کو زہر دیا گیا اور خود مامون نے دلوایا۔ لیکن مامون کی جگہ کوئی دوسرا بادشاہ ہوتا تو کیا کرتا.............شبلی کہتے ہیں مامون نے جو کچھ کیا سیاست ملکی کا عین اقتضا یہی تھا۔'' (۳۲)

یہاں سوال یہ ہے کہ علامہ شبلی نے قدیم تاریخوں، مستند حوالوں اور معتبر مآخذ اور تاریخی اصولوں کے ذریعہ امام رضا کے زہر دینے کا واقعہ غلط ثابت کیا تو اس میں علامہ شبلی نے کون سی

تاویل سے کام لیا یا اگر مامون سے طاہر کو زہر دلوانے کا صحیح سبب علامہ شبلی نے سیاست ملکی بتایا تو اس میں کون سی تاویل کارفرما ہے۔ دراصل سید عبداللہ سے یہاں بھی سہو ہوا ہے۔ علامہ شبلی نے طاہر کے زہر دینے کا جو مورخانہ سبب بیان کیا، ڈاکٹر صاحب نے اسے تاویل تصور کر لیا۔ مورخ کا یہ لازمی فرض ہے کہ وہ اسباب وعلل کی تلاش میں قیاس سے کام لے کر نتائج مستنبط کرے۔ علامہ شبلی کو اس سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ قدیم تاریخوں میں ہمارے مورخین کی بے احتیاطیاں اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ متعدد بے سروپا واقعات نقل کر دیے گئے جو یقیناً ناقابل تسلیم ہیں اور اگر ان کے تسلیم کرنے پر اصرار کیا جائے تو کیا ہمارے تاریخی خزانے بے حقیقت ہو کر نہ رہ جائیں گے؟

ڈاکٹر سید عبداللہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''شبلی کو دلچسپ بشریت سے بہت کم غرض ہے۔ انھیں تو شان، جاہ وجلال، قوت، عظمت، جبروت جیسے اوصاف سے محبت ہے۔ اس لیے ان کے ہوتے ہوئے شبلی کی نظر کسی دوسری صفت پر پڑ ہی نہیں سکتی۔'' (۳۳)

اس میں شبہ نہیں کہ علامہ شبلی کو جاہ وجلال اور عظمت وسطوت سے محبت ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا واقعی علامہ شبلی نے بشریت سے غرض نہیں رکھی اور ان کی نظر عظمت وجلال کے سوا کسی اور صفت پر نہ پڑ سکی؟

المامون کا مطالعہ اگر مامون کی عام اور بشریت پر مبنی زندگی کے نقطۂ نظر سے کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے المامون اور دوسری تصانیف میں بشری خدوخال کو بیان کرنے میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔ بشریت سے بھرپور ایک دلچسپ تحریر ملاحظہ ہو:

> ''ہمارے ناظرین جنھوں نے مامون کو کبھی فقہ وحدیث کا تذکرہ کرتے دیکھا ہے، کبھی اہل کمال کے ساتھ اس کی عالمانہ بحثیں سنی ہیں، نہایت تعجب سے دیکھیں گے کہ بزم عیش میں وہ رندانہ وضع بیٹھا ہے، بے تکلف اور رنگین طبع احباب جمع ہیں، پری پیکر نازنینوں کا جھرمٹ ہے، دور شراب چل رہا ہے۔ ساز چھیڑا جا رہا ہے۔ گل اندام کنیزیں نغمہ سرا ہیں۔ یاران باصفا بدمست ہوتے جاتے ہیں۔'' (۳۴)

علامہ شبلی نے جہاں مامون کے زہد وورع کا ذکر کیا ہے وہیں اس کے جلسہ ہائے عیش و

نشاط اوراس کی رندی وسرمستی کا بھی بھرپور تذکرہ کیا ہے۔مگر ڈاکٹر سید عبداللہ کو اس پر بھی تعجب ہے کہ زہد ورندی کے اس ناخوشگوار امتزاج کے باوجود شبلی کا قلم المامون کی تعریف میں کس طرح رواں ہوسکا، حالانکہ علامہ شبلی نے المامون میں خود لکھا ہے کہ:

''اس میں تعجب کی کیا بات ہے ۔آزادی، حوصلہ مندی، لطافت طبع اور جوش شباب ہمیشہ زہد کی حکومت سے باغی رہتے آئے ہیں۔ مامون کی تخصیص نہیں، اس وقت اسلامی سوسائٹیاں عموماً اس رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔'' (۳۵)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے یہاں ایک اور پہلو نکال لیا کہ شبلی نے اپنے ہیرو کے جوش محبت میں آکر اس زمانے کی ساری اسلامی سوسائٹی کو عیب میں مبتلا دکھایا ہے، حالانکہ یہ عیب امراء و سلاطین کا تھا، صلحاء وصوفیاء اور عام مسلم سوسائٹی کا نہ تھا۔(۳۶) لیکن مذکورہ بالا اقتباس میں علامہ شبلی نے جو بات عموماً کی قید سے لکھی تھی اور یہ قید ظاہر ہے کہ اہم نہیں، مگر ڈاکٹر سید عبداللہ نے اسے کلیتًا نہ صرف تسلیم کرلیا بلکہ دوسروں کو بھی یہی باور کرانے کی کوشش کر ڈالی۔اسلامی سوسائٹی سے علامہ شبلی کی مراد علماء وصوفیاء نہ تھے، بلکہ یہی حکمراں طبقہ تھا۔ میری اس بات کا ثبوت وہ اقتباس ہے جو ذیل میں پیش ہے۔اگر ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس کی طرف توجہ دی ہوتی تو شاید یہ اعتراض پیدا ہی نہ ہوتا۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کو اس عہد میں امن، فراغ، اطمینان، زرومال سب کچھ میسر تھا۔ پھر کیا چیز تھی جوان کو زندگی کے پرخطر مقاصد سے روک سکتی۔ایک مذہب البتہ درانداز ہوسکتا تھا لیکن جدت پسند طبیعتیں اس کو بھی کھینچ تان کر اپنے ڈھب کا بنالیتی تھیں۔شراب کی جگہ نبیذ (کھجور کی تاڑی) موجود تھی جس کو عموماً عراق کے مذہبی پیشواؤں سے حلت کی سند مل چکی تھی اور لونڈیوں کی عام اجازت نے عیاشی کے سب حوصلے پورے کردیے تھے۔نغمہ وسرود تو قابلیت علمی کے بڑے جز سمجھے جاتے تھے۔'' (۳۷)

اس طویل بحث سے المامون پر کئے گئے اعتراضات کی علمی، تحقیقی اور تاریخی حیثیت واضح ہوجاتی ہے کہ یہ اعتراضات یا تو محض برائے اعتراض تھے یا پھر شبلی کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کا نتیجہ۔

المامون کی چنداور خصوصیات

المامون کے امتیازات اوراس کی اصولی خصوصیات کے ذکر کے بعد اس کی چند اور خوبیاں بھی قابل ذکر ہیں۔مثلاً تاریخ کی کتابیں عموماً خشک اور بے کیف ہوا کرتی ہیں،جس سے ایک قسم کی گھٹن اور تکان سی محسوس ہونے لگتی ہے۔مگر علامہ شبلی نے اپنے پیش رومورخین کے برعکس دلچسپ انداز نگارش اختیار کیا اور اپنے ممتاز ادبی اسلوب تحریر سے تاریخ کو دلکش ،پرلطف اور جاذب مطالعہ بنادیا۔اختر وقار عظیم نے درست لکھا ہے کہ:

''وہ کبھی بدمزگی یا بے کیفی میں مبتلا نہیں ہونے دیتے۔جابجا وہ ایک قصہ گو کی طرح ایسے ایسے دلچسپ قصے سناتے ہیں کہ واقعات کا تسلسل بھی ختم نہیں ہوتا۔اس میں خشکی اور بے کیفی بھی نہیں آتی اور قاری کی اکتاہٹ بھی دور ہوجاتی ہے۔''(۳۸)

المامون میں ادب وظرافت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔المامون کی اس خصوصیت کے بارے میں سرسید احمد خاں لکھتے ہیں:

''اس حصہ میں لطائف وظرائف کے ساتھ علمی خصوصاً علم وادب کے ایسے ایسے نکتے مذکور ہیں جو ادیب کے لئے سرمایہ ادب اور ظریف کے لئے سرمایہ ظرافت ہیں۔''(۳۹)

المامون کے نہایت عمدہ اور سلیس وشگفتہ اسلوب نگارش اور صاف وشستہ اور برجستہ عبارت کے متعلق سرسید احمد خاں کا یہ قول کافی ہے کہ اس کی زبان واسلوب پر دلی والوں کو بھی رشک آتا ہوگا۔(۴۰) یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے جس کی جانب سرسید احمد خاں نے اشارہ کیا ہے کہ''تاریخ کی کتابوں میں ناول اور ناول میں تاریخانہ طرز کو کیسی ہی فصاحت وبلاغت سے برتا گیا ہو،دونوں کو برباد کرتا ہے۔(۴۱) لیکن المامون کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

''ہمارے لائق مصنف نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بھی بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے۔جو

خوبصورت ہے خوبصورت ہے۔ جو بھونڈی ہے بھونڈی۔ نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے اور نہ بھونڈے پن کو بھونڈا اور درحقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے۔'' (۴۲)

حقیقت یہی ہے کہ المامون اپنے موضوع پر نہایت عمدہ اور بلند پایہ تصنیف ہے۔ علامہ شبلی نے جن اسباب ومقاصد کے پیش نظر المامون لکھی تھی وہ اس عہد کے مانند آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ اس لئے اس کے مطالعہ سے آج بھی وہ مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں جو علامہ شبلی کے پیش نظر تھے اور یہی ایک عمدہ تصنیف کی پہچان بھی ہے کہ اس کی افادیت صدیوں تک باقی رہے۔

حوالے

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی۔ حیات شبلی ص ۱۷۳۔ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ۔ طبع چہارم ۱۹۸۳ء

(۲) علامہ شبلی نعمانی۔ المامون حصہ دوم ص ۱۵۱-۱۶۱۔ دارالمصنّفین اعظم گڑھ۔ طبع سوم ۱۹۹۲ء

(۳) ایضاً حصہ اول ص ۵۹

(۴) ایضاً حصہ دوم حاشیہ ص ۱۳۵

(۵) دیباچہ المامون ص ۲

(۶) اختر وقار عظیم۔ شبلی بحیثیت مورخ ص ۹۴۔ اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۹ء

(۷) دیباچہ المامون ص ۳

(۸) مولانا سید سلیمان ندویؒ۔ مقالات شبلی ج ۴ ص ۸۱۔ دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۹) المامون حصہ دوم، ص ۱۷۸

(۱۰) ایضاً۔ ص ۱۲۷-۱۲۸

(۱۱) ایضاً حصہ اول ص ۱۲۸

(۱۲) ایضاً ص ۶۰

(۱۳) ایضاً ص ۲۸

(١٤) ایضاً حصہ دوم ص ١٩٥

(١٥) ایضاً حصہ اول ص ٦٠

(١٦) ایضاً ص ١٩

(١٧) شبلی بحیثیت مورخ ص ٩١

(١٨) سرسید اوران کے نامور رفقاء ص ١٦١۔ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔١٩٩٤ء

(١٩) حیات شبلی ص ١٧٣

(٢٠) ایضاً ص ١٧٢۔١٧٣

(٢١) سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر ص ٢٧۔
دارالمصنّفین اعظم گڑھ۔١٩٨٥ء

(٢٢) المامون حصہ اول ص ١٩

(٢٣) مقالات شبلی ج ٨ ص ٤١۔دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

(٢٤) ایضاً ص ٤٢۔٤٣

(٢٥) ایضاً

(٢٦) ایضاً ص ٤٤

(٢٧) سرسید اوران کے نامور رفقاء ص ١٥٨

(٢٨) ایضاً

(٢٩) ایضاً ص ١٥٧-١٥٨

(٣٠) اختر وقار عظیم۔شبلی بحیثیت مورخ ص ٩٠۔اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ١٩٧٩ء

(٣١) المامون، حصہ اول ص ٦٩

(٣٢) سرسید اوران کے نامور رفقاء ص ١٥٩

(٣٣) ایضاً ص ١٥٨

(٣٤) المامون حصہ دوم ص ٢٠٥

(٣٥) ایضاً ص ٢٠٥۔٢٠٦

(۳۶) سرسید اوران کے نامور رفقا ص۱۶۰

(۳۷) المامون، حصہ دوم ص۲۰۶

(۳۸) شبلی بحیثیت مورخ ص۹۱

(۳۹) المامون دیباچہ ص۲

(۴۰) ایضاً ص۳

(۴۱) ایضاً

(۴۲) ایضاً

سیرۃ النعمان

علامہ شبلی نے المامون کے بعد اپنی شہرۂ آفاق کتاب الفاروق لکھنے کی ابتداء کی۔ اس کا ایک معتد بہ حصہ لکھ بھی چکے تھے، مگر اس کے لئے جن مراجع ومصادر کی ضرورت تھی اور علامہ شبلی کے پیش نظر اس کتاب کا جو وسیع خاکہ تھا، اس کے لئے ہندوستان کے کتب خانوں میں خاطر خواہ مواد دستیاب نہ تھا۔ بعض نادر ونایاب کتابیں جو اس کے لئے انتہائی ضروری تھیں، وہ یورپ میں طبع ہو رہی تھیں، اس لئے الفاروق کی تصنیف کا کام کچھ دنوں کے لئے مجبوراً روک دینا پڑا اور اسی زمانہ انتظار میں ''سیرۃ النعمان'' کی طرح ڈالی۔

علامہ شبلی نے نامور فرمانروایان اسلام کے پہلو بہ پہلو ناموران اسلام کا جو خاکہ مرتب کیا تھا سیرۃ النعمان اس کی ایک اہم کڑی ہے۔ علامہ شبلی نے اس سلسلہ کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ بہت وسیع تھا، اس کے ذریعہ ان کی منشا یہ تھی کہ اسلام میں آج تک جس قدر علوم وفنون ایجاد ہوئے اور ان میں جو نامور اشخاص پیدا ہوئے، ان کے حالات زندگی اور اہم علمی کارناموں سے نئی نسل کو واقف کرایا جائے۔ چنانچہ جہاں انھوں نے خلافت وسلطنت کے متعدد خاندانوں سے ہیروز کا انتخاب کیا، وہیں علوم وفنون کے بھی جدا جدا خاندان قائم کئے اور جو لوگ اپنے فن میں عدیم المثال تھے، انھیں اس خاندان کا ہیرو قرار دیا۔ مگر چونکہ یہ کام بڑا طویل اور صبر آزما تھا، اس لئے انھوں نے حکومتوں کے مختلف ادوار کی قید لگا کر اس وسیع خیال کو مختصر اور محدود کر دیا اور اس میں بھی بہت سے خاندان چھوڑ دیے۔ مگر یہ خیال علامہ شبلی کے دل سے نہ گیا کہ فرصت کے اوقات میں اہل کمال کا دربار بھی سجانا چاہئے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ علمی ناموروں کے کارناموں کو دکھلانا بھی ضروری ہے، کیوں کہ اسلام میں تیغ وقلم کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے۔(۱)

غرض الفاروق کے مراجع ومصادر کی دستیابی کی دشواری وتاخیر نے جب یہ فرصت مہیا کردی توانھوں نے فقہ، حدیث، ادب، منطق، فلسفہ اور ریاضی جیسے علوم کے ہیروز میں سب سے پہلے فقہی خاندان کے گل سرسبد اور اسلامی فقہ کے بانی امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کی ذات گرامی کو منتخب کیا اور ان کے حالات اور کارناموں کو سیرۃ النعمان کی شکل میں قوم کی نذر کیا۔

سبب تصنیف

علامہ شبلی کو امام ابوحنیفہ کی ذات سے زمانہ طالب علمی ہی سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ ہمیشہ باقی رہی۔ ان کی اسی عقیدت کی بنا پر ان کے استاذ مولانا فاروق چریاکوٹی نے نعمانی کے لقب سے نوازا تھا۔(۲) گو امام اعظم کی ذات سے علامہ شبلی کی عقیدت اور غیر معمولی شغف وانہماک نے سیرۃ النعمان کی تالیف میں مؤثر رول ادا کیا مگر اس کتاب کی تصنیف کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ اردو زبان میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کی کوئی معیاری سوانح عمری نہیں لکھی گئی تھی۔ چنانچہ اس کے دیباچہ میں خود علامہ شبلی رقم طراز ہیں:

> ''امام ابوحنیفہ کے اجتہادی مسائل قریباً بارہ سو برس سے تمام ممالک اسلامی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بڑی بڑی عظیم الشان اسلامی سلطنتوں میں ان ہی کے مسائل قانون سلطنت تھے اور آج بھی ہیں۔ اسلامی دنیا کا غالب حصہ ان ہی کے مسائل کا پیرو ہے۔ عربی، فارسی، ترکی بلکہ یورپ کی زبانوں میں ان کی متعدد سوانح عمریاں لکھی گئیں، ظلم تھا اگر ان کی لائف خود اردو میں نہ لکھی جاتی۔ جو بلحاظ غالب ان ہی کے پیرووں کی زبان ہے۔''(۳)

تکمیل واشاعت

سیرۃ النعمان کی ابتداء ۱۸۸۹ء میں ہوئی اور ۱۸۹۰ء میں ایک سال کی مدت میں مکمل ہوئی اور ۱۸۹۱ء میں علی گڑھ کالج کی طرف سے شائع ہوئی۔ علامہ شبلی کی دوسری تصانیف کی طرح اس نے بھی ملک میں نہایت مقبولیت حاصل کی اور صرف تین ماہ میں پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل

گیا۔علامہ شبلی کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں دوبارہ اس کی اشاعت کی نوبت آ گئی تھی۔(۴)اب تک اس کے مندرجہ ذیل ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں:

[۱]	مطبع مفید عام، آگرہ، طبع اول	۱۸۸۹ء	۳۱۰ص
[۲]	قومی پریس، علی گڑھ	۱۸۹۱ء	
[۳]	مطبع مفید عام، آگرہ	۱۸۹۲ء	۳۱۰ص
[۴]	کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند	۱۸۹۳ء	۲۰۰ص
[۵]	مطبع مجتبائی، دہلی	۱۸۹۳ء	۳۱۰ص
[۶]	رنگین پریس، دہلی	۱۸۹۳ء	۱۶۴ص
[۷]	حمیدیہ پریس، دہلی	۱۸۹۳ء	۱۶۰ص
[۸]	قومی پریس، دہلی	۱۹۰۴ء	۲۸۰ص
[۹]	مطبع مجتبائی، دہلی	۱۹۱۲ء	۳۰۴ص
[۱۰]	کانگریس پریس، دہلی	غیر مورخہ	۱۶۴ص
[۱۱]	کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند	غیر مورخہ	۱۹۹ص
[۱۲]	محمد شفیع اینڈ سنز، دہلی	۱۹۱۵ء	
[۱۳]	شاہ جہانی پریس، دہلی	۱۹۳۱ء	
[۱۴]	دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۳۶ء	۲۸۶ص
[۱۵]	مکتبہ برہان، دہلی	۱۹۵۶ء	۲۲۴ص
[۱۶]	مکتبہ برہان، دہلی	۱۹۶۳ء	۲۲۴ص
[۱۷]	سی اے، لاہور	۱۹۷۰ء	(بعنوان امام اعظم)
[۱۸]	دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۹۸ء	۱۰+۳۰۴ص
[۱۹]	مکتبہ القریش، لاہور	۱۹۹۶ء	
[۲۰]	دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۰۵ء	۱۰+۳۰۴ص
[۲۱]	دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۱۲ء	۲۸۴ص

[۲۲] ▪ ایم ثناءاللہ خاں، لاہور غیر مورخہ ۳۹۸ص

[۲۳] ▪ دارالاشاعت، لاہور غیر مورخہ ۲۳۵ص

حسن قبول اور تراجم

مذکورہ اشاعتوں کے علاوہ دیگر زبانوں کے اہل قلم نے بھی سیرۃ النعمان سے دلچسپی لی اوراس کا انگریزی، بنگالی، تاجک اور فارسی زبانوں میں ترجمہ کیا، جو دہلی، ڈھاکہ، تاجکستان اور ایران سے شایع ہوئے۔جس کی تفصیل یہ ہے:

ا۔انگریزی ترجمہ

امام ابوحنیفہ مترجم: ہادی حسین

۱۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر لاہور،۱۹۷۲ء۲۵۶ص

۲۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر لاہور،۱۹۷۷ء،۲۵۶ص

۳۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر لاہور،۱۹۸۲ء،۲۵۶ص

۴۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر لاہور،۱۹۸۸ء،۲۵۶ص

۵۔ کتاب بھون، نئی دہلی،۱۹۸۸ء،۲۳۵ص

۶۔ رائٹ وے پبلی کیشن نئی دہلی،۱۹۹۶ء

۷۔ کتاب بھون، نئی دہلی،۱۹۹۵ء،۲۳۵ص

۸۔ کتاب بھون، نئی دہلی،۱۹۹۸ء،۲۳۵ص

۹۔ اسلامک بک سروس دہلی،۱۹۹۸ء

۱۰۔ کتاب بھون، نئی دہلی،۲۰۰۱ء،۲۳۵ص

۱۱۔ کتاب بھون، نئی دہلی،۲۰۰۳ء،۲۳۵ص

۱۲۔ کتاب بھون، نئی دہلی،۲۰۰۵ء،۲۳۵ص

۱۳۔ دارالاشاعت لاہور،۲۳۴ص

۲۔ بنگالی ترجمہ

امام ابوحنیفہ، امدادیہ لائبریری ڈھاکہ، ۲۰۰۱ء

۳۔ تاجک ترجمہ

سیموئے امامی ابوحنیفہ، پوئے می اوشنو، دوشنبے، ۲۰۰۹ء، ۲۹۸ص

۴۔ فارسی ترجمہ

امام ابوحنیفہ، مترجم ملازئی عبدالوہاب سربازی، ناشر اوائے اسلامی، ایران ۱۳۸۶ھ، ۴۰۳ص

پہلا حصہ

سیرۃ النعمان کے پہلے حصہ کی ابتداء ایک تمہید سے ہوئی ہے۔ اس کے بعد امام صاحب کے نام ونسب، ولادت ووطن، سن رشد، تعلیم وتربیت، اساتذہ وشیوخ، درس وافتاء، وفات، اولاد، اخلاق وکردار، طرز معاشرت، ذہانت وطباعی، مناظروں کی تفصیل، علمی مجالس اور ان کے ہم عصروں کی ان کے متعلق رائیں وغیرہ تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں اور یہ حالات اس ترتیب سے لکھے گئے ہیں کہ امام صاحب کی پوری زندگی کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

دوسرا حصہ

دوسرے حصہ میں امام صاحب کی تصانیف ان کے فقہی کمالات واجتہادات اور ان کے طریقہ استنباط پر مفصل بحث کی گئی ہے اور کتاب کے آخر میں امام صاحب کے تلامذہ کے مختصر حالات بھی تحریر کردیے ہیں اور یہی حصہ خود علامہ شبلی کے الفاظ میں ان کی ''محنتوں کا اصل تماشہ گاہ ہے۔'' اس کو پڑھ کر امام ابوحنیفہ کی عظمت وبلند پائیگی کا جہاں اندازہ ہوتا ہے، وہیں علامہ شبلی کی غیرمعمولی فقہی بصیرت اور مورخانہ صلاحیتوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے ایک ماہر فقیہ کی طرح ایک ایک فقہی جزئیات پر بحث وتحقیق کی ہے اور ان کی حقیقت وحیثیت واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور امام صاحب کے خیالات کا ہم عصر فقہاء کے آراء وخیالات سے بعض جگہ موازنہ

ومقابلہ کر کے امام صاحب کی فقہی جلالت و بصیرت اور مہارت فن کی مثالیں پیش کیں۔ مولانا الطاف حسین حالی (ف:۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء) نے دوسرے حصہ کا بڑا عمدہ تجزیہ وتعارف پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مصنف نے نہایت عمدگی سے بتایا ہے کہ کیوں کر امام صاحب اور ان کے اتباع کو اہل الرائے کہا گیا؟ کس لیے انھوں نے مذہب میں قیاس کو کثرت سے دخل دیا۔ روایت حدیث کے لیے کیوں ایسی شرطیں لگائیں جن سے حدیث کا دائرہ تنگ ہو جائے؟ روایت کے اصول جو انھوں نے فن حدیث میں قائم کیے ان سے اسلام کو کیا فائدہ پہنچا؟ فقہ کی حالت امام صاحب سے پہلے کیا تھی؟ اور اس کو انھوں نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟ فقہ کی تدوین اور اس کو ایک جامع قانون کی حد تک پہنچانے کا خیال ان کو کیوں کر پیدا ہوا؟ فقہ کی تدوین انھوں نے کس احتیاط کے ساتھ کی اور کیسے کیسے جلیل القدر لوگوں کو اس میں شریک کیا؟ فقہ حنفی کو اس قدر حسن قبول کیوں حاصل ہوا؟ کس لیے وہ تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گئی؟ اور باوجودے کہ امام صاحب میں مثل دیگر ائمہ مجتہدین کے ذاتی خصوصیتیں نہ تھیں؟ کیوں ان کی فقہ نے اس قدر رواج پایا؟ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ امام صاحب ہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے تشریعی اور غیر تشریعی حدیثوں میں فرق اور امتیاز قائم کیا۔ ورنہ اس سے پہلے شارع کے تمام اقوال وافعال خواہ تبلیغ رسالت کے متعلق ہوں اور خواہ دنیوی مصالح سے، سب تشریعی سمجھے جاتے تھے۔''(۵)

تنقیدیں

سیرۃ النعمان کے یہ مباحث اگر چہ علی العموم پسند کئے گئے تاہم ایک طبقہ میں خاصے متنازعہ بھی رہے اور اس کے جواب میں مضامین اور کتابیں لکھی گئیں۔ یہاں ان کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

ا۔حسن البیان فی مافی سیرۃ النعمان

سیرۃ النعمان کے رد میں لکھی جانے والی یہ پہلی کتاب ہے ۔جو اہل حدیث عالم مولانا محمد عبدالعزیز رحیم آبادی (م:۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء) کے قلم سے ہے۔۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں دہلی کے مطبع فاروقی سے شائع ہوئی۔اس کے چار ایڈیشن نکل چکے ہیں۔چوتھا اور آخری ایڈیشن ۱۹۸۴ء میں مولانا حافظ محمد اسماعیل سلفی کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا۔

اس میں سیرۃ النعمان کو مکمل طور پر رد کر دیا گیا ہے۔علامہ شبلی کے تقریباً ہر جملہ پر اعتراض وارد کیا گیا ہے اوران کی بے بضاعتی دکھائی گئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کی ضخامت تقریباً اصل کتاب یعنی سیرۃ النعمان کی ضخامت کے مساوی [ص:۳۳۶] ہے۔

صاحب حسن البیان کی نظر حدیث اور متعلقات حدیث پر گہری تھی اور بلاشبہ بعض بڑی عمدہ بحثیں کی ہیں۔البتہ زبان و بیان علمی نہیں،لب ولہجہ بھی علمی وقار اور سنجیدگی سے خالی ہے۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے علامہ شبلی کے لباس پر بھی تنقید کی ہے۔اوران پر انگریزی لباس پہننے کا الزام لگایا ہے۔حالانکہ علامہ نے کبھی انگریزی لباس زیب تن نہیں کیا۔ بحیثیت مجموعی ان کے اعتراضات اسی مسلکی گرم بازاری اور تقلید وعدم تقلید کا نتیجہ ہیں جو بدقسمتی سے مسلمانوں میں برسوں سے چلا آرہا ہے۔

۲۔ریویو سیرۃ النعمان

قزلباش نامی ایک شخص نے ۱۸۹۳ء میں یہ کتاب لکھی ہے جو اودھ پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔مصنف نے علامہ شبلی پر متعدد اعتراضات وارد کئے ہیں۔لیکن نہ ان کے اعتراضات سمجھ میں آئے اور نہ جوابات۔البتہ جا بجا اہل تشیع کے علاوہ اہل حدیث علماء کو کتاب اور مصنف کے خلاف اکسایا گیا ہے۔بعض خیالات سے مصنف خود شیعہ معلوم ہوتے ہیں لیکن زبان و بیان سے نہیں۔۹۳رصفحات کے اس رسالہ کا لب ولہجہ غیر علمی اور غیر سنجیدہ ہے۔(۶)

۳۔سیرۃ البخاری

مولانا عبدالسلام مبارک پوریؒ [۱۲۸۹ء/۱۳۴۲ھ] کی یہ معرکہ آرا تصنیف علامہ شبلی کی سیرۃ النعمان کے جواب میں لکھی گئی ہے۔[تحقیقات اسلامی،علی گڑھ،اپریل جون ۲۰۰۷ءص ۶۷]

امام بخاریؒ کی یہ سوانح محنت وتحقیق اور تفحص سے قلم بند کی گئی ہے۔اس کا انداز نگارش بھی عالمانہ، سنجیدہ اور متین ہے تاہم سیرۃ النعمان پر جابجا اعتراضات اور ان کے جوابات میں مصنف کا قلم مولانا محمد عبدالعزیز محمدی سے آگے نہیں بڑھا ہے۔

۴۔الارشاد الی سبیل الرشاد فی امر التقلید والاجتہاد

یہ مولانا حکیم ابو یحییٰ شاہ جہاں پوری کی تصنیف ہے۔ یہ تقلید اور عدم تقلید کے موضوع پر ہے۔اس میں ضمناً سیرۃ النعمان کے بعض مباحث پر نقد وجرح ہے۔

۵۔تذکرہ امام ابوحنیفہ

اسے صاحبزادہ جمیل احمد شرق پوری نے مرتب کرکے پروگریسیو بکس لاہور سے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا۔اس میں بھی بعض نظریات شبلی پر تنقید کی گئی ہے۔آخرالذکر دونوں کتابیں راقم کی نظر سے نہیں گذریں۔

مقاصد

علامہ شبلی کا اگرچہ یہ خیال تھا کہ اعظم گڑھ اور دیہات واطراف میں سیرۃ النعمان کے بہت سے نسخے جانے چاہئیں۔حنفیوں کی مزید اطلاع کا باعث ہوگا۔(مکاتیب شبلی جلد اص ۱۹طبع جدید ۲۰۱۰ء) تاہم اس کی تصنیف کا بنیادی مقصد اسلاف کی عظمت بیان کرنا اور یورپ کے مقابلہ میں ان کی برتری ثابت کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ المامون کی طرح سیرۃ النعمان میں بھی انہوں نے مغربی اہل قلم کے بعض اعتراضات کے جوابات لکھے ہیں۔مثلاً یہ اعتراض کہ فقہ حنفی رومن لا سے ماخوذ ہے۔اس کا نہ صرف دفاع کیا ہے بلکہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کی قانونی کتابوں سے بہت کم واقفیت حاصل کی اور فقہ حنفی کی تدوین تک تو کسی یونانی کتاب کا ترجمہ ہوا ہی نہیں تھا، چہ جائے کہ کسی قانونی کتاب کا ترجمہ، جو آج تک ثابت نہیں ہے۔(۷)

خصوصیات

سیرۃ النعمان میں باوجود صاحب سوانح سے اپنی ذاتی عقیدت ومحبت کے علامہ شبلی نے اپنے تاریخی اور تصنیفی اصولوں کو مکمل طور پر برتا ہے اور کسی جگہ صحیح اصول تاریخ نویسی وسوانح نگاری

سے سر موانحراف نہیں کیا ہے۔ چونکہ صاحب سوانح امام اعظم کی متعدد حیثیتیں تھیں اور ان کا تعلق مختلف فنون سے تھا، اس لئے جو بات جس فن کے مناسب تھی وہاں اس فن کے اصول وضوابط کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ سیرۃ النعمان میں علامہ شبلی کا طرز تحریر کہیں مورخانہ، کہیں فقیہانہ، کہیں محدثانہ اور کہیں مجتہدانہ ہو گیا ہے۔

علامہ شبلی نے اپنی دوسری تصانیف کی طرح سیرۃ النعمان میں تحقیق وتنقید اور حقیقت نگاری کے ذریعہ داد تحقیق دی ہے۔ صحت وصداقت واقعہ کا بھی بڑا خیال رکھا ہے اور اس سلسلہ میں روایت ودرایت کے اصولوں سے بھی پوری طرح کام لیا ہے اور کوئی ایسا واقعہ قلم بند نہیں کیا ہے جس کی معتبر سند اور مستند حوالہ موجود نہ ہو۔ مآخذ ومراجع کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ اس طرح سیرۃ النعمان اصولی طور پر فن تاریخ وتحقیق کے لحاظ سے ایک گرانمایہ تصنیف ہے جس کی دوسری مثال دنیائے اردو میں شاید ہی مل سکے۔

سوانح نگاری کے متعلق علامہ شبلی کا یہ خیال بڑا اہم ہے کہ اس میں عقیدت ومحبت کو دخل نہیں ہونا چاہئے۔ چنانچہ خود انھوں نے امام ابوحنیفہ سے انتہائی عقیدت اور جذباتی تعلق کے باوجود فنی اصولوں کو کہیں قربان نہیں کیا اور نہ فن کو عقیدت کی بھینٹ چڑھنے دیا۔ غالباً اسی بنیاد پر الطاف فاطمہ نے لکھا ہے کہ اس میں حقیقت زیادہ اور خوش اعتقادی کم ہے۔(۸)

امام اعظم کے متعلق بہت سے واقعات وروایات جو عام مورخین اور امام اعظم کے خوش اعتقاد سوانح نگاروں کی خوش اعتقادی کی پیداوار ہیں، علامہ شبلی نے تاریخی اصولوں کی بنیاد پر ان کی پرزور تردید کر دی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''ہمارے تذکرہ نویسوں نے امام کے اخلاق وعادات کی جو تصویر کھینچی ہے، اس میں خوش اعتقادی اور مبالغہ کا اس قدر رنگ بھرا ہے کہ امام صاحب کی اصلی تصویر اچھی طرح پہچانی نہیں جاتی۔ چالیس برس تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی، تیس برس تک متصل روزے رکھے، جہاں وفات پائی اس جگہ سات ہزار بار قرآن ختم کیا، نہر کوفہ میں مشتبہ گوشت کا ٹکڑا پڑ گیا تو اس خیال سے کہ مچھلیوں نے کھایا ہوگا اور مچھلیاں بہت دنوں تک زندہ رہتی ہیں، ایک مدت تک

مچھلی نہیں کھائی۔اسی طرح ایک شبہ پر بکری کا گوشت کھانا چھوڑ دیا۔ان کا ذاتی صرفہ صرف دس آنہ ماہوار تھا۔یہ اور اس قسم کے بہت سے افسانے ان کی نسبت مشہور ہیں اور لطف یہ کہ ہمارے مورخین انھیں دوراز کار قصوں کو امام صاحب کے کمالات کا جوہر سمجھتے ہیں۔حانکہ یہ واقعات نہ تاریخی اصولوں سے ثابت ہیں، نہ ان سے کسی کے شرف پر استدلال ہوسکتا ہے۔''(۹)

اسی طرح مورخین نے امام صاحب کو فن مناظرہ کا امام اور بڑا حاضر جواب لکھا ہے اور اس کو ان کی فضیلت اور عظمت بتایا ہے، مگر علامہ شبلی کا خیال ہے کہ:

''بعض مصنفوں نے ان کی ذہانت اور طباعی کے ذیل میں بہت سے ایسے قصے لکھ دیے ہیں جن کو خدانخواستہ ہم سچ تسلیم کرلیں تو عیاذ أبالله، امام صاحب کو حیلہ جو، چالاک، متفنی، سخن ساز ماننا پڑے گا لیکن وہ روایتیں تاریخی اصولوں سے ثابت نہیں۔''(۱۰)

علامہ شبلی کا یہ بھی خیال ہے کہ امام ابوحنیفہ کی جو تصویر زندگی سادہ اور بشریت کے قریب ہے، وہی ان کی صحیح تصویر ہے۔قاضی ابو یوسف نے ان کی جو تصویر خلیفہ ہارون الرشید کے سامنے کھینچی تھی اور جس پر خلیفہ نے کہا تھا کہ صالحین کے یہی اوصاف ہوتے ہیں، وہی امام صاحب کی صحیح تصویر زندگی ہے۔علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''ایک حکیم نے نہایت سچ کہا ہے کہ کسی نامور یا مقتدیٰ کے حالات لکھو تو اس کے وہ فضائل بھی ضرور دکھاؤ جس میں انسانی فطرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس سے لوگوں کو اچھے کاموں میں ان کی تقلید کی خواہش پیدا ہوگی۔بخلاف اس کے اگر بالکل فرشتہ بنا کر پیش کرو گے تو لوگ شاید ان کی پرستش کرنے پر آمادہ ہوجائیں، لیکن ان کی ریس کرنے کا خیال ہرگز پیدا نہ ہوگا۔وہ سمجھیں گے کہ یہ شخص انسانی دائرہ سے باہر تھا، ہم انسان ہوکر کیوں کر ان کی تقلید کرسکتے ہیں۔''(۱۱)

علامہ شبلی نے سوانح نگار کا یہ فریضہ بتایا ہے کہ وہ صاحب سوانح کے محاسن ومعائب

دونوں کو دکھلائے۔ چنانچہ خود انھوں نے سیرۃ النعمان میں امام ابوحنیفہ کے محاسن کے ساتھ ان کی بشری کمزوریوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''امام صاحب کے مناظرات میں کہیں کہیں ہم اس ادعا اور جوش مقابلہ کا اثر پاتے ہیں جو بظاہر ان کی تواضع اور بےنفسی کے خلاف ہے، لیکن یہ انسانی جذبات ہیں جن سے کوئی بری نہیں ہوسکتا۔'' (۱۲)

امام صاحب کے فقہی اجتہادات ان کے طرز استدلال اور اس سلسلہ میں ان کی عظمت وبلندی بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> ''اب ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم امام ابوحنیفہ کی نسبت یہ عام دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے تمام مسائل صحیح اور یقینی ہیں۔ امام ابوحنیفہ مجتہد تھے، پیغمبر نہ تھے۔ اس لئے ان کے مسائل میں غلطی کا ہونا ممکن ہے۔ نہ صرف امکان بلکہ ہم وقوع کا دعویٰ کرسکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ خود ان کے شاگردوں نے بہت سے مسائل میں ان کی مخالفت کی۔ مدت رضاعت، قضائے قاضی کا ظاہراً و باطناً نافذ ہونا، قتل بالمثل، نکاح محرمات میں حد کا نہ لازم آنا، ان تمام مسائل میں ہمارے نزدیک امام ابوحنیفہ کے مذہب کی کوئی صحیح تاویل نہیں ہوسکتی۔'' (۱۳)

اعتراضات

علامہ شبلی کی اس محتاط اور دیانت دارانہ تاریخی سوانح عمری کے متعلق اختر وقار عظیم کا یہ تبصرہ افسوس ناک ہے کہ ''سیرۃ النعمان فن تاریخ نویسی کے لحاظ سے خاصی کھٹکتی ہے۔ شبلی نے اپنی عادت کے خلاف تصویر کا صرف ایک رخ دکھایا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ تصنیف ادھوری سی لگتی ہے۔'' (۱۴) یہاں یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ علامہ شبلی نے تاریخ وسوانح نگاری کے جو اصول مقرر کئے ہیں سیرۃ النعمان کے صفحہ صفحہ پر ان کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے درست لکھا ہے کہ:

''چندوہ بنیادی نظریات جو شبلی کی تقریباً ہر کتاب میں پائے جاتے ہیں، اس کتاب میں بھی کارفرما ہیں۔ مثلاً موجودہ مغربی تمدن اور قوانین سے مقابلہ، پرانی کتابوں پر جرح، مختلف واقعات میں اثرات کا سراغ لگانا، واقعات کے سلسلہ ارتقاء کی دریافت، بحث کا مورخانہ انداز وغیرہ۔'' (۱۵)

الغرض یہ کتاب اپنے موضوع پر سوانحی معلومات کے ساتھ اسلوب نگارش، تحقیق وتنقید، ترتیب وتہذیب اور اصولی لحاظ سے ایک بہترین سوانح عمری ہے۔ امام ابوحنیفہ کی زندگی اور ان کے کارناموں پر اردو میں اس سے عمدہ شاید ہی کوئی اور کتاب لکھی گئی ہو۔ جس کا اعتراف عام طور پر ہوا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے بالغ نظر نقاد نے لکھا ہے کہ:

''سیرۃ النعمان اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ اس میں شبلی نے محبت و عقیدت کے باوجود امام ابوحنیفہؒ کی صحیح تصویر پیش کی ہے۔ حضرت امام کی لائف کی جزئیات فراہم کرنے میں انھوں نے نہ صرف یہ کہ محنت اور جانفشانی سے کام لیا ہے، بلکہ ان کی زینت میں بڑی کاریگری اور صناعی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ یہ بقول ان کے ان کی '' محنتوں کا تماشہ گاہ ہی نہیں بلکہ ان کے شعور فن کا بھی عمدہ مظاہرہ ہے۔'' (۱۶)

''مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی'' نے اپنی کتاب ''حسن البیان فی مافی سیرۃ النعمان'' میں نقد روایات کے سلسلے میں تنقید کی ہے اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ انھوں نے امام بخاری کی بعض مرویات کے سلسلے میں جو موقف اختیار کیا ہے وہ صحیح نہیں۔ (۱۷) صاحب سیرۃ البخاری مولانا عبدالسلام مبارک پوریؒ نے بھی تقریباً وہی اعتراضات وارد کیے ہیں، جو مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی نے کیے تھے۔ (۱۸) راقم ان کے مطالعے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ علامہ شبلی روایت ودرایت کا اس قدر گہرا علم رکھتے تھے کہ معترضین کی نگاہ وہاں تک نہیں پہونچی۔ دراصل علامہ شبلی حدیث اور علوم حدیث پر مجتہدانہ نگاہ رکھتے تھے۔ جہاں انھیں کسی روایت میں کوئی سقم نظر آیا اس پر انھوں نے تنقید کردی۔ اس میں ان سے بعض سہو بھی ہوئے، تاہم مجموعی طور سے

مولانا عبدلعزیز رحیم آبادی وغیرہ کی تنقیدیں ان کے غلو کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔اس سلسلے میں مولانا حالی کی رائے زیادہ مناسب ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں جو استدلال نقل وروایت سے متعلق کیا گیا ہے گو وہ مخالف پر حجت نہ ہو سکے لیکن موافقین کی تسلی کے لیے کافی ووافی ہے اور ایک ایسے سوال پر جس میں ہزار برس سے اختلافات چلے آئے ہیں، ایسا استدلال جس کا مدار محض نقل وروایت پر ہو اس سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔رہا وہ استدلال جس میں قابل ادب مصنف نے اپنی رائے اور قیاس سے کام لیا ہے، اس کی نسبت کم سے کم یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ ایسے طریقۂ استدلال سے ہمارے لٹریچر میں فلسفہ ومذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔''(۱۹)

بحیثیت مجموعی امام اعظم کی اس سے عمدہ سوانح عمری اوران کے فقہی کارناموں کا جائزہ اب تک پیش نہیں کیا گیا۔اعتراضات اپنی جگہ، حقیقت یہ ہے کہ ۱۲۱برس گذر جانے کے باوجود امام اعظم کا اس سے عمدہ مرقع کم از کم اردو میں اب تک نہیں تیار ہوا۔

حوالے

(۱) سیرۃ النعمان دیباچہ ص ۷۔۸

(۲) حیات شبلی ص ۶۹

(۳) دیباچہ سیرۃ النعمان ص ۳-۴۔طبع جدید

(۴) مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۱۴۳

(۵) شبلی معاصرین کی نظر میں ص ۳۱۹-۳۲۰۔

(۶) ریویو سیرۃ النعمان قزلباش ص ۳۔۷و۳۲۔۳۷۔اودھ پریس لکھنو ۱۸۹۳ء

(۷) سیرۃ النعمان ص ۲۰۴

(۸) اردو میں فن سوانح نگاری ص ۱۲۴

(۹) سیرۃ النعمان حصہ اول، ص ۴۸

(۱۰) ایضاً ص۵۹

(۱۱) ایضاً ص۶۵

(۱۲) ایضا

(۱۳) ایضاً ص۱۸۰

(۱۴) شبلی بحیثیت مورخ ص ۹۸

(۱۵) سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص۱۴۴

(۱۶) ایضاً

(۱۷) مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی۔ حسن البیان فی مافی سیرۃ النعمان۔ مطبع فاروقی دہلی۔ ۱۳۱۱ء

(۱۸) مولانا عبدالسلام مبارک پوری۔ سیرۃ البخاری۔ مبارک پور اعظم گڑھ۔ ۱۳۲۹ھ

(۱۹) کلیات نثر حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ج۲ ص۲۱۴ پانی پت

الجزیہ

مغربی مورخین نے اسلام اور مسلمان حکمرانوں پر جو الزامات عائد کئے، ان میں سب سے زیادہ ناروا الزام جزیہ سے متعلق تھا۔ جزیہ ایک خراج ہے جو اسلامی حکومت وسلطنت میں غیر مسلم رعایا سے ان کی حفاظت کے عوض لیا جاتا ہے۔ یورپ والوں نے جزیہ کو ایک ظالمانہ اور توہین آمیز ٹیکس قرار دیا اور تشہیر کی کہ جزیہ کا موجد اسلام ہے، جسے مسلمان حکمران اپنی غیر مسلم رعایا سے جبراً وصول کرتے تھے اور یہ غیر قوموں کو مسلمان بنانے کا ایک قوی حربہ تھا۔

اسلام دشمن مورخین نے جزیہ پر اس قدر توجہ اس لئے دی کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے برگشتہ کیا جائے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> ''غیر مذہب والوں نے ہمیشہ اس لفظ کو ناگواری سے سنا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام اس لفظ کا موجد ہے۔ اسلام ہی نے یہ اصول پیدا کیا، جس سے اس کا مقصد مسلمانوں اور غیر مذہب والوں میں نہایت متعصّبانہ اور نامناسب تفرقہ قائم کرنا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ جزیہ ایک ایسا جبر تھا جس سے بچنے کے لئے اسلام قبول کر لینا بھی گوارا کیا جاتا تھا اور اس وجہ سے وہ جبراً مسلمان کرنے کا ایک قوی ذریعہ تھا، لیکن یہ تمام غلط خیالات انہیں غلط فہمیوں سے پیدا ہوئے ہیں جو غیر قوموں کو اسلام کی نسبت سے ہیں۔''(۱)

علامہ شبلی نے اس بے سروپا الزام کے ردوابطال میں یہ قیمتی رسالہ ۱۸۸۹ء میں سپرد قلم کیا اور تین باتوں کا جائزہ اس طرح لیا کہ اس کے ضمن میں سارے الزامات کی تردید ہو جاتی ہے۔

۱- جزیہ اصل میں کس زبان کا لفظ ہے اور کن معنوں میں مستعمل ہے۔

۲- ایران اور عرب میں جزیہ کی بنیاد کب قائم ہوئی۔

۳- اسلام نے اس کو کس مقصد سے اختیار کیا۔

علامہ شبلی نے ان سوالات کا تحقیقی اور تاریخی جائزہ لینے کے بعد ثابت کیا ہے کہ جزیہ فارسی لفظ گزیت کا معرب ہے، جس کے معنی خراج کے ہیں۔(۲) اسلام سے پہلے عرب اور ایران میں جزیہ کے اصول وضوابط طے ہو چکے تھے۔ اس طرح اسلام اس کا موجد نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے نوشیرواں اس کا موجد تھا۔ اس نے یہ خراج اس لئے مقرر کیا تھا کہ فوجی اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر ملک اور اس کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں، یہ خراج ان کی محنتوں کا معاوضہ ہوگا۔(۳)

مسلمانوں نے جب غیر مسلموں کے علاقے فتح کئے تو انھوں نے نوشیرواں کے اس خراج کو معمولی تبدیلی کے ساتھ باقی رکھا۔ کیوں کہ اسلامی حکومت میں ہر مسلمان فوجی خدمت کے لئے مجبور کیا جاتا ہے، لیکن غیر مسلم اس سے مستثنیٰ ہیں۔ چونکہ ان کی حفاظت کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے، اس لئے ان سے ان کی حفاظت کا معاوضہ جزیہ کے نام سے لیا جاتا تھا۔ گویا یہ ان کے تحفظ وبقا کا معاوضہ تھا۔(۴) علامہ شبلی نے تاریخی حوالوں سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اگر کبھی غیر مسلم رعایا نے فوجی خدمت انجام دی تو ان سے جزیہ نہیں لیا گیا۔ یہاں تک کہ اگر کسی غیر مسلم نے کسی سال فوجی خدمت کی تو اس سال کا جزیہ معاف کر دیا گیا۔(۵)

علامہ نے جزیہ کی مقدار بھی بتائی ہے اور لکھا ہے کہ جزیہ کی رقم زیادہ سے زیادہ بیس روپئے سالانہ تھی۔ کسی کے پاس لاکھوں روپئے ہوں تو بھی اس سے زیادہ نہیں دینا پڑتا تھا۔ جزیہ کی عام شرح چھ روپئے سالانہ تھی۔ بیس برس سے کم اور پچاس سے زیادہ عمر والوں کا جزیہ معاف تھا۔ اسی طرح عورتوں، مفلوجوں، معطل العضو، نابینا اور مجنوں پر کوئی خراج نہیں تھا۔ مفلسوں یعنی جس کے پاس ۱۰۰ درہم سے کم ہوں ان سے عموماً جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔(۶)

علامہ شبلی نے تاریخ اسلام کے چند واقعات سے استدلال کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ جزیہ کا معاوضہ حفاظت ہونا ایک امر مسلم ہے۔ انہوں نے جزیہ کے مصارف کی بھی تفصیل بیان کی ہے اور اس سے پیدا ہونے والے ایک اعتراض کی بھی حقیقت واضح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جزیہ کے مصارف یہ تھے: لشکر کی آراستگی، سرحد کی حفاظت، قلعوں کی تعمیر،

ان سے بچا تو سڑکوں اور پلوں کی تیاری، سررشتۂ تعلیم۔ بے شبہ اس طرح اس خاص رقم سے مسلمانوں کو بھی فائدہ پہونچتا تھا اور پہونچنا چاہئے تھا۔ مسلمان لڑائیوں میں شریک ہوتے، جانیں لڑاتے، ملک کو تمام خطروں سے بچاتے۔ پس جس طرح ان کے جسم و جان سے ذمی رعایا مستفید ہوتی تھی اگر ذمیوں کے مال سے مسلمانوں کو بھی فائدہ پہنچتا تھا تو کیا بے جا تھا۔ اس کے علاوہ صدقہ کی رقم جو خاص مسلمانوں سے وصول کی جاتی تھی، اس میں ذمی رعایا برابر کی شریک تھی۔'' (۷)

ان تمام ثبوت وشہادت اور حقائق سے واضح ہوجاتا ہے کہ جزیہ کوئی ظالمانہ اور تحقیر آمیز ٹیکس نہیں تھا۔ اس کے بعد علامہ شبلی مورخین یورپ سے سوال کرتے ہیں:

''ہم پوچھتے ہیں کہ ایسا ہلکا ٹیکس جس کی تعداد اس قدر قلیل تھی، جس کے ادا کرنے سے فوجی پرخطر خدمات سے نجات مل جاتی تھی، جس کی بنیاد نوشیرواں عادل نے ڈالی تھی، کیا ایسی ناگوار چیز ہوسکتی ہے جیسی کہ اہل یورپ نے خیال کی ہے؟ کیا دنیا میں ایک شخص نے بھی اس سے بچنے کے لئے اپنا مذہب چھوڑا ہوگا؟ کیا کسی نے اپنے مذہب کو ایسے ہلکے ٹیکس سے بھی کم قیمت سمجھا ہوگا؟ اگر کسی نے ایسا سمجھا تو ہم کو اس کے مذہب کے ضائع ہونے کا رنج بھی نہ کرنا چاہئے۔ جو لوگ جزیہ ادا کرتے ہیں ان کو اسلام نے جس قدر حقوق دئے ہیں کون حکومت اس سے زیادہ دے سکتی ہے؟'' (۸)

علامہ شبلی کی اس اچھوتی تحقیق نے ثابت کردیا کہ یورپ کے اعتراضات لغو اور بے بنیاد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تحقیق بے حد پسند کی گئی۔ اسے ۱۸۹۱ء میں مطبع مجتبائی دہلی نے رسالہ کی شکل میں شائع کیا۔ افادیت کے پیش نظر خود علامہ شبلی نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ کتاب الجزیہ کے نام سے مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔ عربی ترجمہ ۱۸ رصفحات پر مشتمل ہے۔ زبان آسان اور عام فہم ہے۔ یہاں بطور نمونہ ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔ یورپ کی غلط فہمی کا سبب بیان کرتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''والحق انهم غير ملومين في ذالك فان من احاط علما بنصوص المتاخرين من الفقهاء يستبين له في اول الامر ان وضع امثال هٰذه الرسوم اقصى ما يقصد به اذلال قوم و ادغام انفها مع ان الشريعة الاسلاميه ابعد محلا و ارفع شانا من ان يمسها عار او يلحقها عيب و ابى اللّٰه الا برأها عن كل جور و حيف .'' (۹)	سچ یہ ہے کہ اہل یورپ کا یہ انداز کچھ بے جا بھی نہیں۔ جن لوگوں نے فقہائے متاخرین کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے ان سے یہ پوشیدہ نہیں کہ ان کے اسلوب بیان سے اولاً یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ٹیکس غیر قوموں کی تحقیر وتذلیل ہی کہ لئے بنایا گیا تھا۔ حالانکہ شریعت اسلامیہ کا ہرگز یہ مقصد نہیں۔ بلکہ وہ ہرقسم کے عار و عیوب سے پاک ہے۔ اللہ تعالی نے شریعت کو ہرقسم کے ظلم وعدوان سے محفوظ کیا ہے۔

علامہ شبلی کی اس تحقیق کو سرسید احمد خاںؒ نے بے حد پسند کیا اور لکھا کہ:

''اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہمارے کالج کے پروفیسر مولوی محمد شبلی نعمانی نے اپنی تصانیف سے ملک کو بہت فائدہ پہونچایا ہے۔ المامون، سیرۃ النعمان، کتب خانہ اسکندریہ اور الجزیہ بے مثل اور بے نظیر کتابیں ہیں۔ اگر وہ نعوذ باللہ اپنے رسالہ ''الجزیہ'' کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ کہیں کہ فأتو بسورة من مثلہ تو کچھ تعجب نہ ہوگا۔ ایسا بے جا اور غلط الزام مسلمانوں پر تھا جس کا آج تک کسی نے ایسے عمدگی سے حل نہیں کیا تھا۔''(۱۰)

سرسید احمد خاں نے افادیت کے پیش نظر اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرایا۔ جو (The Jizia or Capitalion Tax) کے نام سے ۱۸۸۴ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس سے شائع ہوا۔ یہ ترجمہ دستیاب نہ ہوسکا اور نہ یہ معلوم ہوسکا کہ یہ کس کے قلم سے تھا۔

اس دور میں عربی وانگریزی ترجمے کی وجہ سے علامہ شبلی کی اس تحقیق کی آواز مشرق و مغرب دونوں میں گونجی اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی یہاں تک کہ مصر کے مشہور اخباروں، رسالوں اور تصنیفوں میں اس کے خلاصے اور اقتباسات چھپے۔(۱۱)

ایک عرصہ بعد اس کا ایک اور انگریزی ترجمہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے کیا،

جو''اسلامک کلچر'' حیدرآباد میں شائع ہوا۔مولوی شمس الدین نامی نے جو دھولیا[خاندیش] کے رہنے والے تھے۔الجزیہ کو مراٹھی زبان میں منتقل کیا۔جسے مراٹھی رسالہ''شکشک'' نے شائع کیا۔

[ماہنامہ معارف جولائی ۱۹۲۴ء ص۴]

علامہ شبلی کے بعد جزیہ کے موضوع پر علی العموم ان کے موقف کو درست قرار دیا گیا۔ البتہ بعض اہل قلم اسی لکیر کو پیٹتے رہے جو علامہ شبلی سے پہلے یورپ کی محبوب نظر تھی۔ چنانچہ ایک عرصہ بعد دبستان شبلی ہی کے ایک ممتاز و مصنف و محقق مولانا سعید انصاری نے بڑی محققانہ کتاب لکھی جس میں جزیہ کے تقریبا تمام پہلوؤں کا احاطہ ہوگیا ہے۔ اسے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے ۱۹۹۵ء میں شائع کیا۔اس کے بعد بھی ملک میں رہ رہ کر جزیہ کے حوالے سے مسلمان حکمرانوں کے ظلم و جبر کی داستان سنائی جاتی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ علامہ شبلی کے رسالہ الجزیہ کا ہندی ترجمہ شایع کیا جائے،شاید اس سے تعصب کی آندھی کچھ ہلکی ہو جائے۔

حوالے

(۱) مقالات شبلی۔جلد اول ص ۲۲۱۔دارالمصنّفین ایڈیشن طبع جدید ۲۰۱۰ء

(۲) ایضاً۔جلد ا ص ۲۲۳

(۳) ایضاً۔جلد ا ص ۲۲۴

(۴) ایضاً۔جلد ا ص ۲۲۵

(۵) ایضاً۔جلد ا ص ۲۲۹

(۶) ایضاً۔ج ا ص ۲۲۱-۲۳۱

(۷) ایضاً۔جلد ا ص ۲۳۰

(۸) ایضاً جلد ا ص ۲۳۱

(۹) کتاب الجزیہ ص ۳۔مطبع مفید عام آگرہ ۱۳۱۲ء/۱۸۹۸ء

(۱۰) مقالات سرسید جلد ۷ ص ۳۲۵۔مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی۔ترقی ادب لاہور ۱۹۹۱ء

(۱۱) حیات شبلی ص ۲۲۷

اکرم ندوی کے ترجمہ کا سرورق

سفرنامہ روم ومصر وشام

۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے روم ومصر وشام کا سفر کیا اوران ممالک کے خاص خاص شہروں کواپنی آنکھوں سے دیکھا۔ان کے علمی وتعلیمی نظام اورسیاسی واقتصادی حالات کا جائزہ لیا۔ کتب خانوں کی سیر کی۔نادر کتابوں کا مطالعہ کیا۔اہل علم اورارباب کمال سے ملے۔ترکی زبان سے آشنائی حاصل کی اور واپس آکر اپنے مطالعات ومشاہدات کوسفرنامہ کے قالب میں پیش کیا۔یہ سفرنامہ جولائی ۱۸۹۴ء میں پہلی بار مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا۔اس کے اب تک جو ایڈیشن شائع ہوئے ہیں اورجس کی تفصیل معلوم ہوسکی ہے وہ یہ ہے:

[۱]	قومی پریس دہلی،طبع اول	۱۸۹۲ء	۲۱۶ص
[۲]	▪ مفید عام،آگرہ	۱۸۹۴ء	۲۳۵ص
[۳]	▪ قومی پریس،دہلی	۱۹۰۱ء	۲۴۰ص
[۴]	▪ مطبع تحفہ جنت،دہلی	۱۹۱۶ء	۱۶۰ص
[۵]	▪ مطبع رحمانی،دہلی	۱۹۰۷ء	۱۶۰ص،طبع سوم
[۶]	▪ مطبع تحفہ جنت،دہلی	۱۹۲۳ء	۱۷۶ص
[۷]	▪ مہتاب پریس،دہلی	۱۹۲۹ء	۳۶۰ص
[۸]	▪ مطبع مجتبائی جدید پریس،دہلی	۱۹۳۰ء	
[۹]	▪ دارالمصنّفین،اعظم گڑھ	۱۹۴۰ء	۲۴۲ص
[۱۰]	▪ مقبول اکیڈمی،لاہور	۱۹۸۸ء	مرتبہ ڈاکٹر محمد ریاض
[۱۱]	▪ بساط ادب،لاہور	۱۹۹۱ء	

[۱۲]	▪ بساط ادب، لاہور	۱۹۹۲ء		
[۱۳]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۹۹ء	۲۲۸ص	
[۱۴]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۱۰ء	۲۲۵ص	
[۱۵]	▪ محمڈن پریس، علی گڑھ	غیر مورخہ	۲۳۴ص	
[۱۶]	▪ مطبع سلطانی، دہلی	غیر مورخہ	۱۶۱ص	

ترجمہ وخلاصہ

عرب اسکالر ڈاکٹر جلال السعید الحفناوی نے علامہ شبلی کی شخصیت اور کارناموں پر مقالہ لکھ کر پی ایچ، ڈی کی سند لی ہے۔انہوں نے اہمیت کے پیش نظر سفر نامہ روم ومصروشام کا ''رحالةهندی فی بلادالشرق العربی'' کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا۔ جسے ۲۰۰۲ء میں المجلس الاعلیٰ للثقافة قاہرہ نے شایع کیا۔اس کا دوسرا ایڈیشن قاہرہ ہی سے ۲۰۱۱ء میں المرکز القومی نے شایع کیا ہے۔

اس کا ایک اور عربی خلاصہ رحلة شبلی نعمانی الی القسطنطنیه وبیروت وبیت المقدس والقاهره کے نام سے دکتور محمد اکرم الندوی نے کیا ہے۔ جو ۲۰۱۱ء میں دارالقلم دمشق سے شایع ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو میں سیکڑوں سفر نامے لکھے گئے۔ (۱) مگر جو شہرت ومقبولیت علامہ شبلی کے اس سفر نامے کے نصیب میں آئی، وہ شاید ہی کسی اور کو ملی ہو۔

سفر کے اسباب ومقاصد

۱۸۸۷ء میں علامہ شبلی نے نامور فرماں روایان اسلام کے حالات اور کارناموں کو قلم بند کرنے کا منصوبہ بنایا تو اس کی تکمیل کے لئے انھیں ہندوستان کے کتب خانے ناکافی نظر آئے۔ اس کے لئے اسلامی ممالک، خاص طور سے ترکی اور شام ومصر کے کتب خانوں سے استفادے کی خواہش پیدا ہوئی۔خود انھوں نے لکھا ہے کہ:

''جس زمانہ میں مجھ کو ہیروز آف اسلام کا خیال پیدا ہوا، اسی وقت یہ خیال بھی

آیا کہ ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے، وہ اس مقصد کے لئے
کسی طرح کافی نہیں ہوسکتا۔ یہی خیال تھا جس نے اول اول اس سفر کی تحریک
دل میں پیدا کی، کیوں کہ یہ یقین تھا کہ مصر وروم میں اسلامی تصنیفات کا جو بقیہ
رہ گیا ہے، ان سے ایک ایسا سلسلہ تالیف ضرور تیار ہوسکتا ہے۔'' (۲)

علامہ شبلی کو اسلامی ممالک اور ان کے کتب خانوں سے ابتدا ہی سے بڑی دلچسپی تھی۔ محض انیس برس کی عمر میں انھوں نے حرمین شریفین کی زیارت کی اور فریضہ حج ادا کیا۔ اس مقدس سفر میں خاص طور سے انھوں نے مدینہ منورہ کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ (۳)

ترکی سے انھیں بڑا گہرا اور جذباتی تعلق تھا۔ ۱۸۷۷ء میں روم وروس میں جنگ چھڑی، جس نے عالم اسلام میں ایک آگ سی لگادی تھی۔ علامہ شبلی اس جنگ سے بے چین ہوئے اور ترکوں کی ہمدردی میں ان کی امداد کے لئے اعظم گڑھ میں چندہ کیا اور اسے ترکی سفیر حسین حبیب آفندی کے ذریعہ قسطنطنیہ بھجوایا۔ (۴) قسطنطنیہ وغیرہ سے انھیں اس قدر دلچسپی تھی کہ جب کبھی ان ملکوں کا کوئی سیاح مل جاتا تو اس سے گھنٹوں وہاں کے حالات دریافت کرتے رہتے تھے۔ (۵)

مذکورہ اسباب ومقاصد کے پیش نظر وہ اسلامی ممالک کی سیر کرنا چاہتے تھے۔ ۱۸۹۱ء میں انھوں نے ان ممالک کی سیاحت کا قطعی ارادہ کرلیا تھا۔ (۶) مگر بہ وجوہ سفر نہ کرسکے، البتہ ۱۸۹۲ء میں مسٹر آرنلڈ کا ساتھ مل گیا جو ان کے دوست بھی تھے اور استاد بھی:

آرنلڈ آں کہ رفیق است وہم استاد مرا

تو انھوں نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور فوری طور پر رخت سفر باندھ کر یکم مئی ۱۸۹۲ء کو پانی والے جہاز سے روانہ ہوگئے۔ ۳؍ ماہ قسطنطنیہ میں اور بقیہ وقت شام ومصر میں گذارا۔ ٦ ماہ بعد واپس آئے تو ترکوں اور عربوں کی فیاضی اور فراخ دلی کے ترانے ان کی زبان پر تھے۔ الفاروق اور دوسری تصنیفات کے لئے جو معلومات درکار تھیں وہ بھی ساتھ لائے۔ تمغہ مجیدیہ کا افتخار بھی ساتھ تھا۔ لیکن علامہ شبلی وہاں سے جو سب سے قیمتی سرمایہ ساتھ لائے وہ ان ممالک کے نظام تعلیم وتربیت کا مفصل جائزہ تھا۔ جس سے انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے نظام تعلیم کو

بہتر بنانے کا کام لیا۔

ہندوستان میں اس وقت انگریزوں کی حکمرانی تھی شبلی کو جس قدر ترکوں سے محبت تھی، اس سے کہیں زیادہ انگریزوں کو نفرت۔ اس لئے سفر نامہ لکھنے میں لیت ولعل رہا۔ علی گڑھ کی فضا اوران کے مقام ومنصب کے لحاظ سے بھی سفر نامہ لکھنا مناسب نہ تھا۔ مگر بالآخر احباب کے تقاضوں سے مجبور ہوکر انھوں نے یہ سفر نامہ قلم بند کیا۔(۷) یہی وجہ ہے کہ اس میں انھوں نے ترکوں کے تمدنی اور ملکی حالات سے بحث نہیں کی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے اگرچہ اس کتاب میں ترکوں کی تمدنی یا ملکی حالت سے بحث نہیں کی ہے اور نہ اس قسم کی بحث میرے منصب وحالت کے لحاظ سے مناسب تھی، تاہم اس کتاب کو پڑھ کر ناظرین کے دل میں ترکوں کی تہذیب وشائستگی کا جو درجہ قائم ہوگا۔ وہ اس سے مختلف ہوگا جو یورپ کے عام لٹریچر سے ظاہر ہوتا ہے۔''(۸)

مشمولات

جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے یہ سفر نامہ تین ملکوں کے سفر کی روداد پر مشتمل ہے۔ پہلے ترکی پھر شام اور آخر میں مصر کا ذکر ہے۔ اس کا آغاز ایک تمہید سے ہوا ہے۔ جس میں سفر کے آغاز اوراغراض ومقاصد اور مندرجات کی تفصیل ہے۔

پہلا ملک: ترکی

تمہید کے بعد قسطنطنیہ کی قدیم وجدید تاریخ مجملاً بیان کی گئی ہے، جس میں ترکوں کی طرز معاشرت، تہذیب وتمدن، قسطنطنیہ کی آب وہوا، وسعت وترقی، طرز تعمیر، مساجد ومدارس، عدالت، شاہی ایوانات، تعلیمی مراکز اور اسکول وکالج کا قدرے تفصیل سے ذکر ہے۔ اس وقت کے قسطنطنیہ کے تمدنی جلوے ملاحظہ ہوں۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> ''شہر کی وسعت اور تمدن کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ خاص استنبول میں پانچ سو جامع مسجدیں، ۱۷۱ حمام، ۳۲۴ سرائیں، ۱۶۴ مدارس قدیم، ۵۰۰ مدارس

جدید،۱۲ کالج،۴۵ کتب خانے، ۳۰۵ خانقاہیں، ۴۸ چھاپہ خانے ہیں، کاروبار اور کثرت آمد ورفت کی یہ کیفیت ہے کہ متعدد ٹراموگاڑیاں، بارہ دخانی جہاز، زمین کے اندر ریل، معمولی ریلیں (جو ہر آدھ گھنٹے پر چھوٹتی ہیں) ہر وقت چلتی رہتی ہیں اور باوجود اس کے سڑکوں پر پاپیادہ چلنے والوں کا اس قدر ہجوم رہتا ہے کہ ہر وقت میلہ سا معلوم ہوتا ہے۔''(۹)

اس کے بعد علامہ شبلی نے ترکی مدارس ومکاتیب، ان کی علمی حالت، تصنیفات وتالیفات، مطابع، کتب خانے، ترکی زبان وادب اور دوسری علمی سرگرمیوں کی تفصیل بیان کی ہے۔ مساجد کے ساتھ خانقاہوں حتیٰ کہ سیرگاہوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ رسم سلاملق (جمعہ کا سلطانی جلوس) اور عید کے جشن ومسرت کا آنکھوں دیکھا حال قلم بند کیا ہے۔ ترک خواتین، ان کی وضع قطع اور ان کی تہذیب وشائستگی کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ ایک موقع کی تصویر ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک دفعہ میں عاشر آفندی کے کتب خانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک ترک صاحب بھی تشریف رکھتے تھے، جن سے میری جان پہچان ہوگئی تھی۔ اتفاق سے وہیں ان کی دونو جوان لڑکیاں جن میں سے ایک کی شادی ہو چکی تھی، ان سے ملنے کے لئے آئیں۔ انھوں نے مجھ سے انٹرڈوس کرایا۔ جس احترام اور متانت وشرم سے وہ معصوم خاتونیں میرے سامنے کھڑی تھیں، مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ عورتیں نہیں بلکہ عفت وعصمت کی دیبیاں ہیں۔''(۱۰)

علامہ شبلی نے قسطنطنیہ میں آباد ہندوستانیوں اور بعض ترکی احباب کا بھی ذکر کیا ہے اور خاص طور سے غازی عثمان پاشا شیر پلونہ سے اپنی ملاقات اور تمغہ مجیدیہ سے سرفراز ہونے کی دلچسپ روداد بھی قلم بند کی ہے، جس سے ترکوں کی عظمت دل ودماغ میں نقش ہوجاتی ہے۔ البتہ عام مسلمانوں کی جو تصویر انھوں نے کھینچی ہے وہ ہندوستان کے مسلمانوں سے بہتر نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''سلطنت کی حیثیت سے اگر قطع نظر کی جائے تو مسلمانوں کی حالت وہاں بھی کچھ زیادہ مسرت اور اطمینان کے قابل نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ بہت سی باتوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے قریب قریب ہے۔ صنعت سے ان کو

کچھ واسطہ نہیں، تجارت میں ان کا بہت کم حصہ ہے، معمولی دوکاندار تک یہودی یا عیسائی ہیں۔ پرانی تعلیم نہایت ابتر ہے اور ہوتی جاتی ہے۔ نئی تعلیم سے بے خبر ہیں۔ نئے مذاق کے لوگ جس قدر کہتے ہیں کرتے نہیں، ہمت، غیرت، جوش، عزم، استقلال کے بجائے کل قوم پر من حیث الاغلب افسردگی سی چھائی ہوئی ہے۔ جو شخص جس حال میں ہے، اسی پر قانع ہے، موجودہ حالت تو یہ ہے:

ولعل اللّٰہ یحدث بعد ذالک امرا۔" (۱۱)

دوسرا ملک: شام

ترکی کے بعد شام کا ذکر ہے۔ بیروت علامہ شبلی کا پہلا پڑاؤ تھا۔ اس لئے سب سے پہلے بیروت کا ذکر ہے۔ اس کی موجودہ حالت اور علمی و تعلیمی نظام کی شرح وبسط کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے۔ بیروت یونیورسٹی، اس کے شعبے، اساتذہ، طلبہ، کتب خانے، مطابع وغیرہ غرض ایک ایک پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے، جس سے مسلمانان بیروت کی حالت وحیثیت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ علامہ شبلی نے اپنے بعض بیروتی احباب کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد بیت المقدس کا ذکر مبارک ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مساجد اور وہاں کے اہل علم ودانش اور ارباب کمال کا بھی تذکرہ ہے۔

تیسرا ملک: مصر

شام کے بعد مصر کا ذکر ہے۔ قاہرہ کے اجمالی حالات کے ساتھ مصر کی تعلیمی حالت، دینی مدارس ومکاتب اور خاص طور سے جامع ازہر کا مفصل تذکرہ ہے، جس میں اساتذہ، طلبہ، ان کا رہن سہن، نصاب تعلیم اور اس کے مصارف غرض اس کی ایک ایک تفصیل سپرد قلم کی گئی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قوم کی بدمذاقی پر ماتم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مصری کتب خانوں بالخصوص خدیو کا ذکر ہے۔ قدیم یادگاروں، تفریح گاہوں، مطابع اور اخبارات ورسائل، کلب، انجمن، اہل علم، مصنفین غرض ان تمام امور کا تفصیلی احاطہ کیا گیا ہے جس سے مصر کے علمی وتعلیمی حالات پورے طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ آخر میں جدید عربی زبان پر ایک نوٹ اور فرہنگ ہے جس میں ان جدید الفاظ کی

نشاندہی کی گئی ہے جو اس وقت مستعمل تھے۔ مشمولات کی اس تفصیل سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ سفرنامہ کس قدر معلومات افزا ہے۔

چند اہم مباحث

یوں تو یہ پورا سفرنامہ دلچسپ اور مفید معلومات کا مجموعہ ہے لیکن چند ایسے اہم مباحث ہیں جن کی کسی قدر تفصیل ضروری ہے۔ مثلاً

کتب خانے

علامہ شبلی کی علمی جستجو، تلاش و تفحص اور مطالعہ و کتب بینی کا ذوق مثالی ہے۔ وہ جہاں رہے اور جہاں گئے کتب خانوں سے استفادہ ضرور کرتے۔ روم و مصر و شام کے سفر کا تو بنیادی مقصد ہی مطالعہ و کتب بینی تھا۔ چنانچہ وہ جس شہر سے گذرے وہاں کے کتب خانوں کو ضرور دیکھا۔ ان کے نوادرات سے استفادہ کیا۔ اپنی تصنیفات کے لئے ضروری نوٹ لئے۔ قسطنطنیہ میں کتب خانے دور دور واقع تھے، چنانچہ وہ ان سے استفادے کی غرض سے ہر روز دو تین میل پیدل سفر کرتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے۔ ایک ایک نادر اور قلمی کتابیں دیکھتے۔ کتب خانوں کی تعداد، نوادرات اور دیگر تفصیلات جمع کرتے۔ سفرنامے میں اس کی تمام تفصیلات انھوں نے قلم بند کی ہیں۔ مثلاً کتب خانے اور ان کی تعداد، ان کے اوقاف، ظاہری حالت، نسخوں کی صحت اور عمدگی، خط، زرافشانی، تاریخ و ادب کی نادر کتابیں، یونانی کتابوں کے ترجمے اور ترکوں کی کتب خانوں سے دلچسپی وغیرہ، ان تمام امور کو قلم بند کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ:

> ''حقیقت یہ ہے کہ ترکوں کے علمی کارناموں میں جو چیز سب سے زیادہ قابل فخر ہے وہ یہی کتب خانے ہیں۔ اسلامی دنیا کے جن حصوں میں آج تعلیم و تعلم کا چرچا ہے، وہ ہندوستان، عرب، مصر، شام، بلاد مغرب فارس و ایران ہیں۔ ان میں سے اکثر مقامات کا علمی سرمایہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جو نہیں دیکھا ہے وہ ایسے قوی وسائل سے معلوم ہے کہ دیکھنے کے برابر ہے۔ اس بنا پر کافی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تمام اسلامی دنیا میں قسطنطنیہ عربی تصنیفات کا سب سے بڑا

مرکز ہے۔'' (۱۲)

قدما کی کتابوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''امام غزالی، بوعلی سینا، فخر رازی، فارابی کی وہ کمیاب تصنیفات جن کے نام صرف ابن خلکان وغیرہ کے ذریعہ معلوم ہیں اکثر یہاں موجود ہیں۔'' (۱۳)

اسی طرح بیروت اور مصر کے کتب خانوں کی بھی ایک ایک تفصیل قلم بند کی ہے۔ بیروت کی علمی و تعلیمی سرگرمیوں کو قلم بند کر کے اس بات پر افسوس کیا ہے کہ اس کی تمام تر علمی ترقیاں عیسائیوں کی بدولت ہیں، حتیٰ کہ مسلمانوں نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ بھی عیسائیوں نے لکھوائی ہیں۔ مسلمانوں کی اس بے حسی پر علامہ شبلی نے ماتم کیا ہے۔ (۱۴) غیرت دلائی ہے اور لکھا ہے کہ:

''کس قدر افسوس کی بات ہے کہ یہ شہر اسلامی حکومت کا مرکز اور مسلمانوں اور عیسائیوں میں یہاں حاکم و محکوم کی نسبت ہے۔ تاہم تہذیب و تمدن میں مسلمانوں کو عیسائیوں سے کچھ نسبت نہیں۔'' (۱۵)

نظام تعلیم و تربیت کا جائزہ

اس سفر میں جو دوسری چیز علامہ شبلی کی خاص توجہ کا مرکز رہی وہ ان ممالک کا نظام تعلیم ہے۔ انھوں نے بڑی محنت، دلجمعی اور باریک بینی سے اس کا جائزہ لیا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

''اس دور دراز سفر سے کتب خانوں کی سیر کے علاوہ اگر میرا کچھ اور مقصد ہوسکتا تھا تو یہاں کے طرز تعلیم اور ترقی تعلیم کا اندازہ کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے اس پر بہ نسبت اور تمام باتوں کے زیادہ توجہ کی اور جہاں تک ہوسکا کوشش اور محنت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔'' (۱۶)

بلاشبہ علامہ شبلی نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور مدارس کی ایک ایک بات قلم بند کی۔ ترکی مدارس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ پستی کی اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ اس کے مقابلہ میں ہمارے ہندوستان کی تعلیم غنیمت ہے۔ اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو

برباد کر دیتا تھا وہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری تھی۔'' (۱۷)

قسطنطنیہ اور بیروت کے مدارس ایک طرف، مسلمانوں کے سب سے بڑے قدیم تعلیمی مرکز جامعہ ازہر سے وہ سخت مایوس ہوئے۔اس کی تفصیل انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

''مجھ کو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامع ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا کسی چیز سے نہیں ہوا۔ایک ایسا دارالعلوم جس میں دنیا کے ہر حصہ کے مسلمان جمع ہوں، جس کا سالانہ خرچ دو تین لاکھ سے کم نہ ہو، جس کے طالب علموں کی تعداد بارہ ہزار سے متجاوز ہو، اس کی تعلیم وتربیت سے کیا کچھ امید نہیں ہوسکتی تھی، لیکن افسوس کہ وہ بجائے فائدہ پہنچانے کے لاکھوں مسلمانوں کو برباد کر چکا ہے اور کرنا چاہتا ہے۔تربیت اور معاشرت کا جو طریقہ ہے اور جس کا ذکر کر چکا ہوں اس سے حوصلہ مندی، بلند نظری، جوش، ہمت غرض تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہے۔............ طالب علموں کی دنائت اور پست حوصلگی کا یہ حال ہے کہ بازار میں پیسہ کی ترکاری خریدتے ہیں تو کنجڑے کو قسم دلاتے ہیں کہ براس سیدنا الحسین یعنی تجھ کو امام حسین کے سر کی قسم واجبی قیمت بتانا۔کیا اس قسم کے تربیت یافتہ لوگوں سے امید ہوسکتی ہے کہ وہ اسلام کی عظمت وشان بڑھائیں گے؟ ہمارے ملک میں اس قسم کے جو مدرسے ہیں از ہر ان سے بھی گیا گذرا ہے۔'' (۱۸)

جامعہ ازہر کے نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم کا مفصل جائزہ بھی علامہ نے پیش کیا ہے۔ اس کے طرز تعلیم کو لغو قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں ''اسی لغو طریقہ تعلیم کا اثر ہے کہ ایک مدت سے ازہر نے کوئی قابل ذکر عالم اور مصنف نہیں پیدا کیا۔'' (۱۹)

علامہ شبلی نے قسطنطنیہ سے مصر تک جدید تعلیمی اداروں کو بھی بہ غور دیکھا۔ان کا جائزہ لیا۔ خاص طور سے ترکی کے مکتب حربیہ، مکتب سلطانیہ، مکتبہ ملکیہ، مکتبہ الحقوق وغیرہ کے ایک ایک پہلو، طلبہ کا رہن سہن، طریقہ تعلیم وتدریس، اس کے فوائد وغیرہ کی تمام تفصیلات انھوں نے قلم بند کی

ہیں۔مگر ان کے اپنے نظریہ تعلیم کے مطابق قسطنطنیہ اور بیروت میں کوئی ادارہ نہیں ملا۔سر سید احمد خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''افسوس کہ عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے اور جو قدیم طریقہ تعلیم تھا اس میں یورپ کا ذرا پرتو نہیں۔جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے لیکن دونوں کی حدود جدا رکھی گئی ہیں اور جب تک یہ دونوں ڈانڈے نہ ملیں گے اصل ترقی نہ ہو سکے گی۔یہی کمی تو ہمارے ملک میں ہے جس کا رونا ہے۔''(۲۰)

اور جب انھیں مصر میں اپنے نقطۂ نظر کے مطابق قائم ایک دارالعلوم دیکھنے کو ملا تو ان کی خوشی اور پسندیدگی کا اظہار یوں ہوا:

''مصر اور نہ صرف مصر بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں جو کالج مجھ کو سب سے زیادہ پسند آیا اور جس کو میں نے مسلمانوں کے درد کے لئے کافی سمجھا وہ یہی کالج ہے۔میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے اور میں نہایت مضبوطی سے اس پر قائم ہوں کہ مسلمان مغربی علوم میں گو ترقی کے کسی رتبہ تک پہنچ جائیں لیکن جب تک ان میں مشرقی علوم کا اثر نہ ہو ان کی ترقی مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جا سکتی۔جس مصیبت کا ہندوستان میں رونا ہے وہی قسطنطنیہ بیروت اور مصر میں بھی موجود ہے۔یعنی نئی تعلیم میں قومیت اور مذہبی پابندی کا اثر کم ہے اور پرانی تعلیم اس قابل نہیں کہ دنیا کی موجودہ ضرورتوں کا ساتھ دے سکے۔صرف یہ دارالعلوم ہے جو دونوں ڈانڈوں کو ملانا چاہتا ہے۔''(۲۱)

ہمارے ملک میں قدیم وجدید تعلیم ، مدارس کے نصاب تعلیم اور اس کے مقاصد پر غور وخوض اور بحث وتجزیہ کا سلسلہ ایک عرصے سے قائم ہے۔باوجود اس کے مسلمان پستی اور زبوں حالی کے آخری زینے پر پہنچ گئے ہیں۔ان حالات میں اس سفر نامے کے ان تعلیمی مباحث کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اس لحاظ سے یہ سفر نامہ محض سفر نامہ نہیں بلکہ تعلیم کے موضوع پر ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

مستشرقین کے رویہ کی تردید

مغربی اہل قلم اور خاص طور سے مستشرقین اس وقت ترکی پر طرح طرح کے الزامات عائد کر رہے تھے اور ان کے ہر کام میں عیب نکال رہے تھے، حتی کہ ان کی ترقی کو تنزل بتا رہے تھے۔ علامہ شبلی نے اپنے مشاہدے کی بنیاد پر ان کے اس معاندانہ رویے کی تردید کی ہے اور حقیقت کا یہ آئینہ دکھلایا ہے کہ یہ محض ان کا تعصب اور تنگ دلی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یورپ میں مصنّفین کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس وجہ سے ان میں متعصب، نیک دل، ظاہر بیں، دقیق النظر ہر درجہ اور ہر طبقہ کے لوگ ہیں۔ لیکن ترکوں کے ذکر میں وہ اختلاف مدارج بالکل زائل ہو جاتا ہے اور ہر ساز سے وہی ایک صدا نکلتی ہے۔ مثلاً آج کے سچے سے سچے یورپین مصنّف کی راست بیانی یہ ہے کہ وہ ترکی حکومت کے ذکر میں قرضہ کی گراں باری، صنائع وفنون کا بقدر کافی موجود نہ ہونا، اضلاع میں تعلیم کی عدم وسعت، آلات واسلحہ میں یورپ کی احتیاج، ان تمام امور کو بالکل راست راست لکھتا ہے، لیکن جو اصلاحیں حال میں ہوئی ہیں ان کے ذکر سے اس طرح دامن بچا جاتا ہے کہ گویا اصلاح کا سرے سے وجود نہیں۔ خزانہ کا انتظام، تمام اضلاع میں زراعتی بنکوں کا قائم ہونا اور مدارس رشدیہ کی تعداد کا ۹۶ سے ۴۰۵ تک ترقی کر جانا، بڑے بڑے کالجوں کا جاری ہونا، ریلوے کی وسعت، ادائے قرضہ کے انتظامات، فوجی قوت کی ترقی، ان واقعات کو بھول کر نہیں لکھتا۔''(۲)

یورپ کی یہ اور اس طرح کی دوسری کئی بے اعتدالیوں کا ذکر علامہ شبلی نے کیا ہے۔ جن سے یورپ کا ترکی کے تئیں تعصب پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سفرنامہ یورپ کے اہل قلم کے برعکس ترکی کی سچی تصویر پیش کرتا ہے۔

قومی حمیت وغیرت

علامہ شبلی کے اندر قومی حمیت وغیرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ان کے بیشتر علمی

کارنامے دراصل ان کے اسی احساس بلند کا مظہر ہیں۔اس سفرنامے میں بھی وہ جذبات سے ہر جگہ سرشار نظر آتے ہیں اور تمام باتوں اور واقعات کا اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں وہ شہروں اور آبادیوں کو غور سے دیکھتے ہیں اچھی عمارتیں اور مکانات دیکھ کر اپنے رہنما سے دریافت کرتے ہیں کہ یہ کس کا مکان ہے اور جب وہ یہ بتاتا ہے کہ کسی عیسائی کا مکان ہے تو انھیں رنج ہوتا ہے۔ (۲۳) پورٹ سعید کے قریب وہ ایک آبادی میں گئے، اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جب کوئی بلند اور شاندار عمارت دیکھتا تو اس خیال سے خوش ہوتا کہ الحمدللہ ان ملکوں میں مسلمان خوش حال اور دولت مند ہیں لیکن دریافت کرنے کے بعد معلوم ہوتا کہ کسی یورپین سوداگر کا مکان ہے۔ سارے شہر میں ایک بھی عمدہ دوکان یا بلند عمارت مسلمان کی نہ تھی۔افسوس کہ: ع

بہر زمیں کہ رسیدم آسماں پیداست (۲۴)

اسی طرح جب کوئی شان وشوکت کے ساتھ گزرتا تو وہ دریافت کرتے کہ کون ہے اور معلوم ہوتا کہ عیسائی تو وہ رنجیدہ اور ملول ہوتے۔(۲۵)

علامہ شبلی حمیت وغیرت کے پُتلے تھے۔ وہ مسلمانوں کو فروتر دیکھنے کو کسی قیمت پر تیار نہ تھے یہی وجہ ہے کہ اس سفر میں جب وہ مسلمانوں کو ترقی کی طرف گامزن دیکھتے تو خوش ہوتے اور بے وقعت دیکھتے تو تڑپ جاتے۔ سومالی قوم کے بچوں کو غلطی سے انھوں نے عرب سمجھ لیا تو ان کی ذلیل حرکتوں کو دیکھ کر بے اختیار رو پڑے اور قم یا عمر پکار اٹھے۔(۲۶) یہ اور اس طرح کے بہت سے واقعات سفرنامے میں قلم بند ہیں، جن سے شبلی کی قومی حمیت وغیرت کے جذبات سامنے آتے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ

علامہ شبلی کو عربوں اور ترکوں سے بے پناہ محبت تھی۔اس سفرنامے میں بھی قدم قدم پر اس کا اظہار ہوا ہے۔ان کی فیاضی اور فراخ دلی کی داستان قلم بند ہوئی ہے، بلکہ انھوں نے صراحتاً لکھا ہے کہ اس سفر میں تمام آسانیاں عربوں اور ترکوں کی سیر چشمی کی بدولت پیدا ہوئیں۔خود علامہ

شبلی کے جذبات بھی مختلف مقامات پر عیاں ہوئے ہیں۔مثلاً خلیفہ کی زیارت کے وقت کی کیفیت ملاحظہ ہو:

''سلطان زینہ سے اترے اور افسران فوج اور پاشاؤں کی صفیں جن میں میں بھی شامل تھا دفعتاً سلام کو جھکیں۔ میں ابتداء سے محو حیرت تھا اور آنکھوں کو ٹکٹکی لگ گئی تھی۔ پہلے سے ارادہ تھا کہ سلطان کی زیارت ہوگی تو نہایت نیاز مندی کے ساتھ آداب بجالاؤں گا۔لیکن ازخود رفتگی کا یہ عالم ہوا کہ تمام صف کی صف دیر تک رکوع میں رہی اور میں بھی اسی طرح ٹکٹکی باندھے کھڑا رہا۔البتہ زبان پر دعائیہ الفاظ جاری تھے اور وہ قصداً نہیں بلکہ ایک بے اختیاری حالت تھی۔'' (۲۷)

اسی طرح اور بہت سے مواقع پر ان کے جذبات سامنے آگئے ہیں تاہم یہ تصویر کا پہلا رخ ہے۔دوسرے رخ یعنی ترکوں اور عربوں کی کمیوں کی انھوں نے پردہ پوشی نہیں کی بلکہ ان کا بھی برملا اظہار کیا۔عام مسلمانوں کی حالت کا ذکر اوپر آچکا ہے۔قسطنطنیہ کے کتب خانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ نایاب کتابیں یہاں بالکل بے کار ہیں۔ اولاً تو یہ کتب خانے دن میں صرف دو تین گھنٹے کھلتے ہیں۔اس کے ساتھ سال میں دو تین مہینے مستقل تعطیل رہتی ہے۔ان باتوں کے ساتھ اعلیٰ مذاق کی یہ کمی ہے کہ نایاب اور قدیم کتابیں یوں ہی پڑی رہتی ہیں، کوئی شخص ان کو اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔'' (۲۸)

اسی طرح انھوں نے استنبول کے ذکر میں لکھا ہے کہ:

''یہ بات تعجب کی ہے کہ تمام شہر میں کوئی ٹاؤن ہال نہیں۔ پبلک گارڈن یعنی باغ عامہ بھی ایسا مختصر کہ اس عظیم الشان سلطنت کے لئے کسی طرح موزوں نہیں۔'' (۲۹)

جامع ازہر کے تعلق سے علامہ شبلی کی بے لاگ تحریر اوپر گذر چکی ہے۔بعض دوسرے تعلیمی اداروں اور علمی کاموں کی خامیاں بھی انھوں نے سپرد قلم کی ہیں۔ اپنی اس خوبی کے لحاظ

سے علامہ شبلی کا یہ سفر نامہ ایک بلند پایہ کاوش کی حیثیت رکھتا ہے۔ شیخ محمد اکرام (ف: ۱۷ر جنوری ۱۹۷۳ء) نے بھی اس خوبی کا اعتراف کیا ہے۔ (۳۰) مولانا ضیاء الدین اصلاحی (ف: ۲ر فروری ۲۰۰۸ء) لکھتے ہیں:

> ''مولانا (شبلی) نے ان کے عیوب سے چشم پوشی نہیں کی ہے۔ البتہ اگر ان کی توجیہ ممکن ہوئی ہے تو وہ ضرور کی ہے۔ اس طرح ان کی کتاب یک رخی نہیں ہے بلکہ اس میں محاسن و معائب دونوں دکھائے گئے ہیں۔'' (۳۱)

سفر نامہ لکھنے کے اصول

سفر نامہ روم ومصر وشام میں علامہ شبلی نے سفر نامہ لکھنے کے چند اصولوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ سفر نامے میں معلومات سرسری نہیں ہونی چاہئے اور خاص طور سے اجمالی واقفیت کی بنا پر نتائج مستنبط نہ کئے جائیں، کیوں کہ اس سے اصل تصویر سامنے نہیں آتی۔ سفر نامے میں قیاسات کو بھی دخل نہیں دینا چاہیے۔ سطحی معلومات اور قیاسات سے حقیقت تک رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ علامہ شبلی نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ سفر نامہ لکھتے وقت حسن ظن اور سوئے ظن کا بھی دخل نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ نظریہ قائم کرنے کے بعد خوبیوں اور خامیوں میں سے کسی ایک ہی پر نظر جا کر ٹھہر جاتی ہے۔ (۳۲)

اس سلسلہ میں علامہ شبلی کا یہ بھی خیال ہے کہ حصول معلومات میں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ جن لوگوں سے معلومات حاصل کی جائیں وہ ثقہ ہوں غیر ثقہ نہ ہوں۔ روشن ضمیر ہوں، متعصب نہ ہوں۔ دقیق النظر ہوں ظاہر بیں نہ ہوں۔ (۳۳)

چند اور خصوصیات

سفر نامہ روم ومصر وشام متعدد خصوصیات کا حامل ہے اور اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہ محض سفر نامہ ہے قصداً تاریخی واقعات سے اسے واقعات کی کھتونی نہیں بنایا گیا ہے، بلکہ وہی واقعات درج کئے گئے ہیں جو تجربے و مشاہدے میں آئے۔ سفر نامے کی اس خوبی کی داد یادگار شبلی کے مصنف شیخ محمد اکرام نے بھی دی ہے۔ (۳۴)

اس کی ایک خوبی اس کا تسلسل ہے۔ جو واقعہ جس طرح اور جس موقع پر پیش آیا اسے بے کم وکاست بیان کر دیا گیا ہے۔ شبلی کے دلچسپ اور دلآویز اسلوب کی وجہ سے اس سفرنامے میں بڑی جاذبیت پیدا ہوگئی ہے۔ تسلسل کے ساتھ ایجاز، اختصار، جامعیت، تمثیلات، طنز وتعریض اور بیانیہ وخطابیہ انداز کی وجہ سے یہ ایک مثالی سفرنامہ قرار دیا جاتا ہے۔

اس سفرنامے کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اعداد وشمار کی روشنی میں نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔ مثلاً کتب خانوں کے ضمن میں تعداد کتب، مخطوطات، اس کے ملازمین، عمارتیں، اوقاف، اخراجات غرض ایک کتب خانے کی تمام تفصیلات یکجا کر دی گئی ہیں اور پھر تمام کتب خانوں کی تفصیلات کی روشنی میں رائے قائم کی گئی ہے۔ اسی طرح مدارس ومکاتب کی تعداد، طلبہ واساتذہ کی تعداد، ان کے سالانہ اخراجات، فیس کی رقم، وظائف اور وظائف کی رقم، غرض پورا ڈاٹا درج ہے۔ ان تفصیلات کا حصول آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی کسی اجنبی ملک، اجنبی قوم اور اجنبی زبان میں آسان نہیں۔

یہ سفرنامہ آج سے ۱۱۷ برس قبل شائع ہوا تھا۔ اس وقت دنیا کا نقشہ کچھ اور تھا اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود سلسلہ خلافت قائم تھا جو یورپ کا مدمقابل بھی تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں کی حکمرانی تھی اور دنیا کے بہت سے ممالک برطانوی استعمار کے شکنجے میں ہدف ظلم وتشدد تھے اس لئے سفرنامے کی فضا یورپ کے خلاف ہے۔ اس سے اس دور کی ناہمواریوں اور خاص طور سے روم ومصر وشام کے اس دور کے حالات اور مسلمانوں کے مسائل کا اندازہ ہوتا ہے۔

قدیم وجدید تعلیم کا ذکر سفرنامے میں چھایا ہوا ہے۔ شبلی نے نہ صرف ان کا جائزہ لیا ہے بلکہ ان کا مداوا بھی پیش کیا ہے۔ موجودہ دور میں یہ مسائل کہیں زیادہ اہم ہو گئے ہیں۔ ان پر غور وفکر اور انھیں حل کرنے میں بھی اس سفرنامے سے مدد ملے گی۔

یورپ نے مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ معاندانہ رویہ روا رکھا اور سازشیں کرتے رہے۔ خاص طور پر خلافت اور ترکی کا شیرازہ منتشر کرنے کے لئے انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ آج جب ان کوششوں کی بدولت انھوں نے دنیا کو غلام بنا رکھا ہے تو اس کے تدارک کے لئے شبلی کے ان خیالات کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

شاید یہ تذکرہ یہاں نامناسب نہ ہو کہ آج ترکی دشمنوں کی تمام تر سازشوں کے باوجود ایک طاقت بن کر ابھرا ہے۔ ترک ناداں نے خلافت کی جو قبا چاک کی تھی، اس کے مداوا کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ خدا کرے یورپ کا یہ مرد بیمار اپنی کھوئی ہوئی ساکھ دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

حوالے

(۱) فہارس الاسفار، ضیاءاللہ کھوکھر، گجرانوالہ، ۲۰۰۴ء

(۲) سفرنامہ روم ومصر وشام ص ۸۔ طبع جدید دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۹۹ء

(۳) حیات شبلی ص ۹۲۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء

(۴) ایضاً ص ۹۵

(۵) سفرنامہ روم ومصر وشام ص ۱

(۶) حیات شبلی ص ۱۹۱

(۷) سفرنامہ روم ومصر وشام ص ۱

(۸) ایضاً ص ۲

(۹) ایضاً ص ۳۷

(۱۰) ایضاً ص ۱۱۲-۱۱۳

(۱۱) ایضاً ص ۷

(۱۲) ایضاً ص ۷۷

(۱۳) ایضاً ص ۸۲

(۱۴) ایضاً ص ۱۳۰-۱۳۱

(۱۵) ایضاً ص ۱۳۳

(۱۶) ایضاً ص ۴۳

(۱۷) ایضاً ص ۶۷

(۱۸) ایضاً ص۱۷۴-۱۷۵

(۱۹) ایضاً ص۱۷۵-۱۷۶

(۲۰) مکاتیب شبلی ج۱ص۴

(۲۱) سفرنامہ روم ومصروشام ص۱۶۰-۱۶۱

(۲۲) ایضاً ص۲-۳

(۲۳) ایضاً ص۱۷

(۲۴) ایضاً

(۲۵) ایضاً ص۱۸

(۲۶) ایضاً ص۱۲

(۲۷) ایضاً ص۹۹

(۲۸) ایضاً ص۹۷

(۲۹) ایضاً ص۴۲

(۳۰) یادگارشبلی ص۱۹۸۔شیخ محمد اکرم۔لاہور۔۱۹۹۴ء

(۳۱) شبلی کی علمی وادبی خدمات ص۲۵۵۔ڈاکٹر خلیق انجم۔دہلی ۱۹۹۶ء

(۳۲) سفرنامہ روم ومصروشام ص۵-۶

(۳۳) ایضاً

(۳۴) یادگارشبلی ص۱۹۸

الفاروق کا سرورق

الفاروق

الفارق کی تدوین وترتیب کے سلسلہ میں علامہ شبلی کا یہ احساس تھا کہ اس کے لئے محض ہندوستان کے کتب خانے کافی نہیں ہیں۔ان کی خواہش تھی کہ ممالک اسلامیہ کا سفر کر کے وہاں کے کتب خانوں میں قدیم مراجع ومآخذ کا جوخزانہ ہے ان سے استفادہ کیا جائے۔ان کا خیال تھا کہ اسی بنیاد پر سلسلہ رائل ہیروز آف اسلام کی تکمیل بھی ممکن ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے۔وہ اس مقصد کے لئے کسی بھی طرح کافی نہیں ہوسکتا۔یہی خیال تھا جس نے اول اول اس سفر کی تحریک دل میں پیدا کی کیوں کہ یہ یقین تھا کہ مصروروم میں اسلامی تصنیفات کا جوبقیہ رہ گیا ہے ان سے ایک سلسلہ تالیف ضرور تیار ہوسکتا ہے۔''(۱)

۱۹۹۲ء میں علامہ شبلی کی خواہش پوری ہوئی اورانھوں نے روم ومصروشام کا سفر کیا توالفاروق کے مراجع ومصادر اورمواد کی تلاش میں کتب خانے کے کتب خانے چھان ڈالے۔ متعدد نادروکمیاب کتابوں اورمخطوطات کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ ان سے ضروری اقتباسات بھی نقل کئے اور بقول مولوی محمد یحییٰ تنہا''مولانا نے اس سفر میں الفاروق کے لئے کافی مواد بہم پہنچانے کی کوشش کی اورکوئی دقیقہ تلاش وجستجو کا باقی نہ رکھا۔(۲) اس کے باوجود بعض کتابیں جن کی انھیں شدت سے تلاش تھی نہ مل سکیں۔مثلاً مشہور مورخ علامہ مسعودی کی کتاب اخبارالزمان اورکتاب الاوسط کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اگرچہ وہ فن تاریخ کی جان تھیں لیکن قوم کی بدمذاقی سے مدت ہوئی ناپید ہو چکیں۔میں نے اس غرض سے کہ حضرت عمرؓ کے حالات کا پتہ لگ سکے،قسطنطنیہ

کے تمام کتب خانے چھان ڈالے لیکن کچھ کامیابی نہ ہوئی۔'' (۳)

الفاروق کی تصنیف میں تاخیر اور لیت ولعل کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ سرسید احمد خاں اس کی تصنیف کے حق میں نہ تھے۔ ان کو اندیشہ تھا کہ اس سے کالج میں شیعہ سنی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوگا، جس سے کالج اور ان کی تعلیمی تحریک کو نقصان پہنچے گا۔ انھوں نے علامہ شبلی کو مشورہ دیا کہ وہ الفاروق کے بجائے الغزالی لکھ دیں۔ لیکن جب یہ مسئلہ کالج کے ایک بڑے ہمدرد اور شیعہ عالم نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کے سامنے سرسید کے ذریعہ پیش ہوا تو انہوں نے لکھا کہ ''اسلام میں دین و دنیا کی جامع اور کامل ذات صرف عمر فاروق کی ہے۔ لہٰذا ان کی سوانح لکھنے سے مولوی شبلی کو نہ روکئے۔ (۴)

غرض یہ کہ الفاروق کی تصنیف کی راہ کی جب تمام دشواریاں دور ہوگئیں اور یورپ میں جو نادر علمی کتابیں طبع ہو رہی تھیں ان میں سے بعض کتابیں مثلاً تاریخ طبری وغیرہ چھپ کر آ گئیں تو علامہ شبلی نے ۱۸ر اگست ۱۸۹۴ء کو الفاروق کی ابتداء کی اور چار سال کی مسلسل جاں کاہ محنت ومشقت کے بعد ۱۸۹۸ء میں وہ پایہ تکمیل کو پہنچی۔ جنوری ۱۸۹۹ء میں اس کا پہلا ایڈیشن مطبع نامی کانپور سے طبع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ اس وقت سے آج تک برابر شائع ہو رہی ہے۔ اس کی معلوم اشاعتوں کی تفصیل یہ ہے:

[۱]	▪ مطبع نامی، کان پور، طبع اول	۱۸۹۸ء	۲۰۰ص
[۲]	▪ رحمانی پریس، دہلی، حصہ اول	۱۸۹۸ء	۱۲۶ص
[۳]	▪ مطبع نامی، کان پور، حصہ اول	۱۸۹۹ء	۲۰۰ص
[۴]	▪ رنگین پریس، دہلی	۱۹۰۰ء	
[۵]	▪ برلاس پریس، مراد آباد، حصہ اول	۱۹۰۵ء	۲۹۶ص
[۶]	▪ قومی پریس، دہلی، حصہ اول	۱۹۰۶ء	۱۷۲ص
[۷]	▪ برلاس پریس، مراد آباد، حصہ دوم	۱۹۰۷ء	۲۷۲ص
[۸]	▪ افضل المطابع، دہلی	۱۹۱۵ء	۱۴۴+۲۰۸ص
[۹]	▪ مطبع نامی، کان پور	غیر مورخہ	۳۱۲ص

[١٠]	■ رحمانی پریس، دہلی	۱۸۹۸ء	۱۲۷+۲۸۴ص
[١١]	■ مطبع مجتبائی، دہلی	۱۹۲۲ء	۲۸۸ص
[١٢]	■ افضل المطابع، دہلی، حصہ اول	۱۹۱۵ء	۱۴۴ + ۲۰۸ص
[١٣]	■ مطبع مجتبائی، دہلی	۱۹۳۳ء	۱۰۱+۱۰۴ص
[١٤]	■ تجلی پریس، دہلی	۱۹۳۳ء	۱۵۱+۱۰۴ص
[١٥]	■ علمی کتاب خانہ، دہلی	۱۹۴۳ء	۵۰۳ص
[١٦]	■ ایم ثناءاللہ خاں، لاہور	۱۹۴۶ء	
[١٧]	■ علمی کتاب خانہ، دہلی	۱۹۵۱ء	۵۰۳ص
[١٨]	■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ (مکمل)	۱۹۵۶ء	۲۹۰ص
[١٩]	■ علمی کتاب خانہ، دہلی	۱۹۵۹ء	۵۰۳ص
[٢٠]	■ کتب خانہ حمیدیہ، دہلی	۱۹۶۰ء	۵۶۰ص
[٢١]	■ سجاد پبلشرز، لاہور	۱۹۶۰ء	
[٢٢]	■ پرویز بک ڈپو، نئی دہلی	۱۹۶۰ء	
[٢٣]	■ علمی کتاب خانہ، دہلی	۱۹۶۳ء	۵۰۴ص
[٢٤]	■ کتب خانہ حمیدیہ، دہلی	۱۹۶۴ء	۵۶۰ص
[٢٥]	■ شیخ غلام علی اینڈ سنس، لاہور	۱۹۶۹ء	
[٢٦]	■ نظامی پرنٹرس، لاہور	۱۹۷۲ء	
[٢٧]	■ شیخ غلام علی اینڈ سنس، لاہور	۱۹۷۴ء	
[٢٨]	■ فرید بک ڈپو، دہلی	غیر مورخہ	۲۰۶ص
[٢٩]	■ دارالمصنّفین اعظم گڑھ	۱۹۸۷ء	
[٣٠]	■ عماد پبلی کیشنز، دہلی	۱۹۸۷ء	۴۷۲ص
[٣١]	■ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد	۱۹۸۹ء	
[٣٢]	■ مکتبہ القریش، لاہور	۱۹۹۰ء	۳۹۰ص

[۳۳]	■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۹۳ء	۲۰۲+۲۹۱ص
[۳۴]	■ مشتاق بک کارنر، لاہور	۲۰۰۰ء	
[۳۵]	■ علم وعرفان پبلشرز، لاہور	۲۰۰۰ء	
[۳۶]	■ ادارہ اشاعت دینیات، نئی دہلی	۲۰۰۶ء	۴۵۴ص
[۳۷]	■ دارالاشاعت، کراچی	۲۰۰۷ء	۳۸۳ص
[۳۸]	■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۰۸ء	۱۷۳+۲۳۵ص
[۳۹]	■ فخر المطابع، لکھنؤ	غیر مورخہ	۱۷۲+۲۴۰ص
[۴۰]	■ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد	غیر مورخہ	۵۴۴ص
[۴۱]	■ انٹرنیشنل اسلامک پبلشر	غیر مورخہ	۲۷۴ص
[۴۲]	■ مدینہ بک ڈپو، لاہور	غیر مورخہ	
[۴۳]	■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۱۲ء	۱۷۳+۲۳۵ص

سبب تالیف

المامون کے بعد علامہ شبلی نے ہیروز آف اسلام کی سوانح عمریاں لکھنے کا وسیع منصوبہ بنایا۔اس کی تمام تفصیل سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں موجود ہے۔فاروق اعظم کے حالات اور عظیم الشان کارناموں کی تدوین ان میں سرفہرست ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ علامہ شبلی مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کو جس نہج پر لانا چاہتے تھے،اس کا نمونہ فاروق اعظم کے کوکبہ جلال کے سوا کہیں اور نہیں ملتا۔ایسی جامع کمال شخصیت نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ تاریخ عالم میں بھی نہیں ملتی۔ علامہ شبلی نے فاروق اعظم کی عظمت وجامعیت اور جلالت شان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> ’’قانون فطرت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ فضائل انسانی کی مختلف انواع ہیں اور ہر فضیلت کا جدا راستہ ہے۔ممکن بلکہ کثیر الوقوع ہے کہ ایک شخص ایک فضیلت کے لحاظ سے تمام دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا لیکن اور فضائل سے اس کو بہت کم حصہ ملا تھا۔سکندر سب سے بڑا فاتح تھا لیکن حکیم نہ تھا۔ارسطو حکیم تھا لیکن کشورستاں نہ تھا۔ بڑے بڑے کمال ایک طرف چھوٹی چھوٹی فضیلتیں

بھی ایک شخص میں مشکل سے جمع ہوتی ہیں۔ بہت سے نامور گذرے ہیں جو بہادر ہیں لیکن پاکیزہ اخلاق نہ تھے۔ بہت سے دونوں کے جامع تھے لیکن علم و فضل سے بے بہرہ تھے۔

اب حضرت عمرؓ کے حالات اوران کی مختلف حیثیتوں پرنظر ڈالو صاف نظر آئے گا کہ وہ سکندر بھی تھے اور ارسطو بھی، مسیح بھی تھے اور سلیمان بھی، تیمور بھی تھے اور نوشیرواں بھی امام ابوحنیفہ بھی تھے اور ابراہیم ادہم بھی۔''(۵)

فاروق اعظم کی عظمت و جامعیت کے علاوہ اس کی تصنیف کا ایک سبب مسلمانوں کی یورپ سے مرعوبیت کے سبب پیدا ہونے والا غیر معتدل یہ رجحان بھی تھا کہ یورپ کے حکمراں تدبر وسیاست میں مسلمانوں سے برتر تھے۔ الفاروق لکھ کر علامہ شبلی نے مغرب سے مرعوبیت کے طلسم کو توڑا اور ثابت کیا کہ دنیا کی تاریخ میں فاروق اعظمؓ سے بڑا کوئی حکمراں پیدا ہی نہیں ہوا۔

مشمولات

الفاروق دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ کی ابتداء ایک تمہید سے ہوئی ہے جس میں تاریخ کی ابتداء، تاریخ کی تعریف اوراس کے لوازمات، تاریخ اور انشاء پردازی میں فرق، روایت ودرایت کی تشریح اوران کا طریقہ استعمال، قدماء ومتاخرین کے تاریخی کارنامے، ان کی خصوصیات اوران کے نقائص کا ذکر ہے۔ مورخ کے فرائض کی بھی تفصیل ہے اور یہ بھی قلم بند کیا گیا ہے کہ یورپ کے مورخین کس قسم کی بے اعتدالیاں کرتے ہیں۔ تاریخ کے ساتھ اصول سوانح نگاری پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تمہید تاریخ وسوانح نویسی کے فکر انگیز اور بصیرت سے لبریز اصولوں سے مزین ہے۔ جن کی اہمیت وافادیت کا کوئی مورخ یا سوانح نگار منکر نہیں ہوسکتا۔

تمہید کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا شجرہ نسب بیان کیا گیا ہے اوران کی ولادت، سن رُشد، قبول اسلام، ہجرت اور وفات تک کے حالات بترتیب قلم بند کئے گئے ہیں۔ اسی حصہ میں ان کی فتوحات اوران کے عہد کے معرکوں کا سلسلہ وار ذکر بھی ہے۔

دوسرے حصہ میں فاروق اعظمؓ کے مالی، ملکی اور فوجی انتظامات اوران کے ذاتی اخلاق

وعادات، علمی کمالات اوران کے مجتہدانہ کارناموں کونہایت شرح وبسط کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ یہ حصہ علامہ شبلی کے مورخانہ اجتہادات، وسیع معلومات اورنظریہ تاریخ کا بہترین نمونہ ہے۔خود علامہ شبلی بھی اس حصہ کوزیادہ پسند کرتے تھے۔غرض علامہ شبلی نے الفاروق میں حضرت عمرؓ کے حالات وسوانح اوران کے عہد کے حالات کواس عمدہ انداز سے لکھا ہے کہ فاروق اعظمؓ کی عظمت وبلند پایگی اورعلوئے مرتبہ کے ساتھ اسلام کے اس مثالی اورلائق تقلید عہد کی تمام تفصیلات آنکھوں میں پھرجاتی ہیں۔

مقبولیت

الفاروق علامہ شبلی کی مقبول ترین کتاب ہے۔یہ دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہوکران کے حلقوں میں بھی مقبول ومتداول ہے۔ یہاں ان تراجم کے ذکر سے واضح ہوگا کہ الفاروق نے کس قدر مقبولیت پائی۔

ترکی ترجمے

الفاروق کاسب سے پہلے ترکی زبان میں ترجمہ ہوا۔ترکوں سے علامہ شبلی کوخاص محبت تھی۔محمدعمررضا آفندی نے الفاروق کاترکی میں ترجمہ کرکےاس محبت کاحق ادا کیا ہے۔ جسے مطبع آمدی استنبول نے ۱۹۲۶ءمطابق ۱۳۴۵ھ میں ’’حضرت عمرؓ‘‘ کے نام سے شائع کیا۔اس کادوسرا ایڈیشن مطبع کون طوغدی،استنبول نے ۱۹۲۸ءمطابق ۱۳۴۷ھ میں شائع کیا۔ یہ دونوں مطبوعہ نسخے کتب خانہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ میں موجود ہیں۔

الفاروق کا ایک اورترجمہ طالپ یاسرالپ کے قلم سے ہے۔اسے حمت دعویٰ کیج استانبول نے ۱۹۷۵ء میں شایع کیا۔اس کےصفحات کی تعداد۴۲۴ ہے۔استانبول سے ۱۹۸۶ء میں اس کادوسراایڈیشن بھی شایع ہوچکا ہے۔

مالاباری[ملیالم]ترجمہ

اس کے بعدالفاروق کامالاباری (ملیالم) میں ترجمہ ہوا۔ یہ ترجمہ جناب عبدالسلام وکم

کے قلم سے ہے۔ اسے اسلامیہ پبلشنگ ہاؤس وکم ٹراونکور نے وی وی پریس ترویندرم سے طبع کرا کے ۱۹۳۰ء میں شائع کیا۔ یہ مطبوعہ نسخہ بھی دارالمصنّفین کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

کنڑ ترجمہ

مولوی کے، سی کوم کٹی نے الفاروق کو کنڑ زبان کا جامہ پہنایا۔ اسے کے، آر، برادرس کوزی کوڈ کیرالا نے ۱۹۶۱ء میں شایع کیا۔

فارسی ترجمے

علامہ شبلی اور ان کی تصانیف کے قدرداں اور مرتبہ شناس امراء ورؤسا اور فرمانروایانِ ریاست بھی تھے۔ الفاروق کی تالیف وتکمیل میں سرکار آصفیہ حیدرآباد کا اشتراک شامل تھا اور وہ سلسلہ آصفیہ میں داخل تھی۔ اسی طرح سیرۃ النبیؐ کی تالیف میں بیگم بھوپال کی دلچسپی وتوجہ سے اہل نظر بخوبی واقف ہیں۔ علامہ شبلی کا یہ قطعہ بیگم صاحبہ کی علم نوازی ومعارف پروری کو زندہ جاوید کر گیا:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہرصورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

علامہ شبلی کے ابتدائی تاریخی رسالہ بدء الاسلام کے اردو ترجمے کی سعادت نواب حمیداللہ خاں بھوپال کی بیگم میمونہ سلطان شاہ بانو کے حصہ میں آئی۔ اسی طرح الفاروق کے فارسی ترجمہ کی۔ سعادت جناب اسداللہ خاں صاحب افغانستان کی والدہ اور محمد نادر خاں شہید، بادشاہ افغانستان کی ہمشیرہ عزت مآب علیا جناب کا مقدر بنی۔ اس کی تصحیح وترتیب کا کام جناب نجف علی عاصی جلال پوری نے انجام دیا۔ جسے قندھار سے حاجی عبدالستار نے شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مسلم پرنٹنگ پریس لاہور نے ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۲ء میں اہتمام سے شائع کیا۔ یہ دوسرا

ایڈیشن کتب خانہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ میں موجود ہے۔

اس ترجمے کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے ۳۷ رسال بعد افغانستان ہی کے ایک اہل قلم محسن مہاجر نے الفاروق کا دوسرا ترجمہ کیا، جسے مؤسسہ انتشارات الازہر کابل نے ۱۳۸۸ھ میں شایع کیا۔ اس کے صفحات کی تعداد ۵۵۰ ہے۔

انگریزی ترجمے

الفاروق شائع ہوئی تو اسے انگریزی میں منتقل کرنے کی کئی لوگوں نے کوشش کی۔ سب سے پہلے ۱۸۹۹ء میں علامہ شبلی کے شاگرد (۶) مولانا ظفر علی خاں [ف: ۲۷ر نومبر ۱۹۵۶ء] نے شمس العلماء مولانا سید علی بلگرامی [ف: ۳۰ر مئی ۱۹۱۱ء] اور مولوی عزیز مرزا [ف: ۲۶ر فروری ۱۹۱۲ء] کی تحریک پر اس کام کا آغاز کیا اور الفاروق کے ایک حصہ کا ترجمہ کیا۔ (۷) جسے ۱۹۳۹ء میں شیخ محمد اشرف تاجر کتب اسلامیہ کشمیری بازار لاہور نے شائع کیا۔ اس ترجمہ کے اب تک درج ذیل ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں:

[۱] شیخ محمد اشرف، لاہور ۱۹۳۹ء، ۲۹۵ص

[۲] انٹرنیشنل اسلامک پبلی کیشن، نئی دہلی ۱۹۴۲ء، ۴۶۷ص

[۳] شیخ محمد اشرف، لاہور ۱۹۴۳ء

[۴] شیخ محمد اشرف، لاہور ۱۹۴۷ء

[۵] عماد پبلی کیشنز دہلی، ۱۹۵۶ء، ۲۷۴ص، طبع چہارم

[۶] شیخ محمد اشرف، لاہور ۱۹۵۶ء، ۲۹۵ص

[۷] شیخ محمد اشرف، لاہور ۱۹۵۷ء، ۲۹۵ص

[۸] شیخ محمد اشرف، لاہور ۱۹۵۹ء، ۲۹۵ص

[۹] شیخ محمد اشرف، لاہور ۱۹۶۱ء

[۱۰] شیخ محمد اشرف، لاہور ۱۹۶۶ء

[۱۱] شیخ محمد اشرف، لاہور ۱۹۷۶ء

[۱۲] عماد پبلی کیشنز دہلی، ۱۹۸۷ء، ۲۷۴ص

[۱۳] ادارہ اشاعت دینیات، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ۴۵۴ص

[۱۴] رائٹ وے پبلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ۴۸۵ص

[۱۵] آدم پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس دہلی، ۲۰۰۶ء

[۱۶] آدم پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس دہلی، ۲۰۰۹ء

الفاروق کا انگریزی ترجمہ شیخ عطاء اللہ[ف: ۲۷/دسمبر ۱۹۶۸ء]لاہور نے بھی شروع کیا تھا مگر وہ اسے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔(۸)البتہ دوسرا انگریزی ترجمہ جناب محمد سلیم کے قلم سے نکلا۔ یہ ترجمہ بھی شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور ہی نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔۱۹۶۲ء میں وہیں سے اس کا دوسرا ایڈیشن بھی طبع ہوا۔

پشتو ترجمہ

الفاروق کو پشتو زبان میں بھی ترجمہ ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے، جو پشتو اہل قلم جناب غلام قادر کا کارنامہ ہے۔ یہ ترجمہ ۱۹۴۹ء میں کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ ترجمہ راقم الحروف کی نظر سے نہیں گذرا ہے۔

عربی ترجمے

علامہ شبلی کی خواہش تھی کہ الفاروق کا عربی میں ترجمہ کیا جائے، تا کہ عربی داں طبقہ کے لئے اس سے استفادہ آسان ہو، مگر ان کی یہ خواہش ان کی زندگی میں پوری نہ ہوسکی اور اب الحمد للہ ایک صدی بعد ان کی یہ تمنا پوری ہوئی۔ جناب دکتور سمیر عبدالحمید ابراہیم، استاذ جامعہ امام محمد بن سعود الاسلامیہ نے الفاروق کو عربی میں منتقل کیا ہے، جسے مکتبہ دارالسلام ریاض نے ۱۹۹۹ء میں نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب کتابت وطباعت کے ساتھ شائع کیا ہے۔

الفاروق کا ایک اور عربی ترجمہ حکومۃ عمر بن الخطاب کے نام سے یاسین صباح الاعظمی نے کیا ہے، جسے الدارالعربیہ بیروت نے ۲۰۰۴ء میں شایع کیا۔

مذکورہ تراجم کے علاوہ الفاروق کے کئی خلاصے شایع ہوئے۔

۱۔الفاروق کا پہلا اردو خلاصہ المفروق کے نام سے گلشن شادیانی نے کیا، جسے شیخ جان محمد، لاہور نے ۱۹۴۵ء میں شایع کیا۔ یہ تلخیص ۱۱۱رصفحے کی ہے۔

۲۔ایک اور اردو خلاصہ قمرالقادری نے ''فاروق اعظم'' کے نام سے کیا جسے ایم فرمان علی، لاہور نے شایع کیا۔

الفاروق کے دو انگریزی خلاصے شایع ہو چکے ہیں۔

۳۔پہلا خلاصہ abridged edition of Shibli Nomani's Umar Al-Farooq ڈاکٹر ایف، اے، نظامی آکسفورڈ سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز کی ادارت میں آکسفورڈ پریس دہلی سے ۲۰۰۴ء میں طبع ہوا۔ یہ ۱۵۷رصفحات پر مشتمل ہے۔

۴۔مولانا ظفر علی خاں کے انگریزی ترجمہ کی ایک تلخیص جمیل احمد قریشی کے قلم سے ہے۔ جو (I.B.Tauris London,New Yark 2004,page157) سے چھپی ہے۔

الفاروق کے ان تراجم، تلخیصات اور متعدد اشاعتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی مقبولیت کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور اس کے کس قدر ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے۔ضرورت ہے کہ اس کا ترجمہ ملک کی سرکاری زبان ہندی میں بھی کیا جائے، تا کہ برادران وطن کو بھی اس سے استفادہ کا موقع ملے اور انہیں یہ اندازہ بھی ہو کہ اسلام اور اسلامی تاریخ کس چیز کا نام ہے۔

تحسین وتنقید

الفاروق وجود میں آنے سے پہلے ہی بے حد مقبول ہو چکی تھی۔خود علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> ''الفاروق جس کا غلغلہ وجود میں آنے سے پہلے ہی تمام ہندوستان میں بلند ہو چکا ہے۔اول اول اس کا نام زبانوں پر اس تقریب سے آیا کہ المامون طبع اول کے دیباچہ میں ضمناً اس کا ذکر آ گیا تھا۔ اس کے بعد اگر چہ مصنف کی طرف سے بالکل سکوت اختیار کیا گیا تاہم نام میں کچھ ایسی دلچسپی تھی کہ خود بخود پھیلتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے ابتدائی اجزاء ابھی تیار نہیں ہو چکے تھے کہ تمام ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک الفاروق کا لفظ بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔''(۹)

چنانچہ ''الفاروق'' جب وجود میں آئی تو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ تبصرے ہوئے، تعریفیں ہوئیں، گو بعض لوگوں نے اعتراضات بھی کئے تاہم عام طور سے مدح و تحسین کی نظر سے دیکھی گئی۔ اردو کے صاحب طرز ادیب مہدی حسن افادی (ف: ۲۱/ نومبر ۱۹۲۱ء) نے لکھا کہ:

''یہ عمروں کی کمائی ہے۔ بڑی کاوش و اہتمام سے سالہا سال کی مورخانہ تلاش اور تدوین کے بعد ناموران اسلام کے سلسلہ میں خلیفہ دوم کی لائف پر یہ ضخیم تالیف تیار کی گئی ہے۔ مورخ نے محض تحقیق واقعات کے لئے ممالک غیر یعنی ترکی، مصر وغیرہ کے مصائب سفر برداشت کئے۔ سیکڑوں قدیم و نایاب تاریخوں کے ہزاروں ورق الٹنے پڑے اور جہاں تک دسترس تھی اصلی آخذ کی چھان بین میں یورپ کا تاریخی سرمایہ بھی بچنے نہیں پایا۔ غرض کہ معلومات کا جو ذخیرہ جمع کیا گیا ہے، وہ میرے خیال میں تاریخ فاروقی کے مہمات مسائل ہیں جن کی نسبت یہ عام دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ کسی زبان میں اس قدر مواد یکجا نہیں مل سکتا۔'' (۱۰)

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جنھوں نے المامون پر بڑی تنقیدیں کی تھیں، الفاروق پر ایک جامع تبصرہ لکھا اور علامہ شبلی کی مورخانہ بصیرت ان کی تلاش و تحقیق اور جدید انداز تصنیف کی بڑی تعریف کی۔ (۱۱) یہ تبصرہ خود مولانا شبلی کو بہت پسند آیا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مدح کا پہلو نہ نکلتا تو اسے الفاروق کے ساتھ شائع کرتا۔ (۱۲)

خود علامہ شبلی کو اپنی تمام تصانیف میں الفاروق زیادہ پسندیدہ تھی، انھوں نے ایڈیٹر زمانہ کان پور کے ایک سوال نامہ کے جواب میں لکھا کہ میں اپنی تصنیفات میں الفاروق کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔ (۱۳)

اس داد و تحسین کے ساتھ بعض لوگوں کی جانب سے مختلف قسم کے اعتراضات بھی وارد کئے گئے۔ مرزا عابد علی بیگ قزلباش نے الفاروق کے خلاف دو حصوں میں ''النظر السموق فی سیرۃ الفاروق یاالفرق'' [مطبوعہ برلاس مرادآباد حصہ اول ۱۹۰۵ء ص ۲۹۶، حصہ دوم ۱۹۰۷ء ص ۲۷۲] کے نام سے پوری کتاب ہی لکھ دی۔ یہ کتاب باوجود تلاش و جستجو کے دستیاب نہ ہوسکی اور نہ یہ معلوم ہوسکا کہ مصنف الفرق نے کس قسم کے اعتراضات کئے تھے۔

ان کے علاوہ متعدد اہل قلم نے اپنے مضامین اور کتابوں میں اعتراضات کئے ہیں۔
سیر المصنّفین کے مصنف مولوی محمد یحییٰ تنہا [ف:۱۹/ دسمبر ۱۹۶۶ء] نے الفاروق پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''الفاروق پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ موجودہ زمانے کی شائستگی اور اس زمانہ کے تمدن میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ حالانکہ تیرہ سو برس کے عرصہ میں زمانہ نے ہر شعبہ زندگی میں بے حد ترقی کی ہے اور جو محکمے اور دفاتر موجودہ طرز حکومت کے لازمی عناصر ہیں کم وبیش وہ سب دربار خلافت کے ارکان میں پائے جاتے ہیں جن کو درایت کبھی تسلیم نہیں کر سکتی۔'' (۱۴)

تنہا صاحب کے اس اعتراض کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانے کے انتظامات اور حکومت کے مختلف اداروں پر آج کل کی اصطلاحیں جب چسپاں کی جاتی ہیں تو بظاہر مندرجہ بالا گمان پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً قانون مالگذاری، جمہوریت وغیرہ۔ شبلی نے نظم ونسق کا جو مفصل حال لکھا ہے اس میں بیسیوں ایسی اصطلاحیں موجود ہیں جو اس زمانے میں اپنی موجودہ شکل اور مفہوم میں موجود نہ تھیں۔ کیوں کہ اس وقت نظم وانتظام میں انتہائی سادگی اور بدویت تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان اداروں اور محکموں اور انتظامی کاموں کے لئے شبلی الفاظ کہاں سے لاتے؟ وان کریمر وغیرہ نے جو کتابیں اس موضوع پر لکھی ہیں ان میں بلا تکلف جدید زمانے کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے شبلی نے ان جزئیات میں کوئی بات خلاف واقعہ وسند نہیں لکھی ہے اور مورخ پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہوسکتا ہے کہ وہ صداقت کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔'' (۱۵)

چونکہ علامہ شبلی کے پیش نظر الفاروق کے ذریعہ مذاق حال کی تشفی اور تاریخ کی نئے زمانے اور نئے مذاق کے مطابق تدوین مقصود تھی، اس لئے انھوں نے مذکورہ بالا انداز تصنیف اختیار کیا ہوگا جو اس زمانہ میں مغربی مورخین کے یہاں عام انداز تصنیف تھا۔ قدیم اصطلاحات

اورتعبیرات سے یہ مقصد کماحقہ پورا بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

علامہ شبلی کے شاگرد خاص مولانا سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ ''اس میں حضرت عمر فاروقؓ کی روحانی زندگی کا خاکہ پوری طرح نہیں ابھارا گیا ہے۔''(۱۶) غالباً مولانا سید سلیمان ندوی کو یہ خیال اس وجہ سے پیدا ہوا کہ الفاروق سے حضرت عمرؓ کی جونمایاں تصویر ابھرتی ہے وہ اسلامی طرزِ حکومت کے ایک نامور حکمراں کی ہے۔ سید صاحب جس زمانہ میں حیاتِ شبلی کی تدوین میں مصروف تھے، اس وقت وہ بعض صوفیا کے زیرِ اثر تھے، ممکن ہے یہ خیال اسی کا اثر اور نتیجہ ہو۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ الفاروق میں فاروق اعظمؓ کی زندگی کے کسی پہلو کو نظر انداز کیا گیا ہے اور نہ اس سے پہلوتہی کی گئی ہے۔ ہمارے اس خیال کی تائید سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ اس کو جو پڑھے گا وہ حضرت عمر فاروقؓ کو ایک بہترین فرمانروا، ایک بہترین مسلمان اور ایک بہترین انسان تسلیم کر کے محظوظ ہوگا۔ مسلمان تو اس کتاب کو پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ سکندر، ذوالقرنین، نوشیرواں، امام ابوحنیفہ، حضرت عبدالقادر جیلانی، خواجہ بہاءالدین رومی اور شیخ فریدالدین عطار میں جتنی خوبیاں علاحدہ علاحدہ موجود تھیں وہ حضرت عمرؓ میں جمع ہوگئی تھیں۔''(۱۷)

اس کے علاوہ ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے کہ الفاروق میں اگر کوئی نقص ہے تو یہ ہے کہ اس میں مصنف گاہے گاہے عاشق کے لباس میں سامنے آتا ہے۔(۱۸) مگر انھوں نے الفاروق سے اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی۔

یہاں یہ بھی وضاحت کے لائق ہے کہ علامہ شبلی کے متعلق یہ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ وہ ناموران اسلام کے ذکر میں ہیرو پرستی کا شکار نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ یہ شخصیتیں اپنے اوصاف ومحاسن کی وجہ سے صرف مسلمان ہی نہیں دنیائے انسانیت کے ہر معتدل اور عدل پسند ذہن وقلب کے لئے تاثیر وکشش رکھتی ہیں۔ علامہ شبلی نے اگر ان کی سچی اور واقعی تصویر کھینچ دی تو یہ ان کی مہارت وحذاقت ہے نہ کہ ان کی بے جا محبت اور شیفتگی کا مظاہرہ۔ سوال یہ ہے کہ علامہ شبلی نے

تاریخ وسوانح نگاری کے اصولوں سے کہیں انحراف کیا یا نہیں۔ جواب اگر نفی میں ہے اور یقیناً نفی ہی میں ہے تو پھر ان کی اس عقیدت کو قصور وار اوران کا نقص کیوں قرار دیا جائے بلکہ اس کا اصل تعلق تو ممدوح شخصیت کے حسنات وصفات سے ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی نظر میں الفاروق میں دوسرا عیب یہ ہے کہ اس کا مقصد مغرب کے رجحان کا غیر معتدل احترام ہے۔ مثلاً واقعہ بدر کو مدافعانہ ثابت کیا ہے تا کہ جارحانہ جہاد کے الزام سے بچ سکیں۔(۱۹)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے جس بات کو غیر معتدل احترام قرار دیا ہے، وہ دراصل تاریخ کے سائنٹفک اصولوں کا نتیجہ ہے، مثلاً واقعات کے اسباب وعلل کی تلاش وجستجو، جس کا مقصد جارحانہ جہاد کے الزام سے فرار نہیں بلکہ حقیقت کی تلاش ہے۔ خود اسلام نے جارحانہ جہاد کی جب اجازت ہی نہیں دی ہے تو اس سے اجتناب اور احتراز کی کیا ضرورت ہے۔ یہ اعتراض دراصل ایک عوامی نظریہ ورجحان کی وجہ سے پیدا ہوا اور واقعہ بدر میں جیسا کہ علامہ شبلی نے روایت ودرایت کے معیار سے جائزہ لے کر ثابت کیا ہے کہ معرکہ بدر جارحانہ جہاد نہ تھا بلکہ مدافعانہ جہاد تھا اور اگر اس عام خیال کے مطابق جارحانہ تسلیم کر لیا جائے اور اس کے اسباب وعلل سے صرف نظر کر لیا جائے تو بقول شبلی ''اس سے عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور ان کو تباہ وبرباد کرنے کے لئے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں، صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں۔ اسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا۔ حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے کہ جن قبائل پر فوجیں بھیجی گئیں وہ پہلے سے آمادہ جنگ اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کررہے تھے۔(۲۰)

چنانچہ علامہ شبلی نے واقعہ بدر کے اسباب کو تلاش بسیار کے بعد بیان کر دیا۔ اب اگر وہ کسی مورخ ومحقق کے نظریہ کے مطابق نہیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے۔ اگر علامہ شبلی ایسا نہ کرتے تو آج اصول تاریخ کے لحاظ سے ان پر تنقید کی جاتی کہ انھوں نے تاریخ نویسی کے اصولوں پر عمل نہیں کیا اور خود اپنے بنائے پیمانوں کو توڑ ڈالا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے الفاروق پر ایک اور اعتراض کیا ہے کہ الفاروق میں بعض جگہ

حدیث پر معقولیت کو ترجیح دی گئی ہے۔ اس اعتراض کی دلیل بھی الفاروق سے پیش نہیں کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف اپنے مطالعہ کی بنیاد پر یقین واعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ کسی حدیث پر معقولیت کی ترجیح کی ایک مثال بھی نہیں۔ یہاں ڈاکٹر سید عبداللہ کے اعتراض کے متعلق یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے لفظ درایت کو معقولیت سے تعبیر کیا ہے اور ان دونوں کا فرق بہرحال ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً مولانا شبلی ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''ممکن ہے کسی کوتاہ نظر پر یہ امر گراں گذرے کہ بخاری اور مسلم کی حدیث پر شبہ کیا جائے۔ لیکن اس کو سمجھنا چاہئے کہ بخاری ومسلم کے کسی راوی کی نسبت یہ شبہ کرنا کہ وہ واقعہ کی پوری ہیئت محفوظ نہ رکھ سکا، اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ہذیان اور حضرت عمرؓ کی نسبت گستاخی کا الزام لگایا جائے۔''(۲۱)

ان چند اعتراضات کے بعد خود ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ ''سیرۃ النبیؐ کے بعد الفاروق شبلی کی بہترین تصنیف ہے اور سوانحی لحاظ سے بھی بڑی مکمل اور مفصل ہے۔ اصول صداقت کے معاملہ میں جتنی احتیاط اس کتاب میں روا رکھی ہے، شاید کسی اور کتاب میں ملحوظ نہیں رکھی۔ اس سے حضرت عمرؓ کی پوری شخصیت اپنی گوناگوں خوبیوں کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔(۲۲)

الفاروق: اصول تاریخ نویسی کی روشنی میں

یہاں الفاروق کا علامہ شبلی کے اصول تاریخ کی روشنی میں جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ انھوں نے اپنے اصول ومعیار کا کس قدر خیال رکھا ہے اور الفاروق اس پر کہاں تک پوری اترتی ہے۔

علامہ شبلی نے مورخ کا یہ لازمی فرض بتایا ہے کہ وہ جس عہد کی تاریخ لکھے اس عہد کے ہر طرح کے واقعات لکھے۔ چنانچہ خود علامہ شبلی نے الفاروق میں عہد فاروقی کے ہر طرح کے واقعات قلم بند کئے ہیں۔ جہاں انھوں نے سیاسی تاریخ لکھی ہے، وہیں تہذیبی، تمدنی، معاشرتی اور علمی تاریخ کو بھی مدون کیا ہے۔ فتوحات ملکی کے ذکر کے ساتھ عہد فاروقی کے عام حالات،

اخلاق وعادات، مالی، ملکی اور فوجی انتظامات جیسے موضوعات پر بھی مکمل توجہ دی ہے۔ فاضل محقق ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے اپنے جدید طریقہ مطالعہ سے حضرت عمرؓ کے عہد کی نہایت دلچسپ تاریخ ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔ جس میں آپ کی خلافت کے دہ سالہ دور کی ساری معاشرت، سارے انتظامات ملکی، ساری علمی مذہبی اور ادبی زندگی مفصل طور پر ہمارے سامنے آ گئی ہے۔ اس کتاب میں شبلی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ صحیح تاریخ صرف جنگوں اور لڑائیوں کا نام نہیں اصل تاریخ تہذیب انسانی کا دوسرا نام ہے۔ الفاروق میں تمدنی جزئیات کا مواج سمندر موجزن ہے۔ اس سے مورخ کے عمیق مطالعہ، ناقدانہ استقصاء، پُرشوق محنت کا پورا پورا پتہ چلتا ہے۔''(۲۳)

علامہ شبلی نے نظریہ تاریخ میں اسباب وعلل کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔ الفاروق میں یہ پہلو بھرپور طور پر موجود ہے۔ خود ان کو احساس تھا کہ ''یہ امر بھی جتا دینا ضروری ہے کہ اگرچہ میں نے واقعات میں اسباب وعلل کے سلسلے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یورپ کی بے اعتدالی سے احتراز کیا ہے۔'' علامہ شبلی نے دوسرے حصے کی ابتداء میں اولاً یہ بحث کی ہے کہ آخر وہ کون سے اسباب تھے جن کی بدولت ''چند صحرانشینوں نے فارس وروم کا دفتر الٹ دیا۔ کیا یہ تاریخ عالم کا کوئی مستثنیٰ واقعہ ہے؟ آخر اس کے کیا اسباب تھے۔''

غرض یہ کہ علامہ شبلی نے اسباب وعلل کے سلسلے کی تلاش دیانت سے کی ہے۔ انھوں نے مغربی مورخین کے اس نظریہ سے کہ فارس وروم کی سلطنتیں اوج اقبال سے گر گئی تھیں اور کوئی لائق حکمراں موجود نہ تھا سے اسی بنیاد پر اختلاف کیا ہے۔ علامہ شبلی کا خیال ہے کہ مغربی مورخین کا یہ استدلال ''اگرچہ واقعیت سے خالی نہیں تاہم جس قدر واقعیت ہے اس سے کہیں زیادہ طرز استدلال کی ملمع سازی ہے، جو یورپ کا خاص انداز ہے۔''(۲۴) اس کے بعد علامہ شبلی نے مورخانہ انداز سے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ ''فارس وروم کی سلطنتیں اگرچہ اپنی اصل بلندی پر باقی نہیں تھیں، لیکن فنون جنگ سے بخوبی واقف اور منظم تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ

ہوسکتا تھا کہ کسی قوی سلطنت کا مقابلہ نہ کر پاتیں، نہ یہ کہ عرب جیسی بے سروسامان قوم سے ٹکرا کر پرزے پرزے ہوجاتیں۔'' علامہ شبلی اصل سبب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے نزدیک اس سوال کا اصلی جواب صرف اس قدر ہے کہ مسلمانوں میں اس وقت بانیٔ اسلام کی بدولت جو جوش، عزم، استقلال، ہمت، بلند حوصلگی، دلیری پیدا ہوگئی تھی اور جس کو حضرت عمرؓ نے اور قوی اور تیز کر دیا تھا، روم وفارس کی سلطنتیں عین عروج کے زمانے میں بھی اس کی ٹکر نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ البتہ اس کے ساتھ اور بھی چیزیں مل گئی تھیں، جنھوں نے فتوحات میں نہیں بلکہ قیام امن میں مدد دی۔ اس میں سب سے مقدم چیز مسلمانوں کی راست بازی اور دیانت داری تھی۔ جو ملک فتح ہوجاتا تھا وہاں کے لوگ مسلمانوں کی راست بازی کے اس قدر گرویدہ ہوجاتے تھے کہ باوجود اختلاف مذہب کے ان کی سلطنت کا زوال نہیں چاہتے تھے۔'' (۲۵)

یہ اور اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن کا رشتہ مولانا شبلی نے ''اسباب وعلل'' کے سلسلے سے قائم کیا ہے۔

الفاروق میں ''صحت واقعہ'' کا پورا پورا خیال کیا گیا ہے، بلکہ الفاروق اس اصول کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں انھوں نے ہر واقعہ کو اصول صداقت کی رو سے جانچنے کے بعد ہی اخذ ونقل کیا ہے اور بقول ڈاکٹر سید عبداللہ اصول صداقت کے معاملے میں شبلی نے جتنی احتیاط اس کتاب میں روا رکھی ہے شاید کسی اور کتاب میں ملحوظ نہیں رکھی۔ (۲۶)

صحت واقعہ کے لئے اصول روایت ہمیشہ صاحب الفاروق کے پیش نظر رہے۔ انھوں نے ثقہ وضابط راویوں کی مرویات قبول کی ہیں۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ گو روایت کا تعلق اصلاً فن حدیث سے ہے مگر علامہ شبلی نے اسے تاریخ نویسی کے لئے بھی ضروری قرار دیا ہے۔ مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ صدیق خلیفہ تسلیم کئے گئے تو بنو ہاشم نے بیعت کرنے سے انکار کیا اور اپنے موقف پر بضد رہے اور حضرت فاطمہؓ کے گھر جمع ہوکر مشورہ کرتے رہے، جو حضرت عمرؓ کو ناگوار گذرا۔ چنانچہ انھوں نے حضرت فاطمہؓ کے

دروازے پر کھڑے ہو کر کہا یا بنت رسول اللہ! خدا کی قسم! آپ ہم کو سب سے زیادہ محبوب ہیں تاہم اگر آپ کے یہاں لوگ اسی طرح مجمع کرتے رہے تو میں ان لوگوں کی وجہ سے گھر میں آگ لگا دوں گا۔'' (۲۷) حضرت فاطمہؓ کے متعلق حضرت عمرؓ کا یہ رویہ ممکن ہے ایک عقیدت مند کے قلم سے بالارادہ نقل نہ کیا جاتا لیکن علامہ شبلی نے اس سے صرف نظر نہیں کیا بلکہ یہ لکھا کہ ''درایت کے اعتبار سے اس واقعہ کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کی تندی اور تیز مزاجی سے یہ کچھ بعید نہیں۔'' (۲۸) الفاروق میں روایت کے پہلو بہ پہلو درایت سے بھی کام لیا گیا ہے۔ الفاروق کی اس خصوصیت کا اعتراف ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''شبلی نے اس لائف میں بھی درایت کے اصولوں کو نہایت قوت واحتیاط کے ساتھ استعمال کیا ہے اور اسی اصول کی وضاحت کے لئے شاندار علمی دیباچہ لکھ کر گذشتہ اسلامی تاریخ کی بعض خامیوں سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ہم آج ان نقائص کو کیسے دور کر سکتے ہیں۔'' (۲۹)

علامہ شبلی نے مورخین کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ جانبداری سے کام نہ لیں اور الفاروق میں خود انہوں نے اس اصول کی رعایت کی، شاعری اور لفاظی سے بھی انھوں نے احتراز کیا۔ لیکن صاحب سوانح سے ان کی محبت اور ذہنی وابستگی بہر حال ظاہر ونمایاں ہے لیکن یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ انھوں نے واقعیت اور صداقت کے مطابق ہی اس عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

الفاروق میں علامہ شبلی نے اپنے سند وحوالہ کے اصول کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور کوئی بھی واقعہ بغیر سند اور حوالے کے نہیں لکھا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی کم رتبہ کتاب کا حوالہ دیا ہے تو اس بنا پر کہ اس کی تصدیق کسی دوسرے معتبر ماخذ سے کر لی گئی ہے۔ (۳۰) اس کی شہادت الفاروق کے صفحہ صفحہ پر دیکھی جا سکتی ہے۔

غرض الفاروق میں علامہ شبلی نے اپنے اصول تاریخ نویسی کا پورا پورا پاس ولحاظ رکھا ہے اور اس لحاظ سے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو زبان میں تاریخ کی یہ پہلی کتاب ہے جو اصول تاریخ کے بلند معیار پر لکھی گئی۔ مولانا سعید انصاری نے سچ لکھا ہے کہ الفاروق مولانا کے مورخانہ اجتہادات کا بہترین نمونہ ہے۔ (۳۱)

الفاروق کی یہی وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے بے انتہا عوامی مقبولیت کے ساتھ وہ خواص اور اہل علم کے حلقہ کی بھی نورِ نظر ہے۔اس کے مطالعے و جائزے میں مستقل کتابوں کے علاوہ ۴۲ سے زاید مقالے لکھے گئے۔دسیوں کتابوں میں اس کا تجزیہ کیا گیا۔اشاعت کے سو سال مکمل ہونے پر ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی کی تحریک پر دو روزہ قومی سمینار منعقد کر کے کتاب اور صاحب کتاب کو خراج عقیدت پیش کیا۔اس میں پیش کئے گئے علمی مقالات کا مجموعہ ''الفاروق۔ایک مطالعہ'' کے عنوان سے شایع کیا گیا۔اردو کی شاید ہی کسی کتاب کو یہ افتخار ملا ہو۔

حوالے

(۱) سفرنامہ روم و مصر و شام ص ۲

(۲) سیر المصنّفین ج ۲ ص ۴۱۴

(۳) الفاروق حصہ اول ص ۲۷

(۴) حیاتِ شبلی ص ۲۰۰، طبع جدید ۲۰۰۸ء

(۵) الفاروق حصہ ۲ ص ۲۳۲۔ طبع جدید ۲۰۰۸ء

(۶) البصیر شبلی نمبر ص ۶۷

(۷) شذرات سلیمانی حصہ سوم ص ۲۲۵

(۸) البصیر شبلی نمبر ص ۶۷

(۹) الفاروق ص ۱

(۱۰) افادات مہدی ص ۴۵

(۱۱) مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۱۱۵

(۱۲) مقالات شروانی ص ۳۸-۴۶

(۱۳) مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۲۳۵۔ علامہ شبلی کا یہ قول سیرۃ النبی کی تالیف سے پہلے کا ہے۔

(۱۴) سیر المصنّفین ج ۲ ص ۴۲۶

(۱۵) سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۶۷

(۱۶) حیات شبلی ص ۳۲

(۱۷) مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر ص ۵۲

(۱۸) سرسید اوران کے نامور رفقا ص ۱۶۹

(۱۹) سرسید اوران کے نامور رفقا ص ۱۶۹

(۲۰) سیرۃ النبی ج ا دیباچہ ص ۳۹

(۲۱) الفاروق ص ۵۶

(۲۲) سرسید اوران کے نامور رفقا ص ۱۷۰

(۲۳) سرسید اوران کے نامور رفقا ص ۱۶۶

(۲۴) الفاروق دیباچہ ص ۱۸

(۲۵) الفاروق حصہ دوم ص ۵، ۶

(۲۶) سرسید اوران کے نامور رفقا ص ۱۷۰

(۲۷) الفاروق حصہ اول ص ۶۵

(۲۸) ایضاً

(۲۹) سرسید اوران کے نامور رفقا ص ۱۶۲

(۳۰) الفاروق دیباچہ ص ۱۹

(۳۱) مولانا شبلی اردو کے بہترین انشاء پرداز ص ۵۶

الغزالی

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ایک مصلحت کے تحت سر سید احمد خاںؒ الفاروق کی تصنیف کے حق میں نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ہیروز آف اسلام نہیں بلکہ فادر آف اسلام ہیں۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ شبلی الفاروق کے بجائے الغزالی لکھ دیں۔(۱) علامہ شبلی نے اس وقت اگرچہ سکوت اختیار کیا تاہم الغزالی کا خیال ان کے دل سے نہ گیا۔ چنانچہ انھوں نے الفاروق کے بعد الغزالی لکھی، جو ۱۹۰۲ء میں مطبع نامی کان پور میں طبع ہوئی۔ اب تک اس کے مندرجہ ذیل معلوم ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں:

[۱]	▪ مطبع نامی کان پور، طبع اول	۱۹۰۲ء	۲۷۲ص
[۲]	▪ مطبع ہلالی، دہلی	۱۹۱۴ء	۲۱۲ص
[۳]	▪ مطبع تحفہ جنتہ، دہلی	۱۹۱۹ء	۱۶۴ص
[۴]	▪ رنگین پریس، دہلی	۱۹۲۳ء	۱۲۸ص
[۵]	▪ رحمانی پریس، دہلی	۱۹۲۵ء	۱۲۸ص
[۶]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۲۸ء	۲۳۵ص
[۷]	▪ خواجہ پریس، دہلی	۱۹۳۵ء	۱۲۸ص
[۸]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۵۶ء	۲۳۵ص
[۹]	▪ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد	۱۹۷۹ء	۲۳۵ص
[۱۰]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۹۷ء	۲۶۶ص
[۱۱]	▪ دارالتذکیر، لاہور	۲۰۰۶ء	۲۱۸ص

[۱۲] ▪ کتب خانہ نذیریہ، دہلی غیر مورخہ ۲۷۲ص

[۱۳] ▪ ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی

منصوبہ علم الکلام

۱۸۹۸ء میں سرسید احمد خاں کی وفات کے بعد علامہ شبلی علی گڑھ سے مستعفی ہوئے اور حیدرآباد کا رخ کیا اور وہاں سررشتہ علوم وفنون کے ناظم مقرر ہوئے۔ یہاں انھوں نے علم کلام کی تدوین وترتیب کا ایک وسیع منصوبہ بنایا۔ الغزالی کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں:

''علم کلام جو مسلمانوں کی خاص ایجادات میں سے ایک مہتم بالشان علم اور ان کا سرمایہ ناز ہے، میں آج کل اس کی نہایت مبسوط تاریخ لکھ رہا ہوں اور اس کے چار حصے قرار دیئے ہیں۔

۱- علم کلام کی ابتداء۔ اس کے عہد بہ عہد کی تبدیلیاں اور ترقیاں۔

۲- علم کلام نے اثبات عقائد اور ابطال فلسفہ کے متعلق کیا کیا اور کس حد تک کامیابی حاصل کی۔

۳- ائمہ علم کلام کی سوانح عمریاں۔

۴- جدید علم کلام۔(۲)

چنانچہ علم کلام کے اس وسیع علمی منصوبے پر انھوں نے کام کا آغاز کیا اور کئی برس تک مسلسل اس کوچے سے باہر قدم نہیں نکالا۔ اس سلسلہ کے تحت انھوں نے امام غزالی کے حالات اور کارناموں کو قلم بند کرنا شروع کیا تو وہ اس قدر طویل ہوگیا کہ علاحدہ کتابی شکل میں شائع ہوا۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں امام غزالی کی ولادت سے وفات تک کے حالات وسوانح اور دوسرے حصہ میں ان کی تصنیفات اور علمی کارناموں کا مفصل جائزہ ہے۔

پہلا حصہ اور اس کے مباحث

پہلے حصہ کا آغاز امام غزالی کے نام ونسب اور ولادت کے ذکر سے ہوا ہے کہ وہ ۴۵۰ھ (۱۰۵۸ء) میں طابران میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد رشتہ فروش تھے۔ اسی مناسبت سے ان کا

خاندان غزالی کہلاتا تھا۔علامہ شبلی نے علامہ سمعانی کے اس بیان کو کہ وہ غزالہ نامی ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ ضلع طوس میں غزالہ نام کا کوئی گاؤں ہی نہیں۔(۳) اس کے بعد امام صاحب کی تعلیم وتربیت کا ذکر ہے۔ابتدائی تعلیم اور طریقۂ تعلیم کے ذکر کے بعد امام صاحب کی یادداشتوں کے لٹ جانے کا واقعہ لکھا ہے:

''اس زمانہ میں درس کا قاعدہ یہ تھا کہ استاذ مطالب علمیہ پر جو تقریر کرتا تھا۔ شاگرد اس کو قلم بند کرتے جاتے تھے اور نہایت احتیاط سے محفوظ رکھتے تھے۔ان یادداشتوں کو تعلیقات کہتے تھے۔ چنانچہ امام صاحب نے بھی تعلیقات کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ چند روز کے بعد وطن واپس آئے۔اتفاق سے راہ میں ڈاکہ پڑا اور امام صاحب کے پاس جو کچھ سامان تھا سب لٹ گیا۔اس میں وہ تعلیقات بھی تھیں جو امام ابونصر نے لکھوائی تھیں۔امام صاحب کو اس کے لٹ جانے کا نہایت صدمہ تھا۔ چنانچہ ڈاکوؤں کے سردار کے پاس گئے اور کہا کہ میں اپنے اسباب اور سامان میں سے صرف اس مجموعہ کو مانگتا ہوں کیوں کہ میں نے ان ہی کے سننے اور یاد کرنے کے لئے سفر کیا تھا۔وہ ہنس پڑا اور کہا کہ تم نے خاک سیکھا۔ جب کہ تمہاری یہ حالت ہے کہ ایک کاغذ نہ رہا تو تم کورے رہ گئے۔ یہ کہہ کر اس نے وہ کاغذ واپس کر دیا۔امام صاحب پر اس کے طعنہ آمیز فقرے نے ہاتف غیبی کی آواز کا اثر کیا۔ چنانچہ وطن پہنچ کر وہ یادداشتیں زبانی یاد کرنی شروع کیں۔ یہاں تک کہ پورے تین برس صرف کر دیے اور ان مسائل کے حافظ بن گئے۔''(۴)

اس کے بعد امام غزالی نے تحصیل علم کے لئے نیشاپور کا رخ کیا۔علامہ شبلی نے اس کی تفصیل قلم بند کرنے کے ساتھ نیشاپور کی علمی مرکزیت، امام الحرمین کی شاگردی اور ان کے حالات اور امام غزالی سے ان کے قرب وتعلق اور تحصیل علم پر بھی روشنی ڈالی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''امام غزالی نے ان کی خدمت میں پہنچ کر نہایت جدوجہد سے علم کی تحصیل شروع کی۔ یہاں تک کہ تھوڑی ہی مدت میں تحصیل علم سے فارغ ہو کر تمام

اقران میں ممتاز ہو گئے۔'' (۵)

اس کے بعد امام غزالی نے نیشا پور کو خیر باد کہہ دیا، اس کی تفصیل ہے۔ پھر اس وقت کی ملکی حالت اور خاندان سلجوقیہ کی مختصر تاریخ، اس لئے قلم بند کی گئی ہے کہ اس سے امام غزالی وابستہ رہے۔ خاص طور سے ملک شاہ اور نظام الملک اور ان کی علم اور اہل علم سے دلچسپی کا ذکر ہے۔ امام غزالی چونکہ اس کے دربار سے وابستہ ہوئے، مناظروں میں فوقیت حاصل کی۔ یہاں تک کہ محض ۳۴ برس کی عمر میں مدرسہ نظامیہ کے مدرس اعظم مقرر ہوئے، چونکہ یہ اس دور کا ایک بڑا منصب تھا، اس لئے علامہ شبلی نے ان سب حالات کو تسلسل سے سپرد قلم کیا ہے۔ حکومت میں ان کے مقام ومرتبہ اور اثر ورسوخ کا بھی تذکرہ کیا ہے اور سلاطین سلجوقیہ کی فرمائش پر جو کتابیں لکھی گئیں، ان کی تفصیل بیان کرنے کے بعد امام غزالی کے سلطنت سے ترک تعلق اور عزلت وسیاحت کا باب ہے۔ جس میں فرق اسلامی، علم کلام، فلسفہ، تصوف، ترک طعام وغیرہ کی تفصیل کے ساتھ بے خودی میں بغداد سے نکلنا، دمشق میں قیام، شیخ فارمدی سے بیعت، بیت المقدس کا سفر، حج وزیارت اور اس سفر کے بعض دلچسپ واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ امام غزالی نے مقام خلیل میں تین باتوں کا عہد کیا تھا:

[۱] کسی بادشاہ کے دربار میں نہ جاؤں گا۔

[۲] کسی بادشاہ کا عطیہ نہ لوں گا۔

[۳] کسی سے مناظرہ ومباحثہ نہ کروں گا۔

علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ امام غزالی مرتے دم تک ان کے پابند رہے۔ (۶) اسی سفر میں انھوں نے احیاء العلوم تصنیف کی، اس کی تفصیل کے ساتھ دوبارہ درس وتدریس سے وابستگی کے ساتھ امام غزالی کے حاسدین کا ذکر ہے۔ پھر سلطان سنجر کا امام غزالی کو طلب کرنے کا واقعہ اور ان کے انکار کا ذکر ہے۔ سلطان سنجر کو انھوں نے جو خط لکھا تھا شبلی نے اسے بھی نقل کیا ہے۔ دوبارہ اصرار اور امام غزالی کی معذرت کی بھی تفصیل ہے۔ اس کے بعد ان کے فن حدیث کی تکمیل اور اخیر عمر کی تصانیف کا ذکر ہے۔ ۵۰۵ھ [۱۱۱۱ء] میں بمقام طابران انھوں نے وفات پائی۔ اس کے ذکر کے ساتھ ان کی اولاد اور ان کے تلامذہ کے نام اور مختصر احوال ہیں۔

اس طرح ۳۷ صفحات میں امام غزالی کی سوانح ہے۔ بقیہ پوری کتاب ان کی تصانیف اوران کے افکار وخیالات پر مشتمل ہے۔ اسی اختصار کے سبب بعض نقادوں نے الغزالی پر اعتراضات وارد کئے ہیں اورسوانحی لحاظ سے اسے کمتر قرار دیا ہے۔(۷) حالانکہ معاملہ محض اس قدر ہے کہ بنیادی طور پر یہ کتاب علم الکلام کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں اسی پہلو کو زیادہ واضح اور نمایاں کیا گیا ہے۔لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ قصداً ان کے سوانح لکھنے سے احتراز کیا گیا ہے بلکہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نہ کم رتبہ ہے اور نہ امام غزالی کی شان سے فروتر۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ علامہ شبلی سے پہلے امام غزالی کے حالات اور کارناموں پر مشتمل کوئی مبسوط اور جامع تصنیف موجود نہ تھی۔

دوسرا حصہ اوراس کے مباحث

الغزالی کے دوسرے حصے میں امام غزالی کی تصنیفات کا مختلف نوعیّتوں سے جائزہ لیا گیا ہے۔امام غزالی کثیر التصانیف ہیں۔ان کی تصنیفی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> ''تصنیفات کے لحاظ سے امام صاحب کی حالت نہایت حیرت انگیز ہے۔ انھوں نے کل ۵۴-۵۵ برس کی عمر پائی ،بیس برس کی عمر سے تصنیف کا مشغلہ شروع ہوا، دس گیارہ برس صحرانوردی اور بادیہ پیمائی میں گذرے، درس وتدریس کا شغل ہمیشہ قائم رہا اور کبھی کسی زمانے میں ان کے شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے کم نہیں رہی ،فقر وتصوف کے مشغلے جدا۔ دور-دور سے جو فتاوے آتے تھے ان کا جواب لکھنا الگ، بایں ہمہ سیکڑوں کتابیں تصنیف کیں جن۔ میں بعض بعض کئی کئی جلدوں میں اور گونا گوں مضامین سے پر ہیں اور جو تصنیف ہے اپنے باب میں بےنظیر ہے۔ سچ ہے:
>
> ایں سعادت بزور بازو نیست(۸)

اس کے بعد امام غزالی کی تصنیفات کی الف بائی اور موضوعاتی فہرست دی گئی ہے۔ جن میں ان کی ۷۸ کتابوں کے نام درج ہیں اور ایک کتاب یاقوت التاویل فی التفسیر ۴۰ جلدوں

میں ہے۔ پھر ان چار کتابوں کا ذکر ہے جن کے بارے میں اعتراض ہے کہ یہ امام غزالی کی تصنیفات نہیں۔ان کے نام یہ ہیں: [۱]منخول [۲]مضنون به علی غیر اهله [۳]کتاب النفخ والتسویه [۴]سر العالمین. پھر ان کا مفصل جائزہ لے کر علامہ شبلی نے ثابت کیا ہے کہ دراصل یہ کتابیں امام غزالی ہی کی تصنیف ہیں۔(۹)

امام غزالی کی تصنیفات پر مختلف حیثیتوں سے بحث وتحقیق،الغزالی کا ایک اہم باب ہے۔مثلاً تصنیف کا اوسط،موضوع کی تعیین،اور امام غزالی کی تصنیفات کی مقبولیت اور خاص طور سے علماء کے اعتناء وغیرہ کا ذکر کر کے ان کی عظمت اور قدر و قیمت واضح کی گئی ہے۔امام غزالی کی تصنیفات مشرق سے زیادہ مغرب میں مقبول ومتداول رہیں۔علامہ شبلی اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ عجیب بات ہے کہ امام صاحب کی تصنیفات کے ساتھ جو اعتناء یورپ نے کیا خود مسلمانوں نے نہیں کیا۔ بے شبہ مسلمانوں نے امام صاحب کی اکثر تصنیفات محفوظ رکھیں اور ان پر شروح وحواشی لکھے۔لیکن یہ التفات اور قدردانی صرف ان تصنیفات کے ساتھ محدود رہی جو فقہ،اصول فقہ،اور تصوف واخلاق کے متعلق تھیں۔عقلیات میں جو ان کی معرکہ آراء تصنیفات ہیں اور جہاں آ کر ان کا اصلی جوہر کھلتا ہے،ان کو کسی نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ بلکہ اس قسم کی کتابوں کو ہمارے علماء ان سے منسوب بھی نہیں ہونے دیتے۔''(۱۰)

اس کے بعد ان کی اہم تصنیفات مثلاً منخول، مقاصدالفلاسفه، المنقد، تهافة الفلاسفه اور میزان العمل وغیرہ کا اجمالی تعارف،ان سے یورپ کا اعتناء اور یورپ میں مقبولیت وغیرہ کی وضاحت کی ہے۔

امام غزالی شاعر بھی تھے۔فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ علامہ شبلی نے ان کی دونوں زبانوں کی شاعری پر نقد وتبصرہ کیا ہے۔فارسی شاعری کی بڑی مدح و ستائش کی ہے۔البتہ عربی شاعری کو عامیانہ قرار دیا ہے۔(۱۱)

امام غزالی مختلف علوم وفنون کے جامع تھے۔ چنانچہ ان کی تصنیفات کے موضوعات

میں بھی بڑا تنوع ہے۔تا ہم بقول علامہ شبلی انھوں نے تخصیص کے ساتھ جن علوم کو ترقی دی وہ فقہ، اصول فقہ، کلام اور اخلاق ہیں۔ فقہ میں ان کی تین کتابیں وسیط، وجیز، بسیط شافعی فقہ کے تین ارکان ہیں۔(۱۲) اور غالباً یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی نے انھیں نظر انداز کر دیا ہے۔

اس کے بعد علامہ شبلی نے امام غزالی کی انتہائی معرکہ آرا کتاب احیاء العلوم کا مختلف نوعیّتوں سے جائزہ لیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ نقد وتبصرے کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس کے ضمن میں پہلے ان یونانی تصنیفات کا ذکر ہے جن کے عربی میں ترجمے ہوئے۔ مترجمین کی فہرست اور ان کا مختصر تعارف بھی درج کیا گیا ہے۔ علم الاخلاق میں مذہبی طرز کی کتابوں کے ذکر کے علاوہ اس کی مقبولیت اور عدم مقبولیت کا بھی ذکر ہے۔ پھر علامہ شبلی نے ثابت کیا ہے کہ احیاء العلوم دونوں طرز کی جامع ہے۔(۱۳) علامہ شبلی نے ان کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کے انداز پر احیاء العلوم لکھی گئی۔ اس سے ان کے وسیع مطالعے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ احیاء العلوم کا زمانہ تصنیف اور اس کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد علامہ شبلی نے احیاء العلوم کے فلسفہ اخلاق کی نشاندہی کی ہے اور یہ بھی نشاندہی کی ہے کہ اس میں کس قدر حکمائے یونان کا حصہ ہے۔ امام غزالی نے فلسفہ اخلاق میں کیا اضافہ کیا، علامہ شبلی نے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ رائے جلی، خفی اور اخفی اور دوسرے اخلاقی اور فلسفیانہ مسائل ومباحث کو اس طرح بیان کیا ہے کہ پانی پانی کر دیا ہے۔

اس کے بعد امراض اخلاق کے اسباب اور علاج پر بحث کی ہے۔ اس سلسلہ میں غیبت، غصہ وغضب، حسد اور رشک وغیرہ عنوانات قائم کر کے اس کا مختلف نوعیّتوں سے جائزہ لیا ہے اور اخلاق اور احیاء العلوم پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد علامہ شبلی اصل موضوع یعنی علم کلام میں امام غزالی کی عظمت اور ان کے کلامی کارنامے بیان کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''شہرت عام کے لحاظ سے علم کلام کو امام غزالی کے ساتھ وہی نسبت ہے جو ارسطو کو منطق کے ساتھ۔ ابن خلدون نے علانیہ دعوی کیا ہے کہ امام غزالی سے پہلے علم کلام میں فلسفہ کی آمیزش نہ تھی۔ فلسفیانہ طرز پر سب سے پہلے امام صاحب ہی نے اس فن کو مرتب کیا۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ علم کلام کی تاریخ میں ہم نے اس بحث کو نہایت مفصل لکھا ہے۔ یہاں صرف اس قدر جان

لینا چاہئے کہ علم کلام میں ابتداء سے دوطریقے قائم ہو گئے تھے۔عقلی و نقلی۔علم کلام خود اسلامی فرقوں یعنی معتزلہ، قدریہ، جبریہ، وغیرہ کے مقابلہ میں ایجاد ہوا تھا۔ ابن خلدوں نے مقدمہ تاریخ میں جس کلام کا ذکر کیا ہے وہ یہی علم کلام ہے۔عقلی علم کلام دیگر مذاہب کے مقابلے ایجاد ہوا تھا۔نقلی علم کلام کی بھی متعدد شاخیں تھیں۔ظاہریہ، ماتریدیہ، اشعریہ، امام غزالی اشعریہ فرقہ کے پیرو تھے، جس کے بانی اول امام ابوالحسن اشعری تھے۔ یہ سب طریقے اول اول فلسفہ اور عقلیات سے کچھ تعلق نہیں رکھتے تھے۔اشعریہ میں سے سب سے پہلے باقلانی نے بعض بعض فلسفیانہ اصطلاحیں داخل کیں۔امام الحرمین وغیرہ نے اس میں اضافہ کیا۔ امام غزالی نے اس قدر ترقی دی کہ نقلی ہونے کے بجائے عقلی بن گیا۔''(۱۴)

علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ علم کلام حقیقت میں دو چیزوں کا نام ہے، اثبات اور ابطال۔ یعنی فلسفہ وغیرہ کا ابطال اور عقائد اسلام کا اثبات۔(۱۵) امام غزالی نے دونوں پہلوؤں کو لیا ہے۔ چنانچہ فلسفہ کا ابطال کے عنوان سے اس پر مفصل بحث و تحقیق کی ہے۔البتہ ان ابطال شدہ مسائل کی تفصیل درج نہیں کی گئی ہے۔اس کی وجہ بتاتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''امام صاحب نے ان مسائل پر جو کچھ لکھا ہے ان پر اگر ریویو کیا جائے تو ہماری کتاب صدرا یا شمس بازغہ بن جائے گی۔''(۱۶)

البتہ چند مسائل مثلاً یونانی کس طریقہ سے حقائق اشیا پر استدلال کیا کرتے تھے کو اجمالاً قلم بند کیا ہے۔چند عام مسائل کے بعد ایک خاص مسئلہ پر کہ یونانی عالم کے قدم کے قائل تھے۔ امام غزالی کے خیالات پیش کئے ہیں۔

اس کے بعد اثبات عقائد پر امام صاحبؒ کے خیالات و نظریات پر نقد و تبصرہ کیا ہے۔اسی میں امام صاحب کے قدیم علم کلام سے ربط و تعلق پر بحث کی گئی ہے۔امام غزالی کی تصنیف ''التفرقہ بین الاسلام والزندقہ'' پر تبصرہ کے بعد الٰہیات، صفات باری، نبوت، معجزات، تکالیف شرعیہ اور عذاب و ثواب، معاد واقعات بعد الموت جیسے کلامی مباحث کے سلسلے میں امام غزالی کے خیالات و نظریات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

الغزالی کے دیگر اہم مباحث تصوف، مجددیت، عقائد کی اصلاح، تعلیم کی اصلاح، اخلاق کی اصلاح، ملکی اصلاح ہیں۔ چونکہ علامہ شبلی خود ان موضوعات پر گہری نظر اور ان سے گہری دلچسپی رکھتے تھے، اس لئے امام غزالی کے خیالات و نظریات کی تشریح و توضیح بھی جی لگا کر کی ہے اور اس طرح کی ہے کہ تمام باتیں واضح ہوتی چلی جاتی ہیں۔ مثلاً امام غزالی نے اخلاقی بگاڑ کا ذمہ دار علماء کو قرار دیا ہے۔ غالباً یہی نقطۂ نظر علامہ شبلی کا بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''کوئی شخص اگر امام صاحب کے تمام حالات اور خیالات کو غور کی نگاہ سے دیکھے گا تو اس کو صاف نظر آئے گا کہ امام صاحب کو سب سے زیادہ جس چیز کا رونا ہے وہ علماء کی حالت ہے۔ یہ آگ ان کے دل میں اس قدر بھری ہوئی ہے کہ ذرا سی تحریک سے فوراً بھڑک اٹھتی ہے، کسی قسم کا ذکر ہو، کوئی بحث ہو، کوئی تذکرہ ہو، یہ پر درد ترانہ خواہ مخواہ ان کی زبان پر آجاتا ہے اور احیاء العلوم تو سراپا اسی نوحہ سے لبریز ہے۔ غرور، جاہ، ریا وغیرہ عیوب نفسانی پر جو مضامین لکھے ہیں سب میں تصریح ہے کہ یہ عیوب سب سے زیادہ علماء میں ہیں۔'' (۱۷)

امام غزالی نے محض علماء کو ذمہ دار ہی نہیں قرار دیا ہے بلکہ اس کے اسباب بھی تلاش کئے ہیں اور ان کا مداوا بھی پیش کیا ہے۔ یہ تمام تفصیلات علامہ شبلی نے لکھی ہیں۔

علامہ شبلی نے امام غزالی پر خارجی اثرات کی بھی نشاندہی کی ہے اور اس قدر تحقیق و تدقیق سے کی ہے کہ موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ آخر میں امام غزالی کی مخالفت کا جو طوفان اٹھا اور جن وجوہات سے اٹھا اس کی تفصیل ہے۔

غرض اس کتاب میں امام غزالی کی سوانح، شخصیت اور ان کے عظیم الشان کارناموں کی پوری داستان سمٹ آئی ہے۔ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ خشک کلامی مباحث پر مشتمل ہونے کے باوجود اس کی نثر شستہ و شگفتہ ہے۔ اس کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں امام غزالی کی شخصیت کے دونوں رخوں کو پیش کیا ہے۔ جہاں ان کی عظمت و بلند پائیگی کے گن گائے گئے ہیں، وہیں ان کی بعض کمزوریوں اور خامیوں کا بھی ذکر ہے۔ مثلاً علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''اس بات کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ امام صاحب کی بعض تصنیفات میں

واقعی بعض باتیں مواخذہ کے قابل ہیں ۔مثلاً احیاء العلوم میں احادیث کے نقل کرنے میں نہایت بے احتیاطی کی ہے ۔سیکڑوں ہزاروں حدیثیں موضوع اور ضعیف نقل کردی ہیں ،جن کا کتب احادیث میں کہیں پتہ نہیں ۔احادیث پر موقوف نہیں بزرگان سلف کے متعلق جو واقعات لکھے ہیں اکثر دوراز کار اور بعید از عقل ہیں اور بجز عوام کے کوئی شخص ان پر یقین نہیں کرسکتا۔اسی کے ساتھ مجاہدہ کے بیان میں ایسی باتیں لکھ دی ہیں جو اعتدال سے متجاوز ہیں ۔............ بہر حال امام صاحب امام تھے،پیغمبر نہ تھے اور پیغمبر کے سوا کسی شخص کو عصمت کا رتبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔''(۱۸)

چند اعتراضات اور اس کی حقیقت

الغزالی پر بعض اہل قلم نے اعتراضات کیئے ہیں۔مثلاً ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ:

''الغزالی ایک عمدہ کتاب ہے مگر اچھی سوانح عمری نہیں۔اس میں حضرت امام کے ذہنی کارناموں پر خاص توجہ کی گئی ہے مگر جزئیات زندگی کم ہیں اور شخصیت کی تصویر نامکمل ہے۔اس کی فضا گھٹی ہوئی اور بندسی ہے۔سوانح نگار کا قلم کچھ رک رک کر چل رہا ہے۔''(۱۹)

ڈاکٹر سید عبداللہ کا یہ اعتراض کہ اچھی سوانح عمری نہیں درست نہیں۔کیوں کہ الغزالی میں امام غزالی کی شخصیت کے تمام نقوش ابھارے گئے ہیں ۔البتہ جزئیات زندگی کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔مستند مواد و معلومات کی کمی علامہ شبلی کی مجبوری بھی ہوسکتی ہے کہ اس سے پہلے امام صاحب پر کوئی کام نہیں ہوا تھا۔لیکن اس سے شخصیت کی مرقع آرائی میں کمی کا احساس کیسے پیدا ہوا۔دراصل انہوں نے حیدرآباد کی سیاسی فضا کو سامنے رکھ کر یہ تنقید کی ہے، حالانکہ علامہ شبلی نے الغزالی میں جن عنوانات کو نمایاں کیا ہے وہ اس دور کی تمام حکومتوں کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔مثلاً حق گوئی،آزادی رائے وغیرہ۔

شیخ اکرام نے لکھا ہے کہ ''افسوس کہ مولانا نے الغزالی میں اپنے موضوع کا حق ادا نہیں

کیا۔'' (۲۰) جب کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ ''شبلی اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں۔ الغزالی کے ذریعہ انھوں نے جن رجحانات کی ہمت افزائی کی ہے وہ یہ ہیں: علماء کی اندرونی خرابیوں کی اصلاح، حکام اور سلاطین کے سامنے آزادی اور حق گوئی کی اہمیت، فلسفہ وعقلیات کے مطالعہ کی اہمیت وغیرہ۔ (۲۱)

الطاف فاطمہ نے فنی اعتبار سے جھول اور مواد کی بے ترتیبی کا ذکر کیا ہے اور ثبوت میں مہدی افادی کے نام علامہ شبلی کے ایک خط سے اقتباس نقل کیا۔ (۲۲) حالانکہ اس خط میں محض یہ عبارت ہے کہ ''بے شبہہ غزالی کو بہت کچھ سمیٹا ہے'' سمیٹنے کا مفہوم مواد کی بے ترتیبی خیال کرنا خوبی کو خامی میں بدلنا ہے۔ اسے کم فہمی اور تنقید برائے تنقید کے علاوہ کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

ایک بنگالی اہل قلم محمد منصور الدین نے اگر چہ الغزالی سے دلچسپی لی اور بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا۔ [رسالہ شئے تک ڈھاکہ] تاہم علامہ شبلی کی دیگر سوانحی تصنیفات کی بہ نسبت اس سے کم سروکار رکھا گیا۔ ادیبوں اور نقادوں نے اسے علم الکلام کی کتاب قرار دے کر سوانح نگاری کے اصولوں کے پس منظر میں تنقیدیں کیں اور علماء نے کلامی مباحث میں شبلی کے بعض نقطہ نظر کی وجہ سے اعتناء نہیں کیا۔ حالانکہ اس کا موضوع اور مقصد سب علامہ شبلی نے واضح کر دیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب کسی نوع سے کم رتبہ نہیں اور امام غزالی کے حالات وسوانح، افکار ونظریات اور ان کے فلسفہ وکلام کی اس سے عمدہ اب تک تشریح وتوضیح نہ کی جا سکی۔ ممکن ہے دنیا کی دوسری زبانوں میں کوئی تحقیق سامنے آئی ہو لیکن کم از کم اردو کے دامن میں اس سے بہتر اب تک کوئی کتاب نہیں آئی۔

حوالے

(۱) حیات شبلی ص ۲۳۶

(۲) الغزالی طبع جدید، دار المصنّفین اعظم گڑھ۔ ص ۳ مقدمہ

(۳) ایضاً ص ۳

(۴) ایضاً ص ۳-۴

(۵) ایضاً ص ۶-۷

(۶) ایضاً ص۲۲-۲۳

(۷) اردو ادب میں فن سوانح نگاری ص۱۳۴و مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ ص۲۰۸

(۸) الغزالی ص۳۸

(۹) ایضاً ص۴۱-۴۴

(۱۰) ایضاً ص۴۷-۴۸

(۱۱) ایضاً ص۵۲

(۱۲) ایضاً

(۱۳) ایضاً ص۵۵

(۱۴) ایضاً ص۱۰۳-۱۰۴

(۱۵) ایضاً ص۱۰۴

(۱۶) ایضاً ص۱۱۶

(۱۷) ایضاً ص۲۰۵

(۱۸) ایضاً ص۲۵۰

(۱۹) سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص۱۴۶

(۲۰) شبلی نامہ ص۱۰۲

(۲۱) سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص۱۴۶

(۲۲) اردو ادب میں فن سوانح نگاری ص۱۳۴۔ مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ ص۲۰۹۔

علم الکلام

علامہ شبلی نے علم الکلام کی تاریخ وتدوین نو کا ایک منصوبہ بنایا تھا۔جس کا ذکر گذشتہ اوراق میں آچکا ہے، یہ کتاب اس کی پہلی کڑی اور اصلاً الکلام کا دیباچہ ہے۔

طبع واشاعت

علم الکلام ۱۹۰۲ء میں پہلی بار مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوئی اور اب تک اس کے درج ذیل ایڈیشن نکل چکے ہیں:

[۱]	▪ مطبع مفید عام، آگرہ، طبع اول	۱۹۰۲ء	۲۰۴ص
[۲]	▪ مطبع احمدی، علی گڑھ	۱۹۰۲ء	۳۰۴ص
[۳]	▪ عمدۃ المطابع لکھنو	۱۹۰۶ء	۳۰۸ص
[۴]	▪ مطبع نامی، کان پور	۱۹۱۴ء	۳۰۸ص
[۵]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۲۳ء	۲۰۴ص
[۶]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۳۹ء	۲۱۸ص
[۷]	▪ نفیس اکیڈمی، کراچی	۱۹۵۲ء	
[۸]	▪ مسعود پبلشنگ ہاؤس، کراچی	۱۹۶۴ء	۳۶۸ص
[۹]	▪ نفیس اکیڈمی، کراچی	۱۹۷۹ء	
[۱۰]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۹۳ء	۱۹۹ص
[۱۱]	▪ انوارالمطابع لکھنؤ	غیر مورخہ	۲۵۳ص

ترجمہ

شبلی کی یہ کتاب بھی ہندوستان سے نکل کر ایران پہنچی۔ سید محمد تقی فخر داعی گیلانی نے فارسی میں ترجمہ کیا جو ۱۳۲۸ش میں تہران سے شائع ہوا۔ ۱۳۳۰ش میں اس کا دوسرا ایڈیشن بھی طبع ہوا۔ ۱۳۸۶ھ میں اساطیر، ایران نے تیسرا ایڈیشن شایع کیا۔

علم کلام، اس کی تاریخ، عہد بہ عہد ارتقاء، مشہور متکلمین اور ان کی کاوشیں، غرض اس کے تمام پہلوؤں پر علامہ شبلی کی گہری نظر تھی۔ اس کا انھوں نے بڑی گہرائی اور باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا۔ نئے حالات اور زمانہ کے اقتضاءات کے لحاظ سے وہ جدید علم کلام کی تدوین وترتیب ضروری خیال کرتے تھے۔ علماء سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''دوسرا بہت بڑا فرض جو علماء پر ہے وہ اس وقت دہریت والحاد کے اثر کا روکنا ہے۔ جو آج کل یورپ میں پھیل کر ہندوستان کی طرف بڑھتا آتا ہے۔ غالبًا اس مرض کے پھیلنے سے کسی کو انکار نہیں گفتگو جو کچھ ہے وہ علاج کے طرز وطریقے میں ہے۔لیکن میرے نزدیک ہم کو اس باب میں زیادہ غور وفکر کی حاجت نہیں، یہ بیماری پہلے بھی ایک دفعہ اسلامی ممالک میں پھیل چکی ہے اور اطبائے شریعت یعنی علمائے سلف کا علاج اس کے دفع کرنے مین کارگر ثابت ہوا۔ عباسیوں کا اول اول زمانہ تھا کہ فلسفہ یونان کا ترجمہ ہوا اور ساتھ ہی چاروں طرف الحاد کی ہوا چل گئی۔ اکثر فقہا اور بعض محدثین نے اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ سرے سے فلسفہ پڑھا نہ جائے۔ یہاں تک کہ علم کلام کو اس لحاظ سے ممنوع قرار دیا کہ اس میں عقلیات کی آمیزش تھی۔ امام شافعی کا قول ہے کہ ''ان یضربوا بالجرید ویطاف بھم فی القبائل'' یعنی اہل کلام کے بارے میں میرا فیصلہ ہے کہ ان کے درے لگائے جائیں اور قبائل میں ان کی تشہیر کی جائے۔ اس علاج نے بلحاظ حالات موجودہ کسی قدر فائدہ دیا یعنی بعض نیک دل فلسفہ پڑھنے سے رک گئے لیکن پورا نفع نہ ہوا۔ کیوں کہ سیکڑوں ہزاروں

مسلمان منطق وفلسفہ پر ایسے فریفتہ ہوگئے تھے کہ اس کو بالکل چھوڑ نہ سکتے تھے۔ آخر علما نے دوسرا علاج سوچا، یعنی فلسفہ کے مسائل پر اطلاع حاصل کر کے فلسفہ کے رد کے لئے علم کلام ایجاد کیا۔ اس علاج کے مجوز امام غزالی، امام رازی، ابن رشد، قاضی عضد وغیرہ تھے اور واقعی یہ ان کی تدبیر نہایت کارگر نکلی۔ اسی کا اثر ہے کہ اگر چہ درس نظامیہ میں تمام علوم وفنون سے زیادہ منطق وفلسفہ کی کتابیں زیر درس ہیں، تاہم مذہبی عقائد کو ان سے کچھ ضرر نہیں پہنچا۔

ہمارے زمانہ میں بھی اس مرض نے ظہور کیا ہے اور پہلی قسم کا علاج بھی ہو چکا ہے۔ اب اگر وہ علاج مفید ثابت ہو تو فبہا ورنہ دوسری قسم کا علاج شروع کیا جائے اور امام غزالی اور امام رازی کی روحیں تازہ کی جائیں۔"(۱)

علامہ شبلی نے اپنے یہ خیالات ندوہ کے اجلاس منعقدہ ۱۲/اپریل ۱۸۹۵ء میں ظاہر کئے تھے۔ لیکن علماء میں کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ چنانچہ پانچ سال بعد انھوں نے علم کلام کی تدوین کا ایک وسیع منصوبہ بنایا جو کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ علم الکلام اس سلسلے کا پہلا حصہ ہے۔

اس میں علم الکلام کے آغاز وارتقاء، وسعت وترقی اور عہد بہ عہد کے تغیرات کی تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔ حکمائے اسلام اور ان کی بعض کاوشوں پر عالمانہ نقد وتبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ علامہ شبلی اس کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عباسیوں کے زمانہ میں اسلام کو جس خطرہ کا سامنا تھا آج اس سے کچھ بڑھ کر اندیشہ ہے۔ مغربی علوم گھر گھر پھیل گئے ہیں اور آزادی کا یہ عالم ہے کہ پہلے زمانہ میں حق کہنا اس قدر سہل نہ تھا جتنا آج ناحق کہنا آسان ہے۔ مذہبی خیالات میں عموماً بھونچال سا آ گیا ہے۔ نئے تعلیم یافتہ بالکل مرعوب ہوگئے ہیں۔ قدیم علماء عزلت کے دریچہ سے کبھی سر نکال کر دیکھتے ہین تو مذہب کا افق غبار آلود نظر آتا ہے۔ ہر طرف سے صدائیں آرہی ہیں کہ پھر ایک نئے علم کلام کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو سب نے تسلیم کرلیا ہے۔............ اس بنا پر

مدت سے میرا ارادہ تھا کہ علم الکلام کو قدیم اصول اور موجودہ مذاق کے موافق مرتب کیا جائے لیکن میں نے اس کے لئے ضروری سمجھا کہ پہلے علم کلام کی مفصل تاریخ لکھی جائے۔''(۲)

مشمولات

علم الکلام کا آغاز اختلاف عقائد کی بحث سے ہوا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام میں اختلافات کس طرح شروع ہوئے اور اس کے اسباب کیا تھے۔ سبب اختلاف کے ضمن میں لکھا ہے:

''جب اسلام کو زیادہ وسعت ہوئی اور ایرانی، یونانی، قبطی وغیرہ قومیں اسلام کے حلقہ میں آئیں تو عقائد کے متعلق نکتہ آفرینیاں شروع ہوگئیں۔ اس کا ایک سبب تو وہی تھا کہ عجمی قوموں کا مذاق ہی یہ تھا کہ بال کی کھال نکالتے تھے اور بات کا بتنگڑ بناتے تھے۔''(۳)

اس کے بعد عہد عباسی میں علم کلام کی تدوین وترویج اور اس کے عروج وزوال کی تفصیل ہے۔ پانچویں صدی تک کے علم کلام کی تاریخ پہلے دور میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں عقلی علم کلام، وجہ تسمیہ، اس کی مقبولیت ومخالفت، مشہور متکلمین اور ان کے کلامی عقائد ونظریات پر بحث وتنقید ہے۔ دوسرے دور میں غزالی ورازی یعنی اشاعرہ کے علم کلام کا ذکر ہے، جس میں ذات الٰہی، صفات الٰہی اور سمعیات [قیامت، منکر نکیر، عذاب قبر، میزان قیامت، پل صراط، بہشت ودوزخ کا وجود، احکام امامت، صحابہ کی فضیلت، امامت کے شرائط، امام مشروط موجود نہ ہو تو سلطان وقت کے احکام وغیرہ] کی تفصیل ہے۔ اس میں چند صفحات میں ماتریدیہ کا بھی ذکر ہے۔ تیسرے دور میں ابن رشد، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ (ف: ۸/اگست ۱۷٦۲ء) کی کلامی خدمات اور ان کے افکار وخیالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان تینوں ادوار کے علم کلام کی تاریخ کے بعد حکمائے اسلام پر ایک باب ہے، جس میں فارابی، بوعلی سینا، ابن مسکویہ اور شیخ الاشراق کے فکر وفلسفہ سے بحث کی گئی ہے۔ خاص طور سے روح، نبوت، اور وحی کے سلسلہ میں حکمائے اسلام کے خیالات اور متکلمانہ

استدلال پر علامہ شبلی نے روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں ''علم کلام پر ایک اجمالی نظر'' کے عنوان سے علم کلام کی دیگر جزئیات پر عالمانہ نقد وتبصرہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اس کتاب میں قدیم علم کلام بلکہ فکر اسلامی کی بارہ سو برس کی پوری تاریخ آ گئی ہے۔ بلاشبہ اپنے موضوع پر اردو میں یہ پہلی کتاب تھی یہی وجہ ہے کہ اہل علم اور خاص طور سے علماء کے درمیان یہ کتاب عرصہ تک زیر بحث وتنقید و نزاع رہی۔

اعتراضات اور اس کی حقیقت

علم کلام کے سلسلہ میں علامہ شبلی کا خیال تھا کہ یہ ''مسلمانوں کی ایجادات میں ایک مہتم بالشان علم اور ان کا سرمایہ ناز ہے۔'' (۴) اور اسی فکر وخیال کی وجہ سے انھوں نے اس کی تدوین کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کے ذریعہ وہ علماء کو ایک خاص سطح پر لانا چاہتے تھے۔ (۵) مگر حقیقت یہ ہے کہ علم کلام کے سلسلہ میں مسلمانوں میں ہمیشہ اختلاف واعتراض رہا۔ عام طور سے محدثین اور فقہا کے نزدیک یہ ناپسندیدہ علم رہا حتی کہ امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور سفیان ثوری وغیرہ نے اس علم کو حرام بتایا ہے۔ لیکن علمائے اسلام کا ایک طبقہ اس کا مؤید بھی رہا۔ اس اختلاف رائے کی وجہ سے مسلمانوں میں ہمیشہ دو طبقہ رہا اور جب بھی علم کلام پر کوئی تصنیف یا کوئی کام ہوا دوسرے طبقے نے اس سے اختلاف واعتراض کیا۔ علامہ شبلی کی تصنیف کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ چنانچہ علم کلام پر بھی متعدد اعتراضات ہوئے۔

پہلا اعتراض

علم کلام پر پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ ایک نامکمل کتاب ہے۔ علامہ شبلی نے بھی اعتراف کیا ہے کہ ''میں نے علم الکلام نہایت ناتمام کتاب لکھی اور وہ درحقیقت میری تصنیفات کا سب سے ناقص حصہ ہے۔'' (۶) اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ علامہ شبلی اس میں جو کچھ لکھنا چاہتے تھے وہ تفصیل سے نہ لکھ سکے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس میں ماتریدیہ کے افکار وخیالات کا ذکر انتہائی مختصر ہے۔ (۷) دوسرے یہ کہ یہ کتاب بخار اور لرزہ کی حالت میں مکمل ہوئی۔ (۸) حالانکہ معاملہ محض یہ ہے کہ ماتریدیہ کی تصنیفات دستیاب نہ ہو سکیں اور علامہ شبلی

ان کے خیالات کو جی کھول کر نہ لکھ سکے۔

دوسرا اعتراض

علامہ شبلی کو ماتریدیہ کی کتابیں دستیاب نہ ہو سکیں۔اس کے برعکس انھوں نے اشاعرہ کے افکار ونظریات کی تفصیل سے وضاحت کی ۔اس لئے بعض لوگوں نے انھیں معتزلی سمجھ لیا۔ مولانا سید عبدالحئ حسنیؒ [ف:۲رفروری۱۹۲۳ء] نے نزہۃ الخواطر میں صاف صاف معتزلی لکھا ہے۔ (۹) حالانکہ علامہ شبلی خیالات میں ماتریدی تھے۔غوغائے کفر کے جواب میں انہوں نے جو اعلان شائع کرایا تھا،اس میں بتصریح خود کو اہل سنت اور حنفی المسلک بتایا ہے۔(۹) علم الکلام کے متعدد مباحث سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

تیسرا اعتراض

تیسرا اعتراض شیخ محمد اکرام نے کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ علامہ شبلی علم الکلام کی فہرست مضامین ٹھیک طرح سے ترتیب نہ دے سکے اور اس کا سبب انھوں نے شبلی کی علالت اور بیماری قرار دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''علم الکلام کے ٥٦ ذیلی عنوانات کی ترتیب تو اصول اور قاعدے کے مطابق ہے لیکن انہیں جن حصص یا ابواب کے تابع جمع کیا گیا ہے ان کی نسبت خیال ہوتا ہے کہ بیماری یا ضعف کی وجہ سے انھیں غور سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔مثلاً چوتھا حصہ ہے ''دور سوم'' فی الحقیقت یہ صفحہ ۱۲۸ تک ختم ہو جاتا ہے۔لیکن کتاب کے آخر یعنی ۲۲۸ تک کے مضامین اسی عنوان کے تحت درج ہیں۔اگر صفحہ ۱۲۸ کے بعد کے مباحث کو حکمائے اسلام اور علم الکلام پر اجمالی نظر کے علاحدہ حصوں کے تابع دکھایا جاتا تو جو نقشہ علامہ کے ذہن میں تھا اور جس کے مطابق مولانا نے کتاب فی الواقع ترتیب دی ہے،زیادہ آسانی سے واضح ہو جاتا۔''(۱۱)

ممکن ہے شیخ محمد اکرام نے فہرست مضامین کے سلسلہ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ علامہ شبلی کی فہرست سے بہتر ہوتا ہم یہ ذوقی معاملہ ہے اور ترتیب وتصنیف اور فکر وخیال کو پیش

کرنے کے سلیقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر غور کریں تو ہم شیخ محمد اکرام کے اس اعتراض کو اعتراض برائے اعتراض کے سوا کوئی نام نہیں دے سکتے۔

چوتھا اعتراض اور فتنۂ تکفیر

علم الکلام کے حوالے سے علامہ شبلی پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے خیالات اہل سنت والجماعت کے نہ تھے اور اس کا ثبوت علم الکلام کی نبوت کی بحث سے دیا گیا اور اس کی بنیاد پر ان کے خلاف فتویٰ تکفیر صادر ہوا۔ علم الکلام کا وہ اقتباس یہ ہے:

> ''یہ ترقی کا سلسلہ خود انسان کے نوع میں قائم ہے۔ یہاں تک کہ قوائے عقلیہ ذہن، ذکا، صفائی باطن اور پاکیزہ خوئی میں ترقی کرتے کرتے انسان ملکوتیت کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ یہی مرتبہ ہے جس کو ہم نبوت و رسالت سے تعبیر کرتے ہیں۔'' (۱۲)

حالانکہ محض معاملہ غلط فہمی پر مبنی تھا جس تحریر و انشاء کی بنیاد پر یہ شاخسانہ کھڑا کیا گیا وہ علامہ شبلی کے بجائے ابن مسکویہ کے خیالات کی ترجمانی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ''علم الکلام کی عبارت بالاحکیم ابن مسکویہ کی عبارت ہے جس کا مصنف علم الکلام سے کوئی تعلق نہیں۔ مصنف نے اس کتاب میں بڑے بڑے متکلمین اور حکماء کے اصولی مسائل اعتقادیہ نقل کئے ہیں، اسی سلسلہ میں ابن مسکویہ کے خیالات کی تشریح میں اس کا یہ قول بھی ذکر کیا ہے اور اس قول کا بھی یہ مطلب نہیں کہ جو چاہے ترقی کر کے نبی بن جا سکتا ہے، بلکہ اس میں یہ دکھایا ہے کہ کائنات میں تدریجی ترقی ہے، جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان میں عقل واحساس کی بتدریج ترقی ہوتی ہے، پھر انسان کے مختلف طبقوں میں عقل واحساس اور تزکیہ وتقدس میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ فلاسفہ وحکما تک کا وجود ہو جاتا ہے۔ اب اس سے آگے بھی ایک طبقہ ہے جو اپنے قوائے عقلیہ وتقدس واخلاق میں انسانی ترقی کے انتہا ہوتے ہیں اور وہی پیغمبر ہیں اسی

تقریر کو امام غزالی نے بھی نقل کیا ہے۔'' (۱۳)

اب اس کو کیا کیا جائے کہ فتویٰ تکفیر صادر کرنے والے مفہوم و مدعا کے سمجھنے سے بھی قاصر تھے۔ شیخ محمد اکرام نے بھی ان کی ہمنوائی کی ہے۔ (۱۴) تاہم انھوں نے شبلی کی دقیق النظری کا اعتراف بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''علم الکلام پڑھیں تو خیال آتا ہے کہ نہ صرف علامہ شبلی کو مشہور متکلمین وحکمائے اسلام کی تصانیف اور رجال، تاریخ کی کتابوں میں ان کے متعلق اندراجات سے پوری واقفیت تھی بلکہ اسلام کی تمام فکری تاریخ ان کے سامنے تھی اور وہ بطور ایک طالب حق کے آزادانہ مختلف ادوار کی کمزوریاں اور خوبیاں جاننے اور بیان کرنے کے خواہاں تھے پھر مشکل کلامی اور دقیق فلسفیانہ مسائل کو جس طرح وہ پانی کر دیتے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے۔'' (۱۵)

عیب جو نگاہیں وہیں پہنچتی ہیں جہاں سے ان کا مطلب بہرصورت برآئے، حالانکہ اسی علم الکلام میں دوسرے مقامات پر بالتصریح علامہ شبلی کے خیالات درج ہیں لیکن ان کی نگاہیں وہاں نہ پہنچ سکیں۔

فتویٰ کفر کا ایک اور پس منظر بھی ہے اور وہ ہے علامہ شبلی کا علم و فضل، ندوہ کی معتمدی اور تصنیف و تالیف میں خاص طور پر خطابت کا ملکہ جس کے آگے اس دور کے بڑے بڑوں کا بس نہیں چلتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ منشی اطہر علی نے ندوہ کے ایک اجلاس میں علامہ شبلی کی تقریروں پر پابندی عائد کرنے کی قرارداد پیش کی تھی، جو اگرچہ نامنظور ہوگئی تاہم اس سے مخالفین شبلی کی ذہنیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس نے ندوہ میں ان کے خلاف طوفان برپا کیا۔ جس کا نتیجہ علامہ شبلی کا معتمدی سے استعفیٰ ٹھہرا۔ طلبائے ندوہ نے علامہ شبلی کی حمایت میں اسٹرائک کردی۔ اب زعمائے ندوہ نے ندوہ کی اصلاح کے لئے ایک اصلاحی کمیٹی بنائی جس کا اجلاس دہلی میں ہونا طے پایا۔ اس اجلاس کو ملتوی کرانے کے لئے مخالفین شبلی نے کیا کیا کیا، اس کی تفصیل علامہ شبلی نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام ایک خط میں لکھی ہے:

''اس دفعہ آپ دلی میں ہوتے تو مزہ آتا۔ جلسہ سے پہلے پیغام آیا کہ کفر

کے فتوے تیار ہو چکے ہیں، جلسہ موقوف کرو تو خیر، ورنہ پھر تشہیر ہوگی۔ جلسہ کے دن چار فتوے الگ الگ تقسیم ہو رہے تھے۔ جو مولوی عبدالحق [حقانی] سے تیار کرائے گئے تھے۔ سفرائے ندوہ کے ذریعہ اور شہروں میں ان کی اشاعت کرائی گئی۔ چنانچہ رائے بریلی کی دیوار سے ایک صاحب اتار کر میرے پاس لائے تھے۔ اب بھوپال میں تحریک ہے کہ سیرت کی اعانت بند ہو جائے۔ مزہ کی باتیں ہیں، یہ وہ لوگ کر رہے ہیں جن کو تقدس کا دعوی ہے۔'' (۱۶)

بہر حال علم الکلام تمام تنازعات کے باوجود اب تک اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس اسلوب و انداز میں علم الکلام کی تاریخ میں علامہ شبلی کے بعد کوئی شخص قابل ذکر اضافہ نہ کر سکا۔

حوالے

(۱) خطبات شبلی ص ۳۵-۳۶۔ طبع سوم ۱۹۹۰ء

(۲) علامہ شبلی۔ علم کلام ص ۲-۴۔ دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۹۳ء

(۳) ایضاً ص ۹

(۴) الغزالی ص ۳

(۵) مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۲۰۱

(۶) ایضاً ص ۱۲

(۷) حیات شبلی ص ۳۷۳

(۸) ایضاً ص ۳۷۲

(۹) نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۷۶۔ طبع اول

(۱۰) حیات شبلی ص ۸۲۵

(۱۱) یادگار شبلی ص ۲۶۱

(۱۲) علم الکلام ص ۱۳۸

(۱۳) ایضاً مقدمہ ص۱۱

(۱۴) یادگار شبلی ص۲۶۴-۲۶۵

(۱۵) ایضاً ص۲۶۳

(۱۶) مکاتیب شبلی جلد اول، ص۱۰۱، طبع جدید ۲۰۱۰ء

الکلام

علم الکلام کے بعد ۱۹۰۴ء میں الکلام شائع ہوئی۔ دراصل اسی کتاب کی تصنیف کے لئے علامہ شبلی نے الغزالی اور علم الکلام تصنیف کی تھی۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں علماء وغیرہ کو جس سطح پر لانا چاہتا ہوں اس کے لئے زینے درکار ہیں۔ الغزالی پہلا زینہ ہے۔ دوسرا تاریخ علم الکلام، پھر اصلی سطح یعنی علم کلام جدید ہے۔''(۱)

علامہ شبلی کا خیال تھا کہ جدید خیالات اور مفکرین یورپ نے اسلام کے سامنے جو نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں، ان کی تردید کے لئے ایک نئے علم کلام کی ضرورت ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''قدیم علم کلام میں صرف عقائد اسلام کے متعلق بحث ہوتی تھی، کیوں کہ اس زمانہ میں مخالفین نے اسلام پر جو اعتراضات کئے تھے، وہ عقائد ہی کے متعلق تھے۔ لیکن آج کل تاریخی، اخلاقی، تمدنی ہر حیثیت سے مذہب کو جانچا جاتا ہے۔ یورپ کے نزدیک کسی مذہب کے عقائد اس قدر قابل اعتراض نہیں جس قدر اس کے قانون اور اخلاقی مسائل ہیں۔ ان کے نزدیک تعدد نکاح، طلاق، غلامی، جہاد کا کسی مذہب میں جائز ہونا اس مذہب کے باطل ہونے کی دلیل ہے۔ اس بنا پر علم کلام میں اس قسم کے مسائل سے بحث ہوگی اور یہ حصہ بالکل نیا علم کلام ہوگا۔''(۲)

چنانچہ علامہ شبلی نے اپنے فکر و خیال اور منصوبے کے مطابق کام کا آغاز کیا۔ الکلام ان کے اسی سلسلہ کا دوسرا حصہ ہے۔

مشمولات ومباحث

اس کا آغاز جدید علم کلام کی اہمیت وضرورت کے ذکر سے ہوا ہے۔اس کے بعد مذہب اورعلوم جدیدہ کا ذکر ہے۔ پھر مذہب کی اہمیت سے بحث کی گئی ہے۔اس میں اسلام کی عظمت وبلندی ثابت کی گئی ہے۔''عقل اور مذہب'' ایک اہم عنوان ہے۔ان ضمنی مباحث کے بعد اصل بحث وجود باری پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ملاحدہ کے اعتراضات نقل کر کے ان کے عقلی اور مذہبی جوابات دیے گئے ہیں۔یہ ایک بڑی اہم بحث ہے۔وجود باری پر مختلف حیثیتوں سے بحث کرنے کے بعد قرآن مجید سے استدلال کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

> ''ان آیتوں میں عالم کی نسبت تین اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔کامل اور بے نقص ہے۔موزوں اور مرتب ہے۔ایسے اصول وضوابط کا پابند ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتے۔یہ دلیل کا صغریٰ ہے، کبریٰ خود ظاہر ہے یعنی جو چیز کامل، مرتب اور مستمر الانظام ہوگی وہ خود بخود نہیں ہوگئی ہوگی بلکہ کسی صاحب قدرت اور صاحب اختیار نے پیدا کیا ہوگا۔''(۳)

وجود باری کے بعد توحید کی بحث میں یہ پہلو اور نمایاں ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''نظام عالم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر وہ کثیر الاجزاء یا کثیر الافراد ہے لیکن سب مل کر ایک ہے۔یعنی اس کل کا ایک ایک پرزہ دوسرے سے اس قدر وابستہ ہے کہ وہی ایک شخص اس کو چلا سکتا ہے جو تمام پرزوں کا موجد اور ان کے باہمی تناسب کا محافظ ہو۔''(۴)

اس کتاب کی دوسری اہم بحث نبوت ورسالت ہے۔جس میں اس کی حقیقت پورے طور پر واضح کی گئی ہے۔اس سلسلہ میں معجزہ،خرق عادت وغیرہ موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔اس میں بھی علامہ شبلی نے ملاحدہ اور منکرین کے باطل افکار ونظریات کو نقل کر کے ان کا تار پود بکھیر دیا ہے اور عقلی دلائل سے نبوت کی حقانیت ثابت کی ہے۔آخر میں چند اہم مباحث ہیں، مثلاً ایک باب کا عنوان ہے ''اسلام تمدن اور ترقی کا مانع نہیں بلکہ مؤید ہے۔'' اسی طرح دین ودنیا کا باہمی

تعلق وغیرہ۔علامہ شبلی نے ان موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے صحیح یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔طوالت کے خوف سے اس کی تفصیل قلم انداز کی جاتی ہے۔

علامہ شبلی وجود باری اور نبوت کے ابواب کے علاوہ دوسرے مسائل مثلاً تعدد نکاح، طلاق، غلامی اور جہاد وغیرہ کو قلم بند نہ کر سکے۔اس کے لئے انھوں نے دوسرے حصہ کا منصوبہ بنایا تھا مگر وہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔اس کے چند در چند اسباب تھے اور جس میں بنیادی سبب حیدرآباد کی سیاسی فضا اور بے یقینی کی کیفیت تھی۔بہر حال الکلام علامہ شبلی کے سلسلہ کلامیہ کا سرمایۂ ناز اور جدید علم کلام کا اردو میں بہترین نمونہ ہے۔

علامہ شبلی سے پہلے اس موضوع پر مولوی چراغ علی اور سرسید احمد خاں نے قلم اٹھایا تھا۔علامہ شبلی نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے اور شاید صحیح یہ ہے کہ ان کے ذکر کی ضرورت بھی نہ تھی۔کیوں کہ موضوع کی ہم آہنگی کے باوجود دونوں کی راہیں جدا جدا تھیں۔جسے علامہ شبلی نے تقلیدی اجتہاد کا نام دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''حال میں علم کلام کے متعلق مصر،شام اور ہندوستان میں متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں ہیں اور نئے علم کلام کا ایک دفتر تیار ہو گیا ہے۔لیکن یہ نیا علم کلام دو قسم کا ہے، یا تو وہی فرسودہ اور دور از کار مسائل اور دلائل ہیں جو متاخرین اشاعرہ نے ایجاد کئے تھے یا یہ کیا ہے کہ یورپ کے ہر قسم کے معتقدات اور خیالات کو حق کا معیار قرار دیا ہے اور پھر قرآن وحدیث کو زبردستی کھینچ تان کر ان سے ملا دیا ہے، پہلا کورانہ تقلید اور دوسرا تقلیدی اجتہاد ہے۔اس لئے میں نے ان تصنیفات سے بالکل قطع نظر کی ہے۔''(۵)

الکلام کے معیار کی کتاب اردو مین اگر اس سے پہلے نہیں لکھی گئی تھی تو اس کے بعد بھی نہ لکھی جاسکی۔ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''تعجب تو یہ ہے کہ الکلام کے بعد بھی کوئی دوسری کتاب اس سے بہتر تو کیا اس پایہ کی بھی لکھی نہ جاسکی۔''(۶)

ڈاکٹر آفتاب نے ۱۹۵۷ء میں ان خیالات کا اظہار کیا تھا حقیقت یہ ہے کہ نامکمل ہونے

کے باوجود اب تک کوئی ایسی کتاب نہ لکھی جا سکی اور آئندہ توقع بھی نہیں۔ کیوں کہ علم الکلام پر کم از کم علامہ شبلی کے برابر بھی کوئی گہری نظر رکھنے والا نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب مقبول ہے۔

مختلف اشاعتیں

اب تک اس کے مندرجہ ذیل ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔

[۱]	▪ مطبع نامی، کان پور	۱۹۰۴ء	۳۱۰ص
[۲]	▪ عمدۃ المطابع، دہلی	۱۹۰۶ء	۳۰۸ص
[۳]	▪ شبلی بک ڈپو، لکھنو	۱۹۲۱ء	
[۴]	▪ نیر پریس، لکھنو	۱۹۲۲ء	۲۵۳ص
[۵]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۳۶ء	۲۷۵ص
[۶]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۴۱ء	۳۰۲ص
[۷]	▪ اعوان پبلی کیشنز، کراچی	۱۹۶۳ء	۳۱۷ص
[۸]	▪ لاہور	۱۹۷۵ء	۲۰۶ص
[۹]	▪ نفیس اکیڈمی، کراچی	۱۹۷۹ء	
[۱۰]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۸۴ء	۳۰۲ص
[۱۱]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۹۲ء	۳۲۴ص

اعتراضات اور اس کی حقیقت

الکلام کی اشاعت کے بعد اس پر اعتراضات کی بارش شروع ہو گئی اور مختلف نوعیّتوں کے اعتراضات ہوئے۔ یہاں ان کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اعتراضات کی حقیقت کے ساتھ کتاب کے بعض مندرجات کی مزید وضاحت ہو جائے۔

پہلا اعتراض

الکلام پر پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ ایک نامکمل کتاب ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی

جاتی ہے کہ مصنف نے جن موضوعات پر لکھنے کا وعدہ کیا تھا وہ زیر بحث نہیں آ سکے۔ حالانکہ علامہ شبلی نے دیباچہ میں صاف صاف وضاحت کی ہے کہ:

''عقائد میں اصل الاصول دو ہیں۔ وجود باری اور نبوت۔ اس کتاب میں انہی اصولوں سے بحث ہے۔ باقی مباحث تبعاً وضمناً آ گئے ہیں۔
قرآن مجید کا کلام الٰہی ہونا مہمات عقائد میں ہے لیکن اس کے لئے ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔ اس لئے اس حصہ میں، میں نے اس سے بحث نہیں کی بلکہ اس کو ایک مستقل کتاب کے لئے اٹھا رکھا ہے جو الکلام کا دوسرا حصہ ہوگا اور جس کا نام علوم القرآن ہوگا۔ عبادات اور اخلاق کا بیان بھی اس کتاب میں آ جائے گا۔ اس طرح علم کلام کا سلسلہ تین جلدوں میں پورا ہوگا۔ متکلمین کی سوانح عمریاں اس سلسلہ سے الگ ہیں۔ خدا ان کے اتمام کے بھی اسباب بہم پہنچائے۔''(۷)

شیخ محمد اکرام کا کہنا ہے کہ الکلام کی اشاعت کے ایک سال بعد تک شبلی کا رہوار قلم برابر جاری رہا اور موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم جیسی کتابیں ان کے قلم سے نکلیں لیکن الکلام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی انھوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔ (۸) انھوں نے اس کے مندرجہ ذیل اسباب تلاش کئے ہیں:

۱- شبلی کی محتاط طبیعت
۲- ماحول کی نامساعدت (۹)

ماحول کی نامساعدت تسلیم کی جا سکتی ہے کہ حیدرآباد میں اس وقت جو بے اطمینانی کا ماحول تھا وہ یقیناً الکلام کو نامکمل چھوڑنے کا باعث بنا ہوگا۔ لیکن علامہ شبلی کی محتاط طبیعت الکلام کے نامکمل ہونے کا سبب نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو الکلام اس قدر متنازعہ نہ ہوتی جیسا کہ بعد میں ہوئی۔ اس سلسلہ میں عطیہ فیضی کے بے ہمت ہونے کے طعنہ سے استدلال بھی بالکل بے معنی بلکہ بے جا بات ہے۔ صحیح یہ ہے کہ حیدرآباد کے بعد شعر العجم، ندوہ اور ماہنامہ الندوہ نے انھیں کسی اور طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں دیا اور شبلی کی زندگی کے آخری کئی برس تو بس وہ تھے اور دربار رسالت کا آستانہ تھا۔

دوسرا اعتراض

الکلام پر مولانا عبدالماجد دریابادی (ف: ۷/جنوری ۱۹۷۷ء) نے ''ایک طالب علم'' کے فرضی نام سے متعدد اعتراضات کئے ہیں، حتی کہ وہ الکلام کو سرے سے ایک تصنیف ہی ماننے کو تیار نہ تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''الکلام تصنیف تو درکنار صحیح معنوں میں تالیف بھی نہیں کہی جاسکتی ۔ بلکہ درحقیقت مصر کے ایک اہل قلم فرید وجدی کے خیالات کا اردو زبان میں خلاصہ ہے۔ ہمارے مولانا چونکہ یورپین زبانوں سے ناآشنا ہیں اس لئے انھوں نے یورپ کے متعلق اپنا تمام سرمایہ معلومات فرید وجدی کے خزانہ خیالات سے قرض لیا۔ افسوس ہے کہ مولانا نے انتخاب میں غلطی کی۔ فرید وجدی مذہبی جماعت میں خواہ کسی حیثیت سے علامہ تسلیم کیا جاتا ہو لیکن یورپ اور مشرق کے درمیان سفیر ہونے کی حیثیت سے وہ نہایت ناقابل اعتماد و غیر معتبر ہے۔ ......الکلام میں متعدد مقامات پر یورپین حکما کے جو اقوال درج ہیں۔ ان کے متعلق خوش عقیدہ اردو داں جماعت سمجھتی ہے کہ یہ اقوال براہ راست اصلی تصانیف سے اور صحیح معنی میں اقتباس کئے گئے ہوں گے۔''(۱۰)

مولانا عبدالماجد دریابادی کا یہ بھی خیال تھا کہ علامہ شبلی نے جن فلسفیانہ مسائل مثلاً مذہب و سائنس، وجود باری، معجزہ اور نبوت، روحانیت وغیرہ پر جو بحثیں کی ہیں ان کی تردید کی جاسکتی ہے۔ (۱۱)

مولانا عبدالماجد دریابادی کے یہ جارحانہ اعتراضات دراصل اس وقت کے ہیں جب ان پر فلسفہ کا غلبہ اور ملحدانہ خیالات کے اثرات قائم تھے اور اس وقت تک وہ معتقد شبلی نہ تھے۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے مفکرین یورپ کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور وہ ان سے غالباً شبلی سے زیادہ واقف تھے۔ لیکن اس اعتراض کی دو نوعیت ہے۔ پہلی یہ کہ الکلام سرے سے تصنیف نہیں بلکہ فرید وجدی کے خیالات کا محض خلاصہ ہے، یقیناً درست نہیں۔ شبلی نے الکلام میں مفکرین یورپ کے

اسلام پر جن اعتراضات کو نقل کیا ہے اگر چہ انھوں نے فرید وجدی کے حوالہ سے نقل کیا ہے لیکن یہ عام اعتراضات تھے جو اس زمانے میں علی العموم کئے جاتے تھے۔ دوسرے یہ کہ شبلی نے فرید وجدی سے استفادہ کیا تو الکلام مین اس کا ذکر بھی کیا اور وضاحت سے لکھا کہ:

''ہم نے جابہ جا یورپ کے حکما اور علماء کے اقوال نقل کئے ہیں لیکن ہم نے ان کی اصل تصنیفات کے دیکھنے کی زحمت نہیں اٹھائی بلکہ مصر کے ایک فاضل مصنف کی تصنیفات پر اعتماد کیا ہے جس کا نام فرید وجدی بک ہے۔'' (۱۲)

اس اعتراف کے بعد مذکورہ اقتباس کے انداز نگارش اور لب ولہجہ کی کم مائیگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے یہ اعتراضات شبلی کی نظر سے گذرے مگر انھوں نے اسے لائق اعتناء خیال نہیں کیا۔ البتہ بعض دوسرے مضمون نگاروں نے ان کے اعتراضات کا جائزہ لیا اور ان کی کم مائیگی دکھلائی، مولوی عبداللہ یوسف علی نے لکھا کہ ناقد (مولانا عبدالماجد دریابادی) مذہب کو نہایت محدود معنوں میں استعمال کرتا ہے اور اس کے بیانات جو بظاہر وقیع معلوم ہوتے ہیں نہایت سطحی ہیں۔ طالب علم نے اپنے خیالات کی تائید مین بکثرت مغربی مصنّفین کی رائیں اور ان کی تصانیف سے سندیں پیش کی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو خود اپنے اعتراضات پر اعتماد نہیں اور اسے ڈر ہے کہ پڑھنے والے اسے تسلیم نہ کریں گے۔ (۱۳)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اسماء کے سلسلے میں جو اعتراضات کئے تھے، علامہ شبلی نے ان کی طرف توجہ کی اور آخر کتاب میں تصحیح اسما کے عنوان سے یورپین حکماء وعلماء کے اسماء کے ہجے انگریزی میں درج کئے۔ جن سے ناموں میں جو اشتباہ یا تناقض پیدا ہوا تھا وہ درست ہو گیا۔ ہم اسے علامہ شبلی کی عظمت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ اس وقت کے ایک معمولی طالب علم کے اعتراضات پر انھوں نے توجہ کی اور کتاب میں ترمیم کی۔ مولانا دریابادی نے بعد میں اپنے اعتراضات کو دور الحاد بلکہ لاادریت کی تحریر قرار دیدیا تھا۔ [آپ بیتی، ص۲۴۳]

تیسرا اعتراض

علم کلام کی کتابوں کا انداز نگارش علی العموم یہ رہا ہے کہ پہلے ملاحدہ اور منکرین کے

اعتراضات نقل کئے جاتے ہیں اور پھران کی تردید کی جاتی ہے۔علامہ شبلی نے بھی الکلام میں یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔اس طریق کار پر علماء کے یہاں ہمیشہ سے دوطبقہ رہا ہے۔ایک طبقے کا خیال ہے کہ اس سے ملاحدہ اور منکرین کے خیالات کی اشاعت ہوتی ہے،ان کے نزدیک اسی بنیاد پر یہ انداز ناپسندیدہ بلکہ قابل اعتراض ہے۔اس خیال کے ہم نواؤں نے جس میں خود علامہ شبلی کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی بھی شامل ہیں،اس سے اختلاف کیا ہے کہ یہ جمہور علماء کے یہاں ناپسندیدہ ہے۔(۱۴) حالانکہ یہ ایک اصولی بات ہے کہ جب تک سوالات نہ ہوں گے ان کے جوابات لکھنے کے کیا معنی۔دوسرے لفظوں میں اعتراض نہ ہوتو جواب دینے کی کہاں ضرورت ہوگی۔گویا علم کلام کی کیا ضرورت؟

چوتھا اعتراض

الکلام پر شیخ محمد اکرام نے یہ اعتراض کیا ہے کہ علامہ شبلی نے الکلام میں جو بنیادی طریق کار اختیار کیا تھا،وہ ایسا تھا کہ اس میں عام قارئین کے لئے سخت خطرات پنہاں تھے اور ان پر راسخ العقیدہ مسلمانوں کا اعتراض ناگزیر تھا۔(۱۵) اس سلسلہ میں انھوں نے علامہ شبلی کی اس تحریر ''اب جدید علم کلام کے مرتب کرنے والے کا یہ کام ہے کہ ان بزرگوں [قدیم متکلمین] نے جن خزانوں کو سربہ مہر کر رکھا تھا ان کو عام کر دے۔''(۱۶) سے استدلال کیا ہے اور پھر لکھا ہے کہ ''شبلی نے الکلام میں یہی کیا اور نہ صرف اپنے لئے مشکلات کا سامان پیدا کیا بلکہ جدید علم کلام بھی ترتیب نہ دے سکے۔(۱۷)

شیخ محمد اکرام اور ان کے ہم خیال اہل علم نے یہاں ایک اور مسئلہ پیدا کر دیا کہ شبلی الکلام میں جو کچھ پیش کرنا چاہتے تھے اس سے عام قارئین کے لئے سخت خطرات پنہاں تھے۔عام وخاص کے ذریعہ انھوں نے ایک گمراہ کن راہ دکھا دی،کیوں کہ اب تک علم کلام میں عام وخاص کی اصطلاح رائج نہ تھی بلکہ غور سے دیکھا جائے تو سرے سے علم کلام کا تعلق ہی عوام سے نہیں،بلکہ علماء حکماء اور متکلمین کا ہے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ شبلی علماء کو جس سطح پر لانا چاہتے تھے اس میں ناکام رہے اور جس بلند معیار پر علم کلام مرتب کرنے کا خیال تھا وہ بھی پورا نہ ہوسکا۔اس کی بنیادی وجہ اگر تلاش

کی جائے تو وہ یہ نہیں ہے کہ علماء نے ان سے اعتناء نہیں کیا۔حقیقت یہ ہے کہ شبلی علم کلام میں جس بلند رتبہ کے حامل تھے کوئی ان کے گرد کو نہ پہنچ سکا بلکہ وہ شبلی کے افکار و خیالات کو سمجھنے سے بھی قاصر رہے۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ شبلی اپنی کتاب کو اپنے منصوبے کے مطابق مکمل نہیں کر سکے۔اس کی وجہ سے متعدد غلط فہمیاں پیدا ہوئیں، جس سے نہ صرف شبلی کی شخصیت کو نقصان پہنچا بلکہ مسلمان بھی اس مقام تک نہ پہنچ سکے جہاں پہنچ کر وہ یورپ کے مفکرین کے سامنے اسلام کی حقانیت واضح کرتے۔حقیقت یہ ہے کہ اگر شبلی کا یہ منصوبہ کامیاب ہو گیا ہوتا تو شاید آج یورپ نے اسلام کے خلاف جو مسموم فضا پیدا کر دی ہے وہ نہ ہوتی اور علامہ شبلی بھی کامیاب و بامراد تصور کئے جاتے۔

کمیاں

الکلام میں چند کمیاں اور کمزوریاں ضرور ہیں، جن میں بعض کا ذکر اوپر آچکا ہے اور بعض کا مولانا سید سلیمان ندوی نے بعد کے ایڈیشن میں حواشی میں کیا ہے۔

۱- الکلام میں روحانیات اور غیر محسوسات کا ایک اہم باب ہے۔جس میں ملائکہ، وحی اور قیامت کے واقعات کا بیان ہے۔اس کے آغاز میں سید صاحب نے ایک حاشیہ میں لکھا ہے کہ کتاب کا یہ باب ناقص ہے۔اس میں ملائکہ اور قیامت کے واقعات سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ باقی مباحث کا تعلق مرئیات اور مسموعات سے ہے جو انبیاء کو محسوس ہوتے ہیں یا برزخ میں پیش آتے۔(۱۸)

۲- اسی طرح علامہ شبلی نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ کے ایک اقتباس کے مفہوم بیان کرنے میں اس کے مقصود سے تجاوز کیا ہے۔سید سلیمان ندوی نے یہاں بھی اختلافی نوٹ لکھا ہے کہ مصنف نے شاہ صاحب کے مقصود میں بڑی وسعت پیدا کر دی۔(۱۹)

تعریف و تحسین

الکلام کی بعض خوبیوں کی داد اکثر نقادوں نے دی ہے اور شبلی کے کلامی کمالات کا اعتراف کیا ہے۔مثلاً: الکلام کے مفصل جائزے کے بعد شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''الکلام ایک مشاق اہل قلم اور صاحب فکر عالم کی تصنیف ہے۔ اس کے کئی اندراجات بالخصوص وہ مباحث جن میں اسلام کے نیک اثرات کا ذکر ہے اور اسے تمدن وترقی کا مؤید بتایا ہے بیش قیمت ہیں۔ ان مباحث پر ان سے پہلے مولوی چراغ علی بہت کچھ لکھ چکے تھے اور تلاش معلومات میں انھوں نے شبلی سے کم محنت نہیں کی لیکن مولانا کا دل فریب طرز تحریر دوسروں کو کہاں میسر ہوتا۔''(۲۰)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے سخت اعتراضات کے باوجود لکھا ہے کہ:

''ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو متانت کے خلاف ہو یا جس سے کسی فریق کی دل آزاری ودل شکنی ہو۔ نہ کسی مقام پر طعن وتشنیع ہے اور نہ کہیں توہین وتحقیر کے الفاظ ہیں۔''(۲۱)

وہ الکلام کے اسلوب نگارش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الکلام کا کوئی صفحہ کھولو، اس قدر دلچسپی ہوگی کہ بجائے کسی خشک علمی تصنیف کے یہ معلوم ہوگا کہ کوئی دلچسپ افسانہ پڑھ رہے ہو۔ ممکن ہے کوئی شخص جہاں تک مضمون کا تعلق ہے الکلام کے تمام استدلالات کو غلط وپادر ہوا تصور کرے لیکن بڑے سے بڑا مخالف بھی ان کی دل فریب طرز ادا کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔''(۲۲)

فتویٰ تکفیر

ندوہ سے کنارہ کش ہونے اور سیرۃ النبی جیسی مہتم بالشان تصنیف سے باز رکھنے کے لئے علامہ شبلی پر الزام تراشیاں کی گئیں اور جب کسی طرح معاملہ قابو میں نہیں آیا تو علم الکلام اور الکلام سے چند بے موقع وبے محل اقتباسات بغیر سیاق وسباق کے نقل کرکے شبلی پر آخری حربہ یعنی فتویٰ کفر صادر کیا گیا اور ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے گئے۔ ان میں دو اہم الزامات یہ تھے کہ شبلی مادہ کو قدیم اور نبوت کو اکتسابی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں سراسر غلط فہمی پر

مبنی تھیں۔ الکلام میں پہلے ملاحدہ کے خیالات نقل کئے گئے ہیں، پھر ان کے جوابات دیے گئے ہیں۔ فتویٰ صادر کرنے والوں نے علامہ شبلی کے بجائے معترضین کے اقوال نقل کر لئے تھے۔ بہر حال شبلی نے صفائی پیش کی اور اعلان کیا کہ:

> ۱-''جس کا یہ عقیدہ ہو کہ ''مادہ قدیم ہے اور خدا کا مخلوق نہیں ہے۔'' وہ ملحد وزندیق ہے۔ میں مادہ کو نہ قدیم بالذات تسلیم کرتا ہوں، نہ قدیم بالزمان۔ البتہ میں یہ مانتا ہوں کہ خدا کے تمام اوصاف قدیم ہیں۔ الکلام میں اگر اس قسم کے اقوال مذکور ہیں تو وہ غیر مذہب والوں کے عقائد ہیں اور اس غرض سے نقل کئے گئے ہیں کہ ان کا رد کیا جائے۔
>
> ۲- نبوت کے متعلق میرا یہ ہرگز اعتقاد نہیں کہ وہ اکتسابی ہے اور ہر شخص نبی ہوسکتا ہے۔ میں نبوت کو عطیہ الٰہی سمجھتا ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء یقین کرتا ہوں اور جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی ہوسکتا ہے اس کو مسلمان نہیں جانتا۔
>
> ۳- باقی میرے عقائد وہی ہیں جو قرآن شریف اور احادیث سے ثابت ہیں میں عقیدۃً اور فقہاً دونوں لحاظ سے حنفی ہوں۔''(۲۳)

اور یہی دراصل علامہ شبلی کے عقائد وخیالات تھے۔ اس اعلان نامے کی اشاعت کے بعد بھی معاندین نے شبلی کے ساتھ ہمیشہ معاندانہ رویہ رکھا اور رہ رہ کر آج بھی اس حلقے سے معاندانہ صدائیں بلند ہو جاتی ہیں۔ تاہم معاندین اور معترضین اپنے موقف کے لحاظ سے کیا الکلام کے برابر درجہ کی بھی کوئی کتاب آج تک پیش کر سکے۔؟

۱۹۳۰ء میں علامہ شبلی کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد علامہ حمید الدین فراہی نے وفات پائی۔ وہ ایک بڑے مفسر قرآن اور عالم بے بدل تھے۔ ان کے زہد و ورع اور تقویٰ وصلاح کا اعتراف تمام معاصرین نے کیا ہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ وتحقیق میں ان کا ایک خاص منہج تھا۔ ان کے افکار وخیالات کی شاعت کے لئے ان کے تلامذہ نے دائرہ حمیدیہ قائم کیا اور ماہنامہ الاصلاح جاری کیا۔ اس میں شایع مولانا فراہی علیہ الرحمہ کے کسی اقتباس پر کسی نے مولانا اشرف علی تھانویؒ

سے فتویٰ مانگا، انہوں نے احتراز کیا، البتہ بعض دوسرے علماء سے رجوع کرنے کی ہدایت کی۔ ان علماء کے نام معلوم نہ ہو سکے۔ البتہ انہوں نے نہ صرف مولانا فراہی بلکہ علامہ شبلی اور اہل مدرسہ الاصلاح سب کو کفر اور کافر کے خطاب سے نوازا۔ وہ فتویٰ مولانا تھانویؒ کی خدمت میں پیش ہوا اور انہوں نے بھی اس پہ مہر تصدیق ثبت کر دی۔ چنانچہ مولانا فراہیؒ کے ساتھ علامہ شبلی کو پھر اسی جرم میں ماخوذ کیا گیا جس کی سزا بائیس سال قبل ۱۹۱۴ء میں انہیں دی جا چکی تھی۔ ان فتوی نویسوں کے پیش نظر اسی الکلام کے اقتباسات تھے جن کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

اس کے خلاف مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا بدرالدین اصلاحی نے ماہنامہ الاصلاح سرائے میر [جولائی، اگست، اکتوبر ۱۹۳۶ء] میں اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ترجمان القرآن لاہور [جولائی تا نومبر ۱۹۳۶ء] میں مضامین لکھے۔ مولانا مودودی علیہ الرحمہ نے ''مولانا شبلی اور مولانا فراہی کے خلاف فتوی کا جائزہ'' بہت تفصیل سے پانچ قسطوں میں پیش کیا۔

ماہنامہ الاصلاح نے فتویٰ تکفیر سے متعلق ہندوستان کے نامور علماء مولانا سید حسین احمد مدنیؒ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے آراء و خیالات بھی [اگست ۱۹۳۶ء ص ۵۶-۶۱] شایع کیے۔ خود مولانا اشرف علی تھانوی کی ایک تحریر بعنوان ''تکفیر کے متعلق اللہ والوں کا طریقہ'' کے عنوان سے شائع کی۔

ان مضامین کے کیا اثرات مرتب ہوئے، اس کی کوئی تفصیل تو دریافت نہ ہو سکی۔ البتہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے شیخ و مرشد حضرت تھانوی سے اس سلسلہ میں خط و کتابت اور گفت و شنید کی جس کی تفصیل طوالت کا باعث ہوگی اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ماہ بعد مولانا تھانویؒ نے اپنے فتوے سے رجوع کر لیا اور دونوں بزرگ علامہ شبلی اور علامہ حمیدالدین فراہی دائرہ کفر سے باہر آئے۔

علامہ شبلی نے ہندوستان کے دینی حلقے میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کو سب سے معقول شخص قرار دیا تھا۔ [مکاتیب شبلی ج ا ص ۱۵۲، طبع ۲۰۱۰ء] لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کی سوانح زندگی کا سب سے تکلیف دہ باب انہیں کے قلم سے ہوگا۔

اس واقعہ کے جواثرات مرتب ہوئے اس کے ازالہ کی دانستہ کوئی کوشش تو نہیں کی گئی اور وہ مقصد جوفتوی نویسوں کے پیش نظر رہا ہوگا وہ بہرحال اس طرح پورا ہوا کہ علامہ شبلی اور مولانا فراہی کی سوانح زندگی کفر وکافر کے قضیہ سے آلودہ ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ کی کوششوں کی تحسین ضروری ہے کہ انہی کی کوششوں سے مولانا تھانوی نے اپنے فتویٰ سے رجوع کیا، جس کی تفصیل ان کی کتاب حکیم الامت [ص۴۳۰-۴۴۳، مطبوعہ: دارالمصنّفین، ۲۰۱۱ء] میں موجود ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی اور مولانا فراہی کے متعلق جس فتویٰ کی انہوں نے تصدیق کی وہ اس سے اوراس کے پس منظر سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ بہرحال دوبارہ فتوی کفر بھی علامہ شبلی پراسی کتاب ''الکلام'' کے اسی اقتباس پر دیا گیا جس پر ۱۹۱۴ء میں دیا جاچکا تھا اور جس کی علامہ شبلی تردید کر چکے تھے۔

حوالے

(۱) مکاتیب شبلی ج ا ص ۲۰۱
(۲) الکلام ص ٦
(۳) الکلام ص ۳۸
(۴) ایضاً ص ٦١
(۵) ایضاً ص ۷
(٦) ڈاکٹر آفتاب احمد۔ شبلی ایک دبستاں ص ۱۱۷
(۷) الکلام دیباچہ ص ا
(۸) یادگار شبلی ص ۲٦۷
(۹) ایضاً ص ۲٦۷-۲٦۸
(۱۰) ماہنامہ الناظر لکھنؤ مارچ ۱۹۱۰ء ص ۱۴ بحوالہ یادگار شبلی ص ۲٦۹
(۱۱) ایضاً
(۱۲) الکلام ص ۴۵

(۱۳) بحوالہ شبلی ایک دبستان ص ۱۱۵

(۱۴) تنبیہ از سلیمان ندوی مشمولہ الکلام ص ۱-۲

(۱۵) یادگار شبلی ص ۲۷۲

(۱۶) الکلام ص ۵-۶

(۱۷) یادگار شبلی ص ۲۷۲

(۱۸) الکلام ص ۲۰۶

(۱۹) ایضاً ص ۱۲۰

(۲۰) یادگار شبلی ص ۲۷۳

(۲۱) الناظر جنوری ۱۹۱۱ء ص ۶

(۲۲) ایضاً ص ۸

(۲۳) تنبیہ۔ الکلام ص ۱۴

سوانح مولانا روم

یہ کتاب مولانا جلال الدین رومی (۳۰ر ستمبر ۱۲۰۷–۱۷ر نومبر ۱۲۷۳ء) کی سوانح عمری اور علامہ شبلی کے سلسلہ کلامیہ کا چوتھا حصہ ہے۔ ۱۹۰۴ء میں علامہ شبلی کے قیام حیدرآباد میں لکھی گئی اور ۱۹۰۶ء میں اس وقت شائع ہوئی جب علامہ شبلی ندوہ کی تعمیر و ترقی میں ہمہ تن مصروف تھے۔ اس وقت سے اب تک برابر شائع ہو رہی ہے۔ مختلف اشاعتی اداروں سے اب تک درج ذیل ایڈیشن نکل چکے ہیں:

[۱]	▪ نامی پریس، کان پور، طبع اول	۱۹۰۶ء	۲۰۰ص
[۲]	▪ روز بازار الکٹرک پریس امرتسر	۱۹۰۸ء	۲۰۰ص
[۳]	▪ نول کشور پریس، لاہور	۱۹۰۹ء	۲۰۰ص
[۴]	▪ ہلالی پریس، دہلی	۱۹۲۲ء	۱۴۶ص
[۵]	▪ مطبع مجتبائی، دہلی	۱۹۲۲ء	۱۰۸ص
[۶]	▪ رنگین پریس، دہلی	۱۹۲۶ء	۱۰۸ص
[۷]	▪ مدینہ پریس، بجنور	۱۹۲۷ء	۱۲۸ص
[۸]	▪ رنگین پریس، دہلی	۱۹۳۰ء	۱۰۸ص
[۹]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۳۸ء	۱۷۸ص
[۱۰]	▪ مطبع مجتبائی، دہلی	۱۹۳۸ء	۱۷۸ص
[۱۱]	▪ مکتبہ دین و دانش، لاہور	۱۹۵۹ء	۱۹۹ص
[۱۲]	▪ مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۱ء	۲۴۱ص مرتبہ سید عابد علی عابد

[۱۳]	■ سنگ میل پبلی کیشن، لاہور	۲۰۰۷ء	۲۲۴ص
[۱۴]	■ کتب خانہ نذیریہ، دہلی	۲۰۰۷ء	۲۰۰ص
[۱۵]	■ نگارشات پبلشرز، لاہور	۲۰۰۷ء	۲۱۶ص
[۱۶]	■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۰۳ء	۱۶۶ص
[۱۷]	■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۱۰ء	
[۱۸]	■ مہتاب پریس، دہلی	غیر مورخہ	۱۰۸ص
[۱۹]	■ نامی پریس، کان پور	غیر مورخہ	۲۰۰ص
[۲۰]	■ کتب خانہ نذیریہ، دہلی	غیر مورخہ	۲۰۰ص

مولانا روم کی مثنوی معنوی کو دنیا تصوف وسلوک کی نسبت عام ہی سے جانتی تھی مگر علامہ شبلی نے اپنی تحقیقات سے ثابت کیا ہے کہ وہ کلام وعقائد کی بھی بہترین مثال ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے، وہ فقر وتصوف ہے اور اس لحاظ سے متکلمین کے سلسلہ میں ان کو داخل کرنا اور اس حیثیت سے ان کی سوانح عمری لکھنا، لوگوں کو موجب تعجب ہوگا۔ لیکن ہمارے نزدیک اصل علم کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقائد کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق ومعارف، اس طرح بتائے جائیں کہ خود بخود دلنشیں ہو جائیں۔ مولانا روم نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے، مشکل سے اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ اس لئے ان کو زمرہ متکلمین سے خارج کرنا سخت ناانصافی ہے۔''(۱)

مثنوی معنوی کے اس منفرد مطالعہ وجائزہ کی داد مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نے ان الفاظ میں دی ہے:

''مثنوی شریف کو ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے پڑھا ہوگا۔ اس کی بیسیوں شرحیں لکھی گئیں۔ بہت سے خلاصے ہوئے لیکن (جہاں تک معلوم ہے) صرف ایک تصوف کی کتاب کی حیثیت سے۔ یہ دقیقہ سنجی علامہ شبلی کی نظر کے واسطے ودیعت تھی کہ مثنوی معنوی علم الکلام کا بھی بہترین مجموعہ ہے۔''(۲)

علامہ شبلی کی دوسری سوانحی تصنیفات کی طرح یہ کتاب بھی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں مولانا روم کی سوانح اور دوسرے حصہ میں مثنوی معنوی پر تقریظ وتبصرہ ہے۔ الغزالی کی طرح سوانح مولانا روم کا بھی پہلا حصہ مختصر اور دوسرا حصہ علامہ کی وسعت نظر اور کدو کاوش کا نمونہ ہے۔

پہلا حصہ

اس کا آغاز مولانا روم کے نام ونسب سے ہوا ہے۔ شجرۂ نسب سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا روم، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد میں سے تھے اور سلطان محمد خوارزم شاہ ان کا نانا تھا۔ ان کے والد مولانا بہاء الدین پایہ کے بزرگ اور فضل وکمال میں یکتائے روزگار تھے۔ (۳) ان کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد سلاطین روم کا ذکر ہے۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ:

> ''چونکہ مولانا کے حالات زندگی میں سلاطین روم کا ذکر جابہ جا آئے گا اور ان سلاطین میں سے اکثروں کو مولانا سے خاص تعلق رہا، اس لئے مختصر طور پر اس سلسلہ کا ذکر ضروری ہے۔'' (۴)

اس کے بعد مولانا روم کی ولادت کا ذکر ہے کہ وہ ۶۰۴ھ میں بمقام بلخ پیدا ہوئے۔ اپنے والد مولانا بہاء الدین اور ان کے ایک شاگرد سے تحصیل علم کے بعد حلب اور شام کے مدارس میں علمی تشنگی بجھائی اور تمام علوم درسیہ میں کامل مہارت پیدا کی۔ (۵)

علامہ شبلی نے مولانا روم کی زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دور میں ان پر علوم ظاہری اور دوسرے دور میں علوم باطنی کا رنگ غالب رہا۔ پہلے دور کے بارے میں علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ:

> ''مولانا پر اب تک ظاہری ہی علوم کا رنگ غالب تھا۔ علوم دینیہ کا درس دیتے تھے۔ وعظ کہتے تھے۔ مثنوی لکھتے تھے۔ سماع وغیرہ سے قطعاً احتراز کرتے تھے۔'' (۶)

اس دور میں شمس تبریز سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کے متعلق علامہ شبلی نے کئی روایتیں اور واقعات لکھے ہیں۔ شمس تبریز کا بھی مختصر حال قلم بند کیا ہے۔ ان کی ملاقات سے

مولانا روم تصوف وسلوک اور معرفت کی طرف نہ صرف مائل ہوئے بلکہ اس میں غرق ہو گئے۔ یہیں سے ان کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس کی تمام تفصیلات علامہ شبلی نے قلم بند کی ہیں۔ شمس تبریز سے انھیں جو والہانہ شیفتگی پیدا ہوگئی تھی اور سلوک ومعرفت کا ان پر جونشہ طاری ہو گیا تھا، اس کا ذکر بھی علامہ شبلی نے اسی اسلوب میں کیا ہے۔

اس کے بعد مولانا روم کے تلامذہ اوران کی آل واولاد کا تذکرہ ہے۔ ان کے سلسلہ باطنیہ اور معاصرین کے ذکر کے ساتھ ان کے اخلاق وعادات، زہد وورع، قناعت، توکل الی اللہ وغیرہ اوصاف اوراس کے واقعات قدرے تفصیل سے قلم بند کئے گئے ہیں۔ جس سے مولانا روم کی عظمت وبلند پایگی پورے طور پر عیاں ہوجاتی ہے۔ ان کے زہدوورع کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> ''مزاج میں انتہا درجہ کی زہدوقناعت تھی۔ تمام سلاطین وامراء، نقدی اور ہر قسم کے تحائف بھیجتے تھے۔ لیکن مولانا اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے تھے۔ جو چیز آتی اسی طرح صلاح الدین زرکوب یا چلپی حسام الدین کے پاس بھجوا دیتے۔ کبھی کبھی ایسا اتفاق ہوتا کہ گھر میں نہایت تنگی ہوتی اور مولانا کے صاحبزادے سلطان ولد اصرار کرتے تو کچھ رکھ لیتے۔ جس دن گھر میں کھانے کا کچھ سامان نہ ہوتا بہت خوش ہوتے اور فرماتے کہ آج ہمارے گھر میں درویشی کی بوآتی ہے۔'' (۷)

پانچ جمادی الثانی ۶۷۲ھ (۱۲۷۳ء) میں وفات پائی اور قونیہ کی خاک کا پیوند ہوئے۔ (۸) غرض اس حصہ میں ان کی زندگی کا ایک مختصر مگر جامع مرقع قلم بند کیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ

دوسرے حصے کا آغاز ان کی تصنیفات سے ہوا ہے۔ جس میں فیہ مافیہ، دیوان اور مثنوی کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ مولانا روم کا دیوان شمس تبریز کے نام منسوب ہو گیا تھا، جسے علامہ شبلی نے فاش غلطی قرار دیا ہے اور مختلف دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ تبریز کا نہیں بلکہ مولانا روم کا دیوان ہے۔ مثنوی معنوی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''یہی کتاب ہے جس نے مولانا کے نام کو آج تک زندہ رکھا ہے اور جس کی

شہرت ومقبولیت نے ایران کی تمام تصنیفات کو دبالیا ہے۔''(۹)

مثنوی کے ذکر میں اس کے سبب تصنیف، شہرت ومقبولیت اوراس کے اسباب، اس کی ترتیب، مثنوی اور حدیقہ کے مشترک مضامین اوراس کی متعدد خصوصیات کا ذکر ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''سب سے بڑی خصوصیت جو مثنوی میں ہے، وہ اس کا طرز استدلال اور طریقۂ افہام ہے۔ استدلال کے تین طریقے ہیں۔ قیاس، استقراء، تمثیل۔ چونکہ ارسطو نے ان تینوں میں قیاس کو ترجیح دی تھی، اس لئے اس کی تقلید سے حکمائے اسلام میں بھی اس طریقہ کو زیادہ تر رواج ہوا۔...........مولانا روم نے زیادہ تر اسی قیاس تمثیلی سے کام لیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عام طبائع کے افہام وتفہیم کا آسان اور اقرب الی الفہم یہی طریقہ ہے۔ استدلالی تمثیل کے لئے تخیّل کی بڑی ضرورت ہے، جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہے۔ اس بنا پر مثنوی کے لئے یہی طریقہ زیادہ مناسب تھا۔ مولانا کی شاعری کو جس بنا پر شاعری کہا جاتا ہے وہ یہی قوت تخیّل ہے۔''(۱۰)

اس کے بعد مثنوی کے کلامی مباحث پر اظہار خیال کیا ہے۔ مثنوی کی شہرت عام اور اس کی کلامی حیثیت واضح کرتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''مثنوی نے عالم شہرت میں جو امتیاز حاصل کیا ہے۔ آج تک کسی مثنوی کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس قدر مقبول ہونے اور ہزاروں لاکھوں دفعہ پڑھے جانے کے بعد بھی لوگ اس کو جس حیثیت سے جانتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ وہ تصوف اور طریقت کی کتاب ہے۔ یہ کسی کو خیال بھی نہیں آیا کہ وہ صرف تصوف نہیں بلکہ عقائد اور علم کلام کی بھی عمدہ ترین تصنیف ہے۔ موجودہ علم کلام کی بنیاد امام غزالی نے قائم کی اور امام رازی نے اس عمارت کو عرش کمال تک پہنچادیا اس وقت سے آج تک سیکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی جاچکیں۔ یہ سارا دفتر ہمارے سامنے ہے، لیکن انصاف یہ ہے کہ

مسائل عقائد جس خوبی سے مثنوی میں ثابت کئے گئے ہیں، یہ تمام دفتر اس کے آگے ہیچ ہے۔''(۱۱)

علامہ شبلی کا خیال ہے کہ کلام وعقائد کے تمام اہم اور بنیادی موضوعات کا ذکر مثنوی میں موجود ہے۔ چنانچہ انھوں نے الٰہیات ذات باری، صفات باری، نبوت اور اس کی حقیقت، وحی، ملائکہ، معجزہ، روح، معاد، جبر وقدر وغیرہ کا عنوان قائم کر کے مثنوی میں مولانا روم نے ان سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی وضاحت کی ہے۔ کتاب کا یہ حصہ بہت اہم اور علامہ شبلی کے تخلیقی اجتہادات کا نمونہ ہے۔ یہاں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

ذات باری

یہ ایک اہم بحث ہے۔ مولانا روم نے متعدد حیثیتوں سے اس کی وضاحت کی ہے۔ اس کا ایک نمونہ یہ ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''خدا کے اثبات کے مختلف طریقے ہیں اور ہر طریقہ ایک خاص گروہ کے مناسب ہے۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ آثار سے مؤثر پر استدلال کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ خطابی ہے اور عوام کے لئے یہی طریقہ سب سے بہتر ہے۔ یہ صاف نظر آرہا ہے کہ عالم ایک عظیم الشان کل ہے، جس کے پرزے رات دن حرکت میں ہیں، ستارے چل رہے ہیں، دریا بہہ رہا ہے، پہاڑ آتش فشاں ہیں، ہوا جنبش میں ہے، زمین نباتات اگارہی ہے، درخت جھوم رہے ہیں، یہ دیکھ کر انسان کو خود بخود خیال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی پرزور ہاتھ ہے جو ان تمام پرزوں کو چلارہا ہے۔ اس کو مولانا اس طرح ادا کرتے ہیں:

دست پنہاں وقلم بین خط گذار
اسپ در جولان ونہ پیدا سوار(۱۲)

صفات باری

اسی طرح صفات باری پر متعدد اشعار سے مولانا روم کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی

ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ:

> ''مولانا کی اصل تعلیم یہ ہے کہ خدا کی ذات وصفات کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہئے اور جو کچھ کہا جائے گا وہ خدا کے اوصاف نہ ہوں گے۔ کیوں کہ انسان جو کچھ تصور کرسکتا ہے، محسوسات کے ذریعہ سے کرسکتا ہے اور خدا اس سے بالکل بری ہے۔''(۱۳)

نبوت

نبوت کی حقیقت، وحی کی حقیقت، مشاہدہ، ملائکہ، معجزہ، نبوت کی تصدیق کیوں کر ہوتی ہے، نبوت کے سلسلہ کے اہم مباحث ہیں۔ مولانا روم نے ان سب پر روشنی ڈالی ہے۔ علامہ شبلی نے اس کی مثالیں نقل کر کے ایک ایک کی تشریح وتوضیح کی ہے اور لکھا ہے کہ مولانا نے اس بحث کے تمام اجزاء پر لکھا ہے اور اس خوبی سے لکھا ہے کہ گویا اس راز سربستہ کی گرہ کھول دی ہے۔(۱۴)

روح

مثنوی میں اس موضوع کی بھی مولانا روم نے وضاحت کی ہے اور بڑی حکمت کے ساتھ اس کو بیان کیا ہے۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ:

> ''حقیقت یہ ہے کہ روح وغیرہ اس قسم کی چیزیں نہیں جن پر اس قسم کے دلائل قائم ہوسکیں جیسے محسوسات اور مادیات کے لئے ہوسکتے ہیں۔ ان چیزوں کے ثابت کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ان کی حقیقت اور خواص کی اس طرح تشریح کی جائے کہ خود بخود دل میں اذعان کی کیفیت پیدا ہوجائے۔ مولانا نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔''(۱۵)

معاد

یہ عقائد کی ایک اہم بحث ہے اور بقول علامہ شبلی ''حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ اعتقاد دل سے اٹھ جائے کہ معاصی اور افعال بد پر کبھی کسی نہ کسی قسم کا مواخذہ ضرور ہوگا تو تمام دنیا میں اخلاق

کا جو پایہ ہے دفعۃً اپنے درجہ سے گر جائے گا۔(۱۶) اس کی دوسری تفصیلات پیش کرنے کے بعد انھوں نے مولانا روم کے اشعار میں اس کی جزئیات پر جو اظہار خیال کیا گیا ہے، اس کی نشاندہی کی ہے اور لکھا ہے کہ:

''متکلمین کے برخلاف مولانا (روم) نے اس مسئلہ کی اس طرح تشریح کی ہے کہ روح جسم سے جداگانہ ایک جوہر نورانی ہے اور جس کے فنا ہونے پر اس پر صرف اس قدر اثر پڑتا ہے جتنا ایک کاری گر پر ایک خاص آلہ کے جاتے رہنے سے۔ چنانچہ جب یہ ثابت ہے کہ روح فنا نہیں ہوتی تو معاد کے ثابت کرنے کے لئے نہ اعادہ معدوم کے دعوی کی ضرورت ہے، نہ احیاء موتی کی۔''(۱۷)

جبر وقدر

علامہ شبلی نے پہلے جبر وقدر کی حقیقت واضح کی ہے، پھر مولانا روم کا اس سلسلے میں جو موقف ہے اسے ان کی مثنوی کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ جبر واختیار پر علاحدہ علاحدہ روشنی ڈالی ہے۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ:

''مولانا روم نے اس مسئلہ پر مختلف حیثیتوں سے بحث کی ہے۔ سب سے پہلے مولانا نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ گو جبریہ وقدریہ دونوں غلطی پر ہیں، لیکن ان دونوں کو نسبۃً دیکھا جائے تو قدریہ کو جبریہ پر ترجیح ہے، کیوں کہ اختیار مطلق بداہت کے خلاف نہیں اور جبر مطلق بداہت کے خلاف ہے۔ اس قدر ہر شخص کو بداہۃً نظر آتا ہے کہ وہ صاحب اختیار ہے۔ باقی یہ امر کہ یہ اختیار خدا نے دیا ایک فطری مسئلہ ہے۔ یعنی استدلال کا محتاج ہے، بدیہی نہیں۔''(۱۸)

اس کے بعد جبر وقدر پر مثنوی کی روشنی میں مولانا روم کے خیالات کی توضیح وتشریح ہے کہ مولانا کا عقیدہ عام روش سے علیحدہ ہے اور شبلی نے اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مولانا روم کا عام عقیدہ سے الگ روش اختیار کرنا، ان کے کمال اجتہاد بلکہ قوت قدسیہ کی دلیل ہے۔(۱۹)

اس کے بعد سوانح مولانا روم میں تصوف کا باب ہے۔ جس میں تصوف کی حقیقت اور حضرات صوفیاء کے خیالات پیش کرنے کے بعد مولانا روم کے خیالات پیش کئے گئے ہیں۔ توحید کے ضمن میں وحدۃ الوجود اور دوسرے مقامات سلوک کا ذکر ہے۔ متعدد دلائل پیش کرنے کے بعد علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ:

''مولانا وحدۃ الوجود کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک تمام عالم اسی ہستی مطلق کی مختلف شکلیں اور صورتیں ہیں۔ اس بنا پر صرف ایک ذات واحد موجود ہے اور تعدد جو محسوس ہوتا ہے محض اعتباری ہے۔'' (۲۰)

آخر میں فلسفہ و سائنس کے بعض مباحث جن کا ذکر مثنوی میں پایا جاتا ہے مثلاً تجاذب اجسام، تجاذب ذرات، تجدد امثال اور مسئلہ ارتقا وغیرہ کا بیان ہے۔ اس طرح علامہ شبلی کی یہ کتاب سوانح سے زیادہ فلسفہ و کلام کی کتاب ہوگئی ہے۔

تحقیقات

علامہ شبلی نے جس وقت یہ کتاب لکھی تھی اس وقت مولانا روم کے متعلق بہت کم مستند مواد و معلومات دستیاب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے زیادہ تر دو کتابوں رسالہ سپہ سالار اور مناقب العارفین کی بنیاد پر سوانح مولانا روم قلم بند کی۔ اس کے باوجود کئی مقامات پر انھوں نے اپنے ذوق تحقیق و تدقیق سے کام لے کر اصل حقائق کی وضاحت کی ہے مثلاً:

۱- مولانا روم کا دیوان شمس تبریز کے نام سے اس قدر مشہور تھا کہ انھیں کے نام سے شائع تک ہوا۔ علامہ شبلی نے اسے فاش غلطی قرار دیا اور قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ اصلاً مولانا روم کا دیوان ہے۔ (۲۱) مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نے لکھا ہے کہ یہ فیصلہ بالکل درست ہے۔ (۲۲) البتہ انھوں نے رباعی کے ذکر نہ کرنے کا شکوہ کیا ہے۔ (۲۳) لیکن قیاس یہ ہے کہ علامہ شبلی کے پیش نظر جو دیوان تھا غالباً اس میں رباعیات نہ تھیں۔

۲- مثنوی کے چھٹے دفتر کے بارے میں عام رائے یہ تھی کہ وہ مولانا روم کا نہیں ہے۔ بعد کے لوگوں نے شامل کر دیا ہے۔ علامہ شبلی نے اس کی بھی تحقیق کی اور ثابت کیا کہ یہ دراصل

مولانا روم ہی کا ہے، جسے انھوں نے بیماری کے بعد مکمل کیا اور پھر ساتواں دفتر بھی لکھا۔(۲۴)

۳- اسی طرح شمس تبریز کے قونیہ وارد ہونے اور مولانا سے ملاقات کا حال مختلف تذکرہ نگاروں نے مختلف انداز سے قلم بند کیا ہے۔ جس میں خوش عقیدگی کی وجہ سے بہت سے دوراز کار واقعات شامل کر دیئے ہیں۔ علامہ شبلی نے یہاں بھی روایت ودرایت کے اصولوں سے کام لیتے ہوئے اصل واقعہ قلم بند کیا ہے۔(۲۵)

البتہ بعض واقعات کی تحقیق کی طرف انھوں نے توجہ نہیں کی۔ مثلاً قونیہ میں چالیس دن تک مسلسل زلزلہ کا آنا۔ یہ اس قدر اہم واقعہ تھا کہ اس عہد کی دوسری تاریخوں سے بھی اس کی تصدیق وتحقیق کی جاسکتی تھی مگر علامہ شبلی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ اسی طرح کی بعض اور روایتیں بھی جگہ پا گئی ہیں۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ مولانا روم کے ذکر میں اسی طرح کے دوراز کار واقعات کی کثرت تھی جس کی وجہ سے بعض واقعات کا درج ہو جانا قرین قیاس ہے۔ بحیثیت عموی علامہ شبلی نے تحقیق وتدقیق اور تلاش وتفحص سے کام لیا ہے۔

مثنوی پر ریویو

علامہ شبلی نے مولانا روم کے دیوان اور مثنوی پر ادبی وتنقیدی لحاظ سے جو نقد وتبصرہ کیا ہے، وہ کتاب کا ایک اہم پہلو ہے۔ عموماً کلامی مباحث کی وجہ سے اس کی طرف نقادوں نے توجہ ہی نہیں کی حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ شبلی نے مثنوی کی شرح میں جو ادبی نکتے بیان کر دیئے ہیں، مثنوی کے متعدد شارحین کی وہاں تک نظر نہ پہونچ سکی۔ اس لحاظ سے کہیں کہیں یہ کتاب ادب وتنقید کا نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً مولانا روم کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱- عام غزلوں کی طرح ہر شعر الگ نہیں ہوتا۔

۲- ان کے کلام میں جو جوش وجد اور بے خودی پائی جاتی ہے وہ اوروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔

۳- عشق ومحبت کے جوش میں عاشق پر جو خاص خاص حالتیں گذرتی ہیں، ان کو اس خوبی سے ادا کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے ان کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔

۴- ان کے کلام میں جلال، ادعا، بے باکی اور بلند آہنگی پائی جاتی ہے۔ (۲۶)

بحیثیت سوانح

سوانح مولانا روم ایک سوانح عمری ہے، اس حیثیت سے اس کا نقادوں نے مطالعہ وجائزہ لیا ہے اور اس پر اعتراضات کئے ہیں، مثلاً ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ:

> ''محض سوانح عمری کی حیثیت سے یہ کتاب شبلی کی غالباً ناقص ترین کتاب ہے۔ ......جس طرح مولانا (روم) کے قدیم سوانح نگار سپہ سالار نے ان کی لائف سے انصاف نہیں کیا، اسی طرح جدید محققین کے سپہ سالار مولانا شبلی نے بھی ان کی سوانح نگاری کا حق ادا نہیں کیا۔'' (۲۷)

اسی طرح ڈاکٹر سید شاہ علی نے بھی بحیثیت سوانح اسے کمزور کتاب قرار دیا ہے۔ (۲۸) لیکن ان نقادوں نے ان کمیوں کی نشاندہی نہیں کی جن کی بنیاد پر اسے ناقص قرار دیا ہے۔ غالباً مولانا روم کے سوانحی کوائف کی کمی کے باعث یہ الزامات روا رکھے گئے۔ حالانکہ اختصار کی وجہ خود شبلی نے واضح کر دی ہے کہ ان کے حالات دستیاب نہیں۔ گویا بنیادی کمی مواد و معلومات کی ہے جو ظاہر ہے شبلی کا قصور نہیں۔ جب مولانا روم کی زندگی کی جزئیات دستیاب نہیں تو انہیں شبلی کہاں سے پیش کرتے۔ اب سوال یہ ہے کہ جو معلومات دستیاب تھیں ان سے کس درجہ کام لیا گیا؟ سوانح مولانا روم پڑھنے والا گواہی دے گا کہ اس سے عمدہ مرقع مولانا روم کی زندگی کا پیش کرنا آسان نہیں۔

ان اعتراضات کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ چونکہ دوسرا حصہ جس میں تصنیفات رومی اور کلامی مباحث زیر بحث آئے ہیں وہ طویل ہے اور کدوکاوش کا نمونہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں سوانحی حصہ مختصر ہے۔ غالباً اسی وجہ سے یہ خیالات پیدا ہوئے۔ اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ یہ کتاب ائمہ علم کلام کی سوانح عمریوں کے سلسلہ کی کڑی ہے۔ اسے محض سوانحی اصولوں پر پرکھنا مناسب نہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی صاحب سوانح کی زندگی، عظمت، شخصیت اور کارناموں کا کوئی گوشہ نامکمل نہیں اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ خود ڈاکٹر سید شاہ علی نے بھی اعتراف کیا ہے کہ اس میں شبلی کا سوانحی شعور اطمینان بخش اور ترقی یافتہ ہے۔ (۲۹) مجموعی طور سے مولانا روم

پر یہ ایک اہم کتاب ہے اور غالباً اپنی نوعیت کے لحاظ سے واحد اور منفرد، جس کی مثال ہماری علمی ادبی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

مولانا روم سے متعلق اب بعض جدید ماخذ سامنے آ گئے ہیں جس سے اور بہتر طور پر مولانا روم کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور کیا جا رہا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اب تک سوانح مولانا روم جیسی کوئی دوسری کتاب نہیں لکھی جا سکی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب ہندوستان سے ایران تک مقبول ومتداول ہے۔ مشہور شبلی شناس اور ایرانی مترجم سید محمد تقی فخر داعی گیلانی [ف: ۱۹۵۳ء] نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، جو ۱۳۳۲ھ ش میں شرکت چاپ رنگین تہران سے شائع ہوا۔ ایک اور ترجمہ ہاشم پور اور توفیق سبحانی نے ''زندگی نامہ مولانا جلال الدین رومی'' کے نام سے کیا، جسے علم، تہران نے ۱۳۸۲ھ ش میں شایع کیا۔ ان تراجم کے ذریعہ سوانح مولانا روم کی شہرت بعض مغربی اہل قلم تک پہنچی، چنانچہ ایک انگریز مصنف "Levis Franklin" لوس فرنک لین نے اپنی کتاب Rumi Past & Persent, East & West,Oxford one world Publication, 2000 میں تین جگہ [ص ۲۷۱، ۳۳۶، ۴۸۲] اس کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ اور اسے مولانا روم کی پہلی سوانح عمری قرار دیا ہے۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ جدید دور میں بنیادی طور پر اسی سے مطالعہ رومی کا آغاز ہوا۔ (۳۰)

حوالے

(۱) دیباچہ سوانح مولانا روم ص ۳
(۲) مقالات شروانی ص ۱۵۴
(۳) سوانح مولانا روم ص ۱-۲
(۴) ایضاً ص ۳
(۵) ایضاً ص ۶
(۶) ایضاً
(۷) ایضاً ص ۲۷-۲۸
(۸) ایضاً ص ۱۹-۲۰

(۹) ایضاً ص۳٦

(۱۰) ایضاً ص٦۵

(۱۱) ایضاً ص۸۱

(۱۲) ایضاً ص۸۳

(۱۳) ایضاً ص۹۲

(۱۴) ایضاً ص۹۳

(۱۵) ایضاً ص۱۱۰-۱۱۱

(۱٦) ایضاً ص۱۱۸

(۱۷) ایضاً

(۱۸) ایضاً ص۱۲۸

(۱۹) ایضاً ص۱۲۹

(۲۰) ایضاً ص۱۴۲-۱۴۳

(۲۱) ایضاً ص۳۵-۲٦

(۲۲) مقالات شروانی ص۱۵۴

(۲۳) ایضاً

(۲۴) سوانح مولانا روم ص۳٦

(۲۵) ایضاً ص۷-۱۰

(۲٦) ایضاً ص۳۹-۴۰

(۲۷) سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص۱۴۷

(۲۸) اردو میں سوانح نگاری ص۱۹۷

(۲۹) ایضاً۔

(۳۰) رومی پاسٹ اینڈ پرزنٹ، ایسٹ اینڈ ویسٹ ص۱۷۱،۲۸۲،۴۸۲، آکسفورڈ ۲۰۰۰ء

موازنہ انیس ودبیر

موازنہ انیس ودبیر علامہ شبلی اور اردو کی مقبول ترین کتابوں میں سے ہے۔ طبع اول ۱۹۰۷ء سے لے کر آج تک اہل علم اور ارباب نظر کی توجہ خاص کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ متعدد نقادوں نے اس کی عظمت واہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ اس کے مطالعہ وتجزیے پر مشتمل سیکڑوں مضامین اور کم از کم تین کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موازنہ انیس ودبیر ہماری ادبی وتنقیدی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

علامہ شبلی علی گڑھ کے بعد سرکار آصفیہ حیدرآباد کے سر رشتہ علوم وفنون سے وابستہ ہوئے تو یہاں کے ادبی ماحول میں انھیں خیال آیا کہ اردو کے کسی ایسے شاعر کے کلام پر تقریظ وتنقید لکھی جائے جس سے اردو شعروادب کی کم مائیگی کا احساس ختم ہو۔ چنانچہ انھوں نے میر وغالب کے مقابلہ میں میر انیس کا انتخاب کیا۔ ان کا خیال تھا کہ کلام انیس میں محاسن شعری بدرجہ اتم موجود ہیں۔(۱)

۱۹۰۳ء میں موازنہ لکھنے کا آغاز ہوا اور ۱۹۰۴ء میں یہ کتاب پایہ تکمیل کو پہنچی اور اشاعت کی غرض سے سرکار عالیہ آصفیہ حیدرآباد میں پیش ہوئی، مگر علامہ شبلی کی تمام کوششوں کے باوجود وہاں سے اشاعت کی نوبت نہ آسکی اور نہ ہی اس کا مسودہ واپس ملا۔ اب وہ مسودہ نیشنل میوزیم دہلی کی تحویل میں ہے۔ مسودہ کی عدم دستیابی کے بعد علامہ شبلی نے اسے لکھنؤ میں دوبارہ لکھا اور ۱۹۰۷ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے منشی قادر علی خاں صوفی کے زیر اہتمام طبع کرایا۔

مختلف اشاعتیں

طبع اول ۱۹۰۷ء کے بعد سے یہ مسلسل شائع ہو رہی ہے۔ اب تک اس کے مندرجہ

ذیل معلوم اڈیشن چھپ چکے ہیں:

[۱]	▪ مطبع مفید عام، آگرہ، طبع اول	۱۹۰۷ء	۲۸۵ص	
[۲]	▪ انوار المطابع، لکھنؤ	۱۹۲۱ء	۲۸۲ص	
[۳]	▪ الناظر پریس، لکھنؤ	۱۹۲۴ء	۲۸۴ص	
[۴]	▪ شیخ جان محمد، لاہور	۱۹۳۱ء	۳۰۸ص	
[۵]	▪ لالہ نرائن لال، الہ آباد	۱۹۳۶ء	۳۴۳ص	
[۶]	▪ لالہ نرائن لال، الہ آباد	۱۹۶۱ء	۳۴۳ص	
[۷]	▪ اردو اکیڈمی، کراچی	۱۹۶۲ء	۳۰۸ص	
[۸]	▪ مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۳ء	۴۸۷ص، سید عابد علی عابد	
[۹]	▪ مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۴ء	۵۷۷ص	
[۱۰]	▪ مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۵ء	۵۳۰+۸۸ص	
[۱۱]	▪ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۱۹۶۹ء	۳۰۴ص	
[۱۲]	▪ رام نرائن لعل بک سیلر، الہ آباد	۱۹۷۷ء	۳۳۶ص، سید مسیح الزماں	
[۱۳]	▪ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۱ء	۳۰۴ص، ڈاکٹر فضل امام	
[۱۴]	▪ یو پی اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۸۱ء	۲۸۵ص	
[۱۵]	▪ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۱۹۸۲ء	۳۰۴ص، رشید حسن خاں	
[۱۶]	▪ رام نرائن ارون کمار، الہ آباد	۱۹۸۷ء	۳۵۴ص، سید رفیق حسین	
[۱۷]	▪ یو پی اردو اکاڈمی، لکھنؤ	۱۹۸۶ء		
[۱۸]	▪ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۸ء	۳۰۴ص	
[۱۹]	▪ لاہور پرنٹنگ ورکس، لاہور	غیر مورخہ	۳۰۲ص	
[۲۰]	▪ دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۲۰۰۴ء	۲۹۹ص، محمد الیاس الاعظمی	
[۲۱]	▪ چمن بک ڈپو، دہلی	۲۰۰۷ء	۳۱۶ص	
[۲۲]	▪ گومتی نگر، لکھنؤ	۲۰۱۰ء	۳۲۰ص، سید مجاور حسین	

یہ موازنہ انیس ودبیر کی معلوم اشاعتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے نہ جانے کتنے ایڈیشن پبلشرز نے شائع کئے۔ چوں کہ یہ کتاب کئی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رہی اس لئے متعدد پبلشرز نے طلبہ کی سہولت کے پیش نظر سستے ایڈیشن شائع کئے، جس کی تفصیلات دستیاب نہ ہوسکیں۔

محقق ایڈیشن

موازنہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اردو کی یہ واحد کتاب ہے جس کے سات محقق ایڈیشن اردو کے ممتاز محققین کی تحقیق وتدوین کے ساتھ شایع ہوئے۔ یہاں ان کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے:

[۱] پہلا محقق ایڈیشن سید عابد علی عابد کی تحقیق سے ۱۹۶۳ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہوا۔ چونکہ یہ محقق ایڈیشن راقم کی نظر سے نہیں گذرا، اس لئے یہ تفصیل معلوم نہ ہوسکی کہ سید عابد علی عابد نے اس تحقیق میں کن امور پر توجہ دی ہے۔

[۲] ۱۹۷۷ء میں ڈاکٹر مسیح الزماں کی تحقیق ومراجعت کے بعد رام نرائن بک سیلر الہ آباد نے موازنہ انیس و دبیر کا دوسرا محقق ایڈیشن شائع کیا۔ اس پر انہوں نے محض ایک مقدمہ لکھا ہے۔

[۳] موازنہ انیس ودبیر کا تیسرا تحقیق شدہ ایڈیشن مکتبہ جامعہ دہلی نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا۔ اسے مشہور محقق رشید حسن خاں (۲۶رفروری ۲۰۰۶ء) نے مرتب کیا ہے۔ انہوں نے ایک عمدہ اور بڑا محققانہ مقدمہ لکھا ہے، جس میں صراحت کی ہے کہ ''اس کے متن کی بنیاد طبع اول پر رکھی گئی ہے۔ اصل نسخے میں اشعار کا متن متعدد جگہ مشکوک معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں کوئی تصرف نہیں کیا گیا ہے۔'' (طبع دوم ص ۸۔ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ دہلی ۱۹۸۹ء) اب تک اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

[۴] چوتھا محقق ایڈیشن ڈاکٹر سید رفیق حسین کی ترتیب وتدوین کے ساتھ لالہ رام نرائن الہ آباد نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ اس میں انہوں نے ایک مقدمہ کے علاوہ دو ضمیموں کا

اضافہ کیا ہے۔علامہ شبلی نے موازنہ انیس و دبیر میں فردوسی اور محتشم کاشی کے جو مراثی نقل کئے ہیں، ان ضمیموں میں انہی دونوں کا ترجمہ ہے۔ان کا ایک اور کام یہ ہے کہ موازنہ میں انیس و دبیر کے مشکل الفاظ کے آسان معنی بھی حاشیے میں دیدئے ہیں۔

[۵] پروفیسر فضل امام رضوی کے نام سے موازنہ کا ایک ایڈیشن ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔اس میں پروفیسر موصوف نے ایک مقدمہ کے علاوہ کیا محنت کی ہے، اس کی کہیں وضاحت نہیں کی گئی ہے۔البتہ جو مقدمہ لکھا ہے اس میں انہوں نے تنقیص شبلی کا کوئی پہلو چھوڑا نہیں ہے۔

[٦] موازنہ انیس و دبیر کا چھٹا تحقیقی ایڈیشن راقم کی تحقیق و مراجعت کے بعد ۲۰۰۴ء میں دارالمصنّفین نے شائع کیا۔اس میں حوالوں کی تصحیح و تخریج کے ساتھ جو سب سے اہم کام کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ موازنہ میں علامہ شبلی نے جو مراثی نقل کئے ہیں مطبوعہ مراثی [نظامی و نول کشور] سے ان کے حوالے دیدئے ہیں، جس سے اصل مراثی تک رسائی اور ان کی تحقیق آسان ہوگئی ہے۔متن کی بنیاد اس مطبوعہ نسخے پر ہے، جسے علامہ شبلی نے ۱۹۰۷ء میں مطبع نامی کانپور سے شائع کیا تھا۔

[۷] موازنہ انیس و دبیر کا ساتواں محقق ایڈیشن پروفیسر سید مجاور حسین اور ڈاکٹر سید علی حیدر کی ترتیب و تدوین سے ۲۰۱۰ء میں [ورام کھنڈ گومتی نگر لکھنؤ] سے شائع ہوا ہے۔اس میں ایک دیباچہ، مولانا شبلی کے حالات، موازنہ کی مقبولیت، مرثیہ کی اجمالی تاریخ اور آخر میں فرہنگ ہے۔دارالمصنّفین کے محقق ایڈیشن کو چھوڑ کر اس میں وہ تمام کوششیں جو گذشتہ ایڈیشن میں محققین نے علاحدہ علاحدہ کی تھیں اس میں ان سب کو سلیقہ سے جمع کر دیا گیا ہے۔اس سے طلبہ کو یقیناً بڑی سہولت ہوگی۔

تلخیصات

موازنہ انیس و دبیر کی ان محققانہ اشاعتوں کے سوا اس کے دو خلاصے بھی شائع ہوئے ہیں۔

ا۔ایک خلاصہ بشیر احمد نے کیا ہے۔ جسے شیخ مبارک علی، لاہور نے شائع کیا ہے۔ یہ راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔

۲۔دوسرا خلاصہ اختر حسن، اختر لکھنوی کے قلم سے ہے۔ یہ شاہی پریس نعمت اللہ روڈ لکھنؤ میں طبع ہوااور صدیق بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوا۔ سنہ اشاعت درج نہیں۔ خلاصہ نگار نے سرورق پر لکھا ہے کہ ''کتاب کی تلخیص اس طور پر کی گئی ہے کہ کتاب کی کوئی ضروری بات چھوٹی نہیں۔'' اس کے علاوہ خلاصہ نگار نے کوئی مقدمہ لکھا ہے نہ تلخیص کے اسباب۔

مطالعہ ومحاسبہ

موازنہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ارباب نظر نے اس کو تحقیق وتنقید کا موضوع قرار دیا اور اس پر تحقیقی مقالے لکھوائے۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر ارشاد نیازی کا ہے جو''موازنہ انیس ودبیر، مطالعہ، محاسبہ، تقابل'' کے عنوان سے دہلی سے ۲۰۰۰ء میں چھپ چکا ہے۔ ۱۹۹۵ء میں ایک اور مقالہ برائے ایم فل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اردو میں ''موازنہ انیس ودبیر کا تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے سہیل اختر نے لکھا تھا جو اب تک شائع نہیں ہوسکا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور کتاب سید ظہور الاسلام نے ''موازنہ انیس ودبیر کا تنقیدی مطالعہ'' کے نام سے لکھی ہے جو ۱۹۸۶ء میں مالوہ پبلشنگ ہاؤس بھوپال سے شایع ہوچکی ہے۔ مگر راقم کی نظر سے نہیں گذری۔

ان مستقل مطالعات کے علاوہ اس کی اشاعت کے بعد انیس ودبیر پر جس قدر تحریریں وجود میں آئیں، ان میں شاید ہی کوئی ایسی تحریر ہو جس میں شبلی اور موازنہ کا ذکر نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ شبلی نے ایک موازنہ لکھ کر سیکڑوں موازنے لکھوادیئے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موازنہ ایک صدی سے ہمارے نقادوں کے دل ودماغ اور ذوق ووجدان پر کس قدر اثر انداز ہے اور اس کے کس قدر دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔

سبب تالیف اور مندرجات

موازنہ کا آغاز ایک مختصر تمہید سے ہوا ہے، جس میں وجہ تالیف، میر انیس [ف:

۱۰؍دسمبر۱۸۷۴ء] کے انتخاب کا سبب، شاعری کی حقیقت اور مراثی میں جن لوگوں کا ذکر آتا ہے، ان کے نام اور خصوصیات کا مختصراً ذکر ہے۔ مولانا شبلی قوم کی بد مذاقی پر اظہار تاسف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فلسفہ اور شاعری برابر درجے کی چیزیں ہیں۔ لیکن قوم کی بد مذاقی سے جس قسم کی شاعری نے ملک میں قبول عام حاصل کر لیا ہے اس نے لوگوں کو یقین دلا دیا ہے کہ اردو شاعری میں زلف وخال وخط یا جھوٹی خوشامد اور مداحی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ میر تقی کی غزلیت، درد کا تصوف، غالب کا فلسفہ، شاعری کی جان ہیں، لیکن ان بیش بہا خزانوں میں سے بھی عام لوگوں کی نگاہ صرف خزف ریزوں پر پڑتی ہے۔ میر انیس کا کلام شاعری کے تمام اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے لیکن ان کی قدر دانی کا طغرائے امتیاز صرف اس قدر ہے کہ '' کلام فصیح ہوتا ہے اور بین اچھا لکھتے ہیں۔'' بد مذاقی کی نوبت یہاں تک پہونچی کہ وہ اور مرزا دبیر حریف مقابل قرار دیئے گئے اور مدت ہائے دراز کی غور وفکر، کدو کاوش، بحث وتکرار کے بعد بھی فیصلہ نہ ہو سکا کہ مسند نشیں کس کو کیا جائے۔''(۲)

اس بد مذاقی نے ان کے دل میں یہ داعیہ پیدا کیا کہ میر انیس کی عظمت اور ان کے محاسن شعری کو اجاگر کیا جائے تاکہ اس بد مذاقی کا سد باب ہو سکے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''مدت سے میرا ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ وتنقید لکھی جائے جس سے اندازہ ہو سکے کہ اردو شاعری باوجود کم مایگی زبان، کیا پایہ رکھتی ہے؟۔ اس غرض کے لئے میر انیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے۔''(۳)

سبب تالیف اور انتخاب انیس کے وجوہ بیان کرنے کے بعد شاعری کی حقیقت وماہیت بیان کی ہے اور ان اصولوں کا ذکر کیا ہے جس کی روشنی میں کلام انیس کا مطالعہ وتجزیہ ناگزیر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''شاعری کے دو جز ہیں، مادہ وصورت، یعنی کیا کہنا چاہئے اور کیوں کر کہنا چاہئے؟۔انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے سننے یا کسی حالت یا واقعے کے پیش آنے سے جوش ومسرت،عشق ومحبت، درد ورنج،فخر وناز،حیرت واستعجاب، طیش وغضب وغیرہ وغیرہ کی جو حالت پیدا ہوتی ہے اس کو جذبات سے تعبیر کرتے ہیں۔ان جذبات کا ادا کرنا شاعری کا اصل ہیولیٰ ہے۔ان کے سوا عالم قدرت کے مناظر مثلاً گرمی وسردی،صبح وشام، بہار وخزاں، باغ وبہار، دشت وصحرا، کوہ وبیاباں کی تصویر کھینچنا یا عام واقعات اور حالات کا بیان کرنا بھی اس میں داخل ہے۔

لیکن یہ شرط ہے کہ جو کچھ کہا جائے اس انداز سے کہا جائے کہ جو اثر شاعر کے دل میں ہے وہی سننے والوں پر بھی چھا جائے۔ یہ شاعری کا دوسرا جز یعنی اس کی صورت ہے اوران ہی دونوں جزوں کے مجموعے کا نام شاعری ہے۔باقی خیال بندی،مضمون آفرینی، دقت پسندی، مبالغہ، صنائع وبدائع ،شاعری کی حقیقت میں داخل نہیں اگر چہ بعض جگہ یہ چیزیں نقش ونگار اور زیب وزینت کا کام دیتی ہیں۔میر انیس کی شاعری کو اسی معیار سے جانچنا چاہئے جس کا مختصراً بیان ہوا۔ جس شخص کو یہ معیار تسلیم نہ ہو اس کے سامنے میر انیس کی نسبت کمال شاعری کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔''(۴)

یہ طویل اقتباس اس لئے نقل کیا گیا کہ شبلی کا تصور شعر وشاعری کیا تھا اور انھوں نے کلام انیس کو کن اصول ونظریات کی روشنی میں پرکھا اوراس نتیجے پر پہنچے کہ کلام انیس میں اصناف سخن کے بہتر سے بہتر نمونے پائے جاتے ہیں اوران کا کلام مرزا دبیر سے بلند رتبہ ہے، پورے طور پر واضح ہو جائے۔

تمہید کے بعد مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ ہے،جس میں قصائد پر مرثیے کا اثر،قدیم عربی وفارسی مرثیہ نگاری، اردو مرثیہ نگاری کا آغاز وارتقا اورانیس سے پہلے کے مرثیہ نگاروں کی کاوشوں کا ذکر ہے۔ کتاب کا یہ حصہ اردو ادب کی تاریخ میں پہلی بار لکھا گیا۔اس سے قبل مولوی محمد حسین

آزاد (ف:۲۲رجنوری ۱۹۱۰ء) نے آب حیات اور مولانا حالی نے مقدمہ شعروشاعری میں انیس اور مرثیے کا ذکر اجمالی طور پر کیا تھا۔شبلی نے مرثیے کے آغاز وارتقاء کی تاریخ کا تصور پیش کر کے نہ صرف انیس ودبیر بلکہ اصناف ادب میں مرثیے کو بلند مقام عطا کیا۔بعض نقادوں نے اس میں تحقیق وتدقیق کی کمیاں نکالی ہیں اور شبلی پر تلاش وتفحص سے کام نہ لینے کا الزام عائد کیا ہے۔(۵) حالانکہ معاملہ محض اس قدر ہے کہ یہ تحریر پس منظر کے طور پر قلم بند کی گئی ہے۔اس سے ایک مفصل تاریخ کا مطالبہ ومواخذہ کرنا قرین انصاف نہیں۔تاہم اس کو بنیاد بنا کر بعد کے اہل قلم نے مرثیہ کی جو تاریخیں لکھیں وہ دراصل شبلی کی اسی تحریر کے مفید نتائج ہیں۔

پس منظر کے بعد میر انیس کے حالات اور خاندانی احوال کا مختصراً ذکر ہے۔سید احتشام حسین (ف:۱رد سمبر۱۹۷۲ء) کا خیال ہے کہ شبلی نے میر انیس کے احوال بھی سرسری لکھے۔جب کہ معمولی تلاش وتفحص سے ان کے مفصل حالات لکھے جا سکتے تھے۔(۶) یہ اعتراض اپنی نوعیت کے لحاظ سے درست معلوم ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا شبلی انیس کے حالات لکھنا چاہتے تھے اور انھوں نے حق ادا نہیں کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ انیس کے حالات وسوانح لکھنا مصنف کے پیش نظر تھا ہی نہیں۔بلکہ انیس کے شاعرانہ کمالات کا ذکر مقصود تھا۔اس لئے انھوں نے کتاب کے ضمنی مباحث پر زور صرف نہیں کیا ورنہ الفاروق کے مصنف کو جس نے الفاروق کے لئے روم ومصر وشام کا سفر کر ڈالا ہو، لکھنؤ میں بیٹھ کر انیس کے حالات دریافت کرنا کیا مشکل تھا۔

اس کے بعد علامہ شبلی نے انیس کے شاعرانہ کمالات اور فنی خصوصیات کا مفصل جائزہ لیا ہے اور دکھلایا ہے کہ انیس ایک مایہ ناز شاعر تھے اور ان کا کلام اردو شاعری کا سرمایہ ناز ہے۔

شاعری کے بنیادی ارکان ولوازمات مثلاً فصاحت وبلاغت، روزمرہ اور محاورے، ضرب الامثال، بحر، حسن قافیہ وردیف، تنسیق الصفات، تشبیہات واستعارات، صنائع وبدائع، حسن التعلیل، لف ونشر، مراعات النظیر، منظر نگاری، واقعہ نگاری، رزمیہ، جذبات کی عکاسی وغیرہ پر میر انیس کس قدر مہارت رکھتے تھے اور فن کی باریکیوں، نزاکتوں اور رفعتوں پر ان کی کس قدر گہری نگاہ تھی، ان تمام بنیادی مباحث کا علامہ شبلی نے تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔مثالیں دی ہیں اور انیس کی عظمت بیان کی ہے۔مثلاً فصاحت کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''میر انیس صاحب کے کلام کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر موقع پر فصیح سے فصیح الفاظ ڈھونڈ کر لاتے ہیں ۔ مرزا دبیر اور میر انیس کے ہم مضمون اشعار لو، اگر مرزا صاحب کے ہاں غریب اور ثقیل الفاظ ہوں گے تو ان کے مقابلے میں میر صاحب کے ہاں فصیح الفاظ ہوں گے اور اگر مرزا صاحب کے ہاں فصیح الفاظ ہوں گے تو میر صاحب کے ہاں فصیح تر ہوں گے۔ مرزا دبیر کی تخصیص نہیں تمام مرثیہ گویوں کے مقابلے میں میر انیس کے کلام کا یہی حال ہے۔''(۷)

انسانی جذبات واحساسات کو شاعری کی روح قرار دیتے ہوئے شبلی نے میر انیس کی جذبات نگاری کا جائزہ لیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''میر انیس کا اصلی جوہر یہیں آ کر کھلتا ہے اور یہیں ان کی شاعری کی حد ان کے ہم عصروں سے بالکل جدا ہو جاتی ہے۔ انسانی جذبات کی سیکڑوں قسمیں ہیں اور پھر ہر ایک کے مختلف مراتب اور مدارج ہیں۔ مثلاً جذبات انسانی کی ایک قسم محبت ہے لیکن محبت کے بھی مختلف اقسام اور مدارج ہیں۔ باپ بیٹے کی محبت، بھائی بھائی کی محبت، یار آشنا کی محبت، آقا اور غلام کی محبت، وغیرہ وغیرہ۔ میر انیس کے مرثیوں میں نہایت کثرت سے ان جذبات اور ان کے مختلف مدارج کا ذکر ہے لیکن جس جگہ جس چیز کو لیا ہے اس کمال کے ساتھ اس کی تصویر کھینچی ہے کہ اس کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔''(۸)

اسی طرح میر انیس کی واقعہ نگاری کے متعلق لکھا ہے کہ ''میر انیس نے واقعہ نگاری کو جس کمال کے درجے تک پہنچایا ہے، اردو کیا فارسی میں بھی اس کی نظیریں مشکل سے مل سکتی ہیں۔''(۹)

آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

''اس کے ساتھ الفاظ میں فصاحت، سلاست، روانی، بندش میں چستی، چستی کے ساتھ بے تکلفی، دل آویزی اور برجستگی، لطیف اور نازک تشبیہات اور استعارات، اصول بلاغت کے مراعات، ان تمام اوصاف میں سے کون سی چیز مرزا دبیر میں پائی جاتی ہے؟ فصاحت ان کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی، بندش میں

تعقید اور اغلاق، تشبیہات و استعارات اکثر دور از کار، بلاغت نام کو نہیں، کسی
چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں۔ خیال آفرینی
اور مضمون بندی البتہ ہے لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہیں سکتے۔''(۱۰)

علامہ شبلی نے اپنے موقف کی تائید میں مراثی انیس سے کثرت سے اشعار نقل کئے ہیں اور جہاں جہاں دبیر سے موازنہ کیا ہے، وہاں دبیر کے مراثی سے بھی استدلال کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ میر انیس کا کلام، مرزا دبیر سے بلند رتبہ ہے۔ خاص طور سے فنی لحاظ سے دبیر کا کلام انیس سے فروتر ہے۔

اس کے بعد میر انیس کی رباعی اور سلام نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کلام انیس پر ناسخ نے جو اعتراضات کیے ہیں ان کا بھی ذکر ہے۔ خود بھی چند اعتراضات وارد کیے ہیں۔ پھر سرقات کے عنوان سے ان موضوعات کی نشاندہی کی ہے جو انیس کے پیش رو مرثیہ نگاروں نے باندھے تھے اور جنھیں انیس نے بھی باندھا ہے۔ آخر میں انیس و دبیر کے متحد المضمون اشعار نقل کر کے ایک دوسرے سے تجزیہ و مقابلہ کیا گیا ہے۔ شبلی نے یہاں بھی انیس کی برتری ثابت کی ہے۔ البتہ کہیں کہیں جہاں دبیر کے کلام میں خوبیاں تھیں ان کا بھی اعتراف کیا ہے۔ مجموعی طور سے ''موازنہ انیس و دبیر'' انیس کی شاعرانہ عظمت کا مرقع ہے۔ یہاں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انیس کے فکر و فن پر اس سے عمدہ کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔

ردالموازنہ اور اس کی حیثیت

چوں کہ موازنہ انیس و دبیر کی اشاعت سے پہلے بلکہ عہد انیس و دبیر سے ان کے حامی باہم برسر پیکار تھے۔ اس لئے موازنہ کی اشاعت اور انیس کی حمایت نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ دبیر کے حامی چراغ پا ہو گئے اور مخالفت میں مضامین اور کتابیں لکھیں۔ موازنہ انیس و دبیر اور خود علامہ شبلی پر طرح طرح کی تنقیدیں کی گئیں اور یہ ایک متنازعہ کتاب قرار پائی۔ لیکن چوں کہ علامہ شبلی نے اپنے خیالات مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کئے تھے، اس لئے علی العموم ان کے خیالات کو تسلیم کیا گیا اور آج ایک صدی گذرنے کے بعد شبلی کے موقف کی صداقت سب پر واضح ہے

اور مخالفت میں لکھی جانے والی کتابوں سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ موازنہ کے جواب میں لکھی جانے والی کتابوں کے نام یہ ہیں:

[۱] ردالموازنہ میر افضل علی ضو۔ مطبع تصویر عالم۔ لکھنؤ ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۸ء

[۲] تردیدالموازنہ حسن رضا و محمد جان عروج۔ مطبع تصویر عالم۔ لکھنؤ

[۳] المیزان نظیرالحسن فوق رضوی۔ مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۹۱۴ء

ردالموازنہ ستر صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مرزا دبیر پر علامہ شبلی کے اعتراضات کو درج ذیل پانچ قسموں میں تقسیم کیا ہے:

[۱] ایرادمعانی بے جا [۲] ابتدائے عمر کا کلام [۳] اتہام بر بنائے مشہور عوام [۴] ملحقات [۵] وہ کلام جو شبلی صاحب سے پڑھا نہیں گیا۔

اور پھر ان عنوانات کے تحت نقد شبلی کا جواب دیا گیا ہے اور سنجیدہ لب ولہجہ کے بجائے شوخ اور غیر متین انداز میں جوابات دئے گئے ہیں۔ ردالموازنہ کے مصنف نے دبیر پر شبلی کے اعتراضات کا جائزہ لینے کے علاوہ شبلی کی زبان و بیان اور اسلوب پر بھی تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ ''جون پور اور اعظم گڑھ اور جگہ ہے اور لکھنؤ اور مقام ہے۔'' گویا مصنف کو لکھنوی زبان پر ناز ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ شبلی لکھنو کی زبان سمجھنے سے قاصر رہے اور پھر یہ طنز کیا ہے:

سیکھ لو اے بلبلو یہ داستاں کچھ اور ہے
لکھنؤ کے رہنے والوں کی زباں کچھ اور ہے

کم و بیش یہی حال تردیدالموازنہ کا بھی ہے، جو چالیس صفحات کا رسالہ ہے۔ اس کے بارے میں نیر مسعود نے سچ لکھا ہے کہ ''عروج نے شبلی کے اعتراضوں کے جو جواب دیئے ہیں وہ بہت اطمینان بخش نہیں ہیں۔(۱۱)

مذکورہ کتابوں کے مصنّفین میں کوئی بھی شخص شبلی کے پایہ کا ادیب و نقاد نہ تھا، اس لئے حق جواب ادا نہ کر سکا۔ وسعت معلومات، سائنٹفک تجزیہ اور حسن استدلال کی کمی کے ساتھ اسلوب نگارش کے لحاظ سے بھی یہ کتابیں قابل ذکر نہیں تاہم ان کی اس حیثیت سے کہ یہ موازنہ اور شبلی کی مخالفت میں سپرد قلم کی گئیں کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ البتہ مذکورہ کتابوں میں سب سے مفصل

اور لائق اعتنا نظیر الحسن فوق (ف: ۳۰/ اکتوبر ۱۹۴۸ء) کی کتاب المیز ان ہے۔ اس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ دبیر کے کلام میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو انیس کے یہاں پائی جاتی ہیں اور شبلی نے جس کی نشاندہی کی ہے۔ اسی طرح انیس کے یہاں وہ تمام نقائص پائے جاتے ہیں جو شبلی نے دبیر کے یہاں ثابت کئے ہیں۔ یہ کتاب جب شائع ہوئی اور مولانا شبلی کی نظر سے گذری تو انھوں نے بھی دبیر شناسی کی داد دی اور اس کے مصنف کے نام ایک خط میں لکھا کہ:

> ''آپ نے نہایت متانت وسنجیدگی سے کتاب کا جواب لکھا ہے جو اس زمانے میں نہایت غنیمت ہے۔ آج مجھ کو موازنہ کی قدر ہوئی کیوں کہ اس بہانے اردو میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ اور ایک باکمال (دبیر) کے جوہر اچھی طرح کھلے۔ آپ کی عنایت کا مشکور اور طرز تحریر کا مداح ہوں۔'' (۱۲)

یہ علامہ کی عالی ظرفی اور تعصّبات سے پاک شخصیت کا ایک نمونہ ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں جابہ جا شبلی کی تنقیص کی گئی ہے۔ بعض غلط نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔ تنقیدی مباحث میں بھی وسعت اور گہرائی نہیں۔ اسلوب نگارش کے لحاظ سے بھی یہ موازنہ سے کم رتبہ ہے۔ (۱۳)

ان مستقل کتابوں کے علاوہ متعدد مضامین بھی مخالفت میں لکھے گئے، ان سب میں قدر مشترک ایک ہی ہے کہ علامہ شبلی نے دبیر کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور ان کی شاعرانہ خصوصیات کے بیان میں قصداً کوتاہی برتی اور ان کے کلام کا اچھا انتخاب پیش نہیں کیا۔ میر انیس کا ذکر بڑھا چڑھا کر کیا۔ بعض دوسرے شعراء کے اشعار دبیر سے منسوب کر کے غلط نتائج اخذ کئے وغیرہ۔

معترضین نے علامہ شبلی پر مذہبی تعصب کا الزام بھی عائد کیا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ شبلی نے میر انیس کی آڑ لے کر دبیر پر تنقید کی، پھر میر انیس کو بھی نہیں بخشا اور ان کو اغلاط وسرقات کا مرتکب ٹھہرایا وغیرہ۔ کم وبیش تینوں کتابوں میں یہی اعتراضات کئے گئے ہیں۔

ردالموازنہ اور تردید الموازنہ کے مصنّفین نے حد تنقید سے بڑھ کر شبلی کی تنقیص بھی کی ہے۔ شہرت کی ہوس، اور ان کی برادری روتارہ کا بھی مضحکہ اڑایا ہے۔ لیکن ان الزامات میں واقعیت نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شبلی نے جو کچھ لکھا ہے قوی دلائل کی بنیاد پر لکھا ہے۔ کلام انیس

ودبیر سے استدلال کیا ہے۔فکری وفنی بحثیں کی ہیں اوراپنے اعلیٰ ادبی وتنقیدی شعور وبصیرت سے کام لیتے ہوئے انیس کی عظمت اور دبیر کی کم مایگی دکھلائی ہے۔وہ محض اپنے ذاتی خیالات کی بنیاد پر انیس کے مداح ومعترف نہیں بلکہ وہ اپنے مطالعے ومشاہدے اوراصول ونظریات تنقید کی بنیاد پر ان کے عظمت شناس ہیں۔علامہ شبلی موازنہ انیس ودبیر میں غیر جانب داری کو اہمیت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہماری رائے ہے کہ جس وسعت اور تفصیل کے ساتھ میر انیس کی خوبیاں ظاہر کی گئیں ہیں، اسی طرح نہایت آزادی اور بے باکی کے ساتھ ان کی ہر قسم کی فروگذاشتیں اور غلطیاں بھی ظاہر کی جائیں۔''(۱۴)

ان کا یہ بھی خیال تھا کہ:

''میر انیس کے کمال کا اگرچہ جس قدر مجھ کو اعتراف ہے شاید ہی کسی اور کو ہوگا تاہم میرا یہ دعویٰ نہیں کہ ان کا کلام فروگذاشتوں اور غلطیوں سے پاک ہے۔'' (۱۵)

چنانچہ انھوں نے اعتراضات کے ضمن میں نساخ کے اعتراضات نقل کرنے کے ساتھ خودبھی متعدد اعتراضات کئے ہیں۔فنی بحثوں میں بھی متعدد مقامات پر نقد کیا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''بعض موقعوں پر مرزا صاحب نے جس بلاغت سے مضمون ادا کیا ہے۔میر انیس سے نہیں ہوسکا۔''(۱۶)''مرزا صاحب نے اس مضمون کو نہایت خوبی اور صفائی سے ادا کیا ہے، میر انیس صاحب نے اس مضمون کو کئی طرح سے پلٹا لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ بات نصیب نہ ہوئی۔''(۱۷)

اسی طرح انھوں نے مرزا دبیر(ف:۷/مارچ ۱۸۷۵ء) کی صرف کم مایگی ہی نہیں دکھلائی ہے بلکہ جہاں وہ انیس سے برتر تھے، وہاں ان کے محاسن کا بھی ذکر کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مرزا دبیر صاحب نے اس واقعہ کے بیان میں جو بلاغت صرف کی ہے اور جو دردانگیز سماں دکھایا ہے کسی سے آج تک نہ ہوسکا۔''(۱۸)

البتہ بحیثیت مجموعی علامہ شبلی نے دبیر پر میر انیس کی برتری ثابت کی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہر منصف شخص کلام انیس کے مطالعے و جائزے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچے گا جس پر علامہ شبلی پہنچے بطور نمونہ یہاں اس کی ایک مثال نقل کی جاتی ہے۔ میر انیس کے مرثیے کا ایک شعر ہے:

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

اس شعر میں بلاغت کے جو راز پنہاں ہیں اس کے بارے میں علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''موقع کی حالت یہ ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام اپنا نام اس حیثیت کے ساتھ بتائیں جس سے کسی قدر شرف اور فضیلت کا اظہار ہو، تا کہ پوچھنے والا سمجھ سکے کہ یہ وہی امام حسین ہیں جن کا وہ غائبانہ دلدادہ اور مشتاق ہے، لیکن امام ممدوح کو خاکساری مانع آتی ہے، وہ اس پر اکتفا کرتے ہیں کہ میں حسین ہوں۔ لیکن چوں کہ مستفسر قرائن سے اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ محض نام لینے سے بھی غالباً پہچان لے گا اور اس لئے حسین کہنا بھی گویا اپنے آپ کو امام کہنا ہے۔ اس بنا پر نام لینا بھی ایک طرح پر شرف اور فضیلت کا اظہار ہے۔ اس لئے خالی نام لیتے ہوئے بھی آپ شرما جاتے ہیں اور شرم سے آپ کی گردن جھک جاتی ہے۔ اس بنا پر شاعر کہتا ہے کہ:

مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

لیکن شاعر کو جو امام حسین علیہ السلام کی عظمت کے اثر سے لبریز ہے، گوارا نہیں ہوتا کہ آپ کا نام اس سادگی سے لیا جائے، اس کے نزدیک امام علیہ السلام اگر اپنے آپ کو بادشاہ مشرقین کہتے تو یہ خودستائی نہ تھی بلکہ محض ایک واقعہ تھا، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو رسولؐ اللہ کہتے تھے اور یہ خودستائی نہیں خیال کی جاتی تھی۔ شاعر کے دل میں حسرت ہے کہ کاش امام علیہ السلام نے بیان واقعہ ہی کیا ہوتا اس کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے:

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں

تاہم اس سے یہ خیال بھی ظاہر ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام کی عالی ظرفی اورشرافت نفس کا یہی اقتضا تھا کہ وہ خاکساری کو بیان واقعہ پر مقدم رکھتے۔اس موقع پر یہ کہے بغیرنہیں رہاجاتا کہ اسی واقعے کو دبیر صاحب نے اس طرح باندھاہے:

فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں

میرانیس اورمرزادبیر کےموازنے کی جوبحث ہےاس کےفیصلے کے لئے دونوں کےصرف یہ دونوں مصرعے کافی ہیں۔''(۱۹)

یہ موازنہ اپنی جگہ لیکن میر انیس نے شاعری کو جولازوال رفعتیں عطا کی ہیں،اس میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ڈاکٹرفضل امام نے سچ لکھا ہے کہ:

''اردوشاعری کی طویل تاریخ اورروایت میں میرانیس کی شخصیت اوران کافن کسی رسمی تعارف کامحتاج نہیں،کیوں کہ انیس نے اپنی فکروفن کی وسعتوں سے صرف اردومرثیہ نگاری کوہی توانا اورموثرنہیں بنایا بلکہ اردوشاعری کو ہرنقطۂ نظر سے باآبرو بنادیا۔''(۲۰)

البتہ اس میں کسی قدر سچائی ضرور ہے کہ شبلی سے تسامح ہوا اورانھوں نے ایک- دو مصرعے یاشعر جومرزادبیر کےکلام میں نہیں پائے جاتے ان سے منسوب کرکے بحث کی اور فیصلہ انیس کےحق میں سنایامثلاً یہ مصرعہ:

ہے ہے میرے دیور، میرے دیور، میرے دیور

حیات دبیر کے مصنف افضل حسین ثابت (ف:۱۹۴۱ء) نے لکھا ہے کہ یہ مصرعہ دبیر کےکسی مرثیہ میں نہیں پایاجاتا۔(۲۱)اسی طرح یہ مصرعہ:

زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے

کےمتعلق المیز ان کےمصنف چودھری نظیرالحسن فوق رضوی نےلکھاہے کہ یہ مرزادبیرکانہیں بلکہ ان کے ایک شاگرد حکیم قدیرالدولہ قدیر (ف: ۱۸۶۸ء) کا ہے۔ (۲۲) اسی طرح تلوار کی تعریف میں یہ شعر:

جب خوں میں بھری فوج کے انبوہ سے نکلی
غل یہ تھا کہ وہ لال پری کوہ سے نکلی

بھی ان کے مطبوعہ مراثی میں موجود نہیں ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذکورہ مصرعے یا شعر علامہ شبلی نے دبیر سے قصداً منسوب کیئے؟ اور یہ سہواً گران سے سرزد نہ ہوتا تو کیا دبیر انیس کے مدمقابل یا برتر ہو جاتے؟ اس مفروضے کی حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے عہد کے مآخذ سے بھرپور استفادہ کیا۔ ان کی تنقیح میں انھوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی، جیسا کہ موازنہ میں انھوں نے اس کی تفصیل پیش کی ہے۔ (۲۳) تاہم وہ ان تسامح سے اپنا دامن نہیں بچا سکے جو مطبوعہ مراثی میں الحاقی تھے یا ان میں تصرفات ہوئے تھے۔ مراثی انیس و دبیر کی صحت کا مسئلہ نہ صرف عہد شبلی میں طے نہیں ہو سکا تھا بلکہ آج تک صحت کا التزام جس قدر ہونا چاہئے نہ ہو سکا۔ شبلی کے ان تسامحات کو تسلیم کر لینے کے باوجود فنی لحاظ سے دبیر کی برتری ثابت نہیں ہوتی۔

بعض نقادوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ شبلی نے دبیر کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور ان کا وہ کلام جو فنی لحاظ سے انیس سے برتر یا بہتر تھا اسے پیش ہی نہیں کیا۔ (۲۴) حالاں کہ یہ ذوقی معاملہ ہے۔ شبلی کے مخالفین و معاندین اس رتبہ اور اس ادبی و تنقیدی حیثیت کے حامل نہیں جو شبلی کا طرہ کمال تھی، ان امور کا شبلی سے بڑھ کر کون اندازہ داں ہو سکتا ہے، اصلاً یہ اعتراض برائے اعتراض ہے۔

موازنہ انیس و دبیر محض تنقیدی نظریات کا مجموعہ نہیں بلکہ اردو میں عملی تنقید کا پہلا نمونہ ہے۔ موازنہ پر تنقید بلکہ تنقیص کا طوفان کھڑا کیا گیا، لیکن کون اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ انیس و دبیر کی شاعری پر اس سے برتر تو کجا اس کے برابر کی بھی کوئی کتاب آج تک نہیں لکھی جا سکی۔ سچ یہی ہے کہ یہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک لافانی شاہکار ہے۔

موازنہ کے تجزیے میں ہمارے نقادوں سے کئی تسامح ہوئے مثلاً وہ ''دبیریوں'' کے غوغا میں الجھ گئے اور اس کا تجزیہ عہد شبلی کے پس منظر کے بجائے اپنے عہد و ماحول اور اپنے عہد کی تحقیقات و انکشافات کی روشنی میں پیش کیا۔ دوسرے یہ کہ پہلے سے یہ تسلیم کر لیا کہ شبلی نے دبیر کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ ان کے محاکموں کی قوت، دلائل کی مضبوطی اور تجزیے کی سنجیدگی کی

طرف توجہ نہ دی۔ بعض نقادوں نے عجیب عجیب مشورے دیے ہیں مثلاً ان کو اس کتاب کا نام موازنہ کے بجائے مطالعہ مراثی انیس رکھنا چاہئے تھا۔ (۲۵) اسی طرح علامہ شبلی نے جن اصولوں کی روشنی میں کلام انیس کا تجزیہ ضروری قرار دیا تھا اور جس پر وہ خود عمل پیرا رہے، موازنہ کے نقادوں میں سے بیش تر نے اس سے اغماض برتا۔ نیز قدیم مشرقی انداز تنقید کے بجائے جدید تنقیدی نظریات سے کام لیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے اور موازنہ کی عظمت کو ان کے متضاد اور غیر واضح رویے اور ذہنی تحفظات نے نقصان پہنچایا۔ ڈاکٹر فضل امام کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے نقاد تنقید کی رو میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ موازنہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''شبلی کا انتشار ذہنی یوں تو ان کی سبھی کتب کا طرہ امتیاز ہے، لیکن اس کی واضح اور مضحکہ خیز مثالیں موازنہ میں ملتی ہیں۔'' (۲۶)

اب اس کو کیا کہا جائے کہ موازنہ سے آگے بڑھ کر انھوں نے تمام تصانیف شبلی کا طرہ امتیاز انتشار ذہنی قرار دے دیا۔ راقم کا خیال ہے کہ اسے تنقید کے بجائے فاضل نقاد کے انتشار ذہنی کا نتیجہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ اور اس طرح کی دوسری تنقیدیں دراصل تنقید برائے تنقید ہیں اور ان کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ موافق و مخالف سبھی نے موازنہ کی عظمت کا اعتراف کسی نہ کسی نوع سے ضرور کیا، کسی نے شبلی کے تنقیدی شعور اور دلائل کی مضبوطی کی مدح کی، تو کسی نے ان کے فکر و نظر کی داد دی، اسی طرح کسی نے حسن انتخاب کی تحسین کی تو کسی نے موازنہ کے تصور کو لائق ستائش قرار دیا۔ غرض مدح و قدح کے اس طویل سلسلے نے بہر حال موازنہ انیس و دبیر کو بقائے دوام کی عزت عطا کی۔

حوالے

(۱) موازنہ انیس و دبیر ص۲۔ دارالمصنّفین ایڈیشن ۲۰۰۴ء

(۲) موازنہ انیس و دبیر ص۱-۲

(۳) ایضاً ص۲

(۴) ایضاً ص۳

(۵) سید احتشام حسین ۔موازنہ انیس و دبیر۔ادیب شبلی نمبر ص۱۰۴

(۶) ایضاً

(۷) ایضاً ص۲۹

(۸) نیر مسعود۔موازنہ کے دو جواب۔فکر ونظر شبلی نمبر ص۴۶

(۹) موازنہ انیس و دبیر ص۹۹-۱۰۰۔دارالمصنّفین ایڈیشن

(۱۰) ایضاً ص۱۷۳

(۱۱) ایضاً ص۲۴۷

(۱۲) مکاتیب شبلی ج۱ص۳۲۷

(۱۳) ملاحظہ ہوالمیز ان ص۳۲،وغیرہ

(۱۴) موازنہ انیس و دبیر ص۲۳۶

(۱۵) ایضاً ص۲۳۵

(۱۶) ایضاً ص۲۹۱

(۱۷) ایضاً ص۲۹۹

(۱۸) ایضاً ص۲۹۲

(۱۹) ایضاً ص۶۶-۶۷

(۲۰) مقدمہ وتعارف،موازنہ انیس و دبیر ص۵مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۱۹۸۸ء

(۲۱) حیات دبیر ص۵۴۱

(۲۲) المیز ان ص۳۲

(۲۳) سید عابد علی عابد،موازنہ انیس و دبیر ص۲۷۸بحوالہ ارشاد نیازی ص۱۳۸

(۲۴) موازنہ انیس و دبیر ص۲۵-۲۷

(۲۵) مقدمہ وتعارف موازنہ انیس و دبیر ص۹

(۲۶) ایضاً ص۱۴۔

اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر

اسلام اور مسلمانوں سے متعلق یورپ کے کذب وافترا اوران کی تاریخی غلطیوں کا ازالہ علامہ شبلی کی زندگی کا خاص مقصد اور مشن تھا۔ ان کی اکثر تصانیف اور مضامین ومقالات مورخین یورپ کی کسی نہ کسی افترا پردازی ہی کے ردوابطال اوراحقاق حق کے لئے معرض وجود میں آئیں۔علامہ شبلی کی تصنیف ''اورنگ زیب عالمگیر پرایک نظر''اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

۱۹۰٦ء میں علامہ شبلی نے اپنے شاگرد مولانا محمد علی جوہر(ف:۴رجنوری۱۹۳۱ء) کے اصرار پر بڑودہ کا سفر کیا اورانھیں کے یہاں قیام پذیر ہوئے۔اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مولانا جوہر نے ان سے اورنگ زیب (ف: ۲۵رجنوری ۱۷۰۷ء) پر عائد الزامات کے جواب وتردید میں ایک مفصل مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔(۱) چنانچہ سفر سے واپسی کے بعد علامہ شبلی نے ماہنامہ الندوہ لکھنؤ میں جس کے وہ ایڈیٹر تھے عالم گیر پر سلسلۂ مضامین شروع کیا، جو دسمبر ۱۹۰٦ء سے مارچ ۱۹۰۸ء کے درمیان شائع ہوا۔

طباعت واشاعت

یہ سلسلۂ مضامین اتنا مقبول ہوا کہ ۱۹۰۹ء میں اسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ اب تک اس کے متعدد ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔جس کی تفصیل یہ ہے:

[۱]	نول کشور لاہور	۱۹۰۹ء	۱۳۷ص	طبع اول
[۲]	مطبع نظامی کان پور	۱۹۱۱ء	۱۴۴ص	بعنوان مضامین عالمگیر
[۳]	رنگین پریس دہلی	غیر مورخہ	۱۳٦ص	بعنوان مضامین عالم گیر

[۴] ▪ روز بازار پریس امرتسر ۱۹۱۴ء ۱۳۶ص

[۵] ▪ مہتاب پریس، دہلی ۱۹۱۴ء ۱۰۴ص

[۶] مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی ۱۹۲۴ء ۱۲۲ص

[۷] ▪ ہلالی پریس، دہلی ۱۹۳۲ء ۵۸ص

[۸] ▪ ترقی پریس، علی گڑھ ۱۹۳۲ء

[۹] ▪ اردو مرکز، لاہور ۱۹۴۹ء ۱۲۸ص طبع ششم

[۱۰] ▪ اردو مرکز، لاہور ۱۹۵۲ء ۱۲۸ص

[۱۱] ▪ اردو اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۰ء ۱۲۸ص

[۱۲] ▪ آئینہ ادب، لاہور ۱۹۷۲ء ۲۱۵ص مرتبہ: غلام رسول مہر

[۱۳] ▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۱۹۹۹ء ۱۳۸ص

[۱۴] ▪ فکشن ہاؤس، لاہور ۲۰۰۰ء ۲۳۵ص مرتبہ: مبارک علی

[۱۵] ▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۲۰۰۹ء ۱۳۷ص

[۱۶] ▪ رنگین پریس، دہلی غیر مورخہ ۵۶ص

[۱۷] ▪ رنجیت پریس، دہلی غیر مورخہ ۵۸ص

[۱۸] ▪ اسلامک بک فاؤنڈیشن، دہلی غیر مورخہ ۱۳۵ص

[۱۹] ▪ دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۲۰۱۲ء ۱۳۷ص

ترجمے

''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' کے بعض دوسری زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے۔ ڈاکٹر سید محمود نے اس کا انگریزی خلاصہ لندن سے شائع کیا۔ (۲) دارالمصنّفین کے سابق ناظم جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ جسے عالم گیر کے نام سے ادارہ ادبیات دلی نے ۱۹۸۱ء میں شائع کیا۔ اس ترجمے کا دوسرا ایڈیشن دارالمصنّفین نے ۲۰۰۸ء میں شایع کیا۔

۱۹۸۲ء میں ایک بنگالی اہل قلم حسن علی نے بنگلہ زبان میں اسے منتقل کیا۔ جسے بنگلہ اکیڈمی ڈھاکہ نے شایع کیا۔

ان اشاعتوں اور ترجموں کے علاوہ اس کے جائزے پر مشتمل ایک درجن سے زائد مضامین ومقالات کتب ورسائل میں لکھے گئے، جس میں اس کی اہمیت اور شبلی کی تاریخی بصیرت کا اعتراف کیا گیا۔

ہندوستان میں انگریز مورخوں نے اپنے مخصوص سیاسی اغراض ومقاصد کے تحت تعصب وعناد میں سرشار ہوکر مسلمان حکمرانوں پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے۔ ان کی تنقید وتنقیص کا سب سے زیادہ نشانہ مظلوم اورنگ زیب کی ذات رہی، جس کو مطعون ومجروح کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا گیا۔ علامہ شبلی کے الفاظ میں:

> ''اس کی فرد قرارداد جرم اتنی لمبی ہے کہ شاید کسی مجرم کی نہ ہوگی۔ باپ کو قید کیا، بھائیوں کو قتل کرایا، دکن کی اسلامی ریاستیں مٹادیں، ہندوؤں کو ستایا، بت خانے ڈھائے، مرہٹوں کو چھیڑ کر تیموری سلطنت کے ارکان متزلزل کردیے۔'' (۳)

ان الزامات اور عالم گیر کے مفروضہ مظالم کی تشہیر اس قدر زور شور سے کی گئی کہ وہ ''افسانہ بزم وانجمن'' بن گئے۔ علامہ شبلی نے بحیثیت مورخ ان الزامات کا جواب دینا اپنا فرض سمجھا۔ چنانچہ انھوں نے عہد وسطیٰ کی معتبر تاریخوں اور تاریخ نویسی کے اصول کی بنیاد پر مورخین یورپ کی افترا پردازیوں اور غلط کاریوں کا پردہ فاش کرکے ان کو حقیقت وصداقت کا آئینہ دکھایا اور فرمایا۔

تمھیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ اورنگ زیب ہندو کش تھا ظالم تھا ستم گر تھا

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ کیا علامہ شبلی نے اپنے مذہبی جذبات، دینی حمیت وغیرت اور اورنگ زیب کے اسلامی عقائد وخیالات سے متاثر ہوکر اس پر لگائے گئے الزامات کو بے معنی اور بے سروپا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے یا واقعی عالم گیر پر عائد الزامات درست نہ تھے۔ سید شریف الحسن نقوی لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے محض اورنگ زیب کے اسلامی عقائد سے متاثر ہوکر اس کی طرفداری نہیں کی ہے بلکہ تاریخ کا تنقیدی مطالعہ کر کے ہی وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اورنگ زیب پر لگائے ہوئے الزامات بے بنیاد ہیں۔'' (۴)

علامہ شبلی نے یہ سوال قائم کیا ہے کہ جو الزامات عالم گیر پر لگائے جاتے ہیں وہ بعض دوسرے بادشاہوں پر بھی لگائے جاسکتے ہیں مگر انھیں کے الفاظ میں ''اس کی کیا وجہ ہے کہ شاہ جہاں کے الزامات کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں اور عالم گیر کے وہی الزامات افسانہ بزم و انجمن ہیں۔'' (۵) الزام جواب کی تفصیل سے انھوں نے محض اس لیے گریز کیا ہے کہ اس سے قومی تفریق کو تحریک ہوتی ہے اور شاہ جہاں پر اگر الزام ثابت بھی ہوجائے تو عالم گیر اس سے بری نہیں ہوسکتا۔ (۶)

یہاں کتاب کے مندرجات پر ایک نظر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے، تاکہ براہ راست معلوم ہوجائے کہ انگریز مورخوں نے عالم گیر کی شخصیت کو بدنام کرنے اور مطلب برآری کے لئے تاریخ میں کس طرح بددیانتی سے کام لیا ہے۔ ایک جگہ علامہ شبلی نے ان کے کذب وافترا اور جھوٹ میں جھوٹ ملانے کا ذکر کیا ہے۔ اس سے مورخین یورپ کے تعصب کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور علمی بددیانتی کا بھی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یورپین مورخوں کے اعتراضات اگرچہ نہایت پادرہوا ہوتے ہیں اور اس لئے ان کا جواب دینا نہایت آسان بات ہے لیکن بایں ہمہ جواب دینے والا سخت مشکل میں پڑجاتا ہے۔ یورپین مورخین ایک اعتراض کو بیان کرنے میں جو خود غلط ہوتا ہے، پے درپے اور بہت سے جھوٹ ملاتے جاتے ہیں، جواب دینے والا ایک جھوٹ کا جواب دینا چاہتا ہے تو سامنے ایک اور جھوٹ نظر آتا ہے اور ادھر متوجہ ہوتا ہے تو ایک اور جھوٹ نمایاں ہوتا ہے، مسلسل دروغ بیانی اور افتراؤں کے ہجوم پر بے اختیار اس کو طیش آجاتا ہے اور بجائے اس کے کہ وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ اصل واقعہ کے انکشاف پر متوجہ ہو غصہ سے بے قابو ہوجاتا ہے۔ خود مجھ پر یہی اثر پڑا لیکن میں ان حریفوں کو یہ موقع نہ دوں گا کہ وہ

میرے طیش سے فائدہ اٹھائیں۔'' (۷)

دکن کی اسلامی ریاستوں کے برباد کرنے کا الزام

عالم گیر پر انگریز مورخوں کے الزامات کی فہرست میں ایک جرم یہ ہے کہ اس نے دکن کی اسلامی ریاستیں حیدرآباد اور بیجاپور کو برباد کر دیا۔ حیدرآباد چونکہ ایک شیعہ ریاست تھی اس لئے اس کی بربادی میں عالم گیر کا مذہبی تعصب کارفرما تھا۔ ان ریاستوں کی بربادی سے مرہٹوں کا زور قائم ہوا اس لیے یہ عالم گیر کا سیاسی جرم بھی تھا۔ (۸)

علامہ شبلی نے سب سے پہلے اسی الزام کا جائزہ لیا ہے اور معتبر تاریخی شہادت اور اصول تاریخ سے ثابت کیا ہے کہ چوں کہ حیدرآباد کا حاکم ابوالحسن شاہ (تاناشاہ) نہایت عیش پرست اور ظالم تھا، وہ مرہٹوں سے ساز باز کر کے انھیں مدد دیتا رہا تاکہ وہ سلطنت مغلیہ کو برباد کر دیں۔ اس نے خود اپنی ریاست میں مرہٹوں اور ہندوؤں کو اس قدر بڑھاوا دیا کہ وہ علانیہ مسلمانوں پر ظلم کرتے اور مسجدوں کی بے حرمتی کرنے لگے، اس لیے مجبوراً عالم گیر کو اس کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی۔ حیدرآباد میں مرہٹوں کا اس قدر زور قائم ہو گیا تھا کہ حیدرآباد کا استیصال کرنا کسی اسلامی سلطنت کا نہیں بلکہ ایک مرہٹی سلطنت کا استیصال تھا۔ (۹)

بیجاپور کے حکمرانوں کا بھی یہی رویہ رہا۔ وہ بھی مرہٹوں کے معین و مددگار رہے، اس لیے ان پر بھی عالم گیر نے فوج کشی کی اور سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔ عالم گیر کے اس الزام کا جائزہ لینے کے بعد علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> ''ہمارے دوستوں کو یہ معلوم نہیں کہ دکن کی یہ اسلامی ریاستیں مرہٹوں کی باج گزار بن گئی تھیں اور اگر عالم گیر حیدرآباد اور بیجاپور کو فتح نہ کرتا تو آج بڑودہ اور گوالیار کی طرح حیدرآباد اور بیجاپور پر بھی مرہٹوں کا علم لہراتا ہوتا۔'' (۱۰)

دکن میں پانچ ریاستیں گول کنڈہ، بیجاپور، خاندیس، برار اور احمد نگر تھیں۔ ان پر قبضہ کرنے کی ابتدا اکبر نے کی۔ جہاں گیر اور شاہ جہاں ان سے تعلقات استوار رکھنا چاہتے تھے مگر ان کی شرارتوں سے تنگ آ کر بالآخر ان پر فوج کشی کی اور ان کو زیر کر کے سلطنت تیموری میں داخل کیا،

صرف دو ریاستیں بیجا پور اور گول کنڈہ عالم گیر کے دورِ حکومت میں سلطنت مغلیہ کا حصہ بنیں۔ علامہ شبلی نے موضوع کے پیش نظر اختصار سے کام لیا ہے، ورنہ وہ اس سوال کا جواب بھی دیتے کہ عالم گیر پر جو الزام لگایا جاتا ہے وہی الزام اکبر اعظم پر بھی لگایا جا سکتا ہے، مگر انگریز مورخوں نے عالم گیر کی شخصیت ہی کو کیوں نشانہ بنایا۔

عالم گیر اور مرہٹے

دوسرے مضمون میں مرہٹوں سے متعلق متعدد الزامات کی تردید کی گئی ہے، اس سلسلہ میں عالم گیر پر انگریز مورخوں کے الزامات اس طرح ہیں:

[۱] مرہٹوں کا فساد عالم گیر کی ذات سے برپا ہوا۔

[۲] شیواجی جب عالم گیر کے دربار میں حاضر ہوا تو اس سے ایسا برتاؤ کیا گیا جس سے وہ چار و ناچار سرکشی پر مجبور ہوا، اگر فراخ حوصلگی سے کام لیا جاتا تو وہ عالم گیر کا حلقہ بگوش ہو جاتا۔

[۳] شیواجی کو عالم گیر نے امان دے کر بلایا تھا لیکن خلاف عہد اس کو نظر بند کر دیا۔

[۴] شیواجی کے جانشینوں کے ساتھ عالم گیر نے اچھا سلوک نہیں کیا۔

[۵] عالم گیر مرہٹوں کو زیر نہ کر سکا اور چونکہ مرہٹوں ہی نے سلطنت تیموریہ کو زیر و زبر کر دیا اس لیے تیموریوں کی بربادی کا اصل سبب خود عالم گیر تھا۔(۱۱)

علامہ شبلی نے اس مضمون میں انھیں الزامات کا جائزہ لے کر ثابت کیا ہے کہ مرہٹوں کا فساد خود مرہٹوں کی ذات سے تھا اور ان کی فساد انگیزیوں کی ابتدا شاہ جہاں کے عہد میں ہوئی تھی نہ کہ عہد عالم گیر میں۔(۱۲)

شیواجی کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا اس پر یورپین مورخوں نے بڑی لے دے کی ہے۔ وہ دربار میں عالم گیر کے بلانے پر نہیں بلکہ شکست کے بعد آیا تھا لیکن عالم گیر نے فراخ دلی اور بلند حوصلگی سے کام لیا اور راجہ جے سنگھ کے لڑکے رام سنگھ اور مخلص خاں کو استقبال کے لیے بھیجا، مگر

انگریز مورخ کہتے ہیں کہ اس کے استقبال کے لیے ایک کمتر درجے کے سردار کو بھیجا گیا۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ رام سنگھ کمتر درجے کا سردار نہ تھا، وہ امرائے عالم گیری میں سب سے زیادہ ممتاز اور سپہ سالار لشکر تھا۔ اس الزام کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''شیواجی کی اطاعت کا سلطنت پر کیا احسان تھا؟ شاہی فوجوں نے اس کے تمام علاقے فتح کر لئے تھے۔ وہ قلعے میں چاروں طرف سے گھر چکا تھا۔ اس کے خاص صدر نشیں قلعے کے برجوں پر شاہی فوج کا پھریرا اڑ چکا تھا۔ ان مجبوریوں سے وہ ہتھیار رکھ کر غلاموں کی طرح آیا اور دربار میں روانہ کیا گیا۔ تاہم اس کے استقبال کے لیے عالم گیر نے دربار میں جو شخص سب سے زیادہ موزوں ہوسکتا تھا اس کو بھیجا، پنج ہزاری امرا کی صف میں جو خود راجہ جے سنگھ کا منصب تھا اس کو جگہ دی اور اس سے زیادہ اور وہ کیا چاہتا تھا؟ کیا شہنشاہ ہند ایک مفتوح رہزن کے لئے تخت سے اتر آتا؟ بے شبہ یورپ اس قسم کی جھوٹی مکارانہ خوشامدوں کی مثالیں پیش کرسکتا ہے لیکن اسلام سے اس کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔'' (۱۳)

شیواجی کو پنج ہزاری منصب دیا گیا تھا۔ اس پر بھی انگریز مورخوں کو اعتراض ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ تیسرے درجے کا منصب تھا جو اس کے شایان شان نہ تھا۔ بعض دوسرے مورخوں نے لکھا ہے کہ چوں کہ یہی منصب اس کے لڑکے کے پاس تھا اس لئے اس سے بڑا منصب ملنا چاہئے تھا حالانکہ شیواجی کو جو منصب دیا گیا تھا وہ دربار کے عام دستور کے مطابق تھا اور اس میں تحقیر واہانت کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس مفصل تجزیے کے بعد مولانا شبلی لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ دربار تیموری میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ باپ بیٹے کو ایک درجے کا منصب عطا کیا جاتا تھا۔ اس لیے شیواجی کو بھی پہلے پہل یہی منصب دیا جاسکتا تھا۔ جن لوگوں کو ہفت ہزاری اور دہ ہزاری منصب ملے ہیں، سب ترقی کرتے کرتے اس درجے تک پہنچے ہیں۔ یہ قاعدہ کلیہ شیواجی کے لیے توڑا نہیں جاسکتا تھا۔'' (۱۴)

غرض عالم گیر نے شیواجی کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ اس کے شان و مرتبے کے خلاف نہ تھا۔ عالم گیر پر اس طرح کا الزام محض اسے بدنام کرنے کے لیے لگایا تھا۔

بعض یورپین مورخوں نے لکھا ہے کہ شیواجی کے ساتھ عالم گیر اگر اچھا برتاؤ کرتا تو وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا، مگر علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ یہ بات تاریخی شہادت کے کس قدر خلاف ہے۔ اس نے کبھی اپنے عہد کی پابندی نہیں کی۔ افضل خاں کو دھوکہ سے قتل کیا، جب کہ اسے امن کے لیے بلایا تھا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ سے مکارانہ سازشیں کیں۔ شہروں اور قصبوں پر شب خوں مارا۔ اس کے باوجود اس سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جاتا۔ (۱۵)

عالم گیر پر انگریز مورخوں نے یہ بھی الزام لگایا کہ اسی کی ذات سے مرہٹوں کا زور قائم ہوا اور شیواجی کے بعد اس کے جانشینوں نے عالم گیر کی سلطنت کا سارا نظام درہم برہم کر دیا۔ (۱۶) حالانکہ یہ درست نہیں اور مورخوں کے الزامات میں تضاد ہے۔ ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ عالم گیر نے شیواجی کے جانشینوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور دوسری جانب یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے جانشینوں نے عالم گیر کی سلطنت کا سارا نظام درہم برہم کر دیا۔ اس پر مفصل مورخانہ بحث کر کے علامہ شبلی نے یہ ثابت کیا ہے کہ مرہٹوں کی زیادتیاں اور دست درازیاں جب حد سے بڑھ گئیں تو عالم گیر نے ان کے استیصال کی طرف توجہ دی۔ ان کے الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

> ''عالم گیر کے جیتے جی شیواجی مر گیا، سنبھا مارا گیا، رام راجہ آوارگی اور صحرانوردی کی نذر رہا، سنتا کا سر کٹ کر دربار میں پہنچا، غرض علم برداران بغاوت ایک ایک کر کے مٹا دیے گئے۔ تمام قلعے جات پر قبضہ کر لیا گیا اور دکن سے لے کر مدراس تک سناٹا ہو گیا۔'' (۱۷)

علامہ شبلی نے انگریز مورخوں کے اس دعویٰ کو بالکل غلط ثابت کیا ہے کہ عالم گیر کی سلطنت کا سارا نظام شیواجی کے جانشینوں نے درہم برہم کر دیا تھا۔ ان کا خیال یہ ہے کہ خود مرہٹوں کی ساری قوت و طاقت برباد ہو گئی اور مرہٹے خانہ بدوش راہ زن ہو کر اِدھر اُدھر چوری چھپے

لوٹ مار کرتے رہتے ۔اس کے بعد عالم گیر دنیا سے اٹھ گیا۔علامہ شبلی کے الفاظ میں :

''اب یہ اس کے جانشینوں کا کام تھا کہ ان اڑتے ہوئے ذروں کو بھی فنا کر دیتے لیکن خوبی قسمت سے تیمور کی مسند معظم شاہ کے ہاتھ آئی اور بیداد مورخوں نے نالائق اخلاف کا الزام بلند پایا، اسلاف کے نامہ اعمال میں لکھا۔ اس سے بڑھ کر کیا ناانصافی ہوسکتی ہے۔''(۱۸)

غرض عالم گیر پر مرہٹوں سے متعلق جو الزامات لگائے گئے تھے، علامہ شبلی نے تاریخی نقطۂ نظر سے ان کا رد اس انداز سے کیا کہ آج تک اس کی تردید نہیں ہوسکی۔مگر افسوس ہے کہ ان کی ان کاوشوں کو جس قدر عام کرنے اور بڑے پیمانہ پر شائع کرنے کی ضرورت تھی وہ نہ ہوسکی۔یہی وجہ ہے کہ عالم گیر پر عائد الزامات آج بھی اسی طرح ورد زبان ہیں جس طرح پہلے تھے۔

ہندوؤں پر مظالم کا الزام

علامہ شبلی نے عالم گیر سے ہندوؤں کی ناراضگی اور اس کے اسباب پر مفصل بحث کی ہے اور خاص طور سے اس کے جو اسباب انگریز مورخوں نے بتائے ہیں ان کا جائزہ لیا ہے۔ان کے خیال میں انگریز مورخوں نے پہلی غلطی یہ کی ہے کہ ہندوؤں کی ناراضگی کے مذہبی اور سیاسی اسباب بیان کرنے میں خلط مبحث کر دیا ہے۔جو اصول تاریخ کی رو سے سراسر غلط ہے۔علامہ نے سیاسی اور مذہبی اسباب کی الگ الگ نشان دہی کر کے ان کا رد و ابطال کیا ہے۔سیاسی الزامات مندرجہ ذیل ہیں:

[۱] عالم گیر نے اپنے طرز عمل سے راجپوت رئیسوں کو جو تیموری حکومت کے دست و بازو تھے ناراض کر دیا۔

[۲] عام ہندوؤں کو ناراض کر دیا۔۳-راجپوتوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اس لیے وہ بغاوت پر مجبور ہوئے۔

[۴] عالم گیر راجپوتوں کو کبھی زیر نہ کر سکا۔(۱۹)

علامہ شبلی نے مذکورہ الزامات کا مفصل جائزہ لے کر عالم گیر کے راجپوتوں سے تعلقات

اوران سے رشتہ وتعلق کے شواہد، کتب تاریخ سے پیش کرنے کے بعد فیصلہ کن انداز میں لکھا ہے کہ:

''ان واقعات کے ثابت ہونے کے بعد کہ جے پور، جودھ پور، اودے پور کے فرماں روا عالم گیر کے ساتھ دکن میں مرہٹوں سے لڑائیاں لڑ رہے ہیں، راجپوت فوجیں مسلمانوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں، راجپوت افسروں کو سہ ہزاری منصب عطا ہوتے ہیں، اودے پور کا راجہ نابالغ ہونے کے ساتھ اس بے جگری سے مرہٹوں کا مقابلہ کرتا ہے، تو کیا یورپین مورخوں کے اس قول میں سچائی کا کچھ شائبہ ہے کہ عالم گیر نے راجپوتوں کو اس قدر ناراض کر دیا کہ وہ پھر کبھی تیموری علم کے نیچے نہ آئے۔''(۲۰)

اس کے بعد علامہ شبلی نے ہندوؤں کی ناراضگی کے مذہبی اسباب کا جائزہ لیا ہے۔اس سلسلے میں عالم گیر پر مندرجہ ذیل الزامات لگائے جاتے ہیں:

[۱] عالم گیر نے ہندوؤں کو ملازمت سے یک قلم برطرف کر دیا۔

[۲] ان کے مذہبی میلے ٹھیلے موقوف کرا دیے۔

[۳] ان کی درسگاہیں بند کرا دیں۔

[۴] ان پر جزیہ لگایا۔

[۵] اوران کے بت خانے توڑے اوران کو طرح طرح سے ستایا۔(۲۱)

علامہ شبلی کے اصل موقف اوران کے دلائل کی اہمیت اور قدر و قیمت کو بہ خوبی واضح کرنے کے لیے ان الزامات کا علاحدہ علاحدہ جائزہ لیا جاتا ہے۔

ہندوؤں کو ملازمت سے برطرف کرنے کا الزام

عالم گیر کی شخصیت پر مورخین یورپ نے ایک اہم الزام یہ عائد کیا ہے کہ اس نے اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں کو ملازمت سے برطرف کرنے کا حکم دے دیا تھا۔علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ یورپین مورخوں نے اپنی عادت کے مطابق واقعہ کی اصل ہیئت بدل دی ہے۔'' پھر انھوں نے معتبر معاصر تاریخوں مثلاً مآثر عالم گیری وغیرہ سے ثابت کیا ہے کہ عالم گیر نے تمام ہندوؤں

کو برطرف کرنے کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ اس نے یہ حکم دیا تھا کہ صوبہ داروں اور تعلقہ داروں کے پیش کار، دیوان اور محالات خالصہ کی مال گذاری وصول کرنے والے ہندو مقرر نہ کئے جائیں۔(۲۲)

علامہ شبلی نے اس سلسلے میں یہ دلیل بھی دی ہے کہ ان عہدوں پر عموماً کائستھ مقرر ہوتے تھے جن کی رشوت خوری کے واقعات شہرت کی حد تک سامنے آتے تھے، بعد میں اس حکم میں اصلاح کر دی گئی کہ ایک پیش کار ہندو اور دوسرا مسلمان مقرر کیا جائے۔(۲۳) علامہ شبلی کا خیال ہے کہ یہ قدم عالم گیر نے مذہبی تعصب کی وجہ سے نہیں اٹھایا تھا، بلکہ اس کے پس پشت رشوت خوری اور غبن کی نگرانی کا جذبہ کارفرما تھا۔(۲۴)

اس کے بعد علامہ شبلی نے دوسری دلیل میں ایک معتبر تاریخ سے عہد عالم گیر کے ان ہندو عہدیداروں کی ایک فہرست پیش کی ہے جو اہم عہدوں پر فائز تھے۔ جب کہ سیکڑوں غیر اہم ہندو عہدیداروں اور فوجیوں کو اس فہرست میں شامل نہیں کیا ہے۔ اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ عالمگیر جس قدر اپنے مسلمان عہدیداروں پر بھروسہ کرتا تھا، اسی قدر ہندو عہدیداروں پر بھی یقین کرتا تھا۔ ورنہ وہ فوج کی افسری، قلعہ داری، اضلاع کی نظامت اور فوج داری جیسے اہم عہدوں پر انھیں مامور نہ کرتا۔(۲۵) دور حاضر کے مورخین نے مغل حکمرانوں کے عہد کے ہندو عہدیداروں کی جو محققانہ فہرست تیار کی ہے، اس سے علامہ شبلی کی اس دلیل کو مزید تقویت ملتی ہے اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مغل حکمرانوں میں شاہ جہاں کے بعد عالم گیر کے عہد سلطنت میں سب سے زیادہ ہندو بڑے عہدوں پر مامور تھے۔ یہاں تک کہ اکبر سے بھی زیادہ۔(۲۶)

جزیہ

ہندوؤں سے زبردستی جزیہ لینے کا الزام بھی عالم گیر پر عائد کیا جاتا ہے۔ علامہ شبلی نے چونکہ جزیہ پر ایک علاحدہ مفصل رسالہ لکھا تھا۔(۲۷) اس لیے یہاں مختصراً یہ لکھ دیا ہے کہ جزیہ کوئی ناگوار چیز نہ تھی بلکہ وہ غیر قوموں کے حق میں ایک رحمت تھی، لیکن یہ سچ ہے کہ ہندوؤں نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا تھا، مگر اس کی وجہ بھی مذہبی نہیں تھی بلکہ بات صرف اتنی تھی کہ اس سے پہلے

اکبر کے عہد سلطنت میں جزیہ موقوف ہو چکا تھا۔ دوبارہ جزیہ لگانے پر ناگواری کا اظہار ہوا۔ (۲۸) جزیہ کی بحث پر مولانا ابوالکلام آزاد نے مصنف کی جس بے اعتنائی کا شکوہ کیا ہے۔ (۲۹) وہ درست نہیں، اس لیے کہ علامہ شبلی نے اس موقع پر صراحت کر دی ہے کہ جزیہ پر ایک مفصل رسالہ لکھا جا چکا ہے۔

میلوں ٹھیلوں کی موقوفی

عالم گیر نے میلوں ٹھیلوں کو بند کرادیا تھا۔ اس کا سبب بھی مورخین یورپ کو مذہبی تعصب ہی نظر آیا مگر علامہ شبلی نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ عالم گیر کا یہ حکم مذہبی تعصب کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس سے اخلاق پر برا اثر پڑتا تھا، نیز فساد و بلوہ وغیرہ کا بھی خطرہ رہتا تھا، اس لیے عالم گیر نے اسے بند کرادیا۔ یہ محض علامہ شبلی کا اندیشہ ہی نہ تھا بلکہ انھوں نے اس کی یہ مثال بھی دی ہے کہ ۱۰۷۹ھ کے جلوس میں تابوت کے گشت کو لے کر برہان پور میں بلوہ عظیم ہوا، جس میں بڑی خونریزی ہوئی۔ چنانچہ اس نے تابوت نکالنے پر پابندی عائد کر دی۔ عالم گیر کی افتادِ طبع کو بھی اس میں دخل تھا۔ وہ طبعاً خشک اور روکھا پھیکا شخص تھا۔ اسے میلوں ٹھیلوں، شراب و کباب، ناچ گانے اور ظاہری نمائش و تکلفات سے سخت نفرت تھی۔ غرض یہ کہ ان امور کی پابندی میں عالم گیر کے مذہبی تعصب کا کوئی دخل نہ تھا بلکہ اس کا اصل مقصد اصلاح معاشرت تھا۔ (۳۰)

مولانا آزاد نے بھی عالم گیر کی اس روش پر اعتراض کیا ہے کہ ہندوؤں کے مذہبی میلوں کو بند کرنے کا شرعاً و قانوناً اس کو کوئی حق نہ تھا۔ مذہبی اور اخلاقی اصلاح صرف مسلمانوں کے لیے تھی نہ کہ ذمیوں کے لیے۔ (۳۱) حالانکہ اس اصلاح کا تعلق مذہب کے بجائے نقض امن سے تھا، کیوں کہ اس طرح کے میلوں میں عموماً فساد و خونریزی کا خطرہ ہوتا ہے اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ امن و امان کا قیام ہر فرماں روا اور ہر حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں مسلم اور ذمی کی تفریق کی بحث غیر ضروری اور غیر منطقی ہے۔

ہندوؤں کے مدارس بند کرانے کا الزام

مغربی مورخین نے عالم گیر پر ہندوؤں کے مدارس بند کرانے کا بھی الزام لگایا ہے، مگر

علامہ شبلی نے مستند و معتبر تاریخوں سے ثابت کیا ہے کہ عالم گیر نے تمام مدارس کو بند کرنے کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ صرف ان مدارس کو بند کرنے کا حکم دیا تھا جن کے متعلق یہ شکایت سامنے آئی تھی کہ وہاں کے مسلم طلبہ کو جبراً ہندوؤں کی مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔(۳۲)

بت شکنی کا الزام

عالم گیر پر سب سے بڑا الزام بت شکنی اور مندر توڑنے کا ہے۔ جس کی مغربی مورخین نے اس زور سے تشہیر کی کہ آج تک فضا پر شور ہے۔ علامہ شبلی نے اس اہم الزام کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اس نے ان ہی مندروں کو برباد کیا تھا جہاں بغاوتوں کی سازشیں کی جاتی تھیں۔ مغربی مورخین اوران کے زیر اثر بعض ہندو مورخین نے اس سچائی کا رخ اس طرف موڑ دیا کہ مندر توڑے گئے، اس لیے بغاوتیں ہوئیں۔(۳۳) جس کا ثبوت تاریخ سے نہیں ملتا۔ مندروں کی بربادی کا اصل سبب ان سے اٹھنے والی روز روز کی بغاوتیں تھیں، جیسا کہ علامہ شبلی نے لکھا ہے:

> ''جس قدر بت خانے توڑے گئے، ان ہی مقامات کے توڑے گئے جہاں پرزور بغاوتیں ہوئیں۔ عالم گیر پچیس برس تک دکن میں رہا، ان ممالک میں ہزاروں بت خانے تھے لیکن کسی تاریخ میں ایک حرف بھی نہیں مل سکتا کہ اس نے کسی بت خانے کو ہاتھ بھی لگایا ہو، ایلورا کے مشہور مندر میں سیکڑوں تصویریں اور بت ہیں عالمگیر اسی نواح میں ایلورا سے میل دو میل کے فاصلے پر مدفون ہے، بڑے بڑے بزرگانِ دین کا یہاں مزار ہے جو عالم گیر سے بہت پہلے گذرے ہیں لیکن یہ بت اور تصویریں آج تک موجود ہیں۔''(۳۴)

علامہ شبلی نے اس سلسلہ میں جو ناقابل تردید دلائل پیش کئے ہیں، دور حاضر کے بعض اہم مورخین نے بھی ان کی صداقت کو تسلیم کرلیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عالم گیر نے صرف مندر ہی نہیں توڑے بلکہ بغاوتوں کی زد میں آنے والی مساجد بھی توڑیں۔(۳۵) اس موقع پر ممکن ہے یہ خیال کیا جائے کہ علامہ شبلی نے بغاوتوں کے اسباب و وجوہ بیان کرنے میں پہلو تہی سے کام لیا ہو

لیکن اس بحث کا تعلق ان کے اصل موضوع سے نہ تھا، اس لیے اس سے تعرض کرنے کے بجائے انھوں نے ان مباحث کی جانب اپنی توجہ مرکوز رکھی جو اس مضمون کے لکھنے کا اصل محرک بنے تھے۔ طوالت کا خوف بھی مانع رہا ہوگا ورنہ یہ مباحث اپنی اہمیت کے لحاظ سے کسی مستقل مضمون کے متقاضی تھے۔

یقیناً مسجد و مندر اس کے نزدیک بھی قابل تعظیم و تقدیس تھیں لیکن اگر وہ سازشوں اور دنیاوی اغراض کا مرکز بنائی جائیں تو چاہے کوئی بھی حکمراں ہوتا رفع شر کے لیے اس قسم کی کارروائیاں ضرور کرتا۔ علامہ شبلی نے انگریزوں کے ''روشن زمانے'' میں مہدی سوڈانی کے مقبرے کی بربادی کا ذکر کیا ہے، موجودہ دور میں امرت سر میں سکھوں کی مشہور عبادت گاہ گولڈن ٹمپل کی اس وقت کی حکومت کے ہاتھوں بربادی کو بھی مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ یہ بحث متنازع فیہ ہے کہ حکومت کا یہ قدم روا تھا یا ناروا۔

باپ بھائیوں کے معاملات

آخر میں علامہ شبلی نے اس مشہور الزام کا جائزہ لیا ہے کہ عالم گیر نے باپ کو قید اور بھائیوں کو قتل کیا۔ انھوں نے یہاں بھی معتبر تاریخوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ شاہ جہاں کے بیمار پڑنے کے بعد دارا شکوہ (قتل: ۳۰ راگست ۱۶۵۹ء) نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ عالم گیر اس وقت گلبرگہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ اس کے باوجود دارا شکوہ نے اس کے فوجی عہدیداروں کو برطرف کر دیا۔ اس کے سفیر کا گھر ضبط کر کے اسے قید کر دیا اور اس کے درباری سفراء سے مچلکہ لیا کہ دربار کی کوئی خبر عالم گیر تک نہ پہنچے۔ اس غرض سے بنگال، گجرات اور دکن کی عام شاہراہوں کو بند کرا دیا اور عالم گیر اپنے بیمار باپ کی عیادت کو چلا تو دارا شکوہ کے ایما سے راستہ میں جے سنگھ معرکہ آرا ہوا۔ اس طرح جنگ کی ابتدا اور مخالفانہ کارروائیوں کا آغاز عالم گیر نے نہیں بلکہ خود دارا شکوہ نے کیا۔ جس کی شاہ جہاں نے ہم نوائی کی اور آخر آخر تک اس کا ہم نوا اور معین و مددگار رہا۔ یہاں تک کہ عالم گیر کی زندگی کا خاتمہ بھی کرا دینا چاہا اور اس کے لیے وہ برابر سازشیں بھی کرتا رہا، لہٰذا اس کے جواب میں عالم گیر نے جو کچھ کیا وہ ظلم و جبر نہ تھا، بلکہ اس

کی مجبوری تھی۔ اس کو جب ہر طرف سے اطمینان وسکون حاصل ہوا تو اس نے شاہ جہاں کے ساتھ پسرانہ محبت کا ثبوت پیش کیا، جس کی شہادت اس کے مخالف برنئیر وغیرہ نے بھی دی ہے۔(۳۶)

جیسا کہ اوپر گذرا جنگ کی ابتدا داراشکوہ نے کی، مگر وہ عالم گیر کا مقابلہ نہ کر سکا اور گرفتار ہونے کے بعد قتل کر دیا گیا۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ اسے قتل کے بجائے کسی محفوظ مقام پر نظر بند بھی کیا جا سکتا تھا، لیکن علامہ شبلی کا خیال ہے کہ

''یہ قطعی تھا کہ داراشکوہ جب تک زندہ رہتا، سازشیں برپا رہتیں اور ملک کو امن وامان نصیب نہ ہوتا۔ اس لیے عالم گیر کو وہی کرنا پڑا جو خود اس کے باپ شاہ جہاں سے اس کو ترکہ میں ملا تھا۔''(۳۷)

اسی باب میں علامہ شبلی نے مراد کی گرفتاری اور پھر اس کی موت پر بھی بحث کی ہے۔ محققانہ اور مورخانہ انداز میں بحث کرنے کے بعد مراد کی گرفتاری اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اصل واقعہ یہ ہے کہ مراد گو نہایت دلیر، بہادر اور جانباز تھا لیکن اس کے ساتھ نہایت سادہ لوح اور نہایت آسانی سے لوگوں کے دام میں آجاتا تھا۔ داراشکوہ پر جب اس کو فتح حاصل ہو چکی تو اس کو لوگوں کے بہکانے سے یہ خیال آیا کہ یہ معرکے میں نے سر کیے ہیں، میں ہی تنہا تخت سلطنت کا حق دار ہوں۔ اس خیال سے اس نے عالمگیر سے علاحدگی اختیار کی اور عالم گیر کے بڑے بڑے امراء کو بھاری تنخواہوں اور انعاموں کی طمع دلا کر توڑنا شروع کیا۔ چنانچہ بیس ہزار فوج اس کے رکاب میں جمع ہو گئی اور روز بروز عالم گیر کی فوج گھٹتی جاتی تھی، مجبوراً عالم گیر کو اس کا بندوبست کرنا پڑا۔''(۳۸)

عالم گیر نے مراد کا جس طرح بندوبست کیا خود علامہ شبلی کو بھی وہ پسند نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''گو مراد سے علانیہ جنگ کرنے میں ہزاروں کا خون ہوتا، لیکن اگر عالم گیر اور

خوں ریزیوں کی طرح اس کو بھی گوارا کرتا اور مراد پر تدبیر سے نہیں بلکہ شمشیر سے قابو پاتا تو ہم اس کی مردانہ روش کی زیادہ داد دیتے لیکن سچ یہ ہے کہ عالم گیر نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خلیفہ منصور عباسی سے، جس نے ابومسلم اصفہانی بانی دولت عباسیہ کو دھوکے سے بلا کر قتل کرادیا تھا، زیادہ مدح کا مستحق ہے۔'' (۳۹)

علامہ شبلی نے برنئیر کے اس بیان کو غلط بتایا ہے کہ عالم گیر نے مراد کو شراب پلا کر قید کیا اور لکھا ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور مورخ نے اس کی صراحت نہیں کی ہے۔ اس کے بارے میں الفنسٹن کی یہ رائے نقل کر کے کہ ان کے بیان میں ایسی ایسی حکایتیں مذکور ہیں جو لوگوں کو بناوٹی معلوم ہوتی ہیں۔ (۴۰) اس کی مورخانہ حیثیت واضح کی ہے۔ اس کے علاوہ بھی یورپین مورخوں کی بہت سی غلط بیانیوں اور ان کے کذب وافترا کو تفصیل سے واضح کیا ہے۔

آخر میں علامہ شبلی نے عالم گیر کے مالی وملکی انتظامات واصلاحات، عدل وانصاف، ٹیکسوں کی موقوفی، علمی وتعلیمی ترقی، آراضی کا بندوبست، قانون مال گذاری اور عالم گیر کے اوصاف وکمالات وغیرہ کو قدرے تفصیل سے لکھ کر اس کا درجہ متعین کیا ہے کہ:

''ہم تیموری سلاطین کی فہرست میں وہی درجہ اس کو دے سکتے ہیں جو اسے ترتیب شمار کی رو سے حاصل تھا۔ تاہم عام اسلامی دنیا میں اس کے بعد آج تک کوئی اس کے برابر کا شخص بھی نہیں پیدا ہوا۔'' (۴۱)

چند فنی خصوصیات

یہ رسالہ مولانا شبلی کی تاریخی تحریر ہونے کے باوجود عالم گیر یا عہد عالم گیر کی مکمل تاریخ نہیں ہے۔ بلکہ اس سے عالم گیر کی زندگی کے چند مخصوص پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس بنا پر اصول تاریخ نویسی کے معیار پر اس کا مفصل جائزہ لینا درست نہیں۔ تاہم یہاں اس کی چند فنی خصوصیات وامتیازات کو پیش کیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے، تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ علامہ شبلی نے کہاں تک اس میں فن تاریخ کے اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے۔

غیر جانب داری

مورخ کا اولین فریضہ اس کی غیر جانب داری ہے۔ علامہ شبلی نے اس فریضہ کو شعوری طور پر انجام دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بے شبہ ہم کو نہایت ٹھنڈے دل سے بے رورعایت ان جرائم کی تحقیقات کرنی چاہئے اور نہایت احتیاط رکھنی چاہئے کہ میزان عدل کا پلہ طرف داری کے رخ نہ جھک جائے۔'' (۴۲)

چنانچہ علامہ شبلی نے مکمل طور پر اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے اور عالم گیر پر عائد کردہ الزامات کو صحیح تاریخی مآخذ اور معتبر حوالوں کی مدد سے رد کیا ہے۔ اس میں کہیں بھی عالم گیر کے ذاتی مذہب وعقیدہ یا اس کی پسند یا ناپسند کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ مرزا احسان احمد [ف: ۲۳/ دسمبر ۱۹۷۲ء] نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

> ''علامہ کا دل اگرچہ ہمہ تن اسلامی جوش سے لبریز تھا لیکن پورے مضمون میں عالم گیر کی بے جا حمایت یا طرف داری کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا۔'' (۴۳)

صحت وصداقت

علامہ شبلی نے اسلامی مورخین کی طرح تاریخ نویسی میں صحت واقعہ اور سچائی کی تلاش کو بہت اہمیت دی ہے کیوں کہ اس کے بغیر اصل واقعہ سامنے نہیں آ سکتا۔ چنانچہ خود انھوں نے اپنی اس تصنیف میں واقعہ کی صحت کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے اور صداقت کی تلاش میں انتہائی جانفشانی اور تحقیق سے کام لیا ہے۔ اس سلسلہ میں روایت ودرایت کے اصولوں کو بھی پوری طرح مدنظر رکھا ہے۔ وہ شاہجہاں اور عالم گیر کے موازنے میں لکھتے ہیں:

> ''اسلامی تعلق سے شاہ جہاں اور عالم گیر یکساں واجب التعظیم ہیں، گو وہ خلیفہ نہیں لیکن لغوی معنوں میں (نہ شرعی) امیر المومنین ہیں۔ میرا دل دکھتا ہے کہ اس میں کسی کو ملزم ٹھہراؤں، لیکن سچائی اور تاریخ نویسی کا کیا فرض ہے؟۔ شاہ جہاں اور عالم گیر دونوں قابل ادب ہیں لیکن دونوں سے بڑھ کر بھی ایک چیز ہے ''حق اور

راستی‘‘اور مجھ کو اسی اعلاتر چیز کے سامنے گردن جھکا دینی چاہئے۔‘‘(۴۴)

ہر جگہ انھوں نے حق و راستی کے سامنے پوری طرح گردن جھکا دی۔اختر وقار عظیم کا یہ خیال درست نہیں کہ جہاں شاہ جہاں اور عالم گیر میں موازنے کی نوبت آ جاتی ہے وہیں شبلی کی غیر جانبداری دم توڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔(۴۵)ان کو یہ خیال اس لئے پیدا ہوا کہ شبلی نے عالم گیراور شاہ جہاں کے درمیان ہونے والے جن واقعات پر روشنی ڈالی ہے، وہ عالم گیر کے حق میں جاتے ہیں۔ورنہ وہ اس تاریخی صداقت کو پہلے صراحتاً بیان کر چکے ہیں کہ عالم گیر کو وہی مرتبہ و مقام حاصل ہے جو ترتیب شمار کی رو سے اسے حاصل تھا۔اگر وہ مذہبی جوش و حمیت سے کام لیتے تو تمام مغل حکمرانوں میں عالم گیر کو سب سے بلند تر حکمراں قرار دیتے۔

اسباب وعلل

تاریخ نویسی میں اسباب وعلل کی تلاش مورخ کا فرض مانا جاتا ہے اس کے بغیر واقعہ کی تہہ تک پہنچنا اور اصلیت وحقیقت معلوم کرنا محال ہوتا ہے۔علامہ شبلی عالم گیر پر لگائے گئے الزامات کی حقیقت سمجھنے میں اس اصول پر پوری طرح کار بند دکھائی دیتے ہیں۔مثلاً عالم گیر نے دکن کی اسلامی ریاستوں پر کیوں قبضہ کیا، یا اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ بظاہر اس کے ناروا سلوک کے اسباب ومحرکات کیا تھے؟ وغیرہ۔یورپ کے فضلاء اور مورخین گو اسباب وعلل پر بڑا زور دیتے ہیں لیکن ان کی تحقیقات مخصوص اغراض کے تحت ہوتی ہیں۔ وہ اپنی مطلب برآری کے لئے اپنے اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور کذب وافتراء کا طومار باندھ دیتے ہیں۔

تاریخ اورانشاء پردازی

تاریخ اورانشاء پردازی میں بعد ہے۔علامہ شبلی کا خیال ہے کہ دونوں کی سرحدیں جدا جدا ہیں۔اس لئے خود انھوں نے اپنی اس تحریر میں بیجا انشاپردازی سے احتراز کیا ہے اور کہیں بھی اپنی مورخانہ حیثیت پر ادبی حیثیت کو غالب نہیں آنے دیا ہے،لیکن اگر تحریر میں قارئین کو انشاپردازی کا لطف ملتا ہے تو یہ علامہ شبلی کے قلم کا اعجاز ہے جو ان کی تحریر کا خاص جوہر ہے۔

سند اور حوالے

علامہ شبلی نے تاریخ نویسی میں سند اور حوالے پر بھی بہت زور دیا ہے اور خود اس کا اتنا اہتمام کیا ہے کہ ہر چھوٹے بڑے اہم اور غیر اہم واقعہ کا حوالہ دیا ہے۔ بعض جگہ ان واقعات کے بھی حوالے دیئے ہیں جن کو اگر وہ نہ دیتے تو بھی ان کے علم وفضل اور مورخانہ عظمت کی وجہ سے کوئی معترض نہ ہوتا۔ ان کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ وہ جن کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں، ان کے پایہ اعتبار واستناد کو پہلے ہی بیان کر دیتے ہیں۔ یہاں بھی انہوں نے یہ طریقہ کار ملحوظ رکھا ہے۔

کسی کتاب اور مقالے پر بحث وگفتگو کرتے وقت اس کے عہد اور زمانے کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے۔ علامہ شبلی نے جس وقت یہ رسالہ تحریر کیا تھا اس وقت اس موضوع پر کسی ہندوستانی مورخ اور صاحب علم ونظر کی کوئی تحریر موجود نہیں تھی۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب کے عہد سے متعلق بعد میں جو دستاویز ملی ہیں اور جو اس وقت انھیں (علامہ شبلی کو) حاصل نہیں تھیں ان کی بنیاد پر کئی باتوں میں ان کی تردید کی جاسکتی ہے۔ (۴۶) مگر وہ کوئی دستاویز پیش نہیں کرسکے۔ اس بنا پر ان کا یہ خیال علمی حیثیت سے باوزن نہیں بلکہ اس کے برعکس دور حاضر کے بعض مورخین مثلاً بی این پانڈے، عرفان حبیب، اطہر علی، ستیش چندر اور اوم پرکاش پرشاد وغیرہ نے عالم گیر اور اس کے عہد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس سے نہ صرف علامہ شبلی کے دلائل وبراہین کی تصدیق ہوتی ہے، بلکہ اس کی تائید میں مزید دلائل بھی فراہم ہوتے ہیں۔ (۴۷)

علامہ شبلی کے اس تاریخی رسالے پر مولانا ابوالکلام آزاد نے متعدد اعتراضات وارد کیے ہیں اور ان کے حوالے سے ہمارے عہد کے ایک اہل قلم جناب پروفیسر عزیز الدین حسین نے متعدد بے جا الزامات سے شبلی کی شخصیت کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے۔ راقم نے اس کا مدلل تحقیقی جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ ہمدانی صاحب کے اعتراضات بے سروپا اور بیجا ہیں۔ (۴۸)

علامہ شبلی کی یہ مخصوص انداز کی تحریر جو ان کے وسعت نظر اور مورخانہ بصیرت کا بہترین نمونہ ہے، اصول تاریخ کی رو سے بھی ایک بلند پایہ اور معیاری تحریر ہے۔ آئندہ اس موضوع پر کام کرنے والا کوئی بھی طالب علم اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

حوالے

(۱) حیات شبلی ص۴۵۴۔ محمد سرور۔ خطوط محمد علی ص ۵۹۔
مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی ۱۹۴۰ء

(۲) حیات شبلی ص۴۵۴

(۳) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر ص۳۔ دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۹۹ء

(۴) شبلی کی علمی و ادبی خدمات ص ۲۹۸۔ انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔

(۵) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر ص۳

(۶) ایضاً

(۷) ایضاً ص۴۵

(۸) ایضاً

(۹) ایضاً ص۴،۱۳

(۱۰) ایضاً

(۱۱) ایضاً

(۱۲) ایضاً ص۳۱

(۱۳) ایضاً ص۲۷

(۱۴) ایضاً ص۳۱

(۱۵) ایضاً

(۱۶) ایضاً

(۱۷) ایضاً ص۴۳

(۱۸) ایضاً

(۱۹) ایضاً ص۴۴-۵۷

(۲۰) ایضاً ص۵۷

(۲۱) ایضاً ص۵۸

(۲۲) ایضاً ص۶۳

(۲۳) ایضاً

(۲۴) ایضاً

(۲۵) ایضاً ص۶۷

(۲۶) اوم پرکاش پرساد، اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر ص۲۷-۳۷
خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۰ء

(۲۷) ملاحظہ ہو مقالات شبلی ج اص۲۲۱، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ

(۲۸) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص۶۷

(۲۹) حواشی ابوالکلام آزاد، ص۳۵۰ مرتبہ سید مسیح الحسن، اردو اکادمی، دہلی

(۳۰) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص۶۷-۶۸

(۳۱) حواشی ابوالکلام آزاد، ص۳۵۱

(۳۲) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص۶۸-۶۹

(۳۳) ایضاً ص۷۳

(۳۴) ایضاً

(۳۵) اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر ص۷۱

(۳۶) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص۷۵-۹۵

(۳۷) ایضاً ص۹۳

(۳۸) ایضاً ص۹۵

(۳۹) ایضاً ص۹۶

(۴۰) ایضاً ص۱۰۲

(۴۱) ایضاً ص۱۲۶

(۴۲) ایضاً ص۷۵

(۴۳) مرزا احسان احمد، مقالات احسان ص ۴۷، معارف پریس، اعظم گڑھ۔

(۴۴) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص ۸۵

(۴۵) اختر وقار عظیم، شبلی بحیثیت مورخ ص ۱۲۱، اعتقاد پبلیکیشنگ ہاؤس، دہلی

(۴۶) ضیاء الحسن فاروقی، اشخاص وافکار ص ۲۷

(۴۷) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر۔ ص ۵۔

(۴۸) متعلقات شبلی مطبوعہ ادبی دائرہ اعظم گڑھ ۲۰۰۸ء

داعی کے ترجمے کا سرورق

شعرالعجم

فارسی شعرو ادب پر علامہ شبلیؒ کی گہری نگاہ تھی۔اس کا انہوں نے بڑی گہرائی اور باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا۔وہ خود بھی فارسی پر اہل زبان کی طرح دسترس رکھتے تھے۔ان کا ''دیوان شبلی'' اور شعری مجموعے ''مجموعہ نظم''، ''دستہ گل''، ''بوئے گل''اور ''برگ گل'' اس کی واضح مثالیں ہیں۔ فارسی شعراء کے سیکڑوں اشعار انہیں ازبر تھے۔ان کا خیال تھا کہ:

''ایران کی خاک فنون لطیفہ کی قابلیت میں بھی سب سے ممتاز تھی اور بالخصوص شاعری اس کا خمیر تھا۔اسلام نے اس خاص جوہر کو زیادہ چمکایا اور اس حد تک پہونچایا کہ تمام دنیا کی شاعری ایک طرف اور صرف ایران کی شاعری ایک طرف۔لیکن افسوس یہ ہے کہ آج تک کسی اسلامی زبان میں ایران کی شاعری کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی جس سے ظاہر ہوتا کہ شاعری کب شروع ہوئی؟ کن اسباب سے شروع ہوئی؟ کس طرح عہد بہ عہد بڑھی؟ کیا کیا انداز قائم ہوئے؟ کیا کیا صورتیں بدلیں؟ ملکی اور قومی حالتوں نے اس پر کیا کیا اثر کئے، خود اس نے ملک اور قوم پر کیا اثر ڈالا؟۔''(۱)

۱۸۹۹ء میں پہلی دفعہ انہیں شعرالعجم کا خیال آیا۔مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے فارسی شعرو شاعری پر کچھ لکھنے کا ذکر کیا تو ان کو ایک خط میں لکھا کہ:

''آپ کو مرغوب ہو تو فارسی شاعری کی تاریخ اور عہد بہ عہد کی خصوصیتیں اور ترقیاں لیجیے۔ان تمام مضامین میں آپ کو اسسٹنٹی کا کام دے سکتا ہوں۔ مواد، تحریر، عنوانات، مضامین وغیرہ وغیرہ سب سامان مہیا کروں گا۔''(۲)

ایک دوسرے خط میں شبلی نے شعرالعجم کا خاکہ یوں کھینچا ہے:

''فارسی پر درحقیقت مجھ کو صرف عالم خیال سے کام لینا پڑے گا۔ کیونکہ فارسی کا ایک دیوان بھی میرے پاس نہیں ہے۔ جو کچھ ہے صرف دماغ میں ہے۔ ابتدائی کام اس کے یہ ہیں:

[۱] اس کے ادوار کی تقسیم۔ (مجمع الفصحاء میں چار ادوار قرار پائے ہیں۔)

[۲] ہر دور کی خصوصیات شاعری اور متروکات الفاظ ومحاورات۔

[۳] بڑے بڑے شعرا کے کلام پر ریویو۔

[۴] شاعری سے ملکی، اخلاقی اور معاشرتی اثر کیا پیدا ہوا۔'' (۳)

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی یہ کام انجام نہ دے سکے۔ اس لئے علامہ شبلی کے ذہن سے اس کا خیال نہ گیا۔ ۱۸۹۹ء میں بیماری کے بعد انہوں نے ایران کے سبزہ زاروں سے لطف اندوز ہونے کا ارادہ کیا۔ (۴) یہ ارادہ سفر بھی دراصل شعرالعجم ہی کے خیال سے تھا مگر وہ ایران نہ جا سکے۔ اس کے بعد وہ حیدرآباد کے سررشتہ علوم وفنون سے وابستہ ہو گئے، جس کی فضا نے ان کا رخ سلسلہ کلامیہ کی طرف پھیر دیا اور ان کے قلم سے الکلام، علم الکلام اور سوانح مولانا روم جیسی اہم کتابیں نکلیں۔ موازنہ انیس و دبیر کی تالیف کے بعد انہیں پھر شعرالعجم کا خیال آیا۔ چنانچہ ۹/مارچ ۱۹۰۶ء کو اس کام کا آغاز کیا اور پہلی جلد ۱۹۰۷ء میں مکمل ہو کر ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔ اسی طرح دوسرے حصے بھی پایہ تکمیل کو پہونچے۔ آخری حصہ پنجم ۱۹۱۲ء میں لکھا گیا۔ اس طرح وہ گویا ۸/برس تک شعرالعجم کے لکھنے میں مصروف رہے۔ جہاں تک ممکن تھا اس کی تصنیف میں کوئی کمی نہیں چھوڑی اور اپنے موضوع پر انتہائی معرکہ آراء کتاب سپرد قلم کی۔ مہدی حسن افادی (ف: ۲۱/نومبر ۱۹۲۱ء) نے لکھا ہے کہ:

''شعرالعجم تنقید عالیہ (ہائی کرٹسزم) کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے۔ جس پر دنیا کی کوئی بھی زبان ناز کر سکتی ہے۔...... یہ صرف اردو لٹریچر میں نہیں بلکہ مشرق کی کسی زبان میں اس پایہ کی تصنیف موجود نہیں ہے۔...... یہ دنیا کی سب سے شیریں زبان کے جذباتی لٹریچر کا ایک مرقع ہے۔'' (۵)

یہی وہ دور ہے جس میں اس موضوع پر دو اور اہم کتابیں لکھی گئیں۔ انگلینڈ سے پروفیسر ای۔ جی. براؤن (۱۸۶۲۔۱۹۲۶ء) کی لٹریری ہسٹری آف پرشیا اور لاہور سے مولوی محمد حسین آزاد (۱۸۳۲۔۱۹۱۰ء) کی سخندان پارس نکلیں۔ یہ دونوں کتابیں علامہ شبلی کی نظر سے گذریں۔ لٹریری ہسٹری آف پرشیا کے متعلق ان کا خیال تھا کہ:

''بلا مبالغہ اور بلا تصنع کہتا ہوں کہ براؤن کی کتاب دیکھ کر سخت افسوس ہوا۔ نہایت عامیانہ اور سوقیانہ ہے۔ برادر اسحاق سے پڑھوا کر بھی سنا۔ خود بھی الٹ پلٹ کر دیکھا۔ فردوسی کی نسبت صرف دو۔ تین صفحے لکھے ہیں، جس میں اس کے اقتباسات بھی شامل ہیں۔ مذاق اتنا صحیح ہے کہ آپ فردوسی کا درجہ سبعہ معلقہ کے برابر بھی نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کہ کسی حیثیت سے یہ کتاب اور شعرائے فارسی کے کلام کے برابر نہیں۔ میں مع سود ہرجہ کے آپ سے اس کے دام واپس لوں گا۔'' (۶)

اسی طرح سخندان پارس کے بارے میں لکھا کہ:

''آزاد کا سخندان پارس حصہ دوم نکلا۔ سبحان اللہ، لیکن الحمد للہ کہ میرے شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا۔'' (۷)

ان دونوں کتابوں کے موضوعات و مقاصد جدا جدا ہیں ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان دونوں کتابوں سے شعر العجم کا بڑا عمدہ موازنہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''شعر العجم جس فن کی کتاب ہے اس میں دوسری معاصرانہ کتابیں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ سخندان پارس کا انداز نظر اور نصب العین ہی شعر العجم سے مختلف ہے۔ یہ فارسی شاعری کی مربوط تاریخ ہی نہیں، اس میں مختلف موضوعوں پر مضامین ہیں، جن کو باہم ملایا گیا ہے۔ باقی رہی پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات سو اس کا میدان شعر العجم کے میدان سے وسیع تر ہے۔ یہ فارسی نظم ونثر کی مکمل اور محققانہ تاریخ ہے اور اس کا ذخیرہ معلومات بھی وسیع ہے مگر بقول مہدی حسن وہ تحقیق کے ساتھ مذاق سخن کہاں سے لاتے؟۔ یہی وجہ ہے کہ

یہاں ذوقِ سخن پر فیصلے کا دارومدار ہے۔ مثلاً براؤن شاہنامہ کی حقیقی عظمت کا ادراک نہ کر سکے۔ اسی طرح سعدی کے رتبہ شاعری کے متعلق ان کا نقطہ نظر بہت حد تک ناقص ہے۔ شبلی نے ان معاملات میں براؤن سے اختلاف کیا ہے اور اپنے دلایل کی بنیاد ذوقِ سخن پر رکھی ہے جس سے شبلی بدرجہ اتم بہرہ ور تھے۔ اس کا خود براؤن نے اعتراف کیا ہے۔"(۸)

غرض شعر العجم جس وقت لکھی گئی اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب تھی۔ یہاں اس کے تجزیے سے پہلے اس کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

جلد اول

شعر العجم کی جلد اول ۱۹۰۸ء میں مطبع فیض عام علی گڑھ سے چھپ کر شائع ہوئی۔ اس کا آغاز دیباچہ سے ہوا ہے جس میں سبب تالیف کے ساتھ شعر کا مفہوم اور شاعری کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ پھر فارسی شاعری کے آغاز اور اس کے اسباب بیان کئے گئے ہیں۔ قدیم شعراء اور ان کی شاعری کے اجمالی ذکر کے بعد رودکی، دقیقی، عنصری، فرخی، فردوسی، اسدی طوسی، منوچہری، حکیم سنائی، عمر خیام، انوری اور نظامی گنجوی کے حالات اور شاعرانہ کمالات کا ذکر ہے۔ ان شعراء کا ذکر عہد بہ عہد کیا گیا ہے۔ ان کے اثرات اور ایک عہد سے دوسرے عہد پر مرتب ہونے والے نتائج کا بھی ذکر ہے۔ یہ تمام تفصیلات ان کے کلام کی روشنی میں پیش کی گئیں ہیں۔ آخر میں نظامی اور فردوسی کے کلام کا موازنہ ہے۔ اس طرح عباس مروزی سے نظامی گنجوی [۱۲۱۳ء] تک دور اول کی فارسی شاعری کی پوری تاریخ کا تجزیہ اس میں آ گیا ہے۔

جلد دوم

یہ حصہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں فارسی شاعری کے دوسرے دور کی تاریخ ہے۔ اس کا آغاز دوسرے دور کی شاعری اور اس کی خصوصیات سے ہوا ہے۔ پھر خواجہ فرید الدین عطار، کمال اسمٰعیل اصفہانی، سعدی شیرازی، امیر خسرو دہلوی، سلمان ساوجی، خواجہ حافظ اور ابن یمین کے اجمالی ذکر کے ساتھ ان کی شاعرانہ خصوصیات کی مرقع آرائی ہے۔

جلد سوم

شعرالعجم کے اس حصہ میں فارسی شاعری کے تیسرے اور آخری دور کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ اس میں تیموری عہد کی شاعری اور اس کی خصوصیات کے بعد اس دور کے نامور شعراء فغانی شیرازی، فیضی، عرفی شیرازی، نظیری نیشاپوری، طالب آملی، صائب اصفہانی، ابوطالب کلیم کے حالات اور ان کی شاعری کا تجزیہ ہے۔ یہ حصہ ۱۹۱۰ء میں مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا۔

ان تینوں حصوں میں علامہ شبلی نے شاعری کے تینوں ادوار قدما، متوسطین اور متاخرین کا تاریخی پس منظر اور اس کے عام رجحانات کا ذکر کیا ہے۔ مشاہیر شعراء کے حالات اور ان کے کلام کی فکری و فنی خصوصیات اور دوسرے متعلقہ پہلوؤں کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ''کلیم کے بعد شاعری، شاعری نہیں رہی بلکہ چیستاں گوئی بن گئی۔''(۹) اس لئے اسی کے ذکر پر یہ سلسلہ ختم ہوا ہے۔

جلد چہارم

یہ حصہ ۱۹۱۲ء میں مطبع فیض عام علی گڑھ سے طبع ہوا۔ تین ابواب پر مشتمل اس کتاب میں پہلے شاعری کی حقیقت و ماہیت، شاعری کے مختلف عناصر، مثلاً محاکات، تخییل، تشبیہ واستعارہ، جدت ولطف ادا، حسن الفاظ، سادگی، شاعری کے استعمال اور اس کی اہمیت پر بحث و تحقیق کی گئی ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''کیا ان میں سے ہر ایک چیز ایسی ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو شعر شعر نہ ہوتا اگر ایسا نہیں ہے اور قطعاً نہیں ہے تو ان تمام اوصاف میں خاص ان چیزوں کو متعین کر دینا چاہئے جن کے بغیر شعر شعر نہیں رہتا۔''(۱۰)

پھر شعر کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے۔ محاکات اور تخییل۔ ان میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا۔ باقی اور اوصاف یعنی سلاست، صفائی، حسن بندش وغیرہ وغیرہ شعر کے اجزائے اصلی

نہیں بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں۔''(۱۱)

دوسرے باب میں ایرانی شاعری کے اسباب اور اس کے عہد بہ عہد ارتقاء، اور تنزل کے اسباب اور فارسی شاعری کے متنوع اثرات کی تفصیل قلم بند کی گئی ہے۔ آخری باب میں فارسی شاعری پر اجمالی ریویو ہے جس میں صنف مثنوی کا مختلف حیثیتوں سے جائزہ لیا گیا ہے۔

شعر العجم کا یہ حصہ بجائے خود ایک اہم اور معرکہ آراء کتاب کا درجہ رکھتا ہے۔ مجموعی طور سے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایران کی آب و ہوا اور تہذیب و تمدن نے شاعری پر کیا اثر ڈالا اور کیا کیا تغیرات پیدا کئے۔ نیز شاعری کے تمام ادوار کی خصوصیات بھی سامنے آجاتی ہیں۔

جلد پنجم

یہ حصہ اصلاً حصہ چہارم کا تتمہ ہے۔ جو طوالت کی وجہ سے حصہ چہارم سے علاحدہ شائع ہوا۔ علامہ شبلی نے حصہ چہارم کے خاتمہ پر ایک معذرت نامہ شامل کیا ہے کہ:

''یہ طے شدہ تھا کہ چوتھے حصے پر شعر العجم کا خاتمہ ہوگا لیکن داستان پھیلتی گئی اور اب اس حصہ کے بھی دو حصہ کر دینے پڑے۔ یہ حصہ مثنوی کے ریویو تک ہے۔ دوسرے حصہ میں بقیہ تمام انواع شاعری کی تقریظ و تنقید ہے۔ ناظرین مطمئن رہیں، پانچویں حصہ کے بعد ان کو زحمت نہ دی جائے گی۔''(۱۲)

افسوس کہ شعر العجم کا حصہ پنجم وہ مکمل کر سکے اور نہ شائع بلکہ ان کی وفات کے ۴؍سال بعد ۱۹۱۸ء میں مولانا سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴۔۱۹۵۳ء) نے دارالمصنّفین سے شائع کیا۔ اس میں قصیدہ، عشقیہ شاعری، صوفیانہ شاعری، اخلاقی اور فلسفیانہ شاعری پر نقد و تبصرہ ہے۔ اس کے بارے میں مہدی افادی نے جو علامہ شبلی کے بڑے مداح تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھا کہ:

''شعر العجم دیکھی نہیں آنکھوں سے لگائی، اگلے پچھلے بہتیرے نکتے یاد آ گئے اور صدمہ ہوا کہ یہ نعمت ہمیشہ کے لئے چھن گئی۔ صوفیانہ شاعری کی نزاکتیں جس نفاست سے دکھائی گئی ہیں ان سے بہت متاثر ہوا۔ میں تصوف متعارف سے

زیادہ گھبراتا ہوں، لیکن مولانا کے انتقادات پڑھنے کے بعد ایک دزدیدہ
اور خاموش اثر دل میں پاتا ہوں، جس سے قوت انحراف قریب قریب زیر
ہوچکی ہے۔
اخلاقی شاعری میں زیادہ پھیل نہ سکے کہ مواد بہت کچھ تصوف کی نذر ہو چکا تھا۔
عشقیہ شاعری میں تو دریا بہایا ہے، وہ بھی موتیوں کا۔ بے اختیار جی چاہتا ہے
کچھ لکھ ڈالوں۔'' (۱۳)

اسی تصنیف کے دوران علامہ شبلی نعمانی کے طائر خیال کی پرواز آستانہ نبوت تک پہونچی۔ وہ لکھتے ہیں:

''اب مجھ کو سب سے مقدم اور مہتم بالشان کام یعنی سیرۃ النبی ﷺ کی تالیف میں
مصروف ہونا چاہئے۔ اگر یہ کام انجام پا گیا تو شعر العجم ہوتی رہے گی۔ اس کی کیا
جلدی ہے۔'' (۱۴)

لیکن پھر وہ کبھی شعر العجم کی طرف توجہ نہ کر سکے اور آخری سانس تک شہنشاہ کونین کے دربار سے ہٹنا گوارا نہیں کیا۔ تاہم شعر العجم نے بڑی مقبولیت پائی۔ ملک میں ہر طرف اس کی دھوم مچ گئی۔ (۱۵) اور ارباب ذوق نے ہاتھوں ہاتھ لی۔ یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کی گئی اور کئی ایڈیشن نکل گئے۔ اس کی بنیادی وجہ اس کا اسلوب نگارش تھا۔ شستہ وشگفتہ اور رومانیت سے لبریز نثر، ہر خاص و عام کیلئے جاذبیت کا سبب بنی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ شعر العجم اردو میں عملی اور نظریاتی تنقید کا پہلا نمونہ اور ہزار سالہ فارسی شاعری کا خوب صورت انتخاب بھی تھی۔ اس سے نہ صرف شبلی کا تنقیدی مسلک واضح طور پر سامنے آیا بلکہ عملی تنقید کی مثالیں اور شہادتیں بھی واضح ہوئیں۔ جس سے اردو تنقید کا سفر آسان ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد نقادوں نے اس کی عظمت کا اعتراف کیا اور آج تک اس کی اہمیت کا چراغ روشن ہے۔

تاریخ ادب اردو کے مصنف رام بابو سکسینہ (ف: ۲۰؍دسمبر ۱۹۵۷ء) نے لکھا کہ'' اگر کسی شخص کو زمانہ حال کی کوئی ایسی تصنیف دیکھنا ہو جو وسعت مطالعہ اور تحقیق کے ساتھ فصاحت و بلاغت اور سلاست زبان کا ایک بہترین مجموعہ کہی جا سکے تو اس کو شعر العجم دیکھنا چاہئے۔ جس کی

یکتائی پر پروفیسر براؤن ایسے مشہور زمانہ مستشرق کی شہادت موجود ہے۔(۱۶) مہدی افادی نے تصنیفات شبلی میں شعرالعجم کو گل سر سبد قرار دیا۔(۱۷) لٹریری ہسٹری آف پرشیا کے مصنف پروفیسر براؤن نے شعرالعجم سے استفادہ کرکے اور اپنی کتاب کی آخری جلدوں میں اس کا حوالہ دے کر شعرالعجم کی عظمت کا اعتراف کیا۔(۱۸) غرض شعرالعجم مشرق ومغرب کے متعدد اہل قلم اور نقادوں کی نظر میں قابل قدر ٹھہری حتیٰ کہ ۱۹۲۴ء میں لاہور کے ارباب ذوق نے اسے انعام سے بھی نوازا۔(۱۹) اس کی مقبولیت کا اندازہ اس کی اشاعتوں سے بھی ہوتا ہے۔اب تک اس کے مندرجہ ذیل ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں:

جلد اول

[۱]	▪ مطبع فیض عام علی گڑھ	۱۹۰۹ء	۳۵۶ص، طبع اول
[۲]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۲۱ء	۳۵۵ص، طبع دوم
[۳]	▪ شاہ جہانی پریس، دہلی	۱۹۳۱ء	
[۴]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۴۰ء	۳۶۰ص، طبع چہارم
[۵]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۴۷ء	۳۶۰ص
[۶]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۶۲ء	۳۱۷ص، طبع پنجم
[۷]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۷۲ء	۳۰۴ص، طبع ششم
[۸]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۸۲ء	۳۱۴ص
[۹]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۸۸ء	۳۱۴ص
[۱۰]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۰۴ء	۲۶۶ص
[۱۱]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۱۰ء	۳۲۷ص
[۱۲]	▪ شیخ مبارک علی، لاہور	غیر مورخہ	۲۹۶ص
[۱۳]	▪ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد	غیر مورخہ	۳۱۷ص
[۱۴]	▪ مکتبہ دست گیر، حیدرآباد	غیر مورخہ	

جلد دوم

[۱] ■ مطبع فیض عام، علی گڑھ ۱۹۱۰ء، ۳۰۲ص، طبع اول

[۲] ■ الناظر پریس، لکھنؤ ۱۹۱۷ء ۳۰۲ص

[۳] ■ آسی پریس، لکھنؤ ۱۹۱۷ء ۲۲۸ص

[۴] ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۱۹۱۷ء ۳۰۲ص

[۵] ■ مطبع فیض عام، علی گڑھ ۱۹۱۹ء ۳۵۶ص

[۶] ■ شیخ مبارک علی، لاہور ۱۹۲۴ء ۲۶۹ص

[۷] ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۱۹۴۷ء ۲۷۰ص

[۸] ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۱۹۸۰ء ۲۷۰ص

[۹] ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء ۲۷۰ص

[۱۰] ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۱۹۸۸ء ۲۷۰ص، طبع ششم

[۱۱] ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۱۹۹۸ء ۲۷۰ص، طبع ہفتم

[۱۲] ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۲۰۰۴ء ۲۰۷ص

[۱۳] ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۲۰۱۱ء ۲۶۶ص

[۱۴] ■ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، غیر مورخہ ۲۷۰ص

جلد سوم

[۱] ■ مطبع فیض عام، علی گڑھ ۱۹۱۰ء ۲۳۰ص، طبع اول

[۲] ■ مطبع آصفی، لکھنؤ ۱۹۱۶ء ۲۳۰ص

[۳] ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۱۹۲۰ء ۲۳۰ص، طبع سوم

[۴] ■ شیخ مبارک علی، لاہور ۱۹۲۴ء ۲۰۸ص

[۵] ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۱۹۴۵ء ۲۰۶ص

[۶] ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۱۹۴۷ء ۲۰۶ص

[۷]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۵۰ء	۲۰۶ص
[۸]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۵۶ء	۲۰۶ص، طبع پنجم
[۹]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۵۹ء	۲۰۶ص
[۱۰]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۹۱ء	۱۸۹ص
[۱۱]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۰۲ء	۱۸۹ص
[۱۲]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۰۹ء	۲۰۶ص
[۱۳]	▪ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، غیر مورخہ		۲۰۶ص

جلد چہارم

[۱]	▪ مطبع فیض عام، علی گڑھ	۱۹۱۲ء	۳۴۰ص، طبع اول
[۲]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۱۸ء	۳۴۰ص
[۳]	▪ صدیق بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۲۲ء	۲۷۳ص
[۴]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۲۳ء	۳۳۹ص
[۵]	▪ اسرار کریمی پریس، لاہور	۱۹۲۴ء	۳۱۶ص
[۶]	▪ شیخ مبارک علی، لاہور	۱۹۳۲ء	۲۸۶ص
[۷]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۵۱ء	۲۸۸ص
[۸]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۷۸ء	۲۸۸ص، طبع ششم
[۹]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۸۴ء	۲۸۸ص
[۱۰]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۸۶ء	۲۸۸ص، طبع ہشتم
[۱۱]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۸۸ء	۲۸۸ص
[۱۲]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۰۷ء	۲۲۶ص
[۱۳]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۱۰ء	۲۷۸ص
[۱۴]	▪ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد غیر مورخہ		۲۸۸ص

جلد پنجم

[۱]	▪ مطبع معارف، اعظم گڑھ	۱۹۱۸ء	۲۲۸ص، طبع اول
[۲]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۲۱ء	۲۲۸ص
[۳]	▪ انوارالمطابع، لکھنؤ	۱۹۲۲ء	۱۸۰ص
[۴]	▪ شیخ مبارک علی، لاہور	۱۹۲۴ء	۲۰۳ص
[۵]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۴۲ء	۲۲۷ص
[۶]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۵۷ء	۲۱۰ص، طبع چہارم
[۷]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۹۱ء	۲۰۰ص، طبع پنجم
[۸]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۰۹ء	۲۰۶ص
[۹]	▪ مطبع انوار احمدی، الہ آباد	غیر مورخہ	۸+۲۴۸ص
[۱۰]	▪ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، غیر مورخہ		۲۱۰ص

یہ شعرالعجم کی معلوم اشاعتیں ہیں۔ ممکن ہے اور مکتبوں نے بھی شائع کیا ہو جس کا علم نہیں ہو سکا۔

شعرالعجم کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ متعدد اشاعتی اداروں نے شعرالعجم میں شامل شعراء کے تذکرے، رسالوں کی شکل میں شائع کیے۔ اس کی جو تفصیل مل سکی وہ یہ ہے:

[۱] بیان خسرو
- رحمانی پریس دہلی غیر مورخہ ۸۰ص

[۲] حیات حافظ
- رنگین پریس، دہلی ۱۹۲۳ء ۵۷ص
- جامعہ ملیہ برقی پریس، دہلی، غیر مورخہ، ۵۶ص
- قومی پریس، دہلی ۱۹۲۳ء ۵۷ص

- رحمانی پریس، دہلی غیر مورخہ ۶۴ص

[۳] حیات خسرو

- دائرہ ادبیہ لکھنو ۱۹۲۲ء ۱۰۶ص
- ادبی پریس لکھنؤ ۱۹۳۳ء ۱۰۶ص
- مطبع مجتبائی، دہلی غیر مورخہ ۵۶ص

[۴] حیات سعدی

- خواجہ برقی پریس دہلی غیر مورخہ ۴۸ص
- رحمانی پریس دہلی غیر مورخہ ۵۵ص
- مطبع مجتبائی دہلی غیر مورخہ ۵۲ص
- کانگریس پریس دہلی غیر مورخہ ۵۲ص، طبع سوم
- رنگین پریس، دہلی غیر مورخہ ۵۲ص
- نول کشور پریس دہلی غیر مورخہ ۱۶ص

[۵] سوانح عمری فردوسی

مطبع مجتبائی، دہلی غیر مورخہ ۶۳ص

[۶] سوانح عمری فیضی

مطبع مجتبائی، دہلی ۱۹۱۷ء ۲۲ص

[۷] سوانح عمری نظامی گنجوی

مطبع مجتبائی، دہلی غیر مورخہ ۴۸ص

تراجم

شعرالعجم کو نہ صرف ہندوستان میں حسن قبول نصیب ہوا بلکہ اس کا آوازہ وشہرہ ہندوستان سے باہر بھی پہونچا اور ایران وافغانستان کے اہل قلم بالخصوص سید محمد تقی فخر داعی گیلانی، ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا، احمد گلچیں معانی، توفیق سبحانی اور علی اصغر حکمت وغیرہ نے اس سے پوری دلچسپی لی

اور شبلی کی بصیرت کا اعتراف کیا اور فارسی میں ترجمہ کر کے اہل فارس کو اس سے استفادے کا موقع فراہم کیا۔(۲۰)

ایرانی اہل قلم اور مترجم سید محمد تقی فخر داعی گیلانی (ف:۱۳۴۳اش۔تہران) نے شعر العجم کی پانچوں جلدوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔جس کی تفصیل یہ ہے:

[۱] شعر العجم، حصہ اول، مترجم: سید محمد تقی فخر داعی گیلانی
- ابن سینا، تہران، ۱۳۱۶اش، ۲۶۹ص
- طبع دوم، ابن سینا، تہران، ۱۳۳۹اش، ۲۴۷ص
- طبع سوم، دنیائے کتاب، تہران، ۱۹۸۹ء

[۲] شعر العجم، حصہ دوم، مترجم: سید محمد تقی فخر داعی گیلانی
- ابن سینا، تہران، ۱۳۲۷اش، ۲۵۰ص

[۳] شعر العجم، حصہ سوم، مترجم: سید محمد تقی فخر داعی گیلانی
- ابن سینا، تہران، ۱۳۱۴اش، ۲۸۸ص
- طبع دوم، ابن سینا، تہران، ۱۳۳۶اش، ۲۵۴ص

[۴] شعر العجم، حصہ چہارم، مترجم: سید محمد تقی فخر داعی گیلانی
- ابن سینا، تہران، ۱۳۱۴اش، ۲۳۳ص
- طبع دوم، ابن سینا، تہران، ۱۳۳۶اش، ۲۵۴ص

[۵] شعر العجم، حصہ پنجم، مترجم: سید محمد تقی فخر داعی گیلانی
- ابن سینا، تہران، ۱۳۳۰اش، ۲۳۶ص

اس کے بعد کی ایرانی اشاعتوں کا علم نہ ہو سکا۔

ایران کے ساتھ افغانستان نے بھی شعر العجم کے ساتھ اعتنا کیا بلکہ ایران سے پہلے کیا اور انجمن ادبی کابل نے مختلف دانشوروں سے اس کے فارسی ترجمے کرا کے شائع کئے، جس کی تفصیل یہ ہے:

[۱] شعر العجم، حصہ سوم، مترجم: سرور خاں گویا

▪ انجمن ادبی، کابل، ۱۳۱۵ھ، ۱۵۲ص

[۲] شعرالعجم، حصہ چہارم، مترجم: برہان الدین کشلکی

▪ مطبع مفید عام، لاہور، ۱۳۰۶ھ، ۴۶۳ص

[۳] شعرالعجم، حصہ اول، مترجم: محمد منصور انصاری

▪ انجمن ادبی، کابل، ۱۳۰۴ش (۱۹۲۵ء)، ۲۷۲ص

[۴] شعرالعجم، حصہ دوم، مترجم: محمد منصور انصاری

▪ انجمن ادبی، کابل، ۱۳۰۶ش، ۴۴۸ص

[۵] شعرالعجم، حصہ پنجم، مترجم: محمد منصور انصاری

▪ انجمن ادبی، کابل، ۱۳۱۴ش

شعرالعجم کے ان تراجم سے اس کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ عرض کرنے میں باک نہیں کہ اس دور میں لکھی جانے والی کسی کتاب کو اس قدر مقبولیت نہیں ملی۔ صحیح یہ ہے کہ شعرالعجم آج بھی اپنے موضوع پر نقش اول ہونے کے باوجود سب سے عمدہ کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ شعرالعجم کی اشاعت کے نوے سال بعد فارسی کے ایک ممتاز استاذ امیر حسن عابدی[ف:۲۰۱۱ء] نے علامہ شبلی کو یوں خراج پیش کیا ہے:

> ''علامہ شبلی نعمانی کو یہ اولیت حاصل ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے فارسی شاعری کو انتقادی نظر سے دیکھا۔ نیز اس کو ہندوستانیوں کے لئے نہیں بلکہ ایرانیوں، افغانیوں، تاجکیوں اور دوسرے فارسی کے عاشقوں کے لئے پوری طرح روشناس کرایا۔ شعرالعجم کا فارسی ترجمہ ایران اور افغانستان میں شائع ہو چکا ہے اور بہت مقبول ہوا ہے۔ نیز فارسی کے علماء اور دانش مندان کی عظمت اور بزرگی کے قائل ہیں۔''(۲۱)

ادب و انشاء کے لحاظ سے بھی یہ اپنی مثال آپ کے مصداق ہے۔ شبلی کا اسلوب نگارش جس قدر اس کتاب میں نمایاں ہوا ہے الفاروق کے علاوہ شاید ہی کسی اور کتاب میں واضح طور پر سامنے آیا ہو۔ نظامی کی جامعیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایران میں جس قدر شعراء گذرے ہیں وہ خاص خاص انواع شاعری میں کمال رکھتے تھے۔ مثلاً فردوسی رزم کا مرد میداں ہے، عشقیہ شاعری میں اس کو کمال نہیں۔ سعدی اخلاقی اور عشقیہ شاعری کے پیغمبر ہیں لیکن رزم میں پھیکے ہیں۔ چنانچہ سکندر نامہ کی طرز پر شاطر اصفہانی کی جو حکایت لکھی ہے اگر چہ اس میں اپنا پورا زور صرف کر دیا ہے لیکن وہ بوڑھا پن نہیں جاتا۔ ایک مصرعہ نہایت زورشور کا ہے۔ دوسرے میں دفعتاً پست ہو جاتے ہیں۔ خیام صرف فلسفہ لکھ سکتا ہے۔ حافظ صرف غزل لکھ سکتے ہیں۔ بخلاف اس کے نظامی نے رزم، فلسفہ، عشق، اخلاق سب کچھ لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے، لا جواب لکھا ہے۔ البتہ مدح ان سے نہیں بن پڑتی لیکن مدح کوئی شاعری نہیں۔ شاعر بھاٹ نہ ہو تو اس کی شاعری میں کیا نقص ہے۔''(۲۲)

نظامی کے فکر وفن کی اس سے زیادہ خوبصورت مرقع آرائی شاید ہی کسی اور نے کی ہو۔ یہ تو نظامی کی مرقع آرائی تھی خود شاعر کے عالم خیال کی تصویر ملاحظہ ہو:

''اس عالم میں شاعر کی تاریخ زندگی عجب دلچسپیوں سے بھری ہوتی ہے۔ بلبل نے اسی عالم میں اس سے زمزمہ سنجی کی تعلیم پائی ہے، پروانے اس کے ساتھ کھیلے ہوئے ہیں، شمع سے وہ رات رات بھر سوز دل کہتا رہتا ہے، نسیم سحری کو اکثر اس نے قاصد بنا کر محبوب کے یہاں بھیجا ہے، بار بار اس نے غنچہ کی عین اس وقت پردہ دری کی جب وہ معشوق کا تبسم چرا رہا تھا۔''(۲۳)

حقیقت یہ ہے کہ فارسی شاعری کی اس سے عمدہ تنقیدی تاریخ اب تک ایران میں بھی نہیں لکھی جا سکی اور مسلمانوں کے تہذیبی انحطاط و زوال کے سبب آئندہ اس سے بہتر کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔

علامہ شبلی نے فارسی شعر و ادب کے دور زوال میں شعر العجم لکھ کر اس کے احیاء کی کوشش کی اور فارسی شعر و ادب کو زندہ کرنے کا کارنامہ انجام دیا مگر واقعہ یہ ہے کہ جس طرح ہندوستان

میں فارسی شاعری کا خاتمہ شبلی پر ہوا، اسی طرح فارسی شعروادب پر نقد وجرح کا بھی خاتمہ انہیں پر ہوا اور پھر اس کے بعد اس طرح کی کوئی کوشش وکاوش اس رتبہ کی سامنے نہ آسکی۔

مولانا اسلم جیراج پوری کی تنقیدیں

شعرالعجم شائع ہوئی تو جہاں اس کی افادیت، شبلی کی فکر ونظر کی رفعت، سخن فہمی کی صلاحیت، تنقید وتجزیہ کی قوت اور حسن انتخاب کی ارباب نظر نے داد دی، وہیں بعض اہل قلم نے تنقیدیں بھی کیں۔ تحقیق وتدوین کی کمیاں نکالیں اور اس کی عظمت کو مٹادینا چاہا۔ اس میں سرفہرست مولانا اسلم جیراج پوری (ف: ۲۸ر دسمبر ۱۹۵۵ء) تھے۔ انہوں نے شعرالعجم کی کمیوں پر مشتمل ایک طویل تنقیدی مضمون ''زمانہ'' کان پور جون ۱۹۱۰ء میں لکھا، جبکہ اس وقت تک شعرالعجم کی محض ۲ر جلدیں شائع ہوئی تھیں۔ اس مضمون کے آغاز میں وہ لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب پر بالکل سرسری طور پر بھی نگاہ ڈالنے پر بہت سے عیوب نظر آئے۔ اگر ان سب کی نکتہ چینی کی جائے تو شعرالعجم ہی کے برابر ایک دوسری کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ اس لئے میں جزئیات کو بالکل چھوڑتا ہوں اور صرف ان عام اعتراضات کو بیان کرتا ہوں جو ساری کتاب سے تعلق رکھتے ہیں۔'' (۲۴)

ان تمام اعتراضات کو انہوں نے سلسلہ وار پیش کیا ہے، جس میں مجموعی طور سے آٹھ اور ذیلی طور پر بے شمار کمیوں اور غلطیوں کی نشاندہی فرمائی ہے۔ باوجود اس کے ان کا خیال ہے کہ اگر شعرالعجم کے تمام عیوب پر نکتہ چینی کی جائے تو ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ ان کے اعتراضات یہ ہیں:

[۱] شعرالعجم کی ترتیب درست نہیں۔ ادوار کی تقسیم میں تساہل برتا گیا۔ ترتیب بالکل مخبوط ہے۔ مصنف کو اپنے فرض اولین تک کا احساس نہیں۔

[۲] شعراء کا انتخاب درست نہیں۔ انتخاب کے شرائط بیان نہیں کئے گئے۔ خاقانی اور ظہیر فاریابی کا ذکر نہیں کیا گیا جبکہ منوچہری اور سلمان ساوجی کو شامل کیا گیا۔ ان استادوں کے نکال دینے سے شعرالعجم کا سلسلہ پورا نہیں ہوسکتا۔

[۳] شعراء کا کلام اس قدر نقل کرتے ہیں کہ جی اکتا جاتا ہے۔اس کا نام شعرالعجم کے بجائے بیاض شبلی ہونا چاہئے۔اشعار کا ترجمہ نہیں کیا،اس لیے کتاب کا فائدہ بہت محدود ہے۔یہ ایک نامکمل تذکرہ ہے۔

[۴] کتاب کی تالیف میں محنت بہت کم کی گئی۔محض چند کتابوں سے استفادہ کیا گیا جوایک بڑی کتاب کے لئے ناکافی ہیں۔یورپ وامریکہ میں فارسی ادب سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے،اس سے بے انتہا سرمایہ مہیا ہوسکتا تھا لیکن مؤلف نے اس کے لئے محنت گوارا نہیں کی۔اس کتاب میں تاریخی معلومات بہت کم ہیں اور جو کچھ ہیں وہی بازاری گپیں ہیں۔طاہر ہمدانی عریاںؔ اور رباعیات عمر خیام مطبوعہ لندن کا نام تک نہیں۔واقعات میں تضاد بیانی پائی جاتی ہے۔اس قسم کی غلطیاں کثرت سے ہیں۔ایک شعر کبھی کسی کا بتاتے ہیں تو کبھی کسی اور سے منسوب کردیتے ہیں۔

[۵] اشعار کی خوبی وجدانی چیز ہے اور ذوق صحیح پر منحصر ہے۔ان کا بیان کرنا اہل کمال کا کام ہے۔مولانا حالی نے اس کواس سلاست اور نفاست کے ساتھ بیان کیا کہ اس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔مولانا شبلی اس میں برابر ناکامیاب رہے۔جہاں اس قسم کی باریکیاں ہوتی ہیں ان کا قلم رک جاتا ہے اور جہاں بیان کرتے ہیں بہت دور جا پڑتے ہیں اس قسم کی مثالیں بہت ہیں۔

[۶] فارسی شاعری میں لطافت تصوف سے ہے اور مولانا شبلی کو تصوف سے کوئی مناسبت نہیں،یہی وجہ ہے کہ عطار،امیر خسرو اور حافظ کی شاعری کے رموز واسرار نہیں دکھلائے جا سکے۔جس سے کتاب بے نمک اور بے جان ہوگئی۔

[۷] شبلی نے بزرگان اسلام کا احترام نہیں کیا۔ان کو امرد پرست شراب خور، رند،اوباش قرار دیا۔اس کی بنیاد اشعار پر رکھی۔اشعار کوئی قانون یا فلسفے کے فقرے نہیں ہوتے۔ الف لیلہ، کتاب محمود وایاز، نامہ عندلیب وغیرہ بے فکروں کے دل بہلاؤ کا سامان ہیں۔واقعیت سے ان کو سروکار نہیں۔شبلی نے الفاروق میں بخاری کی روایت کی تردید میں چوٹی سے ایڑی کا زور لگا دیا اور شعرالعجم میں بازاری گپیں مزے لے لے کر بیان کیں۔ایاز حقیقت میں کوئی شخص نہیں تھا

۔محمود کے عشق کی داستان قصوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

[۸] مولانا شبلی جوش وجذبے میں متوالے ہو جاتے ہیں۔کسی کو کسی پر بے جا فوقیت دیتے ہیں اور سراسر غلط بیانی کرتے ہیں ۔ یہ عیب مولانا کی تمام تصانیف میں عام ہے۔ شعرالعجم میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں ، مثلاً امیر خسرو کے جامع اصناف ہونے کی تعریف وغیرہ۔ان اعتراضات کے بعد انہوں نے مضمون کے خاتمہ پر لکھا کہ شعرالعجم کے آئندہ دونوں حصے جب شائع ہوں گے،تو ماہنامہ ''زمانہ'' ہی کے صفحوں میں ہم کو یہ لکھنے کا موقع ملے گا کہ ان کمیوں کی بہت کچھ تلافی کر دی گئی ہے''۔(۲۵)

اعتراضات کی حقیقت

مولانا اسلم جیراج پوری بڑے عالم ومصنف تھے۔حیات حافظ ان کی معرکہ آراء کتاب ہے ۔ وہ علامہ شبلی کے مولد موضع ''بندول'' سے متصل موضع ''جیراج پور'' کے رہنے والے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے استاذ تھے۔عمر میں علامہ شبلی کے شاگردوں کے برابر تھے۔ان کی یہ تنقیدیں وقت سے پہلے یعنی کتاب کی مکمل اشاعت سے پہلے آئیں جس سے گوان کی عجلت پسندی کا اظہار ہوتا ہے،تاہم نقاد بہرحال نقاد ہے۔یہاں علی الترتیب ان کی تنقیدوں کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اندازہ ہو کہ وہ کس قدر حقیقت پر مبنی ہیں:

[۱] پہلا اعتراض کتاب کی ترتیب وتالیف پر ہے۔جسے انہوں نے مخبوط قرار دیا ہے۔علامہ شبلی نے شعرالعجم حصہ اول کے دیباچہ میں اس کا جوخاکہ پیش کیا ہے۔(۲۶) کتاب اسی ترتیب سے لکھی گئی۔اس میں انہوں نے کوئی ترمیم وتنسیخ نہیں کی۔مولانا جیراج پوری کا اسے مخبوط اور تساہل قرار دینا سمجھ سے بالاتر ہے۔

[۲] ان کا دوسرا اعتراض شعراء کے انتخاب اور اس کے شرائط کی وضاحت پر ہے اور یہ کہ خاقانی اور ظہیر کو کیوں شامل نہیں کیا گیا؟ اور منوچہری وسلمان کو شبلی نے اہمیت کیوں دی۔مولانا اسلم جیراج پوری کا یہ شکوہ بجا ہے۔خاقانی اور ظہیر کا تذکرہ ہونا چاہئے تھا۔حالانکہ یہ ذوقی معاملہ ہے۔شبلی نے جن کو فائق سمجھا ان کو شامل کیا۔یہاں خود مولانا سے سوال کیا جاسکتا ہے

کہ منوچہری اور سلمان ساوجی کو وہ کیوں کم تر خیال فرماتے ہیں؟ کیا ان کے ذکر کے بغیر شعرالعجم کا سلسلہ مکمل ہوتا؟

[۳] ان کا تیسرا اعتراض یہ ہے کہ شبلی نے شعراء کا کلام اس قدر نقل کیا ہے کہ جی اکتانے لگتا ہے اور اس کا نام شعرالعجم کے بجائے بیاض شبلی ہونا چاہئے ۔ بلاشبہ علامہ شبلی نے کثرت سے اشعار نقل کئے ہیں جس میں فارسی شاعری کے قدما، متوسطین اور متاخرین شعراء کے خوب صورت اشعار شامل ہیں۔ متعدد نقادوں نے اسے شعرالعجم کا امتیازی وصف قرار دیا ہے اور یہی وہ ذوق شعر وادب ہے جس سے علامہ شبلی کا کوئی ہم عصر ان کا ہم پلہ نہیں اور مولانا اسلم جیراج پوری اس سے بہرہ ور نہ تھے۔

ترجمہ کے سلسلے کا اعتراض بھی بے جا ہے۔ علامہ شبلی نے بلاشبہ ہر شعر کا ترجمہ نہیں کیا لیکن ضرورتاً جہاں ترجمہ کیا ہے، حق ادا کر دیا ہے۔ مثلاً یہ شعر:

برقع بہ رخ افگندہ برد ناز بہ باغش
تا نکہت گل بیختہ آید بہ دماغش

''معشوق جالی کا نقاب پہن کر باغ کی سیر کو نکلا، شاعر کو قوت تخیل سے نظر آتا ہے کہ معشوق چونکہ نہایت نازک اور لطیف الطبع ہے، اس لیے چاہتا ہے کہ پھولوں کی خوشبو دماغ میں آئے تو چھن کر آئے، اس لئے اس نے جالی کا نقاب پہن لیا۔''(۲۷)

اس طرح کے ترجموں کی سیکڑوں مثالیں شعرالعجم کے صفحات میں موجود ہیں۔ شعرالعجم جس وقت سپرد قلم کی گئی اس وقت بہر حال ملک میں فارسی کا مذاق کسی قدر باقی تھا۔ آج کے جیسا ماحول نہ تھا پھر بھی مولانا اسلم جیراج پوری کا خیال تسلیم کر لیا جاتا تو کیا وہ یہ اعتراض نہ کر سکتے تھے کہ اس کتاب کا نام ترجمہ وتشریح کلام شعرائے فارسی ہونا چاہئے تھا۔

[۴] ان کا یہ اعتراض کہ محض چند کتابوں کی بنیاد پر یہ کتاب لکھی گئی، اس کے ان تمام مصادر کا جو امریکہ وغیرہ میں چھپے ہیں، ان سے استفادہ نہیں کیا گیا۔ ممکن ہے صحیح ہو، مگر یہ تو ان کا کمال ہے کہ محدود مصادر سے اس قدر اہم اور لاثانی کتاب لکھ دی اور پھر مولانا اسلم جیراج پوری

کو کس طرح معلوم ہوا کہ شعرالعجم چند کتابوں سے تیار کی گئی ہے۔ غالبًا شعرالعجم کے حوالوں سے انہوں نے اندازہ لگایا ہوگا۔ بات در اصل یہ ہے کہ اشعار کی تشریح وتوضیح میں وہ کیا حوالے دیتے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے جو انہوں نے مولانا شروانی کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ ''فارسی پر درحقیقت مجھے تو اب عالم خیال سے کام لینا پڑے گا۔ کیوں کہ فارسی کا ایک دیوان بھی میرے پاس نہیں جو کچھ ہے صرف دماغ میں ہے۔[مکاتیب شبلی ج ا ص ۱۱۸]

اسی طرح مولانا کا یہ اعتراض کہ اس میں تاریخی معلومات بہت کم ہیں اور جو کچھ ہیں وہ بازاری گپیں ہیں، حقائق پر مبنی نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تاریخی نکتے شعرالعجم کا وصف خاص ہیں۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال جنہوں نے پروفیسر براؤن کو شعرالعجم پیش کی تھی اور انہیں پڑھ کر سنایا تھا۔ (۲۸) اپنے ایک مفصل مقالے میں شعرالعجم کے حوالے سے علامہ شبلی کی ان تین خصوصیات کا ذکر کیا ہے جس کی وجہ سے وہ شعرالعجم لکھنے میں کامیاب ہوئے اور جو شعرالعجم کے مصنف کے لئے ضروری تھیں۔ وہ خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ تاریخ دانی

۲۔ عربی دانی

۳۔ شعروسخن کا مذاق

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے شبلی کی ان تینوں خصوصیتیں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ دلائل دیئے ہیں اور شعرالعجم سے اقتباسات پیش کئے ہیں۔(۲۹) وہ لکھتے ہیں:

> ''شبلی نے جس غائر نظر سے تاریخ اور بالخصوص تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے اس کو بیان کرنے کے لئے ایک الگ مقالہ درکار ہے۔ شعرالعجم سے میں بہت سی مثالیں اس بات کی دلیل میں پیش کرسکتا ہوں کہ شبلی نے اپنی تاریخ دانی کی وجہ سے فارسی شاعری کی خصوصیات اور ان کے اسباب کو کس قدر صحیح طور پر سمجھا۔''(۳۰)

اس کے بعد انہوں نے اس کی متعدد مثالیں دی ہیں۔ اب اس کو کیا کہا جائے کہ شبلی کے جس وصف کے ڈاکٹر اقبال مداح ہیں، مولانا اسلم جیراج پوری اسی کے منکر ہیں۔ حقیقت یہ

ہے کہ شعرالعجم کی تصنیف سے بہت پہلے شبلی کے مورخانہ شعور کی داد سرسید احمد خاں (ف ۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء) جیسے بالغ نظر دانشور دے چکے تھے۔ دراصل مولانا اسلم جیراج پوری کوشبلی کی کوئی ادا نہیں بھاتی اور ان کے ہر کام میں انہیں عیب نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے نزدیک الفاروق بھی قابل اعتناء نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں کے نہ صرف مذہبی بلکہ علمی و تحقیقی نظریات میں بھی بعدالمشرقین ہے۔ اس کی سب سے واضح مثال علامہ شبلی کی تصنیف الانتقاد کے سلسلے کی ہے۔ الانتقاد مشہور عیسائی مورخ جرجی زیدان کی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی کے زہر کا تریاق ہے۔ مولانا اسلم جیراج پوری نے اس زہر کا اردو میں ترجمہ کیا اور لکھا کہ یہ مسلمانوں پر ایک عیسائی مورخ کا اتنا بڑا احسان ہے کہ اس کا قرض ادا نہیں کیا جا سکتا۔ (۳۱)

البتہ مولانا اسلم جیراج پوری کے اس اعتراض میں کہ شبلی نے کسی کا شعر کسی کے نام منسوب کر دیا ہے کسی قدر سچائی ضرور ہے۔ مولانا سے یہ تسامح ایک دو مقام پر ہوا ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا انہوں نے ایسا قصداً کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ تسامح ان سے رودکی کے ذکر میں ہوا۔ جس کا وہ دیوان جو شبلی کے پیش نظر تھا اس میں الحاقی کلام بھی تھا اور جس کا شبلی جیسا سخن فہم بھی ادراک نہ کر سکا۔

[۵] یہ اعتراض کہ شبلی فارسی کے ذوق شناس نہیں تھے۔ شعرالعجم کے مصنف کے بارے میں مولانا اسلم جیراج پوری کے اس خیال کو ایک مضحکہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ اس سلسلے میں مولانا حالی (۱۸۳۷۔۱۹۱۴ء) کا ذکر بھی بے محل ہے۔ مولانا حالی کو اگرچہ بہت سے امور میں شبلی پر تقدم حاصل ہے تاہم خاص فارسی شعر و ادب کے مذاق میں وہ شبلی کے ہم پلہ نہیں۔ اس اعتراض کے ضمن میں مولانا اسلم جیراج پوری نے شبلی کے رد میں جو دلیل دی ہے اور جس کے تجزیے میں انہوں نے پورا زور صرف کیا ہے۔ اس کے بارے میں ہمارے عہد کے نقاد ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ:

> ''یہاں مصنف شعرالعجم پر تنقید درست نہیں معلوم ہوتی۔ دراصل ناقد نے پہلے دونوں مصرعوں کی معنویت اور کیفیت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ چاروں مصرعوں کو ایک ساتھ دیکھا جائے تو مولانا شبلی کا بیان کردہ مفہوم راجح اور ناقد کی شرح

مرجوح نظر آتی ہے۔‘‘(۳۲)

[۶] مولانا شبلی کو مروجہ تصوف سے مناسبت نہیں تھی لیکن یہ کہ وہ تصوف سے سرے سے نا آشنا تھے جس کی وجہ سے شعرالعجم بے نمک اور بے جان ہوگئی حقائق کے خلاف ہے۔تصوف اور اس کے رموز و آداب اور شاعری پر اس کے اثرات کے وہ بڑے واقف کار تھے۔شعرالعجم میں متعدد مقامات پر اس کی صاف جھلک دکھائی دیتی ہے اور اگر وہ عجلت سے کام نہ لیتے اور شعرالعجم کے دوسرے حصے ملاحظہ کر لیتے جس میں صوفیانہ شاعری پر عالمانہ تبصرہ ہے تو ان کا یہ غلط نظریہ قائم ہی نہیں ہوتا۔تصوف کے اثرات کے تجزیہ پر مبنی ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

’’صوفیانہ انداز چونکہ بہت مقبول ہوا اس لئے تمام شعراء اسی انداز میں کہنے لگے۔عرفی،نظیری، طالب، محتشم، شفائی سب یہ بولی بولتے ہیں لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ نری نقالی ہے۔پھول ہیں خوشبو نہیں، شراب ہے لیکن نشہ نہیں حسن ہے لیکن دلفریبی نہیں، قالب ہے لیکن روح نہیں، بخلاف اس کے مولانا روم، سنائی اوحدی، سلطان ابوسعید کا لفظ لفظ بتاتا ہے کہ کہاں سے نکلا ہے:

گو یند ہر آں کہ یافت خامش گردد
نے نے غلط است آں کہ باید گوید (۳۳)

[۷] مولانا اسلم جیراج پوری کا یہ اعتراض کہ انہوں نے بزرگان اسلام کا احترام نہیں کیا کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ جس شخص نے اپنی پوری زندگی بزرگان اسلام کی عظمتوں کے نقوش ابھارنے میں گذاری ہو اور جس کی بدولت ہندوستان میں مغرب سے مرعوبیت میں کمی آئی ہو، اس پر یہ الزام وارد کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ مولانا نے اپنے دعوے کے ثبوت میں شبلی کا جو اقتباس نقل کیا ہے، وہ خود ان کی تردید کے لیے کافی ہے۔دراصل وہ اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے۔وہ اقتباس یہ ہے:

’’فارسی میں خیام دور جام کا ستم زدہ ہے۔وہ جس شغف، جس شوق، جس بےخودی، جس بے اختیاری جوش سے شراب کا نام لیتا ہے اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ درحقیقت شراب پیتا تھا۔افسوس ہے کہ فلسفی اور حکیم تھا،

صوفی نہ تھا، ورنہ حافظ کی طرح یہی شراب، شراب معرفت بن جاتی۔''

اس اقتباس کے بارے میں مولانا اسلم جیراج پوری نے لکھا ہے کہ ''مولانا کا مطلب یہ ہے کہ خواجہ حافظ بھی شراب ظاہری پیتے تھے۔ لیکن یہ وجہ کہ وہ صوفی تھے یاروں نے اس کو شراب معرفت بنالیا۔'' اب آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ علامہ شبلی نے کیا لکھا اور مولانا نے اسے کیا سمجھا اور نہ صرف سمجھا بلکہ اس کی بنیاد پر طرح طرح کے قیاسات کر ڈالے۔

اسی میں انہوں نے محمود وایاز کے عشق اور ان کے وجود کو فرضی قرار دے کر شبلی کو مطعون کیا ہے۔ عشق کی داستان گو غلط ہو لیکن ایاز کا وجود تو تھا۔ علامہ شبلی نے اس وقت جو کچھ لکھا تھا جدید تحقیقات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ:

> ''جدید تحقیقات کی روشنی میں ثابت ہو چکا ہے کہ ایاز کوئی افسانوی نام نہیں بلکہ اہم تاریخی شخصیت تھی۔ اسی طرح محمود کا ایاز کی طرف رجحان ومیلان بھی تاریخی حقائق ومسلمات میں ہے۔ زلف ایاز کا ذکر بھی معاصر شاعر عنصری کے بعض قصائد میں موجود ہے۔'' (۳۴)

[۸] ان کا آخری اعتراض تمام اعتراضات پر بھاری ہے۔ اس میں انہوں نے علامہ شبلی کو جوش وجذبے کا متوالا اور سراسر غلط بیانی کرنے والا بتایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ عیب ان کی تمام تصانیف میں پایا جاتا ہے اور شعر العجم میں اس کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں۔

ان کے اس اعتراض کو شبلی دشمنی کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔ غرض مولانا اسلم جیراج پوری نے شعر العجم کی ابتدائی دوجلدوں کا مطالعہ کیا اور اپنے اعتراضات وارد کئے۔ البتہ ان اعتراضات کی حقیقت کی وضاحت کے بعد ان کی نقادانہ بصیرت کا جائزہ لیا جائے تو درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

ان کے بیشتر اعتراضات اصلاً اعتراض برائے اعتراض ہیں۔ جس میں ان کا رویہ تنقید کے بجائے تنقیص پر مبنی ہے۔ ان کا علم ومطالعہ بالخصوص فارسی شعر وادب کا ذوق پختہ نہ تھا۔ فکری لحاظ سے بھی وہ شبلی کے مرتبے کے نہ تھے۔ ایک نقاد کو جن خوبیوں سے آراستہ ہونا چاہئے وہ بھی ان کے اندر نہ تھیں۔ مثلاً ایک نقاد کا مرتبہ محض یہ نہیں ہے کہ وہ نقائص ہی بیان کرے۔ مولانا اسلم

جیراج پوری نے صرف نقائص بیان کئے ہیں۔انہیں شعرالعجم میں ایک بھی خوبی نظر نہیں آئی، جس کا ذکر وہ مستقلاً نہ سہی ضمناً ہی کر دیتے۔ اپنے موقف میں انہوں نے شعرالعجم سے جو اقتباسات نقل کیے ہیں، اس میں ایمان داری نہیں برتی۔شبلی کے خیالات کے سمجھنے میں بھی غلطی کی، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے۔ مجموعی طور سے وہ ان تنقیدی اصولوں سے نا آشنا تھے جن کی بنیاد پر نقد و جرح کی جاتی ہے۔ البتہ فارسی شعراء اوران کے کلام پر ان کی گہری نظر تھی دوسرے شعراء کے نام شبلی نے جو اشعار غلطی سے منسوب کئے ہیں ان کی نشاندہی دراصل ان کے اسی ذوق کا نتیجہ ہے۔

مولانا اسلم جیراج پوری کے اعتراضات کے جوابات مہدی افادی نے بڑے سخت لب ولہجہ میں دئے اورانہیں نقش بر آب قرار دیا اور لکھا کہ یہ قصور مولانا کا نہیں بلکہ ان کی استعداد کا ہے۔(۳۵)

تنقیدی نقطہ نظر سے جس طرح مولانا اسلم جیراج پوری کا نقطہ نظر درست نہیں اسی طرح مداح شبلی مہدی افادی کے رویے کو بھی درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ دونوں تنقیدیں تنقیص اور مناظراتی تنقید کے درمیان معلق ہیں۔ان میں افادیت کم مضرت کے عناصر کی بہتات ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی تنقید

اس دور میں شعرالعجم پر ایک اور تنقید شبلی کے شاگرد مولانا عبدالسلام ندوی [۱۸۸۳-۱۹۵۶ء] کے قلم سے نکلی اور ماہنامہ الندوہ لکھنؤ [جنوری ۱۹۱۰ء] میں شائع ہوئی۔انہوں نے فلسفہ تاریخ کی روشنی میں شعرالعجم کا جائزہ لیا ہے اوراس لحاظ سے اسے ایک معرکہ آراء کتاب قرار دیا ہےاور لکھا ہے کہ: ’’شعرالعجم کی تدوین وترتیب میں فلسفہ تاریخ کا دامن ہاتھ سے کہیں نہیں چھوٹا۔‘‘(۳۶)

البتہ انہوں نے بھی بعض تسامحات شعرالعجم کی نشاندہی کی ہے اوراس پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔(۳۷) مولانا نے تضاد بیانی کی ایک-دو مثالیں نقل کی ہیں۔اغلاط میں پہلی غلطی عمر خیام کے سنہ وفات ۵۰۳ھ کی دکھلائی ہے اوراس کی بنیاد پر نظامی عروضی کی عمر خیام سے ملاقات ۵۰۶ھ کے واقعہ کو غلط قرار دیا ہے۔حالانکہ یہ تسامح محض سہو کتابت کا نتیجہ ہے۔اصل مسودہ میں سنہ

وفات ۵۱۳ھ تھا، کاتب نے ۵۰۳ھ کر دیا ہے۔ (۳۸) مولانا عبدالسلام ندوی نے بعض ذوقی اور نظری اعتراضات بھی کئے ہیں۔ مثلاً انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''شعراء کے کلام پر جہاں ریویو کیا ہے وہاں پر شاعر کی ایک ایک خصوصیت کو نہایت تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے لیکن افسوس ہے کہ بعض جگہ اس فیاضی میں بخل کیا ہے۔ دقیقی نے ایک مسلسل غزل لکھی ہے جس کا مطلع یہ ہے:
>
> در افگند اے صنم ! ابر بہشتی
>
> زمین را خلعت اروی بہشتی
>
> اس کی بڑی داد دی ہے۔ نظامی کی غزلوں میں بھی بعض اشعار مسلسل نظر آتے ہیں اور خود علامہ موصوف نے اس کو نقل کیا ہے لیکن وہاں اس خصوصیت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔'' (۳۹)

مولانا عبدالسلام ندوی نے اس قسم کے بعض اور اعتراضات بھی کئے ہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ ''اس قسم کی اور فروگذاشتیں پائی جاتی ہیں جو کتاب کی مجموعی خوبیوں کے مقابل میں بے حقیقت ہیں۔'' (۴۰)

مولانا عبدالسلام ندوی کی تنقیدیں مولانا اسلم جیراج پوری کی طرح تنقیصی نہیں بلکہ تحسینی ہیں اور ایک شاگرد اپنے استاذ کے لئے اس سے زیادہ بہتر رویہ اختیار بھی نہیں کر سکتا۔

مولانا اسلم جیراج پوری اور مولانا عبدالسلام ندوی دونوں نے اپنے مضامین میں کتابت کی غلطیوں کا شکوہ کیا ہے۔ ان مضامین کی اشاعت کے برسوں بعد ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے اپنے مضمون میں اور شیخ محمد اکرام [۱۹۰۸-۱۹۷۳ء] نے اپنی کتاب یادگار شبلی میں بھی اس کمی کا ذکر کیا ہے۔ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ فارسی شعر و ادب کی سب سے عمدہ کتاب ہمیشہ غلط سلط چھپی اور اس کی صحیح اشاعت کی کوشش نہیں ہوئی۔ ضرورت ہے کہ دارالمصنّفین کی طرف سے اس کا محقق ایڈیشن شائع کیا جائے، جس میں تصحیح متن کے ساتھ حواشی اور اشاریوں کا بھی اہتمام ہو۔

حافظ محمود شیرانی کی تنقیدیں

شعرالعجم کے ایک بڑے نقاد پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی [ف:۱۵ر فروری ۱۹۴۶ء] ہیں۔انہوں نے ایک سلسلہ وار تنقید سہ ماہی اردو اورنگ آباد میں اکتوبر ۱۹۲۲ء سے جنوری ۱۹۲۷ء تک لکھی جو ۱۹۴۲ء میں تنقید شعرالعجم کے نام سے انجمن ترقی اردو ہند سے کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔اس کے مقدمہ میں پروفیسر شیرانی نے اپنے اعتراضات کی تفصیل اس طرح پیش کی ہے:

''شعرالعجم کے مطالعے کے بعد میری ذاتی رائے یہ قائم ہوئی ہے کہ علامہ شبلی اس تصنیف کے دوران میں مورخانہ ومحققانہ فرائض کی نگہداشت سے ایک بڑی حد تک غافل رہے۔رطب و یابس جو کچھ ان کے مطالعے میں آجاتا ہے بشرطیکہ دلچسپ ہو حوالہ قلم کر دیتے ہیں۔بعض وقت دیکھا جاتا ہے کہ مولانا اپنے پچھلے بیانات کی آگے جا کر خود تردید کر جاتے ہیں۔پہلے کچھ رائے قائم کی پھر بعد میں جا کر کوئی اور نظریہ قائم کر لیا۔ممکن ہے کہ شبلی تاریخ اسلام میں بہتر نظر رکھتے ہوں لیکن شعرائے عجم کے حالات میں ان کے طاقت ور قلم نے بہت سے لغزشیں کی ہیں۔اس خاص دائرے میں ان کی معلومات تاریخی نہایت محدود ہے اور نہ تمام سلسلہ شعراء ان کے دواوین و مآثر پر کافی عبور ہے۔سن و تاریخ جو فن تاریخ کا ایک شاندار اور وقیع پہلو ہے،اس پر اول پوری توجہ نہیں کی اور ضرورتاً کہیں ایسا کیا بھی تو غلطیوں سے خالی نہیں۔بعض متاخرین کو متقدمین کا پہلونشیں بنا دیا اور بعض متاخرین کو متقدمین کا ہم بزم کر دیا ہے۔بہت سے غیر تاریخی افسانوں نے شعرالعجم میں قابل عزت جگہ پائی ہے۔عام اغلاط جنہیں تذکرہ نگاروں نے اپنی اپنی تصنیف میں دہرا کر ہماری ادبیات میں عام طور پر زبان زد کر دیا ہے شعرالعجم کے صفحات پر بھی موجود ہیں۔ایک شاعر کے ابیات دوسرے شاعر کے نام بھی بعض اوقات درج ہوئے ہیں۔اکثر اوقات ایک مورخ یا محقق کو اپنے اجتہاد کے استعمال کی بھی ضرورت ہوتی ہے لیکن مولانا نے ضروری مواقع پر بھی

اس کے استعمال سے احتراز کیا ہے۔جب کسی واقعے کی نسبت دورائیں آ گئی ہیں شبلی اس خوش خلق حاکم کی طرح جو مدعی اور مدعا علیہ دونوں کے خوش کرنے کی بے سود کوشش میں مصروف ہے،تم بھی سچے اور تم بھی سچے کہہ کر بغیر کسی جرح وتعدیل کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ روایات بڑے بوڑھوں کی باقیات الصالحات ہیں۔ان کے متعلق ردوقدح کرنا یاان کو غلط ثابت کرنا ہماری شان کے خلاف ہے''۔(۴۱)

شیرانی صاحب نے ٦۱۰ صفحوں کی اس کتاب میں اپنے مذکورہ بالا خیالات کی وضاحت وتفصیل پیش کی ہے اوراس کی متعدد مثالیں نقل کی ہیں۔بعض شعراء مثلاً رودکی، دقیقی، انوری وغیرہ کے حالات بھی انہوں نے نو دریافت مصادر سے بڑے تفحص سے لکھے ہیں۔گویا علامہ شبلی ان کے صحیح تذکرے لکھنے سے قاصر رہے۔شیرانی صاحب کی ضخیم کتاب شعرالعجم کے پہلے اور کسی قدر دوسرے حصے کے جائزے پر مشتمل ہے۔ان کی اس تنقید سے متاثر ہوکر پنجاب یونیورسٹی نے جس کے وہ خود پروفیسر تھے،شعرالعجم کو نصاب سے خارج کردیا۔(۴۲)اس لئے انہوں نے تنقید کا یہ سلسلہ ختم کردیا،گویاان کا بنیادی مقصد تنقید پورا ہوگیا۔لیکن یہ حقائق پر مبنی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شیرانی صاحب کا قلم اس مقام پر جاکر رک گیا، جہاں تک انہیں خود شعرالعجم کے مصنف نے راہ دکھلائی تھی۔مثلاً مولانا شبلی نے جلداول کے خاتمہ پر''چند ضروری باتیں'' کے عنوان سے شعرالعجم کی چند کمیوں کی نشاندہی کی تھی اور لکھا تھا کہ:

''پہلے حصے کی تدقیق اور محنت میں کچھ کمی نہیں کی گئی لیکن مجھ کو صاف کہنا چاہئے کہ یہ حصہ اور تمام حصوں کی بہ نسبت کم دلچسپ ہے۔جس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم شعراء کے حالات کم ملتے ہیں،مجبوراً چھوٹی چھوٹی باتوں کو لیکر پھیلانا پڑا۔...... چونکہ کتابوں کے تفحص اور تلاش کا سلسلہ اب تک جاری ہے اور بعض بعض نادر کتابیں اس حصہ کی تالیف کے بعد ہاتھ آئیں، اس لئے وہ معلومات جو ان کتابوں سے ہاتھ آئے،اب چوتھے حصے کے کام آئیں گے''۔(۴۳)

گویا شعرالعجم کی تصنیفی کمیوں اوراس کا مواد دونوں کی نشاندہی خود علامہ شبلی نے کی۔

پروفیسر شیرانی نے اسی سے کام لیا اور اس سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

اسی طرح ان کا یہ اعتراض کہ شبلی نے ایک ہی واقعہ ایک جگہ کسی اور سے منسوب کیا تو وہی واقعہ دوسرے مقام پر کسی اور کے نام کر دیا۔ دراصل ان کے اخاذ ذہن کی رسائی نہیں بلکہ ایک اور شخص سید احمد مرتضیٰ نظر کی نظر کا کمال تھا۔ انھوں نے علامہ شبلی کو خط لکھ کر اس کی جانب متوجہ کیا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اس کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا کہ رباعی درج کرنے میں غلطی ہوگئی، اس لیے کہ دولت شاہ اور چہار مقالہ میں اختلاف تھا اور غلطی سے ایک جگہ ایک کی اور دوسری جگہ دوسرے کی روایت لے لی۔ (۴۴)

شیرانی صاحب جس وقت (۱۹۲۲ء) شعرالعجم پر تنقید لکھ رہے تھے، سید احمد مرتضیٰ نظر کے نام علامہ شبلی کا مذکورہ خط مکاتیب شبلی حصہ اول [مطبوعہ ۱۹۱۶ء] میں شائع ہو چکا تھا۔ یہاں یہ خیال بھی نہیں آ سکتا کہ شیرانی صاحب کی نظر سے یہ خط نہ گذرا ہو۔

شیرانی کے دیگر اعتراضات بظاہر طاقت ور اور مبنی بر حقیقت معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ نہ صرف خلاف واقعہ ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے متعدد دعوے درست نہیں۔

البتہ شعرالعجم میں تاریخ و سنہ کے بعض اغلاط ضرور راہ پا گئے ہیں، لیکن ان میں بھی قصور علامہ شبلی کا نہیں، بلکہ ان تذکرہ نگاروں کا ہے جن پر شبلی نے اعتماد کیا اور ان کے حوالہ سے حالات و واقعات لکھے۔ اس نقطہ نظر سے شعرالعجم کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''پہلی چیز البتہ لائق توجہ ہے۔ لیکن اس میں بھی زیادہ تر نام، سنہ ولادت و وفات اور وطن وغیرہ کے جزوی اختلافات ہیں جو دراصل، اصل مآخذ کے ہیں۔ اگر شعرالعجم کے بیانات سب تذکروں کے خلاف ہوتے تو البتہ یہ کتاب کی خامی ہوتی، یہ اختلافات اصل ماخذوں کے ہیں، اس لئے ناقد کی یہ تنقید دراصل شعرالعجم کی تنقید نہیں بلکہ اصل فارسی تذکروں کی تنقید ہے۔ پھر بہت سے قدیم و نایاب تذکرے شعرالعجم کی اشاعت کے بعد شائع ہوئے۔ اگر یہ شبلی کے پیش نظر ہوتے تو شیرانی صاحب کو اتنی خوردہ گیری کا موقع نہیں ملتا۔

علامہ شبلی نے محدود ماخذوں سے جتنا موادفراہم کردیا ہے، وہ دوسروں کے بس
کی بات نہیں''۔(۴۵)

حافظ محمود خاں شیرانی اور حافظ اسلم جیراج پوری کے کئی اعتراضات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔شیرانی صاحب کے بعض خیالات کی بنیاد ممکن ہے مولانا اسلم جیراج پوری کی تنقید پر ہو،مگر اپنی کتاب میں انہوں نے ان کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔اشعار کے غلط انتساب کی بحث دونوں نے اٹھائی ہے۔مولانا اسلم جیراج پوری نے اس کی کوئی مثال نہیں پیش کی ہے۔البتہ شیرانی صاحب نے چونکہ ۱۲-۱۴ سال بعد یہ بحث اٹھائی اس لئے انہوں نے قطران تبریزی کے اشعار رودکی کی طرف منسوب کرنے کی نشاندہی کی ہے،لیکن اس کی حقیقت ڈاکٹر نذیر احمد[ف:۲۰۰۹ء] کے الفاظ میں یہ ہے:

''مولانا شبلی کے وقت میں رودکی اور قطران تبریزی کے دیوان نامشخص تھے،جو شیرانی کے زمانہ میں الگ الگ ہوئے۔پس اگر شبلی کے یہاں قطران کے کچھ اشعار رودکی کی طرف منسوب ہوں اور رودکی کے قطران کے نام سے ملیں تو یہ قدرتی امر تھا۔اس میں شبلی کا کوئی قصور نہ تھا۔شیرانی کی تحریروں میں اسدی خرد و بزرگ کے نظریہ کی جھلک ملتی ہے۔''(۴٦)

بات دراصل یہ ہے کہ علامہ شبلی کے عہد میں مصادر شعرالعجم کمیاب تھے۔البتہ جن مصادر تک شبلی کی رسائی ہوئی،ان سے بھرپور استفادہ کیا۔رطب ویابس سے احتراز کیا اور صحیح واقعات درج کئے۔بعد کی جدید تحقیقات سے کوئی سنہ یا تاریخ ولادت ووفات یا کوئی واقعہ غلط ثابت ہو جائے تو یہ شبلی کی کم مائیگی نہیں،مصادر کی کم مائیگی ہے۔پروفیسر شیخ محمد اقبال نے صحیح لکھا ہے کہ:

''ہمیں اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ شعرالعجم ایسے زمانے میں لکھی گئی جب کہ ہندوستان میں کتابوں کی بڑی نایابی تھی۔کتب خانے اس کثرت کے ساتھ موجود نہ تھے جتنے کہ اب ہیں۔ان حالات میں اس کی تصنیف بہت بڑا قابل داد کارنامہ ہے۔مصنف کے پیش نظر صرف چند شعراء کے تذکرے تھے یا

ہندوستانی مطبعوں کے غلط سلط چھپے ہوئے فارسی دیوان۔'' (۴۷)

شیرانی صاحب کی بیشتر تنقید اسی قسم کی ہے اور خود ان کی تنقید میں بھی اسی طرح کی کمیاں پائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی نے ان کی اس قسم کی فروگذاشتوں کی نشاندہی کی ہے۔ ملاحظہ ہو ''شبلی ایک دبستان'' ص ۱۴۴، ۱۵۰ وغیرہ۔

شعرالعجم کی بنیادی طور پر تین حیثیتیں ہیں۔ تذکرہ، تحقیق وتنقید اور اثرات شاعری۔ مجموعی طور سے شعرالعجم میں ان تینوں حیثیتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ پانچ جلدوں اور چودہ سو صفحات پر مشتمل اس مفصل کتاب میں اگر دو ایک مقامات پر شعراء کے تذکروں میں جدید تحقیقات کی بنیاد پر بعض اندراجات غلط ثابت ہو جائیں تو یہ انسانی فطرت کا تقاضا بھی ہے اور قدیم مصادر کی کمی بھی۔ علامہ شبلی نے کتاب کی تالیف سے پہلے ہی ایک خط میں واضح کیا تھا کہ شعراء کے حالات اور دواوین کمیاب ہیں اور ان کے لکھنے کے لئے عالم خیال سے کام لینا پڑے گا۔ دراصل شبلی کا دور اس موضوع پر مصادر کی کمی کے لحاظ سے عالم خیال ہی کا دور تھا۔ جدید مطبوعات و تحقیقات اور بعد کے دستیاب مصادر کی بنیاد پر عالم خیال کی کاوش کو عالم حقیقت سے مقابلہ وموازنہ دراصل غلط رویہ ہے۔ شیرانی صاحب اسی غلط رویے کی وجہ سے شعرالعجم اور شبلی پر حرف گیری کے مرتکب ہوئے۔

شعرائے فارسی کے حالات اور شاعری کے سلسلے میں جہاں تک ممکن تھا شبلی نے تحقیق و تدقیق سے بھی کام لیا اور ان واقعات کو اپنی کتاب میں درج کیا جنہیں وہ صحیح خیال کرتے تھے۔ البتہ موجودہ دور بلکہ شیرانی کے دور کے مذاق کے مطابق ہر مقام پر اپنی تحقیقات اور اس کے دیگر پہلوؤں کی وضاحت نہیں کی اور نہ وہ ان کے دور کا مذاق تحقیق وتنقید تھا۔ شبلی کا یہ اسلوب ان کی دوسری اہم کتابوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً المامون، سیرۃ النعمان، اور الفاروق میں بھی وہ یہ بحث نہیں کرتے کہ فلاں واقعہ کیوں قبول کیا گیا اور فلاں واقعہ کیوں کر نا قابل قبول ٹھہرا وغیرہ۔ لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں، جہاں وہ مناسب خیال کرتے ہیں اس کی وضاحت بھی کر دیتے ہیں۔

تنقیدی لحاظ سے شعرالعجم کا کوئی جواب نہیں۔ علامہ شبلی نے تنقید کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں شعراء کے کلام کا جائزہ لیا ہے اور ان کے حسن وقبح سے بحث کی ہے۔ شعرالعجم نہ

صرف نظریاتی اور عملی تنقید کا ایک مثالی نمونہ ہے بلکہ ان کے پہلو بہ پہلو جمالیاتی تنقید کے عناصر بھی جلوہ گر ہیں۔خاص طور سے اشعار کی تشریح اور ان کے ترجموں میں جو جمالیاتی حسن ہے، وہ اس دور کے کسی نقاد کے یہاں نہیں پایا جاتا۔اس میں شبلی نہ صرف اشعار کی نزاکت، لطافت اور باریکیوں کو ہو بہو واضح کر دیتے ہیں بلکہ ان الفاظ سے کرتے ہیں جو جمالیات کے وسیع کینوس کا حصہ ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں ان کی تشریحات اثر انگیزی کے لحاظ سے اصل شعر سے بڑھ گئی ہیں۔

علامہ شبلی نے فارسی شاعری کا جس قدر خوب صورت انتخاب شعرالعجم کی جلدوں میں مختلف فنی مباحث کے ضمن میں کر دیا ہے، وہ آج تک کسی اور سے نہ ہو سکا۔انہوں نے بطور نمونہ و شہادت سیکڑوں اشعار نقل کئے ہیں۔اب اگر ان ہزاروں اشعار میں کہیں ایک دو شعر دوسروں کے سہواً نقل ہوں تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔اس کی نشاندہی ایک محقق کا فرض ہے۔تاہم اگر وہ محقق اسے غلط بیانی سے تعبیر کرے تو یہ اس کے درجے یعنی نقاد کے مرتبے کے منافی ہے۔سہو اور غلط بیانی میں بڑا فرق ہے۔شیرانی صاحب اس فرق کو ملحوظ نہ رکھ سکے اور شبلی پر یہ الزام عائد کر دیا کہ وہ تحقیق و تدوین سے غافل رہے۔عجیب بات یہ ہے کہ شیرانی صاحب کا مقصد محض تنقید شعرالعجم تھا، اس کے باوجود خود انہوں نے کئی مقامات پر ٹھوکر کھائی۔ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے اپنے تحقیقی مقالے میں لکھا ہے کہ

> ''غلط بیانی، جہالت وعصبیت اور تدلیس وتلبیس کے الزامات قطعاً بے بنیاد اور غلط فہمی کا نتیجہ ہیں۔اور ان کی کوئی ایک مثال بھی شعرالعجم سے پیش نہیں کی جا سکتی مثال کے طور پر رودکی کے حالات کے ضمن میں رشید سمرقندی کے شعر کے ترجمے کے سلسلے میں حافظ صاحب نے شبلی پر غلط بیانی کا الزام لگایا ہے حالانکہ ان کا ترجمہ بالکل صحیح ہے۔اسی طرح براؤن کی تاریخ ادبیات ایران کو شعرالعجم کی فہرست مآخذ میں مندرج نہ پا کر شیرانی صاحب نے شبلی پر عصبیت کا الزام عائد کیا ہے حالانکہ مآخذ کے خاتمے پر متن میں خصوصیت کے ساتھ اس کا تذکرہ موجود ہے۔یہی حال تدلیس وتلبیس کا ہے اس کی بھی کوئی حقیقی مثال شعرالعجم

سے فراہم نہیں کی جاسکی۔'' [شبلی کی علمی وادبی خدمات ص ۲۷۶]

شعرالعجم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ واقعات کی کھتونی نہیں بلکہ صحیفہ حسن وعشق ہے اور اس صحیفے کے فہم وادراک کے لئے ذوق سلیم کا ہونا ضروری ہے اور بلاشبہ علامہ شبلی اپنے عہد کے فارسی شعروادب کے ممتاز ترین ذوق شناس تھے۔ فارسی شاعری اور ایرانی تہذیب وتمدن کی مرقع آرائی، فارسی شعراء کے کلام سے انہوں نے جس طرح کی ہے وہ انہیں کے بس کی بات تھی۔ شیرانی صاحب نے بڑی تحقیق سے رودکی، دقیقی، انوری، نظامی اور عطار کے حالات اور ان کے متعلق معلومات فراہم کئے، تاہم کون ہے جو ان کے ذوق سلیم کا مداح ہوگا۔

شیرانی صاحب کے بعض اعتراضات درست ہیں، البتہ ان کا نقطہ نظر درست نہیں۔ یہ تنقید کے میدان میں تعمیری سے زیادہ تخریبی طرز عمل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تنقید شعرالعجم کو وہ مقبولیت نہیں ملی جو شعرالعجم کے حصہ میں آئی۔ مولانا ماہرالقادری [ف: ۱۲رمئی ۱۹۷۸ء] نے صحیح لکھا ہے کہ:

> ''والہ داغستانی کا سال ولادت کسی کو غلط یاد ہو، منوچہری کے باپ کا نام اسے پتہ نہ ہو، قزل ارسلان کے کسی جنگی کارنامے کی تفصیل اسے ٹھیک طرح یاد نہ ہو، مگر اس کا ذوق شعری صحت مند ہو اور شعر کو پرکھنا جانتا ہو، شبلی شعرالعجم کے ذریعہ ایسے ہی ذوق صحیح کو پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لحاظ سے ان کی یہ کتاب کامیاب ہے۔'' (۴۸)

محمود شیرانی نے تنقید کے زعم میں کئی مقامات پر شبلی کی تنقیص وتعریض کی ہے۔ دراصل وہ شبلی کے عظمت شناس نہ تھے۔ تنقید شعرالعجم پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سعید احمد اکبرآبادی (ف: ۲۴رمئی ۱۹۸۵ء) نے لکھا کہ:

> ''اس موقع پر ہم اس افسوس کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پروفیسر شیرانی کا قلم کئی جگہ غیر محتاط ہو گیا ہے اور انہوں نے مولانا شبلی کی نسبت ایسے طنزیہ فقرے لکھ دئے ہیں جو اس سنجیدہ اور علمی تنقید کی پیشانی پر بدنما داغ معلوم ہوتے ہیں۔ انجمن کا فرض تھا کہ تنقید کو کتاب کی شکل میں شائع کرتے وقت ان فقروں اور جملوں کو جن سے یک گونہ ذاتی پرخاش کی بو آتی تھی حذف کر

دیتی۔''(۴۹)

اس اظہار افسوس کہ بعد مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے تنقیدی حیثیت سے اس کا تجزیہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''بعض جگہ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ شیرانی صاحب خواہ مخواہ ہی مولانا شبلی کے سر ہو گئے ہیں اور ان پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ مثلاً مولانا شبلی نے عام روایات [جن کا اقرار خود شیرانی صاحب کو بھی ہے۔] کے تتبع میں سلطان سنجر کا انوری کے گھر آنے کا قصہ لکھا ہے۔ شیرانی صاحب سنجر اور انوری کے تعلقات کی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے اس کو بعید از قیاس قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے نزدیک صحیح بیان مولانا شبلی کا ہی ہے۔ چنانچہ اشعار ذیل سے اس کا ثبوت ملتا ہے:

نزولت رابنز د من مثل دانی چہ می آرم
نزول مصطفیٰ نزدیک بو ایوب انصاری
ترا لطف تو داعی بود گر نہ کس روا دارد
کہ رخت کبریا ہر گز بچوناں کلبہ آری

پروفیسر صاحب نے اس قصیدہ کے صرف شروع کے دوشعر لکھے ہیں اور انداز خطاب سے قیاس کیا ہے کہ انوری کے ہاں سنجر نہیں بلکہ کوئی وزیر آیا تھا۔ حالانکہ ''مجیر دولت ودیں'' وزیر کی طرح بادشاہ کو بھی کہا جاتا ہے۔''(۵۰)

پھر عام اعتراضات کے جواب میں شبلی اور شعرالعجم کی عظمت کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

''یہ تنقید مولانا شبلی کی فضیلت علمی کو کسی طرح کم نہیں کرتی ہے۔ مولانا کا اصل شاہ کار شعرالعجم کا چوتھا اور پانچواں حصہ ہے، جس میں انہوں نے فارسی شاعری کے تمام اصناف پر نہایت محققانہ اور بلند پایہ تبصرہ کیا ہے اور جس سے مولانا کی جامعیت، دقت نظر، بلندی ذوق، فارسی زبان کے مذاق صحیح اور قوت بیان وانشا

پردازی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک مولانا کا اصل جوہر یہی ہے۔ان کا اصل مقصد تذکرۃ الشعراء لکھنا نہیں تھا۔تنقید کی علمی عظمت و افادیت کا اعتراف ہر شخص کے لئے ناگریز ہے لیکن یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ شبلی علم وادب کے جن جن میدانوں میں سے ایک شہسوار کی طرح فاتحانہ انداز میں گذر جاتے ہیں، ان میں سے بہتیرے میدان ہیں کہ شیرانی ان میں قدم بھی نہیں رکھ سکتے۔''(۵۱)

شیرانی صاحب علامہ شبلی کے تاریخی شعور کے بھی قائل نہیں ہیں۔(۵۲) جبکہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ان کی اسی تاریخی خوبی کے مداح ہیں۔(۵۳)، یہ وہی ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ہیں جن کا عمر خیام پر ایک مضمون تنقید شعر العجم میں شامل ہے جس کو شیرانی صاحب نے اپنا ہم خیال سمجھ کر شامل کتاب کیا ہے، حالانکہ ڈاکٹر صاحب اس مضمون سے مطمئن نہ تھے اور اس کی تنقید شعر العجم میں شمولیت کے بھی خلاف تھے۔ باوجود اس کے شیرانی صاحب نے اسے شامل کیا۔(۵۴) حیرت ہے کہ شیرانی صاحب شبلی کے اس فضل وکمال کے بھی منکر ہو جاتے ہیں جس کا سارا زمانہ معترف ہے۔واقعہ یہ ہے کہ شعر العجم کی تصنیف سے پہلے ہی انہیں ملک میں تاریخ کا معلم اول قرار دیا جا چکا تھا۔(۵۵) شبلی، شعر العجم، شیرانی اور تنقید شعر العجم کا بڑا عمدہ تجزیہ پروفیسر سید امیر حسن عابدی نے کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی اور حافظ صاحب دونوں الگ الگ میدانوں کے شہسوار ہیں۔علامہ تنقید کے بادشاہ اور ہیرو پرست ہیں۔جب کسی کو وہ ہیرو بنا لیتے ہیں تو اس کے لئے بڑی شان وشوکت کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔علامہ اس قسم کے محقق نہ تھے اور نہ انہیں فرصت تھی کہ لوگوں کا زائچہ دیکھتے اور ان کی ولادت ووفات کا صحیح پتہ لگاتے، نیز اپنے ممدوحین کے نام ونسب وغیرہ کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے اور نہ وہ اس کے لئے پیدا ہوئے تھے۔وہ تو شعر وادب کے پرکھنے والے نقاد تھے۔ نیز انہوں نے فارسی شاعری پر جو کچھ لکھ دیا وہ آج بھی حرف آخر ہے۔............
ہم ان کے یہاں یہ نہیں دیکھتے کہ انہوں نے کیا لکھا ہے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ

کیسے لکھا ہے۔ وہ ایک زبردست انشا پرداز تھے، نیز ان کی تحریریں خود اپنی جگہ پر مستقل تخلیقی کارنامے ہیں۔

برخلاف اس کے حافظ صاحب تحقیق کے مرد میداں ہیں مگر ان کا دائرہ محدود ہے۔ انہوں نے فارسی ادب کی تحقیق کے متعلق جو کام کیا ہے وہ ہمارے لئے شمع راہ ہے مگر اسے حرف آخر نہیں کہا جا سکتا۔''(۵۶)

مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۲۔۱۹۷۷ء) کا خیال تھا کہ شعر العجم میں فن شعر کے متعلق بلا حوالہ بہت کچھ وہی درج ہوا ہے جو مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا تھا۔ (۵۷) مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کے جواب میں لکھا کہ:

''شعر العجم اور مقدمہ حالی کا توارد اس لئے تعجب انگیز نہیں کہ دونوں ایک ہی سر چشمہ سے ہیں۔ علوم وفلسفات کی بحث میں توارد تعجب انگیز نہیں بلکہ ان کی صحت کی دلیل ہے۔ ارسطو نے شاعری پر جو کچھ لکھا ہے وہ دونوں کے لئے دلیل راہ ہے۔''(۵۸)

شیخ محمد اکرام نے اس بحث کو طول دیا ہے اور سید سلیمان ندوی کے نقطہ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے شبلی کے مقدمہ شعروشاعری (۱۸۹۳ء) سے استفادہ کی بحث اٹھائی ہے اور لکھا ہے کہ:

''ہمارے اپنے مطالعے سے شعر العجم کی طویل بحث میں شعروشاعری سے جتنا استفادہ ظاہر ہوتا ہے، اس سے زیادہ حالی اور شبلی کے نقطہ نظر کا اختلاف۔ حالی کی نقادانہ اور حکیمانہ برتری اور شبلی کی جمالیاتی اور فن کارانہ فوقیت نظر کے سامنے آجاتی ہے۔''(۵۹)

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ نظریاتی طور پر شبلی حالی سے آگے نہ بڑھ سکے بلکہ پیچھے ہٹے ہیں۔ (۶۰) نظریہ شعروادب پر بحث وتنقید میں بلاشبہ حالی کو فضیلت حاصل ہے۔ شعر العجم بہر حال بعد میں لکھی گئی۔ تاہم جدید تحقیقات اور نظریات سے جس قدر شبلی واقف ہوئے حالی کو اس کے مواقع میسر نہیں ہوئے۔ اس لئے تقدم کی کمیاں اور متاخر کی برتری بھی دکھلائی جا سکتی ہے اور بلاشبہ ایسی بحثیں

شعرالعجم میں ہیں جو مقدمہ شعروشاعری میں نہیں ہیں۔ دراصل شعرالعجم کی تالیف میں وہ مقاصد شامل ہی نہیں تھے جو حالی کے مقدمہ میں پیش نظر رہے۔ اس لئے توارد کے باوجود یہ بحث بے محل ہے۔ البتہ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ شبلی عملی تنقید کے میدان میں حالی سے کوسوں آگے ہیں۔ ارتقائی لحاظ سے دیکھا جائے تو شیخ محمد اکرام کا یہ خیال کہ شبلی حالی سے پیچھے ہٹے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ حالی کا دور نظریاتی تھا، جبکہ شبلی کے سامنے نظریاتی توضیح وتصریح کے ساتھ عملی تنقید کے چیلنج تھے۔ جسے انہوں نے بخوبی برتا اور ثابت کر دیا کہ وہ محض نظریاتی نقاد نہیں بلکہ عملی نقاد بھی ہیں۔

شعرالعجم کا تجزیہ کرنے والوں کی بنیادی کمی یہ رہی کہ انہوں نے کتاب کے بنیادی اصولوں پر نظر نہیں رکھی اور اس پہلو سے جائزہ نہیں لیا کہ شبلی نے جن بنیادوں پر کتاب لکھی اس میں وہ کہاں تک کامیاب رہے۔ مثلاً قدما، متوسطین اور متاخرین تینوں ادوار کی شاعری کا جائزہ، عہد بہ عہد ارتقاء اور اس کے اثرات کی نشاندہی میں وہ کہاں تک کامیاب رہے۔ اس نقطہ نظر سے شعرالعجم کا مصنف پوری طرح کامیاب رہا اور اس نے فارسی شاعری کی جو تنقیدی تاریخ قلم بند کر دی، اس کی کوئی مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔ مثلاً فارسی شاعری پر ایرانی اثرات کا تجزیہ اس طرح کیا ہے۔

> ''یہ بدیہی بات ہے کہ ملک کی آب و ہوا سرسبزی اور شادابی کا اثر خیالات پر پڑتا ہے اور اس ذریعے سے انشاپردازی اور شاعری تک پہونچتا ہے۔ عرب جاہلیت کا کلام دیکھو تو پہاڑ، جنگل، صحرا، بیاباں، دشوار گذار راستے، مٹے ہوئے کھنڈر، ببولوں کے جھنڈ، پہاڑی جھاڑیاں، یہ چیزیں ان کی شاعری کا سرمایہ ہیں، لیکن یہی عرب جب بغداد میں پہونچے تو ان کا کلام چمنستان اور سنبلستان بن گیا۔ ایران ایک قدرتی چمن زار ہے۔ ملک پھولوں سے بھرا پڑا ہے۔ قدم قدم پہ آب رواں، سبزہ زار، آبشاریں ہیں۔ بہار آئی اور تمام زمین تختہ زمرد بن گئی، بادسحر کے جھونکے، خوشبوؤں کی لپٹ، سبزہ کی مہک، بلبلوں کی چہک، طاؤس کی جھنکار، آبشاروں کا شور وہ سماں ہے جو ایران کے سوا کہیں اور نظر نہیں آ سکتا۔
>
> اس حالت کا یہ اثر ہوا کہ ایران کی تمام انشاپردازی پر رنگینی چھا گئی۔ کسی

چیز کی خوبی یا کمال کو بیان کرنا چاہیں گے تو رنگ و بو کے ذریعہ سے کام لیں گے۔ فردوسی جس کی زبان سے پہلوانی اصطلاحات اور الفاظ کے سوا کوئی لفظ نہیں نکل سکتا فوج کی تعریف میں کہتا ہے:

سوئے شہر ایراں نہاوند روئے

سیاہی بداں گو نہ بارنگ و بوئے

اسی بنا پر رنگین سخنی، رنگین ادائی کے محاورات پیدا ہوئے......اسی طرح پھولوں کی افراط نے گل کے لفظ کو اس قدر عام کر دیا کہ کوئی چیز گل سے خالی نہیں۔ چراغ میں گل، آنکھ میں گل، شراب میں گل، پیکاں میں گل، صبح کا گل، چاند کا گل، ....دو چار قدم ٹہلنا ہو تو گل گشت کہیں گے، گویا ہر قدم پر پھول بچھے ہوئے ہیں کہ جو قدم پڑتا ہے پھولوں پر پڑتا ہے۔ زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا ہو تو گل زمین کہیں گے۔ جب کسی موقع پر کوئی شخص عمدہ بات کہتا ہے تو سب بول اٹھتے ہیں گل گفتی یعنی خوب گفتی، پہلوان حریف کو جب کشتی کا پیغام (چیلنج) دیتے ہیں تو پھول بھیجتے ہیں:

دریں بہار نہ شد کس حریف فریادم

بہ بلبلان چمن ہم گلے فرستادم(۶۱)

اسی طرح انہوں نے چوتھی اور پانچویں جلد میں فن شعر و شاعری، اس کی حقیقت و ماہیت اور اس کے ذیلی و ضمنی مباحث پر جو دقیق فلسفیانہ مباحث لکھے اور شاعری کے اقسام، قصیدہ، غزل وغیرہ کے ساتھ اس کی فنی خوبیاں مثلاً رزمیہ، عشقیہ، صوفیانہ، اخلاقی، اور فلسفیانہ وغیرہ موضوعات کو جس طرح برتا اور جس خوبی کے ساتھ ان کا تجزیہ کیا اردو ادب کی تاریخ میں وہ قابل فخر اضافہ ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی حالی و شبلی کی بحث اٹھائی ہے اور وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ:

''شعر العجم میں شبلی نے مغربی اصولوں سے بھی فائدہ اٹھایا ہے مگر اس کی ساری وضع قطع مشرقی ہے۔ اس لئے مقدمہ شعر و شاعری کے مقابلہ میں اس کے اصول زیادہ مانوس ہیں۔ حالی کے مقدمہ کی ایک خاص کمزوری ہے مغربی

اصولوں کا رعب، خوش قسمتی سے شعرالعجم اس کمزوری سے پاک ہے۔" (۶۲)

بہر حال شعرالعجم کی اہمیت کبھی کم نہ ہوئی۔ اس کا اسلوب نگارش اور فارسی شاعری کا خوب صورت انتخاب، اس کی مقبولیت کا اصل سبب بنا۔ یقین ہے آئندہ بھی شعرالعجم اپنی خصوصیات کی وجہ سے ارباب شعروادب کی آنکھوں کا نور بنی رہے گی۔

حوالے

(۱) شعرالعجم حصہ اول ص۲

(۲) مکاتیب شبلی حصہ اول ص۱۱۷

(۳) مکاتیب شبلی حصہ اول ص۱۱۸

(۴) مکاتیب شبلی حصہ دوم ص۷۔۸

(۵) افادات مہدی ص۲۷۵۔۲۷۶

(۶) مکاتیب شبلی حصہ دوم ص۲۱۱۔۲۱۲

(۷) مکاتیب شبلی حصہ اول ص۱۵۹

(۸) سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص۲۰۷۔۲۰۸

(۹) شعرالعجم حصہ اول ص۴

(۱۰) شعرالعجم حصہ چہارم ص۸

(۱۱) شعرالعجم حصہ چہارم ص۸۔۹

(۱۲) شعرالعجم حصہ چہارم ص آخر

(۱۳) مشاہیر کے خطوط بنام مولانا سید سلیمان ندوی۔ص ۴۶۔مطبوعہ دارالمصنّفین ۱۹۹۷ء

(۱۴) ماہنامہ الندوہ لکھنؤ۔جنوری ۱۹۱۲ء

(۱۵) مکاتیب شبلی حصہ اول ص۱۱۳

(۱۶) تاریخ ادب اردو حصہ دوم ص۲۷۔منشی تیج کمار لکھنؤ ۱۹۶۹ء

(۱۷) مشاہیر کے خطوط ص۳۳

(۱۸) شذرات سلیمانی حصہ سوم ص ۲۴۷

(۱۹) شذرات سلیمانی حصہ اول ص ۳۰۰ دارالمصنّفین ایڈیشن ۱۹۹۰ء

(۲۰) تفصیل کے لئے ملاحظہ راقم کی کتاب متعلقات شبلی ص ۱۶۹۔۱۷۶

(۲۱) سید امیر حسن عابدی۔غالب نامہ۔حافظ محمود شیرانی نمبر ص ۲۵۱

(۲۲) شعرالعجم حصہ اول ص ۳۰۶

(۲۳) شعرالعجم حصہ چہارم ص ۳۴

(۲۴) شبلی معاصرین کی نظر میں ص ۲۰۹

(۲۵) شبلی معاصرین کی نظر میں ص ۲۲۴

(۲۶) شعرالعجم حصہ اول ص ۴

(۲۷) شعرالعجم حصہ چہارم ص ۴۱

(۲۸) ادیب شبلی نمبر ص ۱۳۲

(۲۹) ادیب شبلی نمبر ص ۱۲۸۔۱۳۲

(۳۰) ادیب شبلی نمبر ص ۱۲۹

(۳۱) دیباچہ علوم عرب۔مترجمہ مولانا اسلم جیراج پوری ص ۱۔۲۔انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ

(۳۲) شبلی معاصرین کی نظر میں حاشیہ ص ۲۱۷

(۳۳) شعرالعجم حصہ پنجم ص ۱۵۶

(۳۴) شبلی معاصرین کی نظر میں حاشیہ ص ۲۲۱

(۳۵) افادات مہدی ص ۱۶۰

(۳۶) شبلی معاصرین کی نظر میں ص ۲۲۸

(۳۷) ایضاً

(۳۸) ایضاً ص ۲۲۹

(۳۹) ایضاً ص ۲۳۰

(۴۰) ایضاً ص ۲۳۱

(۴۱) تنقید شعر العجم ص ۲۔۳
(۴۲) تنقید شعر العجم ص ب
(۴۳) شعر العجم حصہ اول ص آخر
(۴۴) مکاتیب شبلی ج ا ص ۳۳۲
(۴۵) شبلی ایک دبستان ص ۱۴۴
(۴۶) غالب نامہ۔ حافظ محمود شیرانی نمبر۔ ۱۹۹۰ء ص ۹
(۴۷) ادیب شبلی نمبر ص ۱۳۲
(۴۸) ادیب شبلی نمبر ص ۱۲۶
(۴۹) ماہنامہ برہان دہلی۔ فروری ۱۹۴۴ء ص ۱۶۰
(۵۰) ماہنامہ برہان دہلی۔ فروری ۱۹۴۴ء ص ۱۶۰
(۵۱) ماہنامہ برہان دہلی۔ جنوری ۱۹۴۴ء ص ۱۶۰
(۵۲) تنقید شعر العجم ص ۳
(۵۳) ادیب شبلی نمبر ص ۱۲۹
(۵۴) تنقید شعر العجم۔ مقدمہ
(۵۵) افادات مہدی ص ۱۸۰
(۵۶) غالب نامہ۔ حافظ محمود شیرانی نمبر ص ۲۵۳۔۲۵۴
(۵۷) حاشیہ مکتوبات سلیمانی ص ۳
(۵۸) مکتوبات سلیمانی ص ۳۱
(۵۹) یادگار شبلی ص ۳۶۹
(۶۰) ایضاً ص ۳۷۰
(۶۱) شعر العجم حصہ چہارم ص ۲۱۵۔۲۱۷
(۶۲) سر سید اور ان کے نامور رفقاء ص ۲۰۶۔۲۰۷

الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی

علامہ شبلی نے عربی زبان میں تین کتابیں سپرد قلم کیں۔ان کی علمی زندگی کی پہلی کتاب اسکات المعتدی علی انصات المقتدی بھی عربی میں ہے، جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ان کی ایک اور اہم عربی تصنیف الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی ہے۔یہ جرجی زیدان کی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی کے رد میں لکھی گئی ہے۔جرجی زیدان نے اپنی کتاب میں بہ ظاہر اسلامی تمدن کی تاریخ مرتب کی ہے لیکن درحقیقت اس نے اسلامی تمدن کی تصویر مسخ کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی تھی۔مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں:

> ''مصنف چونکہ عیسائی تھا،اس لئے اس نے اپنے قلم سے اس میں اسلامی تمدن کی صورت بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔مگر ایسے اسلوب سے اس کو دکھایا ہے کہ بہ ظاہر وہ حسن نظر آتا ہے لیکن درحقیقت اس میں کوئی نہ کوئی عیب چھپی ہوتی ہے۔''(۱)

جرجی زیدان

جرجی زیدان شام کا باشندہ اور متعصب عیسائی مورخ وادیب تھا۔مصر سے الہلال کے نام سے ایک رسالہ نکالتا تھا۔اس نے اسلامی تاریخ اور تہذیب وتمدن کا خاص طور سے مطالعہ کیا اور اسی موضوع کو اپنے مضامین ومقالات کے لئے خاص کیا لیکن وہ اصلاً ناول نگار تھا۔اس کے ناولوں کی تعداد گیارہ ہے، جس میں اس نے اسلامی تاریخ کے افراد وواقعات جیسے فتادہ غسان، ارمانوستہ المصریہ، ابومسلم خراسانی اور عباسہ اخت الرشید وغیرہ کو افسانوی انداز میں پیش

کیا اور اسلامی تاریخ وتہذیب ہی کے کسی پہلو یا عہد کو موضوع بنایا ہے۔ مثلاً قتادہ غسان میں اس نے عرب کی تاریخ اور اخلاق وتمدن، آغاز اسلام، نبوت اور ابتدائی اسلامی تاریخ اس دلچسپ انداز میں لکھی ہے کہ پڑھنے والا اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی پڑھتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امی نہ تھے۔ انھوں نے بحیرہ شامی سے تعلیم پائی تھی اور اسی کی تعلیم سے ادعائے نبوت کا خیال پیدا ہوا۔

دوسرا ناول ارمانوستہ المصر یہ ہے۔ اس میں مسلمانوں کی فتح مصر کے وقت مصر کی حالت، تہذیب وتمدن اور اخلاق وغیرہ کی مرقع آرائی ہے اور وہ اسباب بھی بیان کئے ہیں جن کی وجہ سے مصر فتح ہوا لیکن اسی ناول میں یہ خرافات بھی ہیں کہ مصر کو مسلمانوں نے طاقت سے فتح نہیں کیا بلکہ قبطیوں نے مکر وسازش سے فتح کرادیا اور جب مسلمان پوری طرح قابض ہو گئے تو انھوں نے مصر واسکندریہ کی تمام علمی یادگاریں مٹادیں اور قبطیوں کے احسان کا اچھا بدلہ بھی نہیں دیا۔

ابومسلم خراسانی بھی اس کا ناول ہے۔ اس میں بنوامیہ کے اسباب زوال اور عباسیوں کی حکومت کے قیام واستحکام کی تفصیل ہے۔ اس مین جرجی زیدان نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عباسی سلطنت ابومسلم خراسانی کے دست وبازو سے قائم ہوئی مگر منصور عباسی جو نہایت سفاک تھا، اس نے ابومسلم کے احسانات کو فراموش کر دیا اور اس کو دھوکہ سے قتل کرا دیا۔

عباسہ اخت الرشید میں برامکہ کے فضل وکمال اور حسن انتظام کا ذکر ہے مگر جرجی زیدان نے پردہ نشینان حریم خلافت کو بداخلاق اور فرومایہ دکھایا ہے اور ہارون الرشید کو وحشی، عیش پرست اور محسن کش ظاہر کرنے میں زور قلم صرف کیا ہے۔

درحقیقت جرجی زیدان مصر کے اس اہل قلم گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو اسلام اور اسلامی تہذیب وتمدن کی تصویر بگاڑنے کے درپے تھے۔ اسی لئے یہ لوگ جاذب نظر اور دلفریب انداز تحریر اختیار کرتے تھے اور اس میں اپنے مقصد کی باتیں اس طرح سمو دیتے تھے جو عام لوگوں کی نظر میں قابل اعتراض نہیں ہوتی تھیں۔

تصنیف وتالیف میں بھی جرجی زیدان کا یہی خاص مقصد اور مطمح نظر تھا۔ ناولوں کے علاوہ اس کی کئی اور کتابیں اسی حقیقت کی غماز ہیں۔ ان میں تاریخ التمدن الاسلامی جو پانچ جلدوں

پر مشتمل ہے خاص طور سے بہت مقبول ہوئی۔اس کی مقبولیت کے متعدد اسباب میں سب سے بڑا سبب جرجی زیدان کا مطمح نظر تھا۔اس نے یہ کتاب اصلاً مورخ کے بجائے عیسائی بن کر لکھی تھی۔ چنانچہ مشہور مستشرق پروفیسر مارگو لیوتھ (اکسفورڈ یونیورسٹی) نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ اس کا اردو، فارسی، روسی اور دوسری یورپین زبانوں میں ترجمہ ہوا۔(۲) ہندوستان اور مصر میں نصاب تعلیم میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔مصر میں خود جرجی زیدان نے یہ کوشش کی مگر بعض علماء کی مخالفت کی وجہ سے یہ تجویز مسترد ہوگئی۔(۳)

جرجی زیدان اور علامہ شبلی

علامہ شبلی کے پاس مصر و بلاد عرب سے عربی رسائل و جرائد آتے تھے اور وہ وہاں کے اہل علم و قلم سے بخوبی واقف تھے۔بعض سے علمی روابط بھی قائم ہو گئے تھے۔انھیں میں ایک جرجی زیدان بھی تھا۔مولانا سید سلیمان ندوی کے بقول دونوں میں خط وکتابت بھی ہوتی تھی۔ (۴) علامہ شبلی نے امتحان الالباء لکافۃ الاطباء کے چند صفحات کی نقل جرجی زیدان ہی سے منگا کر حکیم بدر الدین دہلوی (پ: ۱۸۴۰ء) کو دی تھی۔(۵) جرجی زیدان نے بھی علامہ شبلی سے تعلقات کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ ان کی تحریروں سے تاریخ التمدن الاسلامی کی تصنیف میں بڑی مدد ملی۔وہ لکھتا ہے:

فاذا رأينا فى كتب الافرنج مآثر	یورپ کی کتابوں میں عربوں کے جو قابل ذکر
منسوبة الى العرب لم نجدلها ذكرا	واقعات بیان ہوئے ہیں ان کا سراغ مجھ کو اصل
فى كتبهم ضعفت ثقتنا فى صحتها	عربی ماخذ میں نہیں ملتا تھا، اس وجہ سے اس کی
اذقدتكون منقولة عن بعض الرحلات	صحت مجھ کو مشکوک معلوم ہوتی تھی شائد یہ
الافرنجية فى العصور الوسطى	واقعات عہد وسطی کے یورپین سفر ناموں سے
واكثرهايحتاج الى تمحيص	ماخوذ ہیں اور اکثر واقعات محتاج تحقیق ہیں۔
ووقفنا على كتاب فى اللغة	مجھ کو اردو زبان میں لکھی ہوئی نعمانی کی کتاب
الهندوستانية(الاردية) للنعمانى	رسائل شبلی ملی، جس میں مستند حوالوں کے

سماه رسائل شبلی ذکر فیه فصولاً فی مدارس العرب ومارستاناتهم ومکاتبهم وکتبهم ذیلها بالاسناد وهو کتاب جلیل وبعد الاطلاع علی آراء العلماء وابحاثهم فی هذا الموضوع رجعنا الی المصادر العربیة فتفصحناها بامعان وتدقیق فعثرنا فیها علی ما ادهشنا من ضخامة ذالک التمدن وخصوصاً فی العلم والادب مماستراه مفصلا فی هذا الجزء.'' (۶)

ساتھ عرب کے مدارس، شفاخانے، کتب خانے اور عربوں کی تصنیفات کا ذکر متعدد فصلوں میں ہے۔ درحقیقت یہ ایک عظیم الشان تصنیف ہے۔اس کے ذریعہ سے اس موضوع پر علماء کی آراء واقوال کو پڑھ کر جب میں نے اصل مآخذ کی طرف رجوع کیا اور امعان نظر سے واقعات کی جستجو کی تو مجھ کو حیرت انگیز تمدنی سرمایہ ہاتھ آیا، بالخصوص علم وادب کے میدان میں عربوں نے جو نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں۔ یہ اسی کی تفصیل پر مبنی ہے۔

تاریخ التمدن الاسلامی کا پہلا حصہ شائع ہوا تو جرجی زیدان نے اس کا ایک نسخہ علامہ شبلی کے پاس بھیجا جس کی انھوں نے کسی قدر تعریف کی چونکہ علامہ شبلی مورخ کے لئے مآخذ ومراجع کی نشاندہی اور حوالوں کا دینا ضروری قرار دیتے تھے، اس لئے انھوں نے جرجی زیدان کو اس اہم امر کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ جرجی زیدان نے کتاب کے تیسرے حصے میں اس پر عمل کیا۔ وہ خود لکھتا ہے:

وهذا مانبهنا الیه صدیقنا النعمانی العالم الهندی فی کتابه الذی نشرنا فی مقدمة الجزء الماضی اذا اقترح علینا ان نذیل صفحات کتابنا هذا بالمآخذ التی تنقل عنها وقد اطعناه. ......(۷)

ہم کو ہمارے ہندی نژاد عالم دوست شبلی نعمانی جن کا مکتوب ہم نے پچھلی جلد کے مقدمہ میں درج کیا ہے، یہ توجہ دلائی تھی کہ ہم حوالے میں مآخذ کے صفحات کی صراحت بالالتزام کریں۔ چنانچہ ہم نے اس جلد میں اس پر عمل کیا ہے۔

مگر جرجی زیدان نے اپنی عادت کے مطابق اس میں بھی فریب سے کام لیا۔اس کی تفصیل علامہ شبلی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔وہ لکھتے ہیں:

''مصنف نے جب اس کتاب کا پہلا حصہ مجھ کو بھیجا تھا تو میں نے اجمالاً کتاب کی تعریف کی لیکن چوں کہ میں مصنف کی عادت سے واقف تھا اس لئے میں نے اس کو خط لکھا کہ آپ کو واقعات میں کتابوں کا حوالہ دینا چاہئے۔ چنانچہ مصنف نے میرے اس خط کو تمدن اسلام کے دوسرے حصہ میں نقل کیا ہے اور میری تحریک کے مطابق پچھلے حصوں میں حوالے دیئے ہیں لیکن اس میں یہ چالاکی کی کہ چھاپے کی تعیین نہیں کرتا۔اکثر کتابیں مصر مین بار بار چھپی ہیں۔ مصنف ان کے حوالے دیتا ہے اور یہ نہیں بتاتا کہ کون سے چھاپے کے صفحے ہیں اس کا یہ نتیجہ ابن الاثیر،مسعودی وغیرہ کے جو کثرت سے مصنف نے حوالے دیئے ہیں، میں نے مقابلہ کیا تو میرے پاس جو نسخے ہیں ان میں وہ عبارتیں نہیں ملیں لیکن مصنف یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے کسی اور نسخہ کا حوالہ دیا ہے۔اس کارروائی کی وجہ سے مصنف کی بہت سی خیانتوں کا پردہ رہ گیا اور جن کتابوں میں اس کے حوالے میرے نسخے کے مطابق نکلے،اس میں ایک موقع بھی مجھ کو ایسا نہ ملا کہ مصنف نے سخت خیانت نہ کی ہو۔''(۸)

الانتقاد کی ضرورت اور اس کے اسباب

اس علمی خیانت،بددیانتی،کذب وافتراءاور اسلام دشمنی کے سبب ضروری تھا کہ جرجی زیدان کی کتاب کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے۔اس کی ہرزہ سرائیوں کو واضح کیا جائے۔اس کے الزامات کی نشاندہی کی جائے اور اس نے اسلامی تمدن کی جو تصویر مسخ کی ہے اس کی صحیح شکل پیش کی جائے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے ابتداءً ایک خط کے ذریعہ جرجی زیدان کو متنبہ کیا اور اپنے شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی سے اس سلسلہ میں مضامین لکھوائے جو ماہنامہ الندوہ لکھنؤ (اکتوبر ۱۹۰۸ء، اگست ۱۹۱۰ء) میں شائع ہوئے۔علامہ شبلی اپنی دیگر علمی مصروفیات کی وجہ سے اس کی طرف توجہ

نہیں دے پارہے تھے، لیکن ۱۹۱۱ء میں بقول مولانا سید سلیمان ندوی ''چند واقعے ایسے پیش آئے کہ مولانا کو باوجود قلت فرصت اس کی کتاب پر مستقل طور سے ایک نہایت سخت اور مبسوط تنقید بلکہ تردید لکھنی پڑی۔''(۹)

اسی زمانہ میں مصری فاضل ڈاکٹر محمود لبیب نے اسلامی آلات کے کسی رسالہ کے متعلق علامہ شبلی سے استفسار کیا۔ علامہ شبلی وہ رسالہ جرجی زیدان کے پاس بھیج چکے تھے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اس کے نام ایک رقعہ لکھا جس میں وہ رسالہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے حوالہ کرنے کو کہا تھا اور اس کی بعض علمی بددیانتیوں کی طرف توجہ بھی دلائی تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر لبیب نے ایک دوسرے خط میں جرجی زیدان کی علمی خیانتوں کی جانب توجہ دلائی جس سے تاریخ التمدن الاسلامی کے رد کے خیال کو اور بھی تقویت ملی۔(۱۰)

اسی اثنا میں تاریخ التمدن الاسلامی کے انگریزی ترجمہ کے کچھ حصوں کو ڈاکٹر ہارویز کی تجویز پر مولوی فاضل کے امتحان میں شامل کیا جانے لگا۔ علامہ شبلی ۲۹ راگست ۱۹۱۱ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''تمدن اسلام کا ضرر متعدی ہوا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر ہارویز پروفیسر علی گڑھ نے اپنی تحریری رائے یونیورسٹی میں بھیجی ہے کہ امتحانات فاضل وعالم میں وہ داخل درس کی جائے۔ مجھ پر اس کا سخت اثر ہوا اور میں نے سب کام چھوڑ کر اس کی دروغ بیانیوں پر ایک مضمون لکھنا شروع کیا۔ اس وقت تک بیس صفحے ہو چکے ہیں۔ عربی میں لکھوں گا اور عربی اخبارات میں طبع کراؤں گا۔''(۱۱)

تاریخ التمدن الاسلامی کا انگریزی ترجمہ ہی خاص طور سے الانتقاد کی تالیف کا سبب بنا۔ علامہ شبلی مولوی ریاض حسن خاں خیال کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''جرجی زیدان کے صرف ایک حصہ کا انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے۔ مارگولیوتھ نے کیا ہے، جو اسلام کا سخت دشمن ہے اور درحقیقت اسی انگریزی ترجمہ نے مجھ کو رد لکھنے پر آمادہ کیا۔''(۱۲)

ان اسباب کے علاوہ سب سے بڑا سبب علامہ شبلی کی مذہبی حمیت وغیرت تھی، وہ

اسلام اور اسلامی تاریخ وتمدن پر کسی ناروا نقد واعتراض کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ چنانچہ جرجی زیدان کے ہفوات اور تلبیسات نے انھیں برافروختہ کردیا اور وہ اپنی تمام ترعدیم الفرصتی کے باوجود اس کے رد کے لئے تیار ہوگئے۔ الانتقاد میں وہ بڑے جذباتی لب ولہجہ میں لکھتے ہیں:

هل كنت ارضى بان تمدحني	اے جرجی زیدان کیا یہ بات میرے لئے
وتهجو العرب فتجعلهم غرضاً	پسندیدہ ہوسکتی ہے کہ تم میری تو تعریف کرو اور
لسهامك ودريئة لرمحك ترميهم	عرب کی مذمت کرو۔ ان کو اپنے نیزے کا ہدف
بكل معيبة وشين وتعزو اليهم كل دنية	بناؤ اور ہر قسم کا عیب وشر ان کی جانب منسوب
وشر حتى تقطعهم اربا اربا وتمزقهم	کرو اور ان کی مجد وشرافت کو پارہ پارہ کرو۔ کیا
كل ممزق وهل كنت ارضى بان	میں یہ برداشت کرسکتا ہوں کہ تم بنوامیہ کو محض
تجعل بنى امية لكونهم عربا بحتامن	ان کے خالص عرب ہونے کی بنا پر بدترین
اشر خلق الله واسوأهم يفتكون	مخلوق سے تعبیر کرو اور ان کے بارہ میں یہ کہو
بالناس ويسومونهم سوء العذاب	کہ وہ بدمعاملہ، فسادی اور لٹیرے تھے۔ خانہ
ويهلكون الحرث والنسل ويقتلون	کعبہ کو ڈھانے والے اور قرآن کا مذاق
الذرية وينهبون الاموال وينتهكون	اڑانے والے تھے۔ کیا یہ بات میرے لئے
الحرمات ويهدمون الكعبة	قابل ضبط ہوسکتی ہے کہ تم کتب خانہ اسکندریہ
ويستخفون بالقرآن. وهل كنت	کے جلائے جانے کی نسبت حضرت عمرؓ کی
ارضى بان تنسب حريق الخزانة	ذات گرامی کی طرف کرو جن کے عدل و
الاسكندرية الى عمربن الخطاب	انصاف کی گواہی زمین وآسمان دیتے ہیں اور
الذى شهدت بعد له الارض والسماء	یہ بات بھی کم تکلیف دہ نہیں ہے کہ تم
وهل كنت ارضى بان تمدح بنى	خلفائے عباسیہ کی تعریف محض اس وجہ سے
العباس فتعد من مفاخرهم انهم نزلو	کرتے ہو کہ تمہارے خیال مین انھوں نے
العرب منزلة الكلب حتى ضرب	عربوں کو ذلیل ورسوا کیا، یہاں تک کہ ان کو
لذلك المثل وان المنصور بنى القبة	کتوں کے ہم پلہ قرار دیا اور یہ بات ضرب

الخضراء ارغاما للكعبة وقطع	المثل بن گئی اور یہ کہ خلیفہ منصور عباسی نے
الميرة عن الحرمين استهانة بهما	خانہ کعبہ کی تحقیر کے جذبہ سے قبہ خضراء کی تعمیر
وان المامون كان ينكر نزول	کرائی اور حرمین کی تذلیل کی خاطر اس نے
القرآن وان المعتصم بالله انشأ	وہاں کا غلہ روک دیا اور مامون نزول قرآن کا
كعبة فى سامرا وجعل حولها مطافاً	منکر تھا اور معتصم نے سامرا میں ایک کعبہ
واتخذ منى وعرفات. (۱۳)	بنوایا تھا جس کے ارد گرد طواف کی جگہ اور منیٰ
	وعرفات کے نام سے مقامات بنوائے۔

ان اسباب کے علاوہ ایک اہم اور بنیادی سبب جرجی زیدان کی علمی و تحقیقی بد دیانتی تھی جس نے علامہ شبلی کو یہ رد لکھنے پر آمادہ کیا۔ خود علامہ شبلی فرماتے ہیں:

۱- مصنف نے یہ کتاب عیسائی بن کر نہیں بلکہ مورخ بن کر لکھی ہے اور اسی حیثیت سے تمام دنیائے اسلام کے سامنے پیش کی ہے۔

۲- مصنف کا مقصد بنوامیہ کی برائیاں ثابت کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا روئے سخن عرب کی طرف ہے۔ وہ یہ تصریح لکھتا ہے کہ بنوامیہ کی سلطنت خالص عربی سلطنت تھی جس کی بنیاد تعصب اور سخت گیری پر تھی۔ وہ عباسی حکومت کی تعریف کرتا ہے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ عباسی ہے بلکہ اس لئے کہ وہ درحقیقت ایرانی حکومت ہے۔

۳- بنوامیہ کے پردہ میں مصنف نے قرن اول کے تمام مسلمانوں کی ہر قسم کی برائیاں ثابت کی ہیں، اس لئے ایسے اتہامات کا رفع کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

۴- جن باتوں نے اس کتاب کو تاریخی پایہ سے بالکل گرادیا ہے یعنی تحریف، تعصب، کذب، خدع، ان کا سب سے زیادہ استعمال بنوامیہ کے واقعات میں کیا گیا ہے، اس لیے اسی کے ساتھ زیادہ توجہ واعتناء کی ضرورت ہے۔ (۱۴)

رد لکھنے میں انہماک

تاریخ التمدن الاسلامی کے جب مختلف حصے طبع ہو کر آ گئے تو علامہ شبلی نے نقد و تبصرہ کا

آغاز کیا، اس میں ان کو اس قدر انہاک تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہی، حتیٰ کہ آنکھوں میں پانی اتر آیا اور اندیشہ ہوا کہ کہیں آنکھ کی روشنی ہی متاثر نہ ہو جائے۔ ایک خط میں مولانا ابوالکلام آزاد کو لکھتے ہیں:

''تمدن (اسلام) کے رد میں ابتداءً ایک ہفتہ اس قدر انہاک رہا کہ ایک آنکھ میں پانی اترتا محسوس ہوا اور اب اس سے حرف نظر نہیں آتے۔ ایک آنکھ جو صحیح ہے اس پر بھی بہت بار معلوم ہوتا ہے۔ اب لکھنا پڑھنا بالکل کم ہو گیا ہے، اس لئے ساٹھ صفحے ہو کر رہ گئے اور اسی پر کتاب ختم کر دی طبیعت بہت افسردہ رہتی ہے۔ سپاہی کا ہتھیار چھن جائے تو پھر وہ کس کام کا ہے۔'' (۱۵)

علامہ شبلی کی تڑپ اور جرجی زیدان کے رد میں ان کی غیر معمولی توجہ کے چشم دید شاہد مولانا سید سلیمان ندوی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''غالباً اگست ۱۹۱۱ء سے مولانا پورے انہاک کے ساتھ اس کام میں مصروف ہوئے جو کئی مہینے تک جاری رہا۔ بیسیوں تصنیفات کے ہزاروں صفحات جن کے حوالے اصل کتاب میں تھے، ان کو ملا ملا کر دیکھنا اور مختلف ایڈیشنوں کو تلاش کرنا اور ان میں مصنف کے دیے ہوئے حوالوں کو ڈھونڈھنا آسان کام نہ تھا۔ یہ رمضان کا مہینہ اور برسات (ستمبر) کی امس اور حبس، مولانا روزہ رکھ کر اسی طرح کتابیں دیکھنے، پڑھنے اور لکھنے کی زحمت اٹھاتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک آنکھ میں پانی اتر آیا اور اس کی بینائی گویا جاتی رہی، اس پر بھی کام جاری رہا اور اس کو تمام کر کے چھوڑا۔'' (۱۶)

الانتقاد کی طباعت و اشاعت

الانتقاد پایۂ تکمیل کو پہنچی تو اولاً علامہ شبلی نے اس کا اردو میں ترجمہ و خلاصہ کیا جو اکتوبر ۱۹۱۱ء کے ماہنامہ الندوہ لکھنؤ میں ''تمدن اسلام مصنفہ جرجی زیدان کی پردہ دری'' کے عنوان سے شائع ہوا اور اب مقالات شبلی جلد چہارم میں شامل ہے۔ اس کے متعلق خود علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''اصل مضمون عربی میں لکھا ہے اوراس کونہایت وسعت دی ہے۔اردو میں مختصر کردیا ہے اورطرز تحریر معمولی ہے۔''(۱۷)

اصل عربی رسالہ لکھنؤ کے مطبع آسی میں جنوری ۱۹۱۲ء میں طبع ہوا۔اس کے اخراجات ان کے احباب تلامذہ اورخود علامہ نے برداشت کئے۔(۱۸)

الانتقاد کے بعض اجزاء علامہ شبلی نے سید رشید رضا مصری (ف:۲۲/اگست ۱۹۳۵ء) ایڈیٹر المنار مصر کے پاس ارسال کئے تو انھوں نے اس کی بڑی تعریف کی۔مولوی ریاض حسن خاں خیال کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''رسالہ چھپ رہا ہے۔میں نے اس کے کچھ پروف المنار کے ایڈیٹر سید رشید رضا کے پاس بھیج دیے تھے۔انھوں نے بڑی شکر گذاری کی اور لکھا کہ میں نے علمائے مصر کو آمادہ کرنا چاہا لیکن ان لوگوں نے ہمت نہ کی۔المنار میں یہ رسالہ بتدریج شائع ہوگا۔خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کی آبرو مصر میں قائم رہی۔''(۱۹)

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے مطابق سید رشید رضا مصری نے یہ بھی لکھا تھا کہ ''میں خود بھی تردید کرنا چاہتا تھا مگر جرجی زیدان کے مکائداس قدر پھیلے ہوئے تھے کہ ان کو سمیٹ کر یکجا کرنا اور ان کی تردید کرنا قابو میں نہ آتا تھا، آپ نے اس پر قابو پالیا اور تردید کردی۔(۲۰) خود سید رشید رضا مصری لکھتے ہیں:

''شیخ شبلی جو علامہ وقت، مشہور مصلح، جمعیۃ ندوۃ العلماء کے بانی اوراس کے ترجمان رسالہ کے مدیر ہیں۔انھوں نے تاریخ التمدن الاسلامی کی تردید لکھنی شروع کی ہے اور ہم کو یہ لکھا ہے کہ وہ اس کو لکھنؤ میں چھپوار ہے ہیں اوراس کے مطبوعہ فارم وہ ہمارے پاس بتدریج بھیجتے رہیں گے تا کہ ہم انھیں المنار میں چھاپ دیں۔ایسے عالم ومورخ کی تنقید درحقیقت ہمارا قیمتی علمی سرمایہ ہے اور صرف ہمارا ہی نہیں بلکہ ہمارے اوران کے دوست جرجی زیدان کا بھی۔اس

لئے ہم نے اس کو شائع کرنے میں عجلت کی۔''(۲۱)

چنانچہ سید رشید رضا مصری نے الانتقاد کے اجزاء پہلے بالاقساط المنار میں شائع کئے پھر ایک مقدمہ کے ساتھ ۱۹۱۲ء مطابق ۱۳۳۰ھ میں مطبع المنار سے کتابی صورت میں شائع کیا۔

کتاب کی اشاعت کے بعد جرجی زیدان نے علامہ شبلی کو خط لکھا اور اپنے بیس سالہ قدیم تعلقات کا پاس نہ رکھنے پر اظہار افسوس کیا اور وعدہ کیا کہ وہ ان کی مرضی کے مطابق کتاب میں ترمیم و تنسیخ کر دیں گے مگر اسی کے ساتھ یہ خواہش بھی کی کہ الانتقاد کی اپنی نسبت سے انکار کر دیں۔علامہ شبلی نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔(۲۲) جرجی زیدان کا یہ خط ۱۹۱۶ء تک دارالمصنّفین میں محفوظ تھا۔(۲۳)

ادھر ایک مدت سے الانتقاد کے جدید ایڈیشن کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔چنانچہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ نے اس کا محقق ایڈیشن جناب مولانا محمد عارف عمری صاحب کی تحقیق و مراجعت کے بعد شائع کیا ہے۔جس پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔راقم کے پیش نظر یہی جدید طباعت ہے۔

الانتقاد کے چند مباحث

تاریخ التمدن الاسلامی یوں تو بہ ظاہر اسلامی تمدن کی تاریخ ہے، لیکن درحقیقت اس میں اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کی ایسی تصویر کھینچی گئی ہے کہ اس سے بدنما تصویر کھینچی نہیں جاسکتی۔اس نے عربوں کی تحقیر و مذمت، خلفائے عباسیہ اور خاص طور سے خلفائے بنوامیہ کی تذلیل اور مذمت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔مسلمانوں پر طرح طرح کے رکیک اور ناروا الزامات عائد کئے ہیں انھیں ظالم، ستم گر، علم دشمن اور انسانیت سوز مظالم کا مرتکب گردانا ہے۔حتی کہ خود مسلمانوں کو اپنے مذہب اور شعائر اسلامی کی توہین و تضحیک کرنے والا بھی ثابت کیا ہے۔

علامہ شبلی نے پانچ جلدوں پر مشتمل اس کتاب کے سیکڑوں صفحات پر پھیلے، جرجی زیدان کے مکائد، ایک ایک الزام، اس کے کذب و افتراء اور مکر و فریب کی نشاندہی کر کے اس قدر جامعیت اور علمی و تحقیقی انداز سے فریضہ رد و ابطال ادا کیا ہے کہ جرجی زیدان کے تمام ہفوات

کی تردیداور پردہ دری ہوگئی ہے۔مولانا نے بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ جرجی زیدان کا بنیادی مقصد تالیف ''[ا] عرب کی تحقیراوران کی مذمت [۲] خلفائے بنوعباسیہ اور بنوامیہ کی طرف مذہب کی اہانت کا الزام [۳] مسلمانوں پر عام اعتراضات [۴] عرب کو علم دشمن قرار دینااور کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کوان کی طرف منسوب کرنا'' ہے۔(۲۴)

علامہ شبلی نے جرجی زیدان کے مذکورہ مقاصد کی الانتقاد میں متعدد مثالیں دی ہیں۔ یہاں اس کے چند اہم مباحث کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ علامہ شبلی کی کدوکاوش، تحقیق وتدقیق اور الانتقاد کی قدروقیمت کا اندازہ ہوسکے۔

بنوامیہ کی تحقیر

جرجی زیدان کو جہاں موقع ملا ہے اور جس ڈھب سے ملا ہے، اس نے بنوامیہ کی تحقیر وتوہین میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔اس میں کذب وافتراء مکروفریب اور بے ہودہ گوئی کون سی ایسی چیز ہے جو اس نے روانہ رکھی ہو، علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> ''مصنف کا سب سے بڑا مرکز نظر بنوامیہ کی ہجو وتحقیر ہے۔اس محبت میں اس نے جی کھول کر زورطبع صرف کیا ہے اور جس قدر کذب، تحریف، تمویہ، فریب، تدلیس، خدع، غلط بیانی کی قوت فطرت نے اس کو عطا کی تھی سب صرف کردی ہے۔''(۲۵)

بنوامیہ کے مقابلہ میں بنوعباس کی جرجی زیدان نے کسی قدر مدح وتحسین کی ہے اور اس بناپر کی ہے کہ بنوامیہ خالص عرب تھے اور بنوعباس کی حکومت غیرعرب اور ایرانی تھی۔(۲۶) جرجی زیدان کو عربوں سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ان کی تحقیر میں اس نے زمین آسمان ملادئے ہیں۔بنوامیہ کی تحقیر وتذلیل کے پس پشت بھی جرجی زیدان کا مقصد عربوں ہی کی تذلیل ہے ۔علامہ شبلی کی دوربیں نگاہ نے اسے محسوس کرلیا۔وہ لکھتے ہیں:

> ''بنوامیہ کی تحقیر مصنف کا اصل مقصد نہیں ہے بلکہ پوری امت عربیہ اس کے نشانے پر ہے۔چونکہ عمومی انداز بیان اختیار کرنے کی صورت میں شدید ردعمل

ہوسکتا تھا، اس لئے اس نے یہ عیاری کی کہ حق و باطل کو باہم گڈ مڈ کر دیا۔ چنانچہ
اس نے مسلم عہد حکومت کے تین دور قائم کئے۔عہد خلفائے راشدین، دور بنی
امیہ اور دور بنوعباس۔ دور اول کی اس نے تعریف کی۔ اسی طرح دور ثالث کی
بھی اس نے محض دکھاوے کی خاطر مدح سرائی کی اور جب یہ محسوس کر لیا کہ
خلفائے راشدین جو کہ ہمارے مذہبی رہنما ہیں ان کی تعریف سے ہم مسلمان
خوش ہو گئے۔ اسی طرح بنوعباس سے جن کے ساتھ مسلمانوں کا یہ جذباتی تعلق
ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے
ذریعہ سلطنت اسلامیہ اور تمدن اسلام کو بے حد فروغ حاصل ہوا، ان کی تعریف
سے بھی مسلمان مغالطہ میں آ گئے تب مصنف نے خوب بے باکی کے ساتھ دور
بنوامیہ کو اپنی تنقیدوں کا نشانہ بنایا کیوں کہ اس کو اب یہ اطمینان ہو گیا کہ اس کو
کوئی جانب دار اور متعصب نہ قرار دے گا۔ اس لئے اس نے بنوامیہ کی طرف
ہر قسم کی برائی منسوب کی اور ان کو تمام خوبیوں سے عاری ثابت کرنے کی ہر ممکن
کوشش کی۔'' (۲۷)

جرجی زیدان نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ بنوامیہ کے دور میں عرب قومیت کا تصور اپنے عروج پر تھا اور وہ غیر عرب کو حقیر اور کم تر سمجھتے تھے۔ علامہ شبلی نے جرجی زیدان کے اس نقطہ نظر کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس نے جن بنیادوں پر ان خیالات کا اظہار کیا ہے وہ چند متعصب عربوں کے اقوال ہیں۔ ظاہر ہے ان کی بنیاد پر یہ عمومی تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی۔ جرجی زیدان کی تاریخ نویسی میں عام عادت ہے کہ وہ جزء کو کل مان کر واقعات کی تعبیر و تشریح کرتا ہے۔ یہ یقیناً اصول تاریخ نویسی کے خلاف ہے۔ علامہ شبلی مذکورہ الزام کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جو شخص بھی عجم و عرب کی تاریخ سے واقف ہے، اس سے یہ بات پوشیدہ نہیں
ہے کہ ماقبل اسلام اہل ایران عرب کو نہایت ذلیل سمجھتے تھے۔ اسلام نے عرب
کو جب عجم کے ہم پلہ بنا دیا بلکہ انھوں نے عجم کی سیادت بھی چھین لی تو عربوں
کے لئے یہ فخر کا موقع تھا مگر شریعت اسلامی میں اس قسم کے فخر و نخوت کی گنجائش

نہیں تھی۔............تاہم عرب وعجم دونوں میں کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جن کے سینوں میں عداوت کے جذبات باقی رہے اوراسی نے بالآخر یہ شکل اختیار کی کہ دو مدمقابل گروہ پیدا ہوگئے ۔ایک گروہ شعوبیوں کا تھا جو عربوں کو حقیر سمجھتا تھا اوران کی عیب جوئی میں لگا رہتا تھا۔اس جماعت کے سرخیل ابوعبیدہ نے اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں جن میں عرب کے تمام ہی قبائل کے حسب ونسب کو اپنی تنقیدوں کا نشانہ بنایا ہے۔دوسرا گروہ متعصب عربوں کا تھا جو اس کے بالکل مدمقابل تھا۔علامہ ابن عبدربہ نے اپنی کتاب عقدالفرید میں ایک مستقل باب قائم کرکے ان دونوں گروہوں کے اقوال ودلائل جمع کردیے ہیں۔چنانچہ متعصب عربوں کے انہی اقوال کو بنیاد بنا کر مصنف نے عام عربوں کو مطعون ومجروح کیا ہے۔‘‘(۲۸)

موالی کی بحث

جرجی زیدان نے یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ موالی کے ساتھ بنوامیہ کا رویہ حقارت آمیز تھا۔علامہ شبلی نے اس الزام کی بھی تردید کی ہے اور دکھایا ہے کہ جرجی زیدان نے جس بنیاد پر یہ مفروضہ قائم کیا ہے وہ بنیاد ہی سرے سے مبالغہ پر مبنی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

ان اکرام الموالی کان من دیدن العرب عامة وقریشها خاصة لم یکن الاکرام للموالی واکثرهم العجم عندجفاةالعرب وبغاتها کما لم یکن الاکرام للعرب عنه الشعوبیة واکثر هم العجم کان نافع بن جبیرو امثاله من جفاة العرب فلایصح الاستدلال باقوالهم علی استحقار العرب	موالی کے ساتھ عزت کا برتاؤ عربوں اور بالخصوص قریش کی عادت تھی ۔البتہ یہ ضرور ہے کہ چند متعصب عربوں میں یہ چیز نہیں پائی جاتی تھی اوراسی کے مدمقابل شعوبیوں کے یہاں عربوں کی تکریم کا مزاج نہ تھا۔نافع بن جبیر اوراس جیسے متعصب عربوں کے اقوال کو بنیاد بنا کر موالی کی تحقیر وتذلیل کا الزام دینا درست نہیں۔

للموالی والعجم. (۲۹)

اس الزام کی تردید کے لئے علامہ شبلی نے موالی کے ساتھ عربوں کے حسن سلوک، عزت وتکریم اور ادب واحترام کے چند واقعات بھی تاریخ کی مستند کتابوں سے نقل کئے ہیں۔ (۳۰) اور یہ بھی دکھایا ہے کہ دور بنوامیہ میں موالی کن کن بلند عہدہ ومنصب پر متمکن تھے اور ان کی کیا قدر ومنزلت تھی۔ (۳۱) طوالت کے خوف سے اس کی تفصیل قلم انداز کی جاتی ہے۔

مذہب کی توہین کا الزام

بنوامیہ پر مذہب کی توہین کا الزام بھی جرجی زیدان نے عائد کیا ہے۔ متعدد مقامات پر اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ تاہم اس کو ایک خاص عنوان **الاستھانة بالقرآن والحرمین** کے تحت بھی لکھا ہے۔ (۳۲) یہ عنوان ہی اس کی ذہنیت کا پتہ دیتا ہے۔

جرجی زیدان نے اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے بارہ میں لکھا ہے کہ جب اس کو اپنے خلیفہ بنائے جانے کی اطلاع ملی، اس وقت وہ قرآن کی تلاوت میں مشغول تھا۔ اس اطلاع کے بعد قرآن مجید بند کر کے اس نے کہا! اب آخری ملاقات ہے۔ جرجی زیدان نے اس بات کو استخفاف دین ثابت کیا ہے لیکن اصل واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> ''جب عبدالملک کے پاس خلافت کی خبر پہنچی اس وقت وہ تلاوت قرآن میں مشغول تھا، اس نے بار خلافت کی ذمہ داریوں اور مشغولیتوں کا احساس کرتے ہوئے حسرت سے قرآن کو مخاطب کر کے کہا یہ اب آخری ملاقات ہے، یعنی اب عبادت وتلاوت کا جو میرا معمول تھا اس کو بعینہ قائم رکھنا مشکل ہوگا۔ یہ بات عبدالملک نے استخفاف دین کے جذبہ سے نہیں کہی اور خلافت کے زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ عبدالملک فرائض وسنن کا اہتمام کرتا ہے۔ نماز، روزہ اور حج کی ادائیگی کرتا ہے۔'' (۳۳)

جرجی زیدان نے خانہ کعبہ اور بعض دوسرے شعائر اسلامی کی توہین کا بھی الزام مسلمانوں پر عائد کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

ان المعتصم بالله انشاء كعبة في سامراوجعل حولها مطافاًواتخذ منىٰ وعرفات. (۳۴)	معتصم نے سامرہ میں ایک کعبہ اور منیٰ وعرفات تیار کرایا۔

دوسری جگہ لکھتا ہے:

فحبب بعضهم الىٰ المنصور ان يستبدل بالكعبة بما يقوم مقامها في العراق وتكون حجا للناس فبنى بناءً سماه القبة الخضراء تصغير للكعبة وقطع الميرة عن المدينة. (۳۵)	بعضوں نے منصور کو اس طرف مائل کیا کہ کعبہ کے بدلے عراق میں کوئی عمارت بنائے، جس کا لوگ حج کیا کریں۔ چنانچہ اس نے ایک مکان بنایا جس کا نام قبہ خضراء رکھا، تاکہ کعبہ کی حقارت ہو اور مدینہ میں غلہ بھیجنا بند کردیا۔

علامہ شبلی نے ان الزامات کی بھی حقیقت واضح کی ہے اور لکھا ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں۔ جرجی زیدان کا ماخذ منصور کے دشمن محمد نفس زکیہ کا ایک خطبہ ہے جو طبری میں منقول ہے۔ علامہ شبلی اس سے سوال کرتے ہیں کہ ''یہ منصور کے ایک دشمن کے الفاظ ہیں، کیا اس سے کسی تاریخی واقعہ کا اثبات ہوسکتا ہے؟۔'' (۳۶) مدینہ منورہ میں غلہ روک دینے کی وجہ مدینہ منورہ کی تحقیر نہیں تھی بلکہ علامہ شبلی کے الفاظ میں:

> ''واقعہ یہ ہے کہ محمد بن عبداللہ ایک مدت سے خلافت کا خیال پکار رہے تھے، جب انھوں نے علانیہ علم بغاوت بلند کیا تو چوں کہ وہ مدینہ منورہ میں مقیم تھے، اس لئے منصور نے وہاں رسد کا بھیجنا بند کرادیا۔'' (۳۷)

نظام محاصل سے متعلق الزام

جرجی زیدان نے نظام محاصل کو بھی تختۂ مشق بنایا ہے اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کے ظلم وستم کی فرضی تصویر پیش کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

وكان عمال بني امية يجورون على اصحاب الارمنين من اهل الذمة في	بنوامیہ کے عمال زمین داروں پر مالگذاری وغیرہ وصول کرنے میں ظلم کرتے تھے۔

التحصیل ونحوه. (۳۸)

دوسری جگہ لکھتا ہے:

واذا اتی احدھم بالدراھم لیودی مافی خراجه یقطع الجابی منها طائفة ویقول ھذا رواجها وصرفها. (۳۹)

اور جب ان کے پاس کوئی شخص مالگذاری ادا کرنے کے لئے روپیہ لاتا تھا تو تحصیلدار اس میں سے کچھ روپیہ نکال لیتا تھا اور کہتا تھا کہ روپیہ کا نرخ اور چلن اسی قدر ہے۔

اس کے علاوہ بھی متعدد الزامات واعتراضات جرجی زیدان نے لگائے ہیں۔ نظام محاصل کے سلسلہ کی سب سے اہم بحث جزیہ کی ہے۔

جزیہ

جزیہ کے متعلق یورپ کے اہل قلم اور مورخین کا رویہ مسلمانوں کے تئیں بڑا جارحانہ اور معاندانہ رہا ہے۔ انھوں نے اس بحث کو بہت طول دیا اور اس کے ضمن میں مسلمانوں پر ہر طرح کا الزام عائد کیا۔ علامہ شبلی کو اس بات مین اولیت کا شرف حاصل ہے کہ جزیہ سے متعلق یورپ کے بے سروپا الزامات کی مدلل تردید ان کے قلم سے نکلی۔ اس محققانہ مقالہ میں انھوں نے جزیہ کے ہر پہلو سے بحث وتحقیق کر کے ثابت کیا کہ جزیہ کوئی نیا اور ظالمانہ ٹیکس نہ تھا بلکہ غیر قوموں کے حق میں وہ رحمت تھا۔ (۴۰)

چونکہ علامہ شبلی کتاب الجزیہ میں اس پر مفصل بحث وتحقیق پیش کر چکے تھے، اس لئے یہاں قدرے اختصار سے کام لیا ہے، شروع میں جزیہ کی حقیقت بیان کی ہے اور دکھایا ہے کہ یہ ٹیکس مسلمانوں نے جاری ونافذ نہیں کیا بلکہ اس کا آغاز نوشیرواں نے کیا تھا، مسلمانوں نے اس کو باقی رکھا اس کی دوسری تفصیلات علامہ شبلی کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جاننا چاہئے کہ جزیہ محض ایک فوجی ٹیکس ہے جو لوگ مملکت اسلامی میں رہتے ہیں، ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو بذات خود دفاع وتحفظ کے ذمہ دار ہوتے ہیں، چنانچہ ایسے لوگوں سے جزیہ نہیں لیا جاتا ہے۔ البتہ وہ لوگ جو فریضۂ دفاع

سے مستثنیٰ ہیں، ان پر لازم کیا گیا کہ وہ کچھ رقم ادا کریں تاکہ فوجی اخراجات اس سے پورے کئے جاسکیں۔ سب سے پہلے یہ ٹیکس نوشیرواں نے عائد کیا۔ جیسا کہ ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے اور اسی کی اقتداء حضرت عمرؓ نے کی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم اسلامی فوج میں شامل ہو جائے جیسا کہ بلاذری اور طبری نے اپنی تاریخوں میں لکھا ہے تو اس صورت میں اس سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بعض عیسائی افواج اسلامی میں شامل ہوئے تو ان کا جزیہ ساقط کر دیا گیا۔ اسی طرح غربت کی بنا پر بھی غیر مسلم سے جزیہ معاف کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ثعلب کے عیسائی جو نادار تھے حضرت عمرؓ نے نہ صرف یہ کہ ان کا جزیہ معاف کر دیا بلکہ ان کو صدقات کے مال سے مدد پہنچائی۔ خلاصہ یہ کہ جزیہ کفر واسلام کے درمیان حد فاصل نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں مملکت اسلامیہ کے زیر نگیں بہت سے عیسائی مجوسی اور یہودی آباد تھے جو زراعت پیشہ یا سرکاری ملازم تھے اور دفاع کے لئے اپنی جان جوکھم میں ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس بنا پر ان لوگوں سے یہ فوجی ٹیکس وصول کیا گیا۔ اسلامی مملکت میں کسی مسلمان کے لئے یہ بات روا نہیں ہے کہ وہ دفاع و تحفظ سے گریز کرے بلکہ یہ چیز اس پر واجب ہے خواہ وہ بخوشی اس کو انجام دے یا بجبر اس طرح جزیہ کی حیثیت ابتداءً رئیس ورعایا کے درمیان حد فاصل کی تھی جو رفتہ رفتہ مسلم وغیر مسلم کے درمیان فرق وامتیاز کا ذریعہ بن گئی۔'' (۴۱)

اس تمہید کے بعد علامہ شبلی نے جرجی زیدان کے الزامات واعتراضات کا جائزہ لیا ہے یہاں اس کی چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔ جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ بنوامیہ غیر مذہب والوں کے ساتھ جزیہ کی وصولی میں سختی کرتے تھے۔ حتیٰ کہ مسلمان ہونے کے بعد بھی جزیہ وصول کرتے تھے۔ راہبوں پر ابتداءً جزیہ معاف تھا اس لئے لوگ راہب ہونے لگے۔ چنانچہ راہبوں پر بھی جزیہ لگا دیا گیا۔ (۴۲) جرجی زیدان نے یہ مفروضہ مقریزی کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ حالانکہ مقریزی نے سرے سے اس کا ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ جرجی زیدان نے اس

واقعہ کے لئے مقریزی (ص۳۹۲) کا حوالہ دیا ہے لیکن بڑی خیانت کی ہے۔مقریزی میں اس کے متعلق ایک حرف بھی نہیں ہے کہ لوگ جزیہ کے ڈر سے راہب ہونے لگے ہوں۔(۴۳)

اس کے بعد علامہ شبلی نعمانی نے بنوامیہ کے عہد میں جزیہ کی وصولی کے سلسلہ میں جو بے احتیاطیاں سرزدہوئیں اور جن کی بنیاد پر جرجی زیدان نے انھیں مطعون کیا ہے، ان کا جائزہ لیا ہے اور دکھایا ہے کہ جن لوگوں نے یہ کوششیں کیں ان کی عام عرب، علماء اور خود خلیفہ وقت نے مخالفت کی۔انھوں نے جرجی زیدان کے اس مکر کا بھی ذکر کیا ہے کہ ان چند واقعات کو اس نے اس طرح قلم بند کیا ہے گویا یہ بنوامیہ کا عام طرز عمل تھا۔(۴۴) وہ لکھتے ہیں:

''بنوامیہ کی صدسالہ حکومت میں چند دفعہ یہ واقعہ پیش آیا۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے زمانے میں اسی کارروائی کو روکا۔یزید بن عبدالملک کے زمانہ میں جب یزید بن ابی مسلم نے ایسا کرنا چاہا تو بغاوت ہوئی اور اہل عرب نے باغیوں کا ساتھ دیا۔غرض خلفائے بنوامیہ میں سے کسی نے اس فعل کو جائز نہیں رکھا۔عمال نے کیا تو یا خود خلیفہ وقت نے روک دیا یا اہل عرب نے عمالوں کی مخالفت کی اور ان سے لڑے۔

مصنف نے خلفا کے روکنے یا عام مسلمانوں کی ناراضی اور مظلوموں کی حمایت کا ذکر مطلق نہیں کیا اور ان چند واقعات کو اس طرح ادا کیا کہ بنوامیہ کے زمانہ سلطنت میں یہ عام رواج تھا۔''(۴۵)

جرجی زیدان نے حضرت عمرو بن العاصؓ کے بارہ میں لکھا ہے کہ انھوں نے جزیہ اور دوسرے خراج کی بدولت خراج کی رقم ایک کروڑ بیس لاکھ تک پہنچادی تھی۔علامہ شبلی حرص وطمع کے اس الزام کی طرف توجہ نہ کرسکے مگر تاریخ التمدن الاسلامی کے تعلیق نگار ڈاکٹر حسین مونس نے اعداد وشمار کی روشنی میں جائزہ لے کر ثابت کیا ہے کہ خراج کی رقم عہد بنوامیہ میں مسلسل کم ہوتی گئی اور پھر جرجی زیدان سے یہ سوال کرتے ہیں کہ:

ان الجباية كانت تناقص ايام بنى امية و لم تكن فى زيادة فاين	اعداد وشمار کے مطابق عہد بنوامیہ میں خراج کی رقم مسلسل کم ہوتی گئی اور اس میں اضافہ

ذھب اذن المال الذی کان ‏ نہیں ہوا تو پھر وہ مال جو زبردستی وصول
یجبی بالعسف واین ضریبۃ ‏ کیا جاتا تھا وہ کیا ہوا اور جو جزیہ راہبوں
الرھبان. (۴۶) ‏ پر لگایا گیا وہ کہاں گیا۔

علامہ شبلی نے جرجی زیدان کے دوسرے اعتراضات اور غلط بیانیوں کی بھی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ جزیہ کی تحصیل کے جس ظالمانہ طریقے کو جرجی زیدان نے بیان کیا ہے۔ حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں اور وہ محض اس کے کذب وافتراء پر مبنی ہے۔(۴۷)

علم دشمنی کا الزام

جرجی زیدان نے مسلمانوں پر علم دشمنی کی فرد جرم بھی عائد کی ہے، کتاب کے متعدد جملے اور فقرے مسلمانوں کو علم دشمن ظاہر کرتے ہیں، اس نے بڑی عیاری اور کمال جعل سازی سے کام کیا ہے۔ علامہ شبلی کے الفاظ میں اس کی تہ تک عام آدمی تو کجا بیدار مغز اور ذہین افراد بھی مشکل ہی سے پہنچ سکتے ہیں۔(۴۸)

اس سلسلے کی سب سے اہم بحث کتب خانہ اسکندریہ جلائے جانے کی ہے، جس میں حضرت عمرؓ کی ذات گرامی کو مطعون کیا گیا ہے کہ انھوں نے کتب خانہ اسکندریہ کو جو بطلیموسیوں کی یادگار تھا، جلا کر تباہ کرا دیا۔ اس پر یورپ میں بڑی بحث وتحقیق ہو چکی ہے۔ علامہ شبلی پہلے اسلامی مورخ تھے جنھوں نے بدلائل اس الزام کی نہ صرف تردید کی تھی بلکہ ثابت کیا تھا کہ مسلمانوں کی فتح اسکندریہ سے پہلے ہی اس کو خود عیسائیوں نے تباہ و برباد کرایا تھا اور اس کی تباہی و بربادی میں ان کے بڑے بڑے مذہبی پیشوا بھی شریک تھے۔(۴۹) اسی کو کہتے ہیں:

الزام ہم ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

اس بحث وتحقیق کے بعد یورپ کے مورخین اور اہل قلم بھی تسلیم کرنے لگے کہ کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کا الزام مسلمانوں پر عائد کرنا غلط بیانی ہوگی، مگر جرجی زیدان ان تمام حقائق سے صرف نظر کر کے اس بحث کو دوبارہ بڑے طنطنے کے ساتھ پیش کر کے کہتا ہے کہ چوں کہ دو مسلمان مورخوں عبداللطیف بغدادی اور جمال الدین قفطی نے تسلیم کیا ہے اس لئے مسلمانوں کو

یہ الزام اپنے سر لے لینا چاہئے۔ علامہ شبلی نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ:

"تاریخ کی تمام مستند کتابیں اس واقعہ کے ذکر سے خالی ہیں۔ البتہ بغدادی اور قفطی نے یہ روایت ضرور بیان کی ہے مگر اس میں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ یہ دونوں مورخ چھٹی اور ساتویں صدی کے ہیں اور یہ دونوں اپنی روایت کا ماخذ اور سند نہیں ذکر کرتے۔" (۵۰)

ڈاکٹر حسین مونس نے ان دونوں کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی روایتیں تسلیم نہیں کی جاسکتیں کیوں کہ یہ سیاح ہیں اور سیاحت مصر کے دوران ان کو جو باتیں سنی سنائی ملیں ان کو بیان کر دیا ہے۔ (۵۱)

علامہ شبلی نے اس بحث میں بھی اختصار سے کام لیا ہے۔ غالبًا اپنے مضمون کتب خانہ اسکندریہ کی وجہ سے ایسا کیا ہو۔ بہر حال ان چند اہم اور بنیادی مباحث سے الانتقاد کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اب ہم جرجی زیدان کی تاریخ نویسی کا اختصار سے جائزہ پیش کرتے ہیں۔

جرجی زیدان کی تاریخ نویسی

تاریخ التمدن الاسلامی کا جب ہم بہ نظر غائر مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جرجی زیدان نے تاریخ نویسی کے اصولوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور ایسا اس نے نادانستہ نہیں بلکہ دانستہ طور پر کیا ہے۔

تاریخ نویسی میں سند اور حوالہ کی بڑی اہمیت ہے، اس کے بغیر جھوٹ سچ کی تمیز مشکل ہے جرجی زیدان اسلامی تمدن کی تاریخ لکھتا ہے مگر وہ سند اور حوالہ کا اہتمام نہیں کرتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرے سے اس کی اہمیت و افادیت کا منکر ہے۔ علامہ شبلی ہندوستان سے خط لکھ کر اسے تاریخ نویسی کے اس اصول کی طرف متوجہ کرتے ہیں تو گو وہ اس کا اعتراف کرتا ہے لیکن اقرار کے بعد وہ اس میں پھر خیانت کرتا ہے اور مطبع و سنہ طباعت درج نہیں کرتا۔ مراجع کی تحقیق و تلاش میں وہ دیانت داری نہیں برتتا اور حوالے ایسی کتابوں کے دیتا ہے جس کا پایہ استناد ساقط

الاعتبار ہوتا ہے۔مثلاً وہ معتصم باللہ کو خانہ کعبہ کی تحقیر وتوہین کا ملزم قرار دیتا ہے اور اس کا ماخذ معتصم باللہ کے حریف محمد نفس زکیہ کا ایک خطبہ ہوتا ہے۔علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ ''یہ منصور کے ایک دشمن کے الفاظ ہیں کیا اس سے کسی تاریخی واقعہ کا استدلال ہوسکتا ہے۔''؟ (۵۲)

سند اور حوالہ کے سلسلہ میں وہ یہ خیانت بھی کرتا ہے کہ متعدد واقعات میں سے کسی ایک واقعہ کا حوالہ دیتا ہے اور بقیہ بغیر حوالہ کے لکھ جاتا ہے جس سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ انھیں کتابوں سے لیا گیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''وہ ایک پیراگراف میں متعدد صحیح اور محرف واقعات لکھ جاتا ہے اور سب سے اخیر کے واقعہ پر کسی کتاب کا حوالہ دیدیتا ہے۔ عام لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کل واقعات کا حوالہ ہے اس لئے واقعات ناممکن التردید ہیں، حالانکہ یہ حوالہ صرف اخیر کے واقعہ سے متعلق ہوتا ہے۔'' (۵۳)

وہ مسلمانوں پر اور خاص طور سے حضرت عمرؓ کی ذات گرامی پر علم دشمنی کا الزام قائم کرتا ہے اور ثبوت میں عبداللطیف بغدادی اور جمال الدین قفطی کے اقوال پیش کرتا ہے جن کے بیانات کی عدم صحت کا نہ صرف مسلمان بلکہ یورپ کے اہل قلم بھی اعتراف کرتے ہیں۔اس کے باوجود پروفیسر مارگولیوتھ وغیرہ تاریخ التمدن الاسلامی کو ایک معرکہ آراء تاریخ قرار دیتے ہیں اور انگریزی میں ترجمہ کرکے اس کی اشاعت میں حصہ لیتے ہیں۔ہم اسے تعصب کے علاوہ اور کیا نام دے سکتے ہیں۔

تاریخ نویسی میں غیر جانب داری ضروری ہے۔اس کے بغیر تاریخ کے ساتھ انصاف ممکن نہ ہوگا جرجی زیدان غیر جانب دار بھی نہ رہ سکا۔متعدد مقامات پر اس نے ایسی بحثیں کی ہیں جن سے اس کی جانب داری کا پردہ فاش ہوجاتا ہے۔علامہ شبلی نے اس کی جانبداری کے متعدد ثبوت فراہم کئے ہیں۔(۵۴)

کسی عہد کی تاریخ میں خوبیاں اور خامیاں دونوں ہوتی ہیں۔ انصاف پسند مورخ دونوں رخ پر روشنی ڈالتا ہے مگر اس میں یہ انصاف وعدل ملحوظ رکھتا ہے کہ خوبیاں خامیوں پر اور خامیاں خوبیوں پر غالب نہ آجائیں۔جرجی زیدان نے دانستہ اس کا خیال نہیں رکھا۔مثلاً بنوامیہ

کے کسی عامل نے بہ تقاضائے بشری مالگذاری یا کسی اور خراج کی وصولی میں خیانت کر دی تو وہ تمام عمال کو مطعون کر کے خود بنوامیہ کے پورے عہد کو قبائح کا مجموعہ ثابت کر دیتا ہے۔ اسی طرح جزیہ کے سلسلہ میں بعض افراد نے انفرادی طور پر اسلامی احکام کی خلاف ورزی کی، جس کی کسی نے حوصلہ افزائی کی نہ اس پر عمل ہوا، مگر جرجی زیدان نے اسے ایک مسلمہ واقعہ سے تعبیر کر دیا۔ اسی طرح وہ کسی ایک شخص کے ذاتی خیالات کو تمام قوم کے خیال سے تعبیر کر دیتا ہے اور کسی کے ذاتی فعل کو عام طرز معاشرت سے تشبیہ دیدیتا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''کسی خلیفہ یا امیر کے جزئی اور شخصی واقعہ سے وہ (جرجی زیدان) اصول کلی منضبط کرتا ہے اور اس کو کل مسلمانوں کا طرز عمل بتاتا ہے۔''(۵۵)

واقعات میں اسباب وعلل کی وضاحت اس لئے ضروری ہوتی ہے کہ اس واقعے کا اصل پس منظر سامنے آجائے مگر جرجی زیدان ان سے بھی صرف نظر کرتا ہے اور اسباب وعلل بیان نہیں کرتا۔ مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں کہ:

''اسلامی تاریخ میں چند واقعات ایسے گذرے ہیں جو بہ ظاہر بالکل ناپسندیدہ ہیں اور سخت ناسزا معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر ان کے اسباب وعلل کا اظہار کر دیا جائے تو وہ بالکل مناسب اور قرین مصلحت معلوم ہوں گے۔ جرجی زیدان اکثر ایسے موقعوں پر مصالح اور اسباب کی تشریح سے احتراز کرتا ہے۔''(۵۶)

مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کی تاریخ نویسی کی ایک اور خامی کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب وہ مسلمانوں کے کسی حسن انتظام یا اسلامی عہد کے کسی صیغے کی ترقی کا ذکر کرتا ہے تو اکثر اس انتظام یا صیغہ کی موجودہ ترقی کا بھی ذکر کر دیتا ہے۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ ناظرین کتاب کے ذہن میں اسلامی ترقی کی کوئی وقعت نہ قائم ہونے پائے۔''(۵۷)

خلاصہ یہ کہ جرجی زیدان کی تاریخی بصیرت وواقفیت تعصب کے رنگ میں رنگی ہے، علامہ شبلی نے بجا طور پر اس کی نشاندہی کر دی کہ اس کی تاریخ نگاری [ا] صرف کذب ودروغ

بیانی۔ [۲] روایات کی نقل میں خیانت اور تحریف۔ [۳] کسی صحیح واقعہ میں اپنی طرف سے ایسا اضافہ کہ واقعہ کی صورت بدل جائے۔ [۴] غلط استنباط اور استدلال وغیرہ سے عبارت ہے۔ (۵۸)

الانتقاد کا اسلوب

الانتقاد میں علامہ شبلی نے جو اسلوب تحریر اختیار کیا ہے اور جس کے متعدد نمونے گذشتہ صفحات میں آچکے ہیں وہ متقدمین کے اسلوب سے ہم آہنگ ہے۔ علامہ شبلی گو جدید اسلوب تحریر سے بخوبی واقف تھے تاہم اس میں قدماء ہی کا طرز انھوں نے اختیار کیا ہے اور اسی لئے ان کی تحریر میں بعض عجمی تعبیریں صاف محسوس ہوتی ہیں جن کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ سید رشید رضا مصری نے الانتقاد کے مصری ایڈیشن میں ان کی بعض عجمی تعبیروں میں معمولی سا ردوبدل کر کے جدید اسلوب سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔

علامہ شبلی عربی تحریر میں جاحظ کے پیرو تھے اور الانتقاد لکھتے وقت انھوں نے خاص طور سے اس کا اہتمام کیا ہے۔ جب وہ الانتقاد لکھ رہے تھے تو البیان والتبیین اور کتاب الحیوان مطالعے میں تھی۔ اس لئے ان کی تحریر میں انشاء پردازی کا جوہر بھی نمایاں ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ''اس رسالہ کی عربی تحریر بڑی انشاء پردازانہ ہے۔ مولانا عربی تحریر میں جاحظ کے طرز کے پیرو تھے۔ جس زمانہ میں وہ یہ مضمون لکھ رہے تھے۔ جاحظ کی بیان وتبیین اور کتاب الحیوان اکثر مطالعہ میں رہتی تھی۔'' (۵۹)

مولانا سعید انصاری نے علامہ شبلی کی عربی تحریروں پر ایک مقالہ لکھا ہے جس میں انھوں نے بھی ان کو جاحظ کا پیرو اور متبع قرار دیا ہے۔ (۶۰) خود علامہ شبلی کو بھی الانتقاد کی تحریر پر فخر تھا۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''جرجی زیدان کی تنقید اردو میں کچھ نہیں، اصل مخاطب عرب تھا، اس لئے عربی زبان میں تمام زور صرف ہوا۔ سو صفحے کی کتاب ہوگئی اور لٹریچر بھی ایسا ہے کہ مصر والے بھی ہندوستان کو کچھ چیز سمجھیں گے۔'' (۶۱)

خلاصہ یہ کہ الانتقاد علامہ شبلی کا ایک بڑا علمی و تحقیقی اور تنقیدی کارنامہ ہے۔ اس سے اس زہر کا تریاق ممکن ہوا جو جرجی زیدان کے ذریعہ پھیلا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے سچ لکھا ہے کہ:

''اس کتاب کی اشاعت نے ہندوستان اور مصر اور دنیائے اسلام کے دوسرے حصوں میں جہاں تک (جرجی زیدان کی) تمدن اسلامی کا زہر پھیلا تھا تریاق کا کام دیا اور ایک بڑے فتنہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔ والحمدللہ علی ذالک۔''
(۶۲)

حوالے

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی ص۵۷۸۔ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۱۹۸۴ء

(۲) ماہنامہ الندوہ لکھنو، اکتوبر ۱۹۰۸ء ص ۱۷۔ تاریخ التمدن الاسلامی کے تیسرے حصے کا اردو ترجمہ علوم عرب کے نام سے مولانا اسلم جیراج پوری نے کیا ہے اس کے مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کی علمی ترقی جو گذشتہ صدی میں ہوئی اور موجودہ اور آئندہ قوموں کی ترقی کا اصل تخم ہے، مشرق کبھی ان علمی احسانات کو فراموش نہیں کرسکتا جو بغداد اور مراغہ سے اس کو حاصل ہوئے اور مغرب کبھی اس خرمن علم کی خوشہ چینی سے انکار نہیں کرسکتا جو قرطبہ اور غرناطہ سے اس نے کی تھی، ایسی حالت میں اس علمی ترقی کی تاریخ کو جو مسلمانوں نے کی ہیں مدون نہ کرنا ایک ایسی کمی ہے جس کو کم سے کم میں بہت محسوس کرتا تھا اور عرصہ سے اس فکر میں تھا کہ جس طرح ہوسکے کوشش کر کے اس قسم کی ایک تاریخ لکھوں، اسی دوران میں علامہ جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال (قاہرہ، مصر) کی کتاب تمدن اسلام مطالعہ میں آئی .... جی باغ باغ ہوگیا یہ جلد (سوم) اس عنوان پر اس قدر مکمل اور کافی وشافی ہے کہ اب کسی قسم کی مزید جستجو اور اس پر اضافہ کی مطلق ضرورت باقی نہیں .... علامہ جرجی زیدان کے اس علمی احسان پر ہمیشہ اسلامی دنیا شکریہ

ادا کرے گی اور اس وجہ سے اور بھی کہ فاضل مورخ نے باوجود عیسائی ہونے کے ایک مسلمان مورخ کا فرض ادا کیا ہے۔'' (علوم عرب دیباچہ مترجم ص۱،۲، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ)

(۳) مقدمہ مجلّہ المنار مصر ج۱۵،عدد۱ جنوری۱۹۱۲ء۔

(۴) حیات شبلی ص۵۷۸۔

(۵) امتحان الالباء لکافۃ الاطباء ص۳۔۶ بحوالہ معارف اعظم گڑھ مئی ۲۰۰۸ء ص۳۴۲۔۳۴۳۔

(۶) جرجی زیدان، تاریخ التمدن الاسلامی ج۳ مقدمہ ص۳-۵۔

(۷) ایضاً، ص۴۔

(۸) مقالات شبلی ج۴، ص۱۳۹ (حاشیہ) مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ، طبع سوم ۱۹۵۶ء

(۹) حیات شبلی ص۵۷۹۔

(۱۰) ایضاً۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس خط کا ایک بڑا حصہ اپنے مضمون میں نقل کردیا ہے ملاحظہ ہو ماہنامہ الندوہ لکھنو، اکتوبر ۱۹۰۸ء ص۱۶-۱۹۔

(۱۱) مکاتیب شبلی ج۱، ص۲۸۰، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء طبع دوم

(۱۲) ایضا، ج۲، ص۱۹۰۔ مطبوعہ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۱۹۷۱ء

(۱۳) علامہ شبلی، الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی ص۲ طبع جدید دارالمصنّفین، اعظم گڑھ۔

(۱۴) مقالات شبلی ج۴، ص۱۵۴-۱۵۶۔

(۱۵) مکاتیب شبلی ج۱، ص۲۸۲۔

(۱۶) حیات شبلی ص۵۸۰۔

(۱۷) مقالات شبلی ج۴، ص۱۳۳۔

(۱۸) حیات شبلی ص۵۸۱، ۵۸۲۔

(۱۹) مکاتیب شبلی ج۲، ص۱۸۹۔

(۲۰) حیات شبلی ص۵۸۱۔

(۲۱) مقدمہ مجلّہ المنار مصر ج ۱۵ عدد ا جنوری ۱۹۱۲ء۔

(۲۲) مولانا سعید انصاری، عربی انشاء البصیر شبلی نمبر ص ۱۲۰۔ اسلامیہ کالج چینوٹ۔

(۲۳) ایضاً۔ راقم نے بھی اسے دیکھا تھا مگر اب معلوم نہیں کہاں ہے۔

(۲۴) مقالات شبلی ج ۴، ص ۱۵۴-۱۵۶۔

(۲۵) ایضاً ص ۵۴۔

(۲۶) تاریخ التمدن الاسلامی ج ۴، ص ۱۰۳۔

(۲۷) الانتقاد ص ۳۔

(۲۸) ایضاً ص ۴، ۵۔

(۲۹) ایضاً ص ۱۵۔

(۳۰) ایضاً ص ۱۳-۱۵۔

(۳۱) ایضاً ص ۹، ۱۰۔

(۳۲) تاریخ التمدن الاسلامی ج ۴، ص ۷۸۔

(۳۳) الانتقاد ص ۱۹۔

(۳۴) تاریخ التمدن الاسلامی ج ۲، ص ۳۲۔

(۳۵) ایضاً ص ۳۰۔

(۳۶) مقالات شبلی ج ۴، ص ۱۴۲۔

(۳۷) ایضاً۔

(۳۸) تاریخ التمدن الاسلامی ج ۲، ص ۱۹۔

(۳۹) ایضاً۔

(۴۰) ملاحظہ کتاب الجزیہ، مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۴ء و مقالات شبلی ج ۱ ص ۲۲۱-۲۳۱۔

(۴۱) الانتقاد ص ۳۲، ۳۳۔

(۴۲) تاریخ التمدن الاسلامی ج ۲ ص ۲۰۔

(۴۳) الانتقاد ص ۳۵۔

(۴۴) مقالاتِ شبلی ج ۴، ص ۱۷۳۔

(۴۵) ایضاً ص ۱۷۵۔

(۴۶) تاریخ التمدن الاسلامی ج ۲، ص ۵۳۔

(۴۷) الانتقاد ص ۲۶-۳۶۔

(۴۸) ایضاً ص ۵۳۔

(۴۹) مقالاتِ شبلی ج ۶ ص ۱۱۵، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۱۹۵۱ء۔

(۵۰) الانتقاد ص ۶۴، ۶۵۔

(۵۱) تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳، ص ۵۱۔ مطبوعہ الہلال مصر ۱۹۶۸ء

(۵۲) مقالاتِ شبلی ج ۴، ص ۱۴۲۔

(۵۳) ماہنامہ الندوہ لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۰۸ء ص ۱۷۔

(۵۴) مقالاتِ شبلی ج ۴، ص ۱۵۴-۱۵۷۔

(۵۵) ماہنامہ الندوہ، اکتوبر ۱۹۰۸ء ص ۱۷۔

(۵۶) ایضاً ص ۱۶۔

(۵۷) ایضاً ص ۱۸۔

(۵۸) مقالاتِ شبلی ج ۴، ص ۱۳۴۔

(۵۹) حیاتِ شبلی ص ۵۸۱۔

(۶۰) البصیر شبلی نمبر ص ۱۲۵۔

(۶۱) مکاتیبِ شبلی ج ۲، ص ۲۵۸۔

(۶۲) حیاتِ شبلی ص ۵۸۲۔

سیرت کا سرورق

سیرۃ النبیؐ

سیرۃ النبیؐ علامہ شبلی کی آخری مگر سب سے زیادہ مہتم بالشان اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ وہ خود بھی اسے اپنی زندگی کا حاصل اور وسیلہ نجات خیال کرتے تھے۔(۱) اس کی تالیف وتدوین میں ان کا جذبہ خلوص اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر معمولی عقیدت وشیفتگی بھی شامل ہے اور یہ ان کے وسعت مطالعہ، غور وفکر، دقت نظر، تحقیق وتدوین، تلاش وتفحص، مورخانہ اجتہاد وبصیرت، حسن استدلال، ادبی لطافت اور اسلوب نگارش کی دلآویزی کا نمونہ بھی ہے۔ اس لئے یہ بڑی اہم، جامع اور عدیم المثال تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا ہے کہ یہ کتاب اپنی خصوصیات میں سیرت کے سارے ذخیرہ کتب میں خواہ وہ کسی بھی زبان میں لکھی گئی ہوں، منفرد حیثیت رکھتی ہے، حتی کہ عربی زبان میں بھی اس نوعیت کی ایسی جامع سیرت نہیں لکھی گئی۔(۲)

قبول عام اور مختلف اشاعتیں

گو علامہ شبلی کی سیرۃ النبیؐ تقریباً سو برس پہلے لکھی گئی ہے، لیکن ابھی تک اس کی شہرت ومقبولیت اور معنویت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ ہند وپاک سے اس کے بے شمار ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ جن اشاعتوں کا علم ہوسکا اس کی تفصیل یہ ہے:

جلد اول

[۱] ▪ نامی پریس کان پور ۱۹۱۸ء ۱۴۵ص، طبع اول

[۲] ▪ دار المصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۴۵ء ۵۶۱ص

[۳]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۶۱ء	۶۲۲ص، طبع ششم
[۴]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۶۲ء	۶۲۲ص
[۵]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۷۱ء	۶۲۲ص
[۶]	▪ مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور	۱۹۷۵ء	
[۷]	▪ دینی کتب خانہ، لاہور	۱۹۷۵ء	
[۸]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۷۶ء	۶۲۲ص
[۹]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۷۷ء	۶۲۲ص
[۱۰]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۸۱ء	۶۲۲ص
[۱۱]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۸۳ء	۶۲۲ص
[۱۲]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۸۴ء	۶۲۲ص
[۱۳]	▪ دارالاشاعت، کراچی	۱۹۸۵ء	
[۱۴]	▪ بریڈفورڈ بک سینٹر، لاہور	۱۹۸۵ء	
[۱۵]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۸۷ء	۶۲۲ص
[۱۶]	▪ مکتبہ الفیصل، لاہور	۱۹۹۱ء	
[۱۷]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۹۶ء	۲۷۲ص
[۱۸]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۰۳ء	۴۸۱ص
[۱۹]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۱۱ء	۵۰۸ص

جلد دوم

[۱]	▪ نامی پریس، شہر کان پور	۱۹۱۸ء	۳۵۱ص طبع اول
[۲]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۲۰ء	۳۵۱ص
[۳]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۵۰ء	۴۳۹ص
[۴]	▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۵۵ء	۴۴۰ص طبع پنجم

[۵]	▪ دار المصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۶۳ء	۴۴۰ص طبع ششم
[۶]	▪ دار المصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۶۹ء	۴۴۰ص
[۷]	▪ دار المصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۷۶ء	۴۴۰ص
[۸]	▪ دار المصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۷۸ء	۴۴۰ص
[۹]	▪ دار المصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۸۱ء	۴۴۰ص
[۱۰]	▪ دار المصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۸۴ء	۴۴۰ص
[۱۱]	▪ بریڈفورڈ بک سینٹر، لاہور	۱۹۸۵ء	
[۱۲]	▪ دار المصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۸۷ء	۴۴۰ص
[۱۳]	▪ مکتبہ الفیصل، لاہور	۱۹۹۱ء	
[۱۴]	▪ دار المصنّفین، اعظم گڑھ	۱۹۹۷ء	۴۹۰ص
[۱۵]	▪ دار المصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۰۳ء	۳۸۰ص
[۱۶]	▪ دار المصنّفین، اعظم گڑھ	۲۰۱۱ء	۳۹۲ص

سیرۃ النبی اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے ضمنی مباحث اور مشمولات کو کتابی صورت میں علاحدہ شایع کیا گیا۔ جیسے:

[۱]	آفتاب رسالت	نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد	غیر مورخہ
[۲]	اخلاق نبی	نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد	غیر مورخہ
[۳]	عبادت	گلاب پبلشرز لاہور	غیر مورخہ
[۴]	عقائد	گلاب پبلشرز لاہور	غیر مورخہ
[۵]	غزواۃ النبی	مکتبہ قادریہ، لاہور	۱۹۸۱ء
[۶]	غزوہ احد	نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد	غیر مورخہ
[۷]	غزوہ بدر	نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد	غیر مورخہ
[۸]	فطرۃ الاسلام	لال باغ کوٹھی لکھنو	غیر مورخہ
[۹]	معجزات نبوی	نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد	غیر مورخہ

[۱۰] مقدمہ سیرۃ النبیؐ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۹۹ء

[۱۱] ہجرت مدینہ گلاب پبلشرز لاہور غیر مورخہ

تراجم

سیرۃ النبیؐ کا دنیا کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ اس لحاظ سے بھی ایک منفرد کتاب ہے۔

انگریزی تراجم

علامہ شبلی کی خواہش تھی کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تا کہ یورپ کے خیالات کی اصلاح ہو سکے۔ (۳)

[۱] انگریزی ترجمہ کی متعدد کوششیں ہوئیں، لیکن یہ سعادت جناب فضل الرحمٰن نے حاصل کی۔ انہوں نے سیرۃ النبیؐ کی دونوں جلدوں کو انگریزی قالب عطا کیا۔ جسے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی نے علی الترتیب ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔

[۲] دوسرا انگریزی ترجمہ طیب بخش بدایونی کے قلم سے ہے۔ جو قاضی پبلشرز لاہور سے ۱۹۷۹ء [جلد اول] اور ۱۹۸۰ء [جلد دوم] میں شائع ہوا۔ اسی ترجمہ کو دہلی کے ادارہ ادبیات دلی نے بھی ۱۹۷۹ء [جلد اول] اور ۱۹۸۳ء [جلد دوم] میں شایع کیا۔

[۳] سیرۃ النبی جلد اول کا ایک اور انگریزی ترجمہ جناب سبطین احمد بدایونی نے کیا ہے جسے الفلاح کراچی نے شایع کیا ہے۔ ۳۷۹ صفحے کے اس ترجمہ پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔

[۴] سیرۃ النبی کا چوتھا انگریزی ترجمہ Peace be upon him کے نام سے محمد سعید صدیقی نے کیا۔ اسے کتاب بھون دہلی نے ۲۰۰۰ء میں شایع کیا۔

[۵] سیرۃ النبی کے ترجمہ وتلخیص پر مبنی ایک اور انگریزی کتاب (Last Prophet & his Teachings) جناب عبدالمجید کے قلم سے ہے۔ جسے نور پبلی کیشنز دہلی نے ۱۹۶۶ء میں شایع کیا۔

[۶] مقدمہ سیرۃ النبی میں علامہ شبلی نے روایت ودرایت پر جو بحث کی ہے اسے جامعۃ

الفلاح کراچی نے انگریزی میں (Method of Sifting Prophetic Tradition Rivayat & Dirayat or Internal & External Evaluation) کے نام سے ۱۹٦٦ء میں شایع کیا۔

پشتو ترجمہ

[۷] انگریزی ترجمہ کی طرح پشتو زبان میں بھی سیرۃ النبیؐ کے کئی ترجمے ہوئے۔ برہان الدین کشلکی نے ابتدائی دونوں جلدوں کا ترجمہ کیا جو پشتو تولنہ کابل سے علی الترتیب ۱۳۲٦ھ اور ۱۳۲۸ھ میں شائع ہوئے۔

[۸] سیرۃ النبیؐ کو عزیز الرحمٰن سیفی نے بھی پشتو میں منتقل کیا۔ دونوں جلدوں کا یہ ترجمہ بھی پشتو تولنہ کابل سے ۱۳۵۰ھ اور ۱۳۵۴ھ میں شائع ہوا۔

[۹] جلد اول کا ایک اور پشتو ترجمہ محمد اسرائیل کے قلم سے ہے۔ اسے پشتو اکیڈمی پشاور نے ۱۹٦۹ء میں شائع کیا۔

[۱۰] پشتو زبان میں آخری پیغام بر کے نام سے ایک اور ترجمہ ہوا ہے۔ جسے ۱۹۵۸ء میں پشتو اکیڈمی پشاور نے شایع کیا ہے، مگر مترجم کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

مراٹھی ترجمہ

[۱۱] منشی محمد اسماعیل بھالدار نے جلد اول کو مراٹھی میں منتقل کیا۔ مزید تفصیل نہ مل سکی۔

تمل ترجمہ

[۱۲] بی. داؤد شاہ اور حافظ محمد یوسف فاضل باقوی نے سیرۃ النبیؐ کو تمل لباس عطا کیا۔ یہ ترجمہ کتب خانہ دارالسلام مدراس نے گارڈن پریس سے طبع کرا کے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا۔

ترکی ترجمہ

[۱۳] ترک شبلی شناس محمد عمر رضا آفندی نے سیرۃ النبی کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا۔ جسے کتب خانہ آثار علمیہ قسطنطنیہ نے ۱۹۲۸ء میں شائع کیا۔

[۱۴] سیرۃ النبی کا ایک اور ترکی ترجمہ کتب خانہ ناویزی استانبول نے ۱۹۷۳ء میں شایع کیا جو عمر رضا دوگرل، عثمان زکی اور ملا محمد گل کا مشترکہ ترجمہ ہے۔

عربی ترجمہ

[۱۵] انگریزی کی طرح عربی ترجمہ کی بھی کئی اہل قلم نے کوشش کی تاہم یہ سعادت مولانا محمد اسماعیل مدراسی مرحوم کے حصے میں آئی۔ وہ جب مصر میں مقیم تھے سیرۃ النبیؐ کے ترجمہ کا آغاز کیا۔ پھر وہ الجزائر منتقل ہو گئے، یہیں وہ ترجمہ پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ یہیں مترجم نے وفات پائی، ان کا علمی اثاثہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ منتقل ہوا تو اس میں سیرت کا ترجمہ بھی تھا، اس کی ایک نقل جناب ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی صاحب نے دار المصنّفین کو فراہم کی۔ یہ ترجمہ اب تک شائع نہ ہو سکا۔ اس کی نقل راقم کی نظر سے گذری ہے۔

[۱۶] عربی میں ایک ترجمہ دائرۃ معارف فی سیرۃ النبی کے نام سے ۲۰۰۵ء میں قاہرہ سے شایع ہوا۔ اس کے مترجم کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

[۱۷] سیرۃ النبی کا طویل دیباچہ اپنے مباحث کے لحاظ سے کسی تصنیف سے کم درجہ نہیں رکھتا، جناب ڈاکٹر محمد علی غوری نے اس کو فن السیرۃ النبویہ تاریخ واصول کے نام سے عربی میں منتقل کیا، جسے مرکز جمعة الماجد للثقافة، دبئی نے ۲۰۱۱ء میں شایع کیا ہے۔

فارسی ترجمہ

[۱۸] سیرۃ النبی کا ایک فارسی ترجمہ ''فروغ جاوداں'' کے نام سے زاہدان ایران سے ۲۰۰۲ء میں شایع ہوا۔ اس کے مترجم ابوالحسین عبدالماجد مرادزہی خاصی ہیں۔

تلخیصات

ان تراجم کے علاوہ سیرۃ النبی کی کئی تلخیصات بھی شایع ہوئیں۔ ۱۹۴۷ء میں ایک تلخیص شایع ہوئی جس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ پھر ۱۹۶۵ء میں احسان بی، اے نے دوسری تلخیص ادبستان لاہور سے شایع کی۔ تیسری تلخیص مولانا عبدالسلام قدوائی نے کی جو شایع نہ ہو سکی اور

دارالمصنّفین میں محفوظ ہے۔ چوتھی تلخیص بنگالی زبان میں ہے۔ جومولانا محی الدین خاں کا کارنامہ ہے۔ سیرت کی ساتوں جلدوں کی یہ تلخیص ۷۳۶ صفحات پر مشتمل ہے یہ ڈھاکہ بنگلہ دیش سے ۱۹۹۷ء میں شایع ہوئی ہے۔ پانچویں انگریزی تلخیص طیب بخش بدایونی کے انگریزی ترجمہ کی ہے۔اسے رائٹ وے پبلی کیشن دہلی نے ۲۰۰۱ء میں شایع کیا۔اس کا دوسرا اڈیشن مکتبہ قرآنیات اردو بازار لاہور سے ۲۰۰۵ء میں شایع ہوا۔ چھٹی تلخیص رفیق عبدالرحمٰن نے کی ہے اور دارالاشاعت کراچی سے چھپی ہے۔

ان تراجم اور تلخیصات نے سیرۃ النبیؐ کا شہرہ تمام علمی دنیا میں پہونچا دیا۔

ذات نبویؐ سے علامہ شبلی کی عقیدت

علامہ شبلی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ابتداء ہی سے خاص عقیدت ومحبت اور والہانہ شیفتگی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے بقول ''اس نام نامی کے ساتھ ان کی عقیدت کی کوئی حد پایاں نہ تھی۔(۴) اس کا اظہار بھی شعوری ولاشعوری طور پر ہوتا رہا۔ ۱۹/سال کی عمر میں حج بیت اللہ کے موقع پر روضہ اطہر کے سامنے منظوم نذرانہ پیش کیا، جو گذشتہ صفحات میں درج ہو چکا ہے۔اس دور کی ان کی ایک فارسی نعت مولوی محمد عمر بینا پارہ کی بیاض سے ملی تھی اور جو کلیات میں شامل [ص ۹۵] بھی ہے۔ بڑی اہم نعت ہے۔اس کے ایک ایک مصرعے سے شاعر کے عشق رسول کا اظہار ہوتا ہے۔شیخ اکرام نے اس کی بڑی تحسین کی ہےاور لکھا ہے کہ اس میں وہ عشق رسول موجزن ہے جس نے شاعر کو بالآخر سیرت نگار نبوی بنا دیا۔[یادگار شبلی ص ۶۷]

علی گڑھ کے زمانہ قیام میں عربی میں ان کے قلم سے جو تحریر سب سے پہلے نکلی وہ تاریخ بدءالاسلام تھی۔جس کا تعلق اصلاً سیرت ہی سے ہے۔ یہ سرسید کی فرمائش پر عربی زبان میں درسی ضرورت کے پیش نظر ۱۸۹۱ء میں لکھی گئی۔(۵) اور عرصہ تک کالج کے نصاب میں شامل رہی۔ مقتدی خاں شروانی نے اسے سیرۃ النبیؐ کا تخم قرار دیا ہے۔(۶) سرسید احمد خاں کی فرمائش پر علامہ حمیدالدین فراہی نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔اور یہ بھی داخل نصاب رہا۔ ۱۹۱۵ء میں اسی فارسی ترجمہ کا اردو ترجمہ ''آغاز اسلام'' کے نام سے میمونہ سلطان شاہ بانو [ف:۴/فروری ۱۹۶۰ء] نے

کیا۔اردو میں ایک اور ترجمہ تاج کمپنی کراچی نے شائع کیا۔(۷)اس کے بارے میں ڈاکٹر انور خالد محمود لکھتے ہیں:

> ''اس رسالہ نے نہ صرف طلبہ کے دلوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عقیدت و محبت کے جذبات پیدا کئے، بلکہ خود مصنف کے دل میں عشق رسول کی قندیل روشن کر دی۔''(۸)

چنانچہ مولانا شبلیؒ نے کالج میں میلاد کی مجلسوں میں سیرت نبویؐ پر تقریروں کا سلسلہ شروع کیا۔ بعد میں میلاد کی یہ تقریبات نہایت شان وشوکت کے ساتھ سالار منزل میں منعقد ہونے لگیں۔(۹) یہ سلسلہ ابتک قائم ہے۔ یونیورسٹی میں جلسہ سیرت نہایت اہتمام سے منعقد ہوتا ہے اور یونیورسٹی کا ایک نہایت اہم فنکشن تصور کیا جاتا ہے۔

علامہ شبلی نے اپنے اشعار وقطعات میں بھی ذات نبویؐ سے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار کیا۔سیرۃ النعمان کے منظوم دیباچہ [ص۶] میں ان کا عشق حد انتہاء پر دکھائی دیتا ہے:

شیفتگا نیم و پیمبر پر ست
سجد ہ اگر نیست ز میں بوس ہست

حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں بھی جب وہ علم الکلام کی تدوین وتصنیف میں مشغول تھے ۔سیرت نبویؐ ان کی توجہ کا خاص مرکز رہی اور سب سے پہلے یہیں سیرۃ النبیؐ کی ابتداء بھی کی۔(۱۰) اور ۳ھ تک کے واقعات مورخانہ انداز میں لکھے،مگر مولانا سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ وہ جس انداز سے سیرت نبویؐ لکھ رہے تھے غالبًا وہ خود انہیں پسند نہیں آیا اور آگے نہ لکھ سکے۔(۱۱) ان کی نگاہ میں سیرت نبویؐ کی تالیف وتدوین کا معیار بہت بلند تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ سوانح عمری ایسی لکھنی چاہئے جس سے صاحب سوانح کا پایہ اونچا نظر آئے،لیکن ہم مسلمانوں کے دلوں میں سرور کائناتﷺ کی عقیدت کا پایہ اتنا اونچا ہے کہ کوئی کتاب اس کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتی،اس لئے سیرت کی کوئی کتاب مشکل ہی سے معیار پر پوری اتر سکتی ہے۔(۱۲)

علامہ شبلی نے جب ناموران اسلام کا سلسلہ شروع کیا تو بقول مولانا سید سلیمان ندوی ''بارہا ان کے اور دوسروں کے دل میں خیال آیا کہ ان ناموروں سے پہلے سب سے اول اس

نامور کا نام آنا چاہئے جس کی ناموری نے ان سب کو نامور بنایا۔'' (۱۳) مگر یہ ایک ایسا اہم اور نازک فریضہ تھا کہ علامہ شبلی باوجود اس کی اہمیت وافادیت اور ذات گرامیؐ سے عشق کے عرصہ تک اس کے ادا کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ (۱۴) کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ آنحضرت ﷺ کے واقعات میں ایک حرف بھی صحت کے اعلیٰ معیار سے ذرا اتر جائے تو سخت جرم ہے۔ (۱۵)

اس شدید احساس کے باوجود متعدد اسباب کی بنا پر سیرت نبویؐ کی ضرورت کا خیال ان کے دل میں برابر جاگزیں رہا اور قوم کی طرف سے بھی ان سے پیہم اصرار ہوتا رہا جس کی بنا پر سیرت نبویؐ کی تالیف کا عزم مصمم کر لیا اور جنوری ۱۹۱۲ء میں ماہنامہ الندوہ لکھنؤ میں 'مجلس تالیف سیرت' کے قیام کا اعلان اور قوم سے اس میں معاونت کی خواہش کی۔

تالیف سیرت کے مقاصد وضروریات

ذیل میں ان اسباب ومقاصد کا ذکر کیا جاتا ہے، جو سیرۃ النبیؐ جیسی معرکہ آراء اور بے مثال کتاب کی تالیف کا باعث بنے۔

۱- تالیف سیرت کا پہلا سبب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے علامہ شبلی کی عقیدت ومحبت کا بے پایاں جذبہ تھا اور وہ اس کو سعادت دارین کا ذریعہ اور وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> ''سیرۃ النبیؐ بنیادی طور پر ایک عاشق رسولؐ کا والہانہ اظہار عقیدت ہے۔ .... یہ ایک گدائے بے نوا کی شہنشاہ کونین کے دربار میں اخلاص وعقیدت کی نذر ہے جس کی فرط عقیدت پکار پکار کر کہہ رہی ہے:
>
> ز چشمم آستیں بردار وگوہر را تماشا کن (۱۶)

مگر سیرۃ النبیؐ صرف ایک عقیدت مند کا نذرانۂ عقیدت ہی نہیں ہے بلکہ دور جدید کے معیار ومذاق کے مطابق بھی ایک اہم تصنیف ہے۔

۲- تالیف سیرت کا دوسرا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کے پاس اردو زبان میں سیرت پر کوئی معتبر، مستند اور جامع کتاب نہ تھی اور جو کتابیں تھیں علامہ شبلی کے الفاظ میں ''انھیں سیرت نبویؐ

کہنا آنحضرت ﷺ کی روح مبارک کو آزردہ کرنا ہے۔'' (۱۷) اس لئے یہ ایک اہم قومی اور دینی ضرورت تھی کہ اردو میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک مکمل مستند اور جامع کتاب لکھی جائے۔

۳- اردو ہی نہیں دوسری زبانوں میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مستند اور دور جدید کے معیار و مذاق کے مطابق سوانح عمری موجود نہ ہونے کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو عربی علوم وفنون سے ناواقف تھا، انگریزی کتابوں کی طرف رجوع کرتا تھا، جو نہ صرف یہ کہ صحیح نقطۂ نظر سے نہیں لکھی گئی تھیں بلکہ ان میں جا بجا زہر بھی بھرا ہوا تھا۔ جن کو پڑھ کر لوگ گمراہ ہو رہے تھے اور رفتہ رفتہ ملک میں جدید دانشوروں کا ایک ایسا طبقہ بھی وجود میں آ گیا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یورپ کے معیار کے مطابق محض ایک مصلح تصور کرتا تھا۔ (۱۸) اس لیے ضرورت تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مستند حالات وسوانح جدید طرز کے مطابق اس طرح لکھے جائیں کہ نیا تعلیم یافتہ طبقہ اس سے اپنی علمی پیاس بجھا سکے۔

۴- علامہ شبلی کے نزدیک سیرت نبویؐ کی ضرورت صرف تاریخی حیثیت ہی سے نہیں تھی بلکہ مستشرقین نے جب اس کو اپنا موضوع بنایا تو انھوں نے اس کے جلو میں عقائد کی بحثیں بھی شامل کر لی تھیں۔ گویا سیرت جدید علم کلام کا ایک اہم موضوع ہو گیا تھا۔ چنانچہ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> ''اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا لیکن معترضین حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو یہ بحث یہیں تک رہ جاتی ہے لیکن اگر اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی اور سفیر الٰہی تھا اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے۔'' (۱۹)

دراصل سیرت نبویؐ کی تالیف کا یہ نہایت اہم سبب ہے اور علامہ شبلی اس کو تمام دینی ودنیوی ضروریات کا مجموعہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک علمی ضرورت ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے اور مختصر یہ کہ مجموعہ ضروریات دینی ودنیوی ہے۔'' (۲۰)

۵- علامہ شبلی نے سیرۃ النبیؐ کی تالیف کا بنیادی مقصد اوراس کی اصل غرض وغایت نفوس انسانی کے اخلاق وتربیت کی اصلاح وتکمیل بتایا ہے اوراسے وہ کائنات کا سب سے اہم اور مقدس فریضہ تصور کرتے تھے۔ان کے نزدیک اس کا سب سے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ فضائل اخلاق کا ایک پیکر مجسم سامنے آجائے جوخود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو۔دنیا کی تاریخ میں ان کے نزدیک ایسی جامع اور کامل ہستی صرف حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔کیوں کہ نفوس انسانی میں صرف آپ ہی کے حالات اور کارنامۂ زندگی نہایت وسعت وتفصیل اورصحت وصداقت کے ساتھ قلم بند کئے گئے ہیں۔یہاں تک کہ آپ کی ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی۔(۲۱)

٦- علامہ شبلی کا یہ بھی خیال تھا کہ علوم وفنون میں سیرت کا ایک خاص درجہ ہے اوراس کی غرض وغایت عبرت پذیری ہے۔اس لئے اس وجودمقدس کی سوانح عمری کی ضرورت نہ صرف ہم مسلمانوں کو ہے بلکہ تمام عالم کواس کی ضرورت ہے۔(۲۲)اورغالبًا اسی لئے وہ چاہتے تھے کہ سیرت میں ہرقسم کے مطالب آجائیں اوروہ صرف سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلوپیڈیا ہو۔(۲۳)

۷- نفوس انسانی کی تربیت واصلاح ہی کی غرض سے علامہ شبلی مورخین یورپ کے کذب وافترا اوران کی غلطیوں کی تردید کرنا چاہتے تھے۔یہ صحیح ہے کہ اس میں حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی عقیدت ومحبت اوران کی دینی حمیت وغیرت کوبھی بڑا دخل تھا تاہم اس کے پس پشت اصل مقصد اسلام کی حقیقی عظمت وبلندی کے ساتھ مورخین یورپ کے خیالات کی اصلاح ہی تھااوراسی لئے وہ سیرت النبیؐ کے انگریزی ترجمہ کے آرزومند بھی تھے۔ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> ''سیرت نبویؐ کی اشاعت کی ضرورت سب سے زیادہ یورپ میں ہے تاکہ
> یورپ کے خیالات کی اصلاح ہوسکے۔''(۲۴)

بالآخرعلامہ شبلی کومذکورہ اسباب ومقاصد اورقوم کے پیہم اصرار اورشدید تقاضے نے کہ ''وہ سب کام چھوڑ کر سیرت نبویؐ کی تالیف میں مصروف ہوجائیں۔''(۲۵) مجبور کردیا کہ وہ سیرت نبویؐ پرایک جامع،مستند،مکمل اورمبسوط کتاب کی تالیف کا گراں بار فریضہ انجام دیں۔لیکن جیسا کہ پہلے واضح کیا جاچکا ہے علامہ شبلی کی نظر میں تالیف سیرت کا معیار بہت بلند تھا۔اس لئے یہ بڑا دقت طلب اورمشکل کام تھا۔ان کی نگاہ اس حقیقت پربھی تھی کہ ''آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں

لکھی گئی جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا۔'' (۲۶) وہ لکھتے ہیں:

''جس طرح امام بخاری ومسلم نے یہ التزام کیا ہے کہ کوئی ضعیف حدیث بھی اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے، اس طرح سیرت کی تصنیفات میں کسی نے یہ التزام نہیں کیا ہے۔ آج بیسیوں کتابیں قدماء سے لے کر متاخرین تک کی موجود ہیں۔ مثلاً سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، سیرت ابن سید الناس، سیرت دمیاتی، حلبی، مواہب لدنیہ، کسی میں یہ التزام نہیں ہے۔'' (۲۷)

اس قدر بلند معیار پر سیرت نبویؐ کی تالیف وتدوین واقعتاً فرد واحد کے بس کی بات نہ تھی اور شاید اسی احساس کے پیش نظر علامہ شبلی نے تجویز پیش کی کہ ''مجلس تالیف سیرت نبویؐ'' بنائی جائے۔ جس کے علمی ومالی معاملات کے لئے باقاعدہ ایسے ارکان ہوں جو مربی بن کر کم از کم ایک ہزار یکمشت یا دس روپئے ماہوار دیں، یا عام ارکان ایک روپیہ ماہوار عنایت کریں تاکہ مصنفین یورپ نے جو کتابیں سیرت میں لکھی ہیں ان کو یکجا کیا جا سکے اور کچھ مترجم ہوں جو ان کو پڑھ کر ان کے اعتراضات کا خلاصہ کر سکیں اور کچھ علماء ہوں جو روایات کی تلاش وتنقید اور چھان بین کا کام کریں، کچھ مسودہ نویس ہوں جو مسودوں کو صاف کریں۔ اس لائحہ عمل کی صراحت کے بعد انھوں نے اخراجات کے لئے قوم سے ڈھائی سو ماہوار اور کتابوں کی خریداری کے لئے یک مشت کی درخواست کی۔ [مقالات شبلی ج ۸ ص ۴۳۔ طبع جدید ۲۰۱۰ء] عجیب بات ہے کہ شاہ شاہان کی سیرت نگاری کے لئے شبلی بے نوا کی اس درخواست پر ایک فرمانروائے ریاست نے اول اول لبیک کہا۔ چنانچہ کتابوں کی خریداری کے لئے نواب حمید اللہ خاں بھوپال نے دو ہزار روپئے عنایت کئے اور زبیدۂ وقت نواب سلطان جہاں بیگم فرماں روائے بھوپال نے تدوین سیرت کے لئے دو سو ماہوار منظور کر کے مصارف کی طرف سے علامہ شبلی کو مطمئن کر دیا۔ انھوں نے اسی موقع پر یہ قطعہ کہا تھا:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف وتنقید روایت ہائے تاریخی

تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے میری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

علمی معاونت کے لئے انھوں نے مولانا حمید الدین فراہیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالسلام ندویؒ اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ وغیرہ کو منتخب کیا۔ غرض ہر طرف سے مطمئن ہو کر آستانۂ رسالت میں پہنچے اور ۱۷رجون ۱۹۱۲ء کو انتہائی جوش و سرمستی اور عزم و حوصلہ کے ساتھ سیرۃ النبیؐ کی ابتداء کی۔ منشی محمد امین زبیری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ہر حالت میں کام جاری رکھوں گا اور اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو انشاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہوسکتی۔'' (۴۸)

ان کے جذبات اور عزم و حوصلہ کا اندازہ مندرجہ ذیل قطعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حال سرورِ عالم ۔۔۔ دبیر چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے
صدا یہ بارگاہِ عالم قدوس سے آئی ۔۔۔ کہ ہے یہ اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے

سیرت نبویؐ کا خاکہ

اس انتظام کے بعد علامہ شبلی اس عظیم الشان تالیف کے ابتدائی خطوط اور خاکے بنانے میں مصروف ہوئے۔ ایک کے بعد ایک خاکے بنائے۔ بالآخر جس خاکے پر وہ مطمئن ہوئے، اس کا ذکر سیرت کے مقدمہ میں ان کے قلم سے یوں ہے:

''اس کتاب کے پانچ حصے ہوں گے۔ پہلے حصے میں عرب کے مختصر حالات، کعبہ کی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لے کر وفات تک کے عام حالات اور واقعات و غزوات ہیں۔ اسی حصہ کے دوسرے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی اخلاق و عادات کی تفصیل ہے۔ آل و اولاد اور ازواج مطہرات کے حالات بھی اسی باب میں ہیں۔''

دوسرا حصہ منصب نبوت سے متعلق ہے۔نبوت کا فرض،تعلیم عقائد،اوامر ونواہی، اصلاح اعمال واخلاق ہے، اس بنا پر منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے۔اس حصہ میں فرائض خمسہ اور اوامر ونواہی کی ابتدا اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ وموازنہ ہے۔اسی میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق وعادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں۔ نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا اور کیوں کر وہ تمام عالم کے لئے اور ہر زمانہ کے لئے کافی ہوسکتا ہے۔

تیسرے حصہ میں قرآن مجید کی تاریخ،وجوہ اعجاز اور حقائق واسرار سے بحث ہے۔

چوتھے حصہ میں معجزات کی تفصیل ہے۔قدیم سیرت کی کتابوں میں الگ باب باندھے ہیں لیکن آج کل تو اس کو بالکل مستقل حیثیت سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ معجزات کے ساتھ اصل معجزہ کی حقیقت اور امکان سے بحث کرنے بھی ضرورت پیش آئے گی۔البتہ جن معجزات کی تاریخ اور سنہ متعین ہے مثلاً معراج یا تکثیر طعام وغیرہ ان کو اس سنہ کے واقعات میں لکھ دیا ہے۔

پانچواں حصہ خاص یورپین تصنیفات کے متعلق ہے۔یعنی یورپ نے آنحضرت ﷺ اور مذہب اسلام کے متعلق کیا لکھا ہے؟ مسائل اسلام کے سمجھنے میں ان سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں؟ آنحضرت ﷺ کے اخلاق وعادات یا مسائل اسلام پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں ان کے جواب۔‘‘(۲۹)

اس ضمن میں یہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ علامہ شبلی نے سیرۃ النبیؐ کی تالیف وتدوین اس وقت شروع کی جب ان کی زندگی کی شام ہو چکی تھی۔گونا گوں عوارض،صحت کی خرابی، خانگی مسائل، بھائی کی وفات،مخالفین کی سازشیں اور سب سے بڑھ کر قومی وملی درد نے انہیں چور کر دیا تھا۔صحت، خانگی مسائل اور ماحول کی اس ناموافقت ونامساعدت کے باوجود انھوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر سیرت نبویؐ کی تالیف کا کام شروع کیا۔(۳۰) اور لکھا کہ ’’سیرت کو جس

طرح ہو (گو جان دے کر) پورا کرنا ہے۔'' (۳۱) واقعہ یہ ہے کہ اسی تصنیف پر وہ اپنی زندگی کا خاتمہ بھی چاہتے تھے اور اسے حسن خاتمہ تصور کرتے تھے۔(۳۲) وفات سے چندماہ پیشتر انھوں نے یہ الہامی قطعہ کہا جس کی صداقت اب سب پر آشکارا ہے۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی　　مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہاہوں سیرت پیغمبر خاتم　　خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

ہماری علمی تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ علامہ شبلی سیرۃ النبیؐ مکمل نہ کر سکے اور دنیا سے ناتمامی کا داغ لے کر گئے۔ان کی تالیف کردہ دوجلدیں ان کی وفات کے وقت مسودہ کی حالت میں طباعت کی منتظر تھیں۔۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۰ء میں یہ جلدیں شائع ہوئیں۔جلداول کے دیباچہ میں مولانا سیدسلیمان ندوی نے بڑی حسرت سے لکھا ہے کہ:

''مصنف اپنی چارسال کی جانکاہ محنت کا ثمرہ خود اپنے ہاتھوں سے قوم کی نذر نہ کرسکا اور حسن عقیدت کے جو پھول سیکڑوں چمن کدوں سے چن کر اس کے ہاتھ آئے تھے، ان کو آستانۂ نبوت پر وہ خود نہ چڑھاسکا۔'' (۳۳)

مگر شکر ہے کہ علامہ شبلی نے جو خاکہ مرتب کیا تھا اس میں رنگ بھرنے کے لئے ان کو مولانا سیدسلیمان ندوی جیسا لائق شاگرد اور جانشیں ملا۔جس نے بعد کی پانچ ضخیم جلدوں کو بہ حسن وخوبی پورا کیا۔علامہ شبلی کے قلم سے سیرت کی دوجلدیں نکلیں یہاں پہلے ان کے مشمولات ومحتویات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حصہ اول

سیرۃ النبیؐ جلداول طبع جدید ۷۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔شروع میں دومقدمے ہیں۔ پہلا مقدمہ معلومات ومباحث اور قدر وقیمت کے لحاظ سے خود ایک تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں سیرت نبویؐ کی ضرورت، اہمیت، افادیت، سیرت ومغازی اور حدیث کا فرق، سیرت نگاری کی ابتدا اور ارتقا، قدیم وجدید سیرت نگار اور ان کی سیرت نگاری اور ان کی خوبیاں وخامیاں اوران کے اصول سیرت نگاری کا ذکر ہے۔ حدیث اوراصول حدیث کا مفصل جائزہ اورمغربی

مورخین اور سیرت نگاروں کی تصانیف، ان کی غلط کاریاں اور اس کے اسباب کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ان اصولوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن کا سیرۃ النبیؐ کی تالیف میں خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ اس مقدمہ کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے عالمانہ تنقید کا شاہکار قرار دیا ہے۔(۳۴) ڈاکٹر سید شاہ علی نے لکھا ہے کہ سارے اسلامی ادب میں اس مقدمہ کی شاید ہی کوئی مثال مل سکے۔(۳۵) اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر ضیاءالحسن فاروقی لکھتے ہیں:

''اس میں مصنف نے اپنی علمیت، ذہانت، گہرے مطالعہ، تنقیدی صلاحیت اور مورخانہ ژرف نگاہی سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سیرت نبویؐ پر قلم اٹھانے کا حق انہیں کا تھا۔''(۳۶)

دوسرے مقدمہ میں تاریخ عرب قبل از اسلام، عرب کی وجہ تسمیہ، اقوام وقبائل کے علاوہ اس عہد کی سیاسی، مذہبی، تہذیبی، معاشرتی اور تمدنی تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔ خانۂ کعبہ کی تعمیر اور اس کی قدامت، نیز حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے کا تذکرہ بھی ہے۔ اس دوسرے مقدمہ کو اصل کتاب کا ابتدائی باب بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

ان دونوں مقدموں کے بعد کتاب کے آغاز میں حضور اکرم ﷺ کا شجرۂ نسب اور آپؐ کے آباء واجداد کا مختصر احوال ہے۔ اس کے بعد حضور اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت کا ظہور قدسی کے عنوان سے وہ ذکر ہے جس کو اب اردو ادب میں شہ پارے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ علامہ شبلی کے قلم سے اس میں جس جوش وسرمستی کا اظہار ہوا ہے اس سے یہ تحریر گویا الہامی بن گئی ہے۔ فرماتے ہیں:

''چمنستان دہر میں بار ہا روح پرور بہاریں آ چکی ہیں۔ چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں، لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے۔ سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنان قضا وقدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت

طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں، ابروباد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیم، جمال یوسف، معجز طرازی موسوی، جاں نوازی مسیح، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز شاہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے، ارباب سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ'' آج کی رات ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتش کدہ فارس بجھ گیا لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے، آتش کدہ فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتش کدہ کفر، آزرکدہ گمرہی سرد ہوکر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا۔ چمنستان سعادت میں بہار آ گئی۔ آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہرطرف پھیل گئیں۔ اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا''(۳۷)

ظہور قدسی کے باب میں تاریخ ولادت، اسم گرامی، رضاعت، حلیمہ سعدیہ کی پرورش، رضاعی باپ، بھائی، بہن، سفر مدینہ، والدہ ماجدہ کی وفات، دادا عبدالمطلب و چچا ابوطالب کی کفالت، سفر شام اور بحیرہ راہب کا قصہ، حرب فجار اور حلف الفضول میں شرکت، تعمیر کعبہ، تجارت اور تجارتی اسفار، تزویج خدیجہؓ، اجتناب شرک، موحدین سے ملاقات اور احباب خاص کا ذکر ہے۔

اس حصہ میں'' آفتاب رسالت کا طلوع'' کے عنوان سے نبوت کے واقعات ہیں۔ جس میں ہجرت کے پہلے کے تمام واقعات بہ ترتیب لکھے گئے ہیں، اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مراسم جاہلیت، لہو ولعب سے فطری اجتناب، غار حرا کی عبادت، رویائے صادقہ سے نبوت کا آغاز، پہلی وحی، دعوتِ اسلام کا آغاز اور حضرت ابوبکرؓ کا قبول اسلام وغیرہ کا بیان ہے، اس کے بعد قریش کو دین کی دعوت اور ان کی مخالفت وایذ ارسانیوں کا ذکر ہے بعد ازاں حضرت حمزہؓ و

حضرت عمرؓ کا قبول اسلام، تعذیب مسلمین، مسلمانوں پر ظلم وستم اور ان کا استقلال، ہجرت حبشہ اور نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر کی تقریر اور اس کا اثر، واقعہ غرانیق، شعب ابی طالب کی محصوری، حضرت خدیجہؓ اور چچا ابوطالب کی وفات کا بیان ہے۔ اسی ضمن میں سفر طائف، مطعم بن عدی کی پناہ، تبلیغ دین اور کفار کی ایذا رسانیاں، مسلمانوں کی گھبراہٹ اور آپ ؐ کی تسلی، مدینہ منورہ، انصار اور انصار کی قدیم تاریخ نیز بیعتِ عقبیٰ اولیٰ وثانیہ وغیرہ کی تاریخ لکھی گئی ہے۔

۱ھ کے ذیل میں ہجرت کے واقعات اور مدینہ منورہ میں قیام کی تفصیل ہے۔ اسی میں ہجرت کی اجازت خداوندی، ہجرت کا ارادہ اور کفار کا محاصرہ اور اس کی ناکامی، غارثور کی روپوشی اور کفار کا تعاقب، ہجرت مدینہ اور اہل مدینہ کا جوش مسرت، قبا میں نزول اور تعمیر مسجد، پہلی نماز جمعہ وخطبہ، مسجد نبویؐ کی تعمیر، ازواج مطہرات کے حجروں کی تعمیر، اذان کی ابتداء، مواخاۃ اور طریقۂ مواخاۃ، انصار کا ایثار، صفہ اور اہل صفہ اور مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ معاہدوں کی تفصیل ہے۔ اس کے بعد اس سنہ کے متفرق واقعات بھی لکھ دیے گئے ہیں۔

سنہ وار ذکر میں تحویل کعبہ اور اس کے وجوہ، غزوۂ بدر، سویق، احد، بنوقینقاع، بنونضیر، مریسیع، غزوۂ احزاب، بنوقریظہ وغیرہ کے تمام واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ اسی میں واقعۂ افک کا بھی بیان ہے۔ سلسلہ وار ذکر میں حضرت زینبؓ سے نکاح، صلح حدیبیہ، بیعت رضوان، سلاطین کو دعوتِ اسلام، خالدؓ بن ولید اور عمروؓ بن العاص کا قبول اسلام، فتح خیبر، ادائے عمرہ، غزوۂ موتہ، فتح مکہ، غزوۂ حنین، محاصرۂ طائف، واقعۂ ایلاء، غزوۂ تبوک اور حج اکبر کی تمام تاریخی، تمدنی اور تہذیبی تفصیلات قلم بند کرنے کے بعد سلسلۂ غزوات پر دوبارہ نظر ڈالی ہے۔ جس سے اسلام کے اصول جنگ کی بھی وضاحت ہوجاتی ہے۔ حصہ اول کے بارے میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے سچ لکھا ہے کہ:

> ''ان تمام حالات وواقعات کو خواہ وہ تبلیغ اسلام سے متعلق ہوں یا میدان جنگ سے، خانگی زندگی سے متعلق ہوں یا پبلک زندگی سے، پیغمبر کی حیثیت سے ہوں یا عام انسان کی حیثیت سے، دشمنوں سے متعلق ہوں یا دوستوں سے، غرض زندگی کے جس شعبے سے تعلق رکھتے ہوں اس طرح پیش کیا ہے جس سے آپؐ کی

پیغمبرانہ صداقت اوراخلاقی عظمت پوری طرح نمایاں ہوجاتی ہےاورآپ کے خلق کریم کودیکھ کرمخالف بھی آپ ؐ کی عظمت ماننے پرمجبور ہوجاتا ہے۔''(۳۸)

اس حصہ میں مورخین یورپ کی غلط بیانیوں اوراس کے بے جا اعتراضات کا جابجا رد ابطال بھی کیا گیا ہے۔

حصہ دوم

سیرۃ النبیؐ کا دوسرا حصہ طبع جدید ۵۰۷ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں حضوراکرم ﷺ کی آخری تین سالہ پرامن زندگی کی تاریخ اوراس عہدزریں کے حالات وواقعات ہیں۔شروع میں قیام امن کی کوششوں کا ذکر ہے۔اس کے بعد وفودِعرب کی آمد،قبول اسلام،تاسیس حکومت الٰہی،مذہبی انتظامات،شریعت کی تاسیس وتکمیل،اسلامی عقائد،عبادات ومعاملات،حلال وحرام، حجۃ الوداع اورشریعت کا اعلان عام،وفات نبویؐ،تجہیز وتکفین اورمتروکات وغیرہ کی تفصیل ہے۔ اسی میں حضوراکرم ﷺ کے شمائل ومعمولات،حلیہ،مہرنبوت،گفتگو،لباس،غذا،مرغوبات اورصبح سے شام تک کے معمولات کا بھی ذکر ہے۔اس کے بعد مجالسِ نبویؐ،عبادات نبویؐ،اخلاق نبویؐ، ازواج مطہرات اوران کے ساتھ برتاؤاوراولادوغیرہ عنوانات کے تحت بے شمار حالات وواقعات کے ذریعہ اس عہدزریں کی مرقع کشی کی گئی ہے،جس سے آپؐ کی پیغمبرانہ شان اوراخلاقی عظمت پوری طرح نمایاں ہوگئی ہے۔اس دوسرے حصہ کی تکمیل سے پہلے ہی علامہ شبلی سفرآخرت پرروانہ ہوگئے۔اس لئے مولاناسیدسلیمان ندوی نے اس کی تکمیل اپنے بعض اضافوں کے ذریعہ کی۔ان اضافات کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹرانورمحمودخالد لکھتے ہیں:

''جلددوم میں سیدسلیمان ندوی نے اصل متن میں جواضافے کئے ہیں وہ کتاب میں قیام امن،تبلیغ واشاعت اسلام،تاسیس حکومت الٰہی کے عنوان کے تحت شامل ہیں۔علاوہ ازیں مذہبی انتظامات،تکمیل شریعت،عقائد، عبادات،معاملات اورحلال وحرام کے مباحث میں بھی سیدصاحب نے معتدبہ اضافے کئے ہیں۔سال آخر(۱۰ھ)سال وفات،متروکات اورشمائل

نبویؐ وغیرہ میں سید صاحب نے کسی خاص اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں کی، لیکن خطابت نبویؐ اور عباداتِ نبویؐ کے ابواب مکمل طور پر اور معمولات نبویؐ اور مجالس نبویؐ کے ابواب کافی حد تک سید سلیمان ندوی کے تحریر کردہ ہیں۔ اخلاق نبویؐ کے طویل باب میں استاذ وشاگرد دونوں کا اشتراک ہے۔ البتہ آخری تینوں ابواب [آنحضرت ﷺ کے ازواج واولاد] میں شاگرد نے کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔'' (۳۹)

تحسین وتنقید

سیرۃ النبیؐ کا غلغلہ اس کے وجود میں آنے سے پہلے ہی پورے ملک میں اس سرے سے اس سرے تک بلند ہو چکا تھا اور ہر شخص کی نگاہ سیرۃ النبیؐ پر لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ جب سیرۃ النبیؐ طبع ہو کر آئی تو ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور اپنے اپنے ظرف کے پیمانوں میں تولی گئی۔ بحیثیت مجموعی اہل علم کا یہ اعتراف ہے کہ آج تک اس موضوع پر سیرۃ النبیؐ جیسی معیاری اور بلند پایہ کتاب دنیا کی کسی زبان میں نہیں لکھی جا سکی ہے۔ اس اعتراف عام اور خراج وتحسین کے ساتھ اس پر متعدد اعتراضات بھی وارد کئے گئے ہیں۔ ان اعتراضات کو معاندانہ اور غیر معاندانہ دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

معاندانہ تنقید

علامہ شبلی نے جب سیرت نبویؐ کی تالیف کا اعلان کیا تو بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ ''ہر طرف سے مسلمانوں نے اس کو لبیک کہا۔'' مگر ایک آواز اس کے خلاف بھی آئی۔ مولوی انشاء اللہ خاں (۱۸۷۰ء-۱۹۲۸ء) ایڈیٹر ''وطن'' لاہور نے لکھا کہ ''چوں کہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری (ف:۱۳۴۹ھ) اس کے لکھنے کا ارادہ کر چکے ہیں، اس لئے مولوی شبلی کو تکلیف کی ضرورت نہیں۔ (۴۰) ظاہر ہے سیرت کے لئے یہ اعلان کس درجہ غلط اور مضحکہ خیز ہے؟ اس موقع پر سر سید احمد خاں کا یہ قول بھی حد درجہ برمحل اور معنی خیز ہے کہ ''اگر ایک ہی موضوع پر دس شخص بھی لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر نرالی ہوگی۔'' (۴۱) سرسید نے اپنی یہ رائے سیرۃ النبیؐ کی تالیف سے بہت پہلے ظاہر کی تھی۔ بہر حال مولوی انشاء اللہ خاں کی نامناسب اور ضعیف آواز علامہ شبلی کے عزم وحوصلہ کے سامنے گرد

ثابت ہوئی، مگر بعض لوگ ایسے بھی تھے جن کو یہ بات پسند نہ تھی کہ فرماں روائے بھوپال کی سرپرستی میں سیرت نبویؐ پر جو کتاب لکھی جائے وہ علامہ شبلی کے قلم سے ہو اور وہ بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ ''اس کے منتظر تھے کہ سیرت نبویؐ کا کوئی صفحہ منظر عام پر آئے اور وہ اعتراضوں کی بوچھار کر دیں۔'' (۴۲)

مولانا شبلی کی خواہش کے مطابق مولانا ابوالکلام آزاد نے مقدمہ سیرت کو الہلال میں اس مقصد سے شائع کیا کہ ارباب نظر دیکھ لیں اور ملاحظہ فرمالیں کہ کتاب کس قدر تحقیق وتنقید اور تدقیق سے لکھی گئی ہے۔ انھوں نے یہ درخواست بھی کی کہ اہل علم بحث ومذاکرہ سے دریغ نہ کریں اور سیرت وتاریخ سے دل چسپی رکھنے والے علماء اپنے مفید مشورے دفتر سیرت یا الہلال تک پہنچائیں۔ (۴۳) اس سلسلہ میں دو مراسلے شائع ہوئے۔ ایک مراسلہ حکیم غلام غوث صاحب بہاولپور کا تھا۔ (۴۴) اور دوسرا مولوی محمد اسحاق صاحب مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ نے لکھا تھا۔ (۴۵) ان کے علاوہ کسی نے اس مذاکرۂ علمی میں حصہ نہیں لیا۔ مولانا آزاد نے اس پر اپنے تاسف کا بھی اظہار کیا۔ (۴۶) حالانکہ حکیم غلام غوث بہاولپوری نے علمائے دیوبند سے بھی اس میں حصہ لینے کی درخواست کی تھی۔ (۴۷) مگر معاندانہ طرزِ عمل رکھنے والوں نے اس علمی انداز کے بجائے دوسرا غیر علمی طرز اختیار کیا۔ چنانچہ مولوی عبدالشکور صاحب ایڈیٹر ''النجم'' نے مقدمہ سیرت پر اپنے نقطۂ نظر سے سخت تنقید کی۔ مخالفین نے جس میں دیوبند کے لوگ بھی شامل تھے، اس تنقید کو دستاویز بنا کر بیگم بھوپال تک پہنچایا تاکہ سیرت کی امداد بند ہو جائے۔ مخالفین کے اس معاندانہ طرز عمل کا اندازہ بیگم بھوپال سلطان جہاں (ف: ۳۰/ جون ۱۹۰۱ء) کو بھی ہو گیا کہ یہ چند مولویوں کی معاندانہ حرکتیں ہیں۔ اس لئے امداد جاری رہی مگر مخالفین نے بھی اپنی حرکتیں جاری رکھیں۔ مصنف کو فتویٰ کفر سے نوازا گیا۔ یہاں تک کہ مسودہ سیرت کے سرقہ کی بھی کوشش کی گئی۔ (۴۸)

گو سرکار عالیہ کی خواہش تھی کہ معاندین کی ان تنقیدوں کا بھی جواب لکھا جائے مگر علامہ شبلی چوں کہ ان اعتراضات کو مہمل اور معاندانہ تصور کرتے تھے۔ (۴۹) اس لئے ان کا جواب بھی دینا نہیں چاہتے تھے۔ ہاں ان کی یہ خواہش ضرور تھی کہ مسودہ سیرت کسی عالم کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ وہ دیکھ کر اپنی رائے دے جو اعتماد کا باعث ہو۔ اس سلسلہ میں خود انھوں نے مولانا محمود

حسن صاحبؒ (ف: ۳۰/نومبر ۱۹۲۰ء) کا نام پیش کیا اور ان کی خدمت میں بھی اپنی خواہش پیش کی، مگر اس خواہش کا جو انجام ہوا وہ علامہ شبلی کی زبانی ملاحظہ ہو:

''آج ان کا (مولانا عبیداللہ سندھی) خط آیا کہ وہ گئے، لیکن دیوبند پارٹی کو بھوپال سے اطلاع مل چکی تھی۔ ان لوگوں نے مولوی محمود حسن صاحب کو باز رکھا کہ وہ مسودے کا سرے سے دیکھنا ہی منظور نہ کریں۔ دیوبند کے خیالات سے مولوی محمود حسن صاحب فی نفسہ الگ ہیں۔ چنانچہ مولوی عبیداللہ سندھی کو ان لوگوں نے کافر بنا دیا لیکن مولوی محمود حسن صاحب سے ان کے تعلقات اب تک وہی ہیں، بہرحال اب غور کرنا چاہئے کہ کیا کیا جائے۔ چونکہ مولویوں نے ایک جتھا بنا لیا ہے اس لئے سردست اور کوئی مولوی مسودہ دیکھنے کی ذمہ داری اپنے سر نہ لے گا، ورنہ سمجھے گا کہ برادری سے خارج ہونا پڑے گا۔''(۵۰)

سیرۃ النبیؐ شاید اردو کی پہلی ایسی تصنیف ہے جس کے مصنف پر قبل از اشاعت اس قسم کا دباؤ ڈالا گیا۔ معاندین کے اعتراضات ہمیں دستیاب نہ ہو سکے۔ مولانا شبلی کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے بخاری و مسلم کی روایتوں کو ضعیف ثابت کرنے کا الزام عائد کیا تھا مگر مولانا نے اس کی تردید کی ہے۔(۵۱)

غیر معاندانہ تنقید

معاندانہ تنقیدوں کے علاوہ بعض نقادوں نے سیرۃ النبیؐ کی ممتاز حیثیت اور مسلمہ فضیلت کے باوجود اس پر علمی انداز سے تنقیدیں کیں۔ ذیل میں اس طرح کی چند تنقیدوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

فاضل نقاد ڈاکٹر سید عبداللہ، علامہ شبلی کے بڑے مداح اور ان کے کارناموں کے ثناخواں ہیں، مگر انھوں نے سیرۃ النبیؐ پر بعض اعتراضات وارد کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اپنے بار بار کے دعوی کے باوجود بہت سے مقامات پر شبلی کی رائے معذرت خواہانہ اور مدافعانہ ہے۔ شبلی نے مورخین

یورپ کے اعتراضات سے دب کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کے سلسلے میں ضرورت سے زیادہ معذرت کا لہجہ اختیار کیا ہے۔ اسی طرح غلامی اور تعدد ازدواج کے مسئلے کے تجزیے میں بہت کچھ دبے دبے نظر آتے ہیں اور ہر چند کے وہ پیغمبر کی سوانح عمری لکھ رہے ہیں، بار بار مغربی نقادوں کی اس رائے سے مرعوب ہوکر چلتے ہیں کہ حضور کا ہر قول وفعل عام بشریت کے مطابق تھا۔ حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عام بشر نہ تھے۔ خاص بشر تھے۔ کتاب کا وہ حصہ بھی کسی قدر تحقیق طلب ہے جس کا تعلق غزوات کے جغرافیے سے ہے۔ شبلی کے لئے یہ ممکن نہ ہوا کہ وہ ان مقامات کا خود مشاہدہ کرتے جہاں جنگیں ہوئیں۔‘‘ (۵۲)

ڈاکٹر سید عبداللہ کے اعتراضات دراصل سیرۃ النبیؐ کے بنیادی مقاصد تصنیف پر نظر نہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ علامہ شبلی نے سیرۃ النبیؐ کی تصنیف سے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ ’’میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنّفین نے جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہے اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے تا کہ ان کے تائیدی بیان حسب موقع حجت الزامی کے طور پر پیش کئے جائیں اور جہاں انھوں نے غلطی اور بد دیانتی کی ہے نہایت زور شور کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے۔ (۵۳)

اس پردہ دری کو معذرت اور مدافعت سمجھنا درست نہیں۔ مورخین یورپ نے جس انداز سے کذب بیانی کی ہے اور جھوٹ میں جھوٹ ملایا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کا کوئی پہلو شاید ہی ان کی تنقیدوں سے محفوظ ہو۔ اگر ایک سیرت نگار مورخ اس کی تردید نہیں کرتا ہے تو اس پر مقصد سے گریز اور مورخانہ ذمہ داری سے صحیح طور پر عہدہ برآ نہ ہونے کا الزام عائد ہوگا۔ علامہ شبلی نے تو بالکل درست مورخانہ فریضہ انجام دیا ہے۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں ادیبوں اور نقادوں کا ایک ایسا طبقہ سامنے آیا جس نے تردید وجواب کو مدافعت اور معذرت کہہ کر اس طرح کی مورخانہ کوششوں کی حیثیت کم کرنے کی کوشش کی۔ مشہور مورخ پروفیسر خلیق احمد نظامی رقم طراز ہیں:

''اسلامی ہندوستانی تاریخ کو مسخ کرنے کا کام جب خطرناک حد تک پہنچ گیا تو اصلاح حال کے لئے بعض مسلمان مصنّفین نے اپنا قلم اٹھایا۔ پرفریب ذہنوں نے ان کے دلائل پر غور کرنے کے بجائے اس سارے لٹریچر کو جوابی اور معذرت آمیز کہہ کر اس کی اہمیت کو کم کر دیا اور مطالعہ سے پہلے ہی ان مصنّفین کے انداز تحقیق کو مشتبہ بنا دیا۔''(۵۴)

قدیم مورخین نے عموماً غزوات کے اسباب وعلل پر روشنی ڈالی اور نہ اس سلسلہ میں تحقیق وتدقیق سے کام لیا۔ ان کی اس خامی کی وجہ سے مغربی مورخین نے معرکوں کی ابتدا اور جنگ وجدل کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ دیا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اصولِ تاریخ کی رو سے جب ان واقعات کے اسباب وعلل پر غور کیا خصوصاً غزوات کے سلسلے میں تو یہ حقائق سامنے آئے کہ غزوات کی ابتداء مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہوئی بلکہ یہ سلسلہ کفار نے شروع کیا۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اسباب وعلل کی تلاش فلسفۂ تاریخ کی رو سے نہایت ضروری ہے۔ یہ اصول مغرب ہی کا ایجاد کردہ ہے۔ علامہ شبلی نے انھیں کے اصول پر عمل پیرا ہو کر انھیں کے اسلوب میں ان کا جواب دیا۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے معذرت خواہانہ اور مدافعانہ طرز عمل اختیار کیا۔ درحقیقت یہی مورخانہ اور حقیقت پسندانہ انداز نگارش علامہ شبلی کا طرہ امتیاز ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے اعتراضات تسلیم کرتے ہوئے اگر اسباب وعلل کی تلاش نہ کی جائے تو مورخین یورپ کا یہ الزام کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے صحیح ثابت ہوگا۔ علامہ شبلی کے الفاظ میں ''اس سے عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور ان کو تباہ وبرباد کرنے کے لئے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں۔'' اسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا۔ حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے کہ جن قبائل پر فوجیں بھیجی گئیں وہ پہلے سے آمادۂ جنگ اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔(۵۵)

ڈاکٹر صاحب نے عام بشر اور خاص بشر کی اصطلاحات کے ذریعہ جو اعتراض کیا ہے غالبًا اس کی حقیقت سے وہ خود بھی واقف نہیں تھے، اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ کی تفسیر اور اس کے اسرار ونکات

کی جگہ اور ہے۔ یہاں یہ بے محل اور بے موقع ہی کہی جائے گی۔

جہاں تک مقام غزوات کے جغرافیے کے مشاہدہ کا تعلق ہے، ہمارے پاس شواہد نہیں ہیں کہ انہوں نے سفرِ حجاز میں ان مقامات کا مشاہدہ کیا تھا یا نہیں۔ لیکن ایک مورخ کے لئے تمام مقامات جنگ کا بہ چشم خود معائنہ کرنے کا اصول فن تاریخ میں قطعاً ضروری اور لابدی نہیں سمجھا گیا ہے۔ اس لئے یہ اعتراض بھی غور و فکر سے خالی اور بے وزن ہے۔

ایک اور ناقد ڈاکٹر سید شاہ علی نے سیرۃ النبیؐ میں اقتباس کی کثرت اور تضاد بیانی ڈھونڈھ نکالی ہے۔ علامہ شبلی کی کسی تصنیف پر اس طرح کا مہمل اعتراض خود ناقد ومعترض کے بے بہرہ ہونے کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف سیرۃ النبیؐ کی جامعیت کے بھی منکر ہیں۔(۵۶) جب کہ ڈاکٹر سید عبداللہ جامعیت کو سیرۃ النبیؐ کا سب سے بڑا وصف قرار دیتے ہیں۔(۵۷) طبقہ ناقدین کی اس تضاد بیانی کو کیا کہا جائے۔؟

ڈاکٹر سید شاہ علی کا یہ بھی اعتراض ہے کہ سیرۃ النبیؐ میں آنحضرت ﷺ کی ابتدائی زندگی کے حالات کا فقدان ہے۔ تجارتی اسفار، موحدین اور احباب کا ذکر بھی تشنہ ہے۔ حالانکہ اسی سے بیرونی اثرات اور فطری رجحانات کے متعلق رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔(۵۸) یہ اعتراض اگرچہ درست نہیں تاہم اگر کسی درجہ میں اسے درست بھی تسلیم کرلیا جائے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ علامہ شبلی نے اسے دانستہ نظر انداز کر دیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس عہد کے متعلق صحیح روایات کے فقدان کی وجہ سے انھوں نے بے سروپا روایتوں کی تفصیل میں پڑنے کے بجائے اختصار کو ترجیح دیا ہے۔ شیخ محمد اکرام کے الفاظ میں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ''انھیں میں یورپین سیرت نگار اسلام کے ماخذ ڈھونڈتے ہیں۔ اس لئے علامہ نے ان معاملات میں خاص احتیاط سے کام لیا ہے۔(۵۹) خلاصہ یہ ہے کہ سیرۃ النبیؐ پر جو اعتراضات کئے گئے ان میں بیشتر جانب دارانہ مطالعہ اور معاندانہ روش کا نتیجہ ہیں۔ واقفیت اور معقولیت سے ان کا تعلق نہیں معلوم ہوتا۔

مورخین یورپ کے جوابات

سیرۃ النبیؐ میں علامہ شبلی نے مستشرقین اور مورخین یورپ کی زہرافشانیوں کا خاص طور

سے رد وابطال کیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی ذات مقدس اور آپؐ کے اخلاق کریمہ پر مورخین یورپ نے متعدد اعتراضات واتہامات وارد کئے تھے۔ علامہ شبلی نے ان اعتراضات سے پوری واقفیت حاصل کی اور پھر ان کے جوابات کے لئے انھوں نے سیرۃ النبیؐ کا ایک جدا حصہ خاص کیا تھا۔ اگرچہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اسے نہ لکھ سکے، تاہم جلد اول میں انھوں نے جابجا ان اعتراضات کی مدلل تردید کردی ہے۔ یہاں اس کی ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی پیغمبرانہ زندگی پر بھی مورخین یورپ نے اعتراضات کئے ہیں اور آپؐ کو پیغمبر کے بجائے فاتح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی پیغمبر اور فاتح کا فرق واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عین اس وقت جب معرکہ کارزار گرم ہے۔ تیروں کا مینہ برس رہا ہے۔ تمام میدان لالہ زار بن گیا ہے۔ ہاتھ اور پاؤں اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں، جس طرح موسم خزاں میں پتے جھڑتے ہیں۔ دشمن کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھی آرہی ہیں۔ عین اس حالت میں آنحضرت ﷺ کا دستِ دعا آسمان کی طرف بلند ہے۔ جنگ آور باہم نبرد آزما ہیں اور سر مبارک سجدۂ نیاز میں ہے۔ معرکہ بدر میں حضرت علیؓ عین شدت جنگ میں تین بار خبر لینے آئے اور ہر دفعہ دیکھا کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے۔''(۶۰)

''حنین میں دشمن نے دفعتاً اس زور سے حملہ کیا کہ تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بارہ ہزار آدمیوں میں سے ایک بھی پہلو میں نہیں۔ سامنے دس ہزار قدرانداز تیر برساتے رہے لیکن مرکز حق اپنی جگہ پر قائم ہے اور ایک پر جلال آواز آرہی ہے:

انا النبی لاکذب — میں پیغمبر ہوں اور جھوٹا پیغمبر نہیں ہوں

عین اس وقت جب کہ صفیں باہم معرکہ آرا ہیں، ہر طرف تلواریں برس رہی ہیں، ہاتھ پاؤں کٹ کٹ کر زمین پر بچھے جاتے ہیں، موت کی تصویریں ہر طرف نظر آرہی ہیں، اتفاق سے نماز کا وقت آجاتا ہے، دفعتاً نماز کی صفیں قائم

ہوجاتی ہیں۔ سپہ سالار امام نماز ہے۔ فوجیں صفوف نماز ہیں۔ رجز کے بجائے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہیں۔ جوش وخروش، تہور وجاں بازی، غیظ وغضب، عجز ونیاز، تضرع وزاری اورخشوع وخضوع بن جاتا ہے۔ صفیں دو، دو رکعتیں ادا کرکے دشمن کے مقابلہ پر چلی جاتی ہیں۔ ان کے بجائے لڑنے والے نماز میں شامل ہوجاتے ہیں۔ یہ دو رکعتیں ادا کرکے پھر اپنی خدمت پر واپس چلے جاتے ہیں اور مشغولین جنگ آ کر بقیہ نمازیں پوری کر لیتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں فوجوں میں ہوتی ہیں، امام (رسول) اول سے آخر تک عبادت الٰہی میں مصروف ہے۔''(۶۱)

اسی طرح اور بھی متعدد اعتراضات کا انھوں نے جائزہ لیا ہے۔ مثلاً سر ولیم میور کا یہ اعتراض کہ آنحضرت ﷺ حضرت اسماعیلؑ کے خاندان سے نہ تھے۔(۶۲) یا مارگولیوتھ کی یہ ہرزہ سرائی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان مبتذل تھا۔(۶۳) اور آپؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب آپ کی طرف سے لاپرواہ تھے۔(۶۴) یا یہ اعتراض کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ سونے سے پہلے ایک بت کی پرستش کرتے تھے جس کا نام عزیٰ تھا۔(۶۵) یا عزیٰ کے نام پر ایک خاکی رنگ کی بھیڑ ذبح کی۔(۶۶) یا یہ افسانہ کہ آپؐ نے چاہا کہ بادشاہ حبش سے سازش کرکے اس کو مکہ پر حملہ کی ترغیب دیں تاکہ قریش کا زور ٹوٹے۔ اسی غرض سے ہجرت کا بہانہ کرکے اپنے اصحاب کو حبش بھیجا، لیکن پھر سمجھے کہ نجاشی مکہ میں آیا تو وہ مکہ پر قابض ہوجائے گا، میرے ہاتھ کیا لگے گا۔ اس بنا پر اس ارادے سے باز رہے۔(۶۷) یا ڈریپر کی یہ تحقیق انیق کہ بصریٰ کی خانقاہ میں بحیرہ راہب نے آپ ﷺ کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی تھی۔(۶۸)

اس قسم کے بے بنیاد، لغو اور بے سروپا الزامات بلکہ اتہامات کا علامہ شبلی نے مستند حوالوں اور اصول تاریخ وسیر کی روشنی میں رد وابطال کیا ہے۔ سیرۃ النبیؐ اس نوع سے لکھی جانے والی پہلی کتاب سیرت ہے اور یہ اس کا خاص وصف وامتیاز ہے۔

سیرت النبیؐ اصول تاریخ وسیر کی روشنی میں

علامہ شبلی نے تاریخ اور سیرت نگاری کے جو بلند اور معیاری اصول وضوابط متعین کئے ہیں اور جن کا انھوں نے بار بار ذکر کیا ہے ان پر خود وہ کہاں تک عمل پیرا رہے اور ان کا کس قدر پاس ولحاظ رکھا۔ یہاں ہم اسی حیثیت سے سیرۃ النبیؐ کا جائزہ لیتے ہیں اور اس سلسلہ میں نقادوں نے سیرت النبیؐ پر جو اعتراضات کئے ہیں یا جن کمیوں کی نشاندہی کی ہے ان کی حقیقت وحیثیت کا بھی ایک تجزیہ پیش کرتے ہیں:

۱- سیرت کے متعلق علامہ کا پہلا اصول یہ ہے کہ جو واقعات قرآن مجید میں مذکور ہیں ان کے لئے کسی دوسرے ماخذ کی ضرورت نہیں۔ سیرت النبیؐ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے ان تمام واقعات میں جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے، اصل ماخذ قرآن مجید ہی کو بنایا ہے۔ عقائد اور اوامر ونواہی کا اصل مرجع قرآن مجید ہے، اس لئے ان میں خاص طور سے اس کا اہتمام کیا ہے۔ غزوۂ بدر، واقعہ ایلا اور دوسرے بہت سے واقعات میں قرآن مجید کو خاص طور سے پیش نظر رکھا ہے۔ علامہ شبلی سے پہلے کسی سیرت نگار کے ہاں اس اصول کے اہتمام کی کوشش نظر نہیں آتی۔ یقیناً یہ علامہ شبلی کی اولیات وامتیازات میں خاص جگہ رکھتی ہے۔

۲- علامہ شبلی نے واقعات سیرت کے متعلق قرآن مجید کے بعد احادیث صحیحہ کو اصل ماخذ قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تاریخ اور سیر ومغازی کے مقابلہ میں احادیث کا سرمایہ زیادہ مستند ہے اس لئے انھوں نے تالیف سیرت میں تاریخ وسیر کی روایات کے مقابلہ میں احادیث صحیحہ کو فوقیت دی اور سیرۃ النبیؐ میں اپنے اس اصول کا خاص اہتمام کیا۔ علامہ شبلی پہلے مورخ ہیں جنھوں نے ان اصول وضوابط کو واقعی اہمیت وحیثیت دی اور اسے سیرت کا بنیادی ماخذ قرار دیا کیوں کہ وہ اپنے وسیع مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ''اگر عام استقرا اور تفحص سے کام لیا جائے تو اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں۔(۶۹) اور جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں، ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں۔ (۷۰) خود علامہ شبلی کو اس کا احساس تھا۔ چنانچہ ایک جگہ صاف لکھا کہ ''ہماری اس کتاب کی بڑی

خصوصیت یہی ہے کہ اکثر تفصیلی واقعات ہم نے حدیث ہی کی کتابوں سے ڈھونڈ ھ کر مہیا کئے جو اہل سیر کی نظر سے بالکل اوجھل رہ گئے تھے۔(۷۱) مثلاً واقعہ غرانیق میں ارباب تاریخ وسیر نے جو روایات نقل کی ہیں انھیں سرے سے اسی بنا پر مسترد کر دیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ اکثر کبار محدثین مثلاً بیہقی، قاضی عیاض، علامہ عینی، حافظ منذری، علامہ نووی وغیرہ نے ان روایات کو باطل اور موضوع قرار دیا ہے۔

اسی طرح حضرت زینبؓ سے آنحضرت ﷺ کے نکاح کے بارے میں متعدد بے سروپا روایتیں ارباب سیر نے نقل کی ہیں۔علامہ شبلی نے ان باطل روایات کو مسترد کر کے ان کے مقابلہ میں صحیح احادیث وروایات کو پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے اپنی کتاب ''مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار'' میں علامہ شبلی پر اس اصول کی خلاف ورزی کا الزام عائد کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''اس کتاب کے مواد و مشتملات کی تحقیق وتفتیش کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ سیرۃ النبیؐ میں غیر مستند یا کم مستند روایت کا تناسب کم از کم پچاس یا ساٹھ فیصد ہے۔''(۷۲) مگر ان کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔شبلی انسان تھے معصوم عن الخطا نہیں، تاہم فاضل مصنف نے جس طرح کے اعتراضات سیرۃ النبی، علامہ شبلی اوران کے اصول سیرت نگاری پر وارد کئے ہیں، وہ اصلاً قدیم سیرت نگاروں کے اصول سیرت نگاری پر علامہ شبلی کی تیشہ زنی کے زیر اثر پیدا ہوئے جسے ایک طبقے نے اس لئے ناپسند کیا کہ جدید نافع کے قبول کرنے میں اس کے ذہن ودل نے کبھی ساتھ نہیں دیا۔یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب پوری کتاب میں شبلی اور قدیم اصول سیرت نگاری کے درمیان الجھے نظر آتے ہیں۔

یہی نہیں فاضل مصنف نے جن اعداد وشمار کو دقت نظر کے ساتھ تیار کیا ہے اوراس کے حوالے سے جو رائے قائم کی ہے، اس میں خود ان سے تسامح ہوا ہے۔جس کا ذکر کتاب کے حصہ استدراکات [ص ۲۳۹-۲۷۷] میں موجود ہے اور جن سے مصنف نے اتفاق بھی کیا ہے اور کتاب کی اشاعت کے وقت اس حصے کو خارج کر دیا ہے۔کیا اس کے بعد بھی ان کے موقف سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی پوری کتاب میں غیر مستند اور کم مستند جیسے الفاظ سے سیرۃ النبی کو غیر مستند قرار دینے کی کوشش کی ہے حالانکہ معاملہ اصول سیرت نگاری کا تھا اور

پھر آخر میں انہوں نے غیر مستند اور کم مستند کا اپنا مفہوم واضح کیا۔ [ص۱۱۴-۱۱۵] جو اس کے بالکل برعکس ہے اور پھر انہوں نے یہ تمام مفروضات استدراک کرنے والوں کے سر ڈال کر یہ وضاحت کی ہے کہ

> ''بعض اہل علم نے اپنے تبصرہ وتجزیہ کے دوران کم مستند اور غیر مستند کے اس فرق کو [جو مصنف نے طے کئے ہیں] ملحوظ نہیں رکھا اور انہوں نے یہ تاثر قائم کرلیا کہ ناچیز راقم اس باب میں پیش کردہ تمام روایات و واقعات کو غیر مستند تصور کرتا ہے اور ان کی صحت وثبوت کا بالکلیہ منکر ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔''
>
> [مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار ص۱۱۵]

اگر ایسا نہیں ہے تو یقیناً مصنف سے معروضیت کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کوتاہی ہوئی ہے۔

۳- ماخذ سیرت سے متعلق شبلی نے یہ اصول بھی پیش کیا ہے کہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کے بعد تاریخ وسیر کا درجہ ہے۔ چنانچہ انھوں نے روزمرہ اور عام واقعات میں تاریخ وسیر کی روایتیں نقل کی ہیں۔ ان میں بھی جو اہم واقعات ہیں، ان میں اولاً احادیث صحیحہ تلاش کی ہیں، نہ ملنے کی صورت میں تاریخ وسیر کی روایتیں نقل کی ہیں، لیکن اس میں بھی ان کا معیار کہیں فروتر نہیں ہے۔

۴- علامہ شبلی نے مورخ کے لئے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ جس عہد کی تاریخ لکھے اس عہد کے تمام سیاسی ، مذہبی، معاشرتی اور تمدنی حالات قلم بند کرے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اس اصول کے مدنظر عہد رسالت کے تمام سیاسی ، مذہبی معاشرتی اور تمدنی حالات و واقعات کا استقصاء کیا ہے اور خاص حضور اکرم ﷺ کے ذاتی حالات وسوانح اور آپ ؐ کی حیات طیبہ کی تمام تفصیلات اس طرح تحریر کی ہیں کہ عہد نبوی ؐ کا معاشرہ بلکہ ہر پہلو اور ہر گوشہ واضح طور پر سامنے آ گیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''شبلیؒ نے آپ ؐ کی شخصیت کی خارجی اور بشری جزئیات اتنی مفصل پیش کی ہیں کہ سیرۃ النبی ؐ کو اردو میں سوانحی ادب کی مکمل اور مفصل ترین کتاب کہا جاسکتا ہے۔ آپ ؐ کی خلوت اور جلوت کے باریک اور چھوٹے چھوٹے واقعات اور جزئیات، آپ کی عادات وشمائل کے لطیف سے لطیف پہلو، ان سب باتوں

سمیت جن کا اظہار عموماً نہیں کیا جاتا، سیرۃ النبیؐ کے اوراق میں جمع ہوگئے ہیں۔''(۷۳)

تاریخ کے اس بنیادی اصول سے لکھی جانے والی اردو میں سیرت کی یہ پہلی کتاب قرار دی جاسکتی ہے۔ کیوں کہ اس سے پہلے عموماً تاریخ کی کتابوں میں کسی ایک ہی پہلو پر توجہ دی جاتی تھی۔ سیرۃ النبیؐ سے پہلے کی اردو تصانیف سیرت کے بارے میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی (ف:۱۳ر دسمبر۱۹۷۴ء) لکھتے ہیں:

''سیرت کی تالیف سے پہلے اردو میں سیرت نبویؐ پر جس قدر کتابیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر مغازی واخلاق وشمائل نبویؐ پر مشتمل ہیں اور ان میں روایات کی صحت اور تحقیق وتنقید کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا اور وہ ہر قسم کی رطب ویابس روایات کا مجموعہ ہیں۔''(۷۴)

۵- علامہ شبلی کے نزدیک مورخ کا ایک ضروری فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ جو کچھ لکھے صحیح لکھے اور واقعات کی صحت کے لئے ہر ممکن تحقیق وتنقید سے کام لے۔ چنانچہ خود علامہ شبلی ازاول تا آخر اس اصول پر قائم نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے پیش رو اسلامی مورخین کی بہ نسبت زیادہ چھان بین سے کام لیا ہے اور کوئی بھی واقعہ یا روایت بغیر صحت وصداقت کے نقل نہیں کی ہے۔ حتی کہ جس واقعہ یا روایت میں کسی قسم کی کوئی کمی یا خامی نظر آئی اسے نظر انداز کردیا۔ بعض مقامات پر اس کے اسباب بھی لکھ دیے ہیں اس سلسلہ میں چند اہل قلم مثلاً مولوی عبدالحلیم شرر وغیرہ نے اعتراضات بھی کئے ہیں۔(۷۵) مگر وہ اعتراضات اصلاً فن حدیث اور تاریخ وسیر کے بنیادی فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔

۶- واقعات کی صحت کی تعیین کا ایک اسلامی اصول روایت ہے۔ علامہ شبلیؒ نے خاص طور پر مورخ کے لئے اس اصول کا بروئے کار لانا ضروری قرار دیا ہے اور روایتوں کو بلا بحث وتمحیص نقل کرنے کو رواۃ پرستی سے تعبیر کیا ہے۔(۷۶) اور خود سیرۃ النبیؐ میں روایت اور اس کے اصول وفروع اور جزئیات سے کام لے کر ہر ممکن کوشش کی ہے کہ واقعہ میں صحت کی تعیین ہوجائے۔ قدیم ارباب سیر وتاریخ کے ہاں اس کا التزام نظر آتا ہے مگر ان سے غلطی یہ ہوئی کہ عموماً

ان حضرات نے یہ روایتیں حدیث کی کتابوں میں ان موقعوں پر تلاش کیں جہاں انھیں عنوان اور مضمون کے لحاظ سے درج ہونا چاہئے اور جب وہ وہاں نہ ملیں تو کم درجہ کی روایتیں نقل کر دیں جس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوئی، خاص طور سے مورخین یورپ نے حضور اکرم ﷺ پر جو اعتراضات کئے وہ انہیں کم درجہ روایتوں کی وجہ سے پیدا ہوئے، جنھیں مغربی مورخین کی ملمع سازی نے مزید رنگ دے دیا۔ علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:

''یورپ کے اکثر مورخوں نے آنحضرت ﷺ کے معیار اخلاق پر جو حرف گیریاں کی ہیں ان کا کل سرسبد یہی روایتیں ہیں۔'' (۷۷)

۷- علامہ شبلی نے مورخ کے لئے صحت واقعہ میں روایت کے پہلو بہ پہلو درایت سے کام لینا بھی ضروری قرار دیا ہے۔ بلکہ اپنے تمام اصول تاریخ نویسی کے مقابلہ میں سب سے زیادہ زور اسی پر دیا ہے۔ سیرۃ النبیؐ میں اس اصول کی جلوہ گری پوری طرح نظر آتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ مختلف واقعات میں ارباب تاریخ وسیر سے ان کے اختلاف کی وجہ اکثر یہی اصول درایت ہی ہے۔ مثلاً غزوۂ خیبر کے ذکر میں کنانہ بن ابی الحقیق کے بارے میں لکھتے ہیں:

''خیبر کے واقعات میں ارباب سیر نے ایک سخت غلط روایت نقل کی ہے اور اکثر کتابوں میں منقول ہو کر متداول ہو گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اول آپؐ نے یہود کو اس شرط پر امن عام دیا کہ کوئی چیز نہ چھپائیں، لیکن جب کنانہ بن ابی الحقیق نے خزانہ بتانے سے انکار کیا تو آپؐ نے حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ سختی کر کے اس سے خزانہ کا پتہ لگائیں۔ حضرت زبیرؓ چقماق جلا کر اس کے سینے کو داغتے تھے، یہاں تک کہ اس کی جان نکلنے کے قریب ہو گئی۔''

سادہ طور پر یہ روایت نقل کرنے کے بعد علامہ شبلی کا درایتی معیار ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

''کسی شخص پر خزانہ بتانے کے لئے اس قدر سختی کرنا کہ اس کے سینہ پر چقماق سے آگ جھاڑی جائے، رحمۃ للعالمینؐ کی شان اس سے بہت ارفع ہے۔ وہی شخص جو اپنے زہر دینے والے سے مطلق تعرض نہیں کرتا، کیا چند سکوں کے لئے کسی کو آگ سے جلانے کا حکم دے سکتا ہے۔'' (۷۸)

یہ روایت متصل اور صحیح ہونے کے باوجود چوں کہ درایت کے معیار سے نا قابلِ فہم ہے، اس لئے علامہ شبلی نے اسے نظر انداز کر دیا۔ اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہونے کی تفصیل صحیح بخاری کی دو روایتوں میں مذکور ہے۔ پہلی روایت باب بدء الوحی میں جس میں فرشتۂ غیب کا نظر آنا، اس کو دیکھ کر آپ کا خوف زدہ ہو جانا، حضرت خدیجہؓ کا آپ کو تسلی دینا اور ورقہ بن نوفل کے پاس لے جانا مذکور ہے۔ لیکن دوسری روایت جو باب التعبیر میں ہے، اس میں مندرجہ ذیل اضافہ ہے:

''چند روز تک جب وحی رک گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے تھے کہ اپنے آپ کو گرا دیں۔ دفعتاً حضرت جبریلؑ نظر آتے تھے اور کہتے تھے اے محمدؐ! تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو۔ لیکن جب پھر وحی کچھ دن کے لئے رک جاتی تھی تو پھر آپؐ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینا چاہتے تھے اور پھر حضرت جبریلؑ نمایاں ہو کر تسکین دیتے کہ آپؐ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں۔'' (۷۹)

دوسری روایت کے اس اضافہ پر علامہ شبلی درایت کی رو سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب کہ ترمذی میں یہ حدیث موجود ہے کہ نبوت سے پہلے سفر شام میں بمقام (بصریٰ) جس درخت کے نیچے آپؐ بیٹھے تھے اس کی تمام شاخیں آپؐ پر جھک آئیں، جس سے بحیرا راہب نے آپؐ کے نبی ہونے کا یقین کیا، جب کہ صحیح مسلم میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو نبوت سے پہلے مجھ کو سلام کیا کرتا تھا، جب کہ صحاح ستہ میں موجود ہے کہ نبوت سے پہلے فرشتوں نے آپؐ کا سینہ چاک کیا اور جسمانی آلائش نکال کر پھینک دی تو خود ان روایتوں کے روایت کرنے والے کیوں کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرشتہ کا نظر آنا ایسا واقعہ تھا جس سے آپ اس قدر خوفزدہ ہو جاتے تھے کہ ایک دفعہ تسکین ہو کر بھی بار بار اضطراب ہوتا تھا اور آپؐ اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا دینے کا ارادہ کرتے تھے اور بار بار حضرت جبریلؑ کو اطمینان دلانے کی

ضرورت ہوتی تھی۔کیا اور کسی پیغمبر کو بھی ابتدائے وحی میں کبھی شک ہوا تھا۔؟
حضرت موسیٰؑ نے درخت سے آواز سنی کہ میں خدا ہوں تو کیا ان کو کوئی شبہ پیدا
ہوا۔''(۸۰)

۸- علامہ شبلی نے واقعات کے اسباب وعلل کی تلاش اور اس سے صحیح نتائج مستنبط کرنے کو ضروری قرار دیا ہے اور انھوں نے خود واقعات میں سبب اور مسبب کی تلاش کی ہے اور استنباط نتائج میں روایت ودرایت، عقل سلیم اور دلائل و براہین سے کام لیا ہے۔ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے اس خصوصیت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

''سب سے اہم اور قابل ذکر چیز واقعات سیرت کے بیان میں مورخانہ اسباب وعلل کی تلاش ہے۔مولانا نے اس طرف خاص توجہ دی ہے اور سیرۃ النبیؐ میں جابجا مستقل عنوانات قائم کر کے بعض اہم واقعات اور ان کے اسباب سے متعلق بہت عمدہ بحثیں کی ہیں، جن کی مثالیں عام کتب سیرت میں نہیں ملتیں۔''(۸۱)

مثلاً قریش کی مخالفت، قریش کے تحمل، اسلام کی اشاعت، تحویل قبلہ، مسلمانوں کی فتح، غزوات اور کثرت سرایا کے اسباب وعلل وغیرہ۔

۹- سبب اور مسبب کی تلاش کے بعد استنباط نتائج میں مورخ کو عموماً قیاس واجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے۔علامہ شبلی کا خیال ہے کہ اصل واقعہ اور مستنبط نتیجہ کو الگ الگ بیان کرنا چاہئے۔ چنانچہ خود انھوں نے سادہ واقعات بیان کرنے کے بعد نتائج قلم بند کئے ہیں۔خصوصاً غزوات کی بحث میں یہ اصول صاف کارفرما ہے۔

۱۰- علامہ شبلی نے مورخ کے لئے ایک نہایت سخت اصول مقرر کیا ہے کہ وہ جس واقعہ کو لکھے مورخ اس کے فن سے بخوبی واقف ہو۔ ورنہ اس کی نظر واقعہ پر سطحی پڑے گی اور واقعہ کی روح تک نہ پہنچ سکے گا۔ ظاہر ہے یہ ایک مشکل امر ہے مگر علامہ شبلی اس مشکل اصول پر بھی کاربند نظر آتے ہیں، وہ ایک جامع العلوم والکمالات مصنف تھے۔اسی وجہ سے ہر واقعہ کی تہ اور اس کی اصل روح تک ان کی دوررس نگاہ پہنچ جاتی ہے۔

۱۱- علامہ شبلی نے غیر جانبداری پر بھی بڑا زور دیا ہے اور رینکی کے حوالے سے لکھا ہے کہ مورخ کے طرز نگارش سے اس کے قوم و مذہب، ذاتی اعتقاد اور اس کی خوشی و ناخوشی کا اظہار نہیں ہونا چاہئے۔ اس اصول پر بھی سیرت النبیؐ پوری اترتی ہے، باوجودیکہ اس سے علامہ شبلی کے عشق رسولؐ کا واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے مگر ایسا کہیں نہیں ہوا کہ حق وصداقت کو بالائے طاق رکھ کر محض اخلاص وعقیدت کا نذرانہ پیش کیا گیا ہو۔ ڈاکٹر سید شاہ علی کا یہ لکھنا کہ ''شبلی اپنے مذہبی جذبہ پر پوری طرح قابو نہیں پا سکے اور عشق رسولؐ کے زیر اثر مذہبی اور اخلاقی سرگرمیوں کا شکار ہو گئے۔ (۸۲) اور یہ کہ ''سیرۃ النبیؐ'' میں کہیں کہیں محبت وعقیدت مدلل مداحی کی شکل اختیار کر گئی ہے۔'' (۸۳) بجا نہیں ہے کیوں کہ علامہ شبلی نے مذہب اسلام کے مصنفات کے ساتھ توراۃ وانجیل اور صحف سماوی سے استدلال کئے ہیں اور ماقبل بعثت عرب کے جو حالات لکھے ہیں وہ اس کی تردید کے لئے کافی ہیں۔ ڈاکٹر انور محمود خالد کا نقطۂ نظر بھی لائق توجہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جو مصنف کسی ایسے شخص کی سوانح عمری لکھ رہا ہو جو نہ صرف اس کا اپنا محبوب نظر ہو بلکہ کروڑوں انسانوں کی عقیدت کا مرکز ہو، اس کے حالات رقم کرتے وقت جوش وجذبہ کا مظاہرہ ہونا کوئی خلاف حقیقت بات نہیں ہے۔ پھر صاحب سوانح مذہبی شخصیت ہو تو اس کی سوانح سے مذہب کیسے خارج کیا جا سکے گا۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ عقیدت کے غلو میں کہیں سوانح نگار مذہبی اور اخلاقی جذبے سے مغلوب تو نہیں ہو گیا۔ سیرۃ النبیؐ پڑھنے والا ہر شخص گواہی دے گا کہ ایسا نہیں ہوا۔'' (۸۴)

۱۲- علامہ شبلی نے مورخ کو اس بات سے بھی آگاہ کیا ہے کہ اس کا منصب سادہ واقعہ نگاری ہے، انشاء پردازی نہیں۔ کیوں کہ تاریخ اور انشاء پردازی کی حدیں جدا جدا ہیں۔ اس لئے مورخ کو تاریخ میں انشاء پردازی کا جوہر نہیں دکھلانا چاہئے۔ چنانچہ خود انھوں نے سیرۃ النبیؐ میں سادہ واقعہ نگاری سے کام لیا ہے اور کہیں بھی مورخ شبلی پر انشاء پرداز شبلی کا غلبہ نہیں ہوا ہے۔ یہاں اس شبہہ کا ازالہ ضروری ہے کہ سیرۃ النبیؐ میں واضح طور پر جو ادبی رعنائی وگل کاری کا احساس ہوتا ہے وہ انشاء پردازی نہیں، بلکہ علامہ شبلی کے ادبی اسلوب کا خاصہ اور جوہر ہے۔ جس سے وہ

خود بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے اور نہ اس کی وجہ سے وہ کہیں تاریخی اصولوں سے منحرف ہوئے۔ غرض یہ کہ سیرۃ النبیؐ کا ہر صفحہ اس کا شاہد ہے۔ اس کے سرنامہ اور ظہور قدسی پر تو الہام کا شبہہ ہوتا ہے۔ یہاں چند دوسرے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں تاکہ علامہ شبلی کی فطری انشاء پردازی اور تاریخی دیانت داری کا اندازہ ہو سکے۔

۱- خطبہ فتح مکہ کے بعد کی منظر کشی ان الفاظ میں کی ہے:

''خطبے کے بعد آپؐ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جبارانِ قریش سامنے تھے۔ ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب سے پیشرو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ وسناں نے پیکر قدسی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنھوں نے آنحضرت ﷺ کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریت پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔''

رحمت عالم ﷺ نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا تم کو کچھ معلوم ہے؟ میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں۔؟

یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے، لیکن مزاج شناس تھے، پکار اٹھے کہ ''تو شریف بھائی ہے اور شریف برادرزادہ ہے،۔ ارشاد ہوا تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔'' (۸۵)

۲- ارباب سیر ومغازی کی داستان سے مورخین یورپ کی خاص دل چسپی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کیا عجب بات ہے کہ ارباب سیر، مغازی کی داستان جس قدر درازنفسی اور بلند آہنگی سے بیان کرتے ہیں یورپ اسی قدر اس کو زیادہ شوق سے جی

لگا کر سنتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ داستان اور پھیلتی جائے کیوں کہ اسلام کے جور و ستم کا جو مرقع آراستہ کرنا ہے اس کے نقش و نگار کے لئے چند قطرے نہیں چشمہائے خوں درکار ہیں۔''(۸۶)

۱۳- علامہ شبلی نے سند و حوالہ اور مراجع و مصادر کا سیرۃ النبیؐ میں خاص اہتمام کیا ہے اور کوئی واقعہ بغیر سند اور حوالہ کے نہیں لکھا ہے۔ قرآن پاک کے علاوہ حدیث، تفسیر، اصول حدیث، طبقات و تراجم، تاریخ اور سیر و مغازی کی سیکڑوں کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں۔ دراصل علامہ شبلی اردو کے پہلے مورخ ہیں، جنھوں نے حوالہ اور مآخذ و مراجع کی نشاندہی کی ابتداء کی۔ ان سے پہلے اس اصول کا اس قدر اہتمام کسی اور مورخ نے نہیں کیا۔ اردو میں علامہ شبلی اس اصول کے موجد تصور کئے جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ علامہ شبلی نے سیرۃ النبیؐ میں اپنے تاریخی اصولوں کا ہر ممکن پاس و لحاظ رکھا ہے اور اسی وجہ سے وہ جملہ سیرت نگاروں میں سب سے زیادہ قدآور اور بلند پایہ تسلیم کئے گئے ہیں اور اختر وقار عظیم نے اسی بنا پر یہ لکھا ہے کہ ''آج تک سیرت النبیؐ سے زیادہ محققانہ، عمدہ اور جامع المعلومات کتاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں لکھی گئی۔''(۸۷)

حوالے

(۱) مکاتیب شبلی ج ا ص ۱۰۸۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۲۸ء

(۲) ماہنامہ معارف (سلیمان نمبر) ص ۱۷۸، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۵ء

(۳) مقالات شبلی۔ جلد ۸۔ ص ۳۶۔ دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۳۸ء

(۴) مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی ص ۱۰۷، دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء

(۵) مولانا سید سلیمان ندوی، یاد رفتگاں ص ۱۱۶، دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۹۳ء

(۶) مقالات یوم شبلی ص ۱۱، مرتبہ حافظ نذر احمد، مسلم اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۶ء

(۷) اختر راہی، کتاب نامہ شبلی ص ۲۰، مسلم اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۱ء

(۸) ڈاکٹر انور محمود خالد، اردو نثر میں سیرت رسول ص ۵۳۸، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۹ء

(۹) حیات شبلی ص ۱۴۹

(۱۰) مکاتیب شبلی، ج ا ص ۳۳۶

(۱۱) حیات شبلی ص ۲۰۷

(۱۲) ایضاً ص ۲۰۳

(۱۳) ایضاً ص ۲۰۷

(۱۴) علامہ شبلی نعمانی، سیرۃ النبیؐ ج ا مقدمہ ص ۴، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۱۹۹۶ء

(۱۵) مقالات شبلی ج ۸ ص ۳۳، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۷۲ء

(۱۶) ڈاکٹر سید عبداللہ، سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۴۹، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۴ء

(۱۷) مقالات شبلی، ج ۸ ص ۳۳

(۱۸) سیرت النبیؐ ج ا مقدمہ ص ۵

(۱۹) سیرت النبیؐ ج ا، مقدمہ ص ۵

(۲۰) ایضاً ص ۴

(۲۱) ایضاً ص ۱-۴

(۲۲) ایضاً ج ا مقدمہ ص ۱-۴

(۲۳) مکاتیب شبلی، ج ا، ص ۲۰۲

(۲۴) مقالات شبلی، ج ۸، ص ۳۶

(۲۵) ایضاً ص ۳۴

(۲۶) علامہ شبلی، سیرۃ النبیؐ ج ۲ مقدمہ ص ۵، دار المصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۹۶ء

(۲۷) ایضاً حاشیہ ص ۷

(۲۸) مکاتیب شبلی، ج ا، ص ۲۴۲

(۲۹) سیرۃ النبیؐ ج ا، مقدمہ ص ۶۵ و ۶۶

(۳۰) مکاتیب شبلی ج ا، ص ۲۴۲

(۳۱) ایضاً ص ۳۲۷

(۳۲) ایضاً ج ۲، ص ۲۳۲

(۳۳) سیرۃ النبیؐ ج ۱، دیباچہ طبع اول ص ۸

(۳۴) فن سیرت نگاری پر ایک نظر، سہ ماہی فکر ونظر اسلام آباد، اپریل ۱۹۷۶ء ص ۳۸۰

(۳۵) سید شاہ علی، اردو میں سوانح نگاری ص ۲۰۴۔ گلڈ پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۶۱ء

(۳۶) ضیاء الحسن فاروقی، اشخاص وافکار ص ۱۱۴۔ مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۷۳ء

(۳۷) سیرۃ النبیؐ ج ۱، ص ۱۱۴

(۳۸) ماہنامہ معارف، (سلیمان نمبر) ص ۱۸۱

(۳۹) اردو نثر میں سیرت رسولؐ ص ۵۵۸

(۴۰) قاضی سلیمان منصور پوری، دیباچہ رحمۃ للعالمین حصہ سوم ص ۷، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور

(۴۱) بحوالہ حیات شبلی ص ۲۳۵

(۴۲) حیات شبلی ص ۷۱۷

(۴۳) الہلال، کلکتہ، مورخہ ۲۲ر جنوری ۱۹۱۳ء ص ۸، مدیر مولانا ابوالکلام آزاد

(۴۴) الہلال ۳۰ر اپریل ۱۹۱۳ء بعنوان سیرت نبویؐ

(۴۵) الہلال ۲۱ و ۲۸ر مئی ۱۹۱۳ء بعنوان سیرت نبویؐ اور روایات وآثار

(۴۶) الہلال ۳۰ر اپریل ۱۹۱۳ء ص ۱۰

(۴۷) ایضاً

(۴۸) مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۲۰۹، ۲۱۰ وج ۲ ص ۱۶۱

(۴۹) مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۲۵۶

(۵۰) ایضاً ص ۲۶۰

(۵۱) ایضاً ص ۲۵۱

(۵۲) فن سیرت نگاری پر ایک نظر، فکر ونظر اسلام آباد ۱۹۷۶ء ص ۸۳۱

(۵۳) مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۲۰۱

(۵۴) پروفیسر خلیق احمد نظامی، شبلی بحیثیت مورخ، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، مارچ ۱۹۸۶ء ص ۲۱۰

(۵۵) سیرۃ النبیؐ ج ا، ص ۳۹

(۵۶) الطاف فاطمہ، اردو میں فن سوانح نگاری ص ۲۰۲، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی

(۵۷) فکر و نظر اسلام آباد مارچ ۱۹۷۶ء ص ۸۲۵

(۵۸) اردو میں سوانح نگاری، ص ۲۰۴، ۲۰۵

(۵۹) شیخ محمد اکرام، یادگار شبلی، ص ۳۴۰، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور

(۶۰) سیرۃ النبیؐ ج ا، ص ۴۳۴

(۶۱) ایضاً ص ۴۳۴، ۴۳۵

(۶۲) سیرۃ النبیؐ ج ا حاشیہ ص ۱۰۸

(۶۳) ایضاً

(۶۴) ایضاً ص ۱۱۸

(۶۵) ایضاً ص ۱۲۹

(۶۶) ایضاً ص ۱۳۰

(۶۷) ایضاً

(۶۸) ایضاً ص ۱۲۰

(۶۹) سیرۃ النبیؐ ج ا ص ۶۵

(۷۰) ایضاً ص ۶۵

(۷۱) ایضاً

(۷۲) مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار ص ۱۱۱

(۷۳) سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۵۱

(۷۴) ماہنامہ معارف (سلیمان نمبر) ص ۱۷۸

(۷۵) دلگداز لکھنو، مئی ۱۹۱۸ء ص ۱۰۸–۱۱۱

(۷۶) سیرۃ النبیؐ ج ا ص ۱۲۱

(۷۷) ایضاً ج ا ص ۳۹۱

(۷۸) ایضاً ج ا ص ۳۴۴، ۳۴۵

(۷۹) ایضاً ص ۲۴۲

(۸۰) ایضاً ج ا ص ۱۳۷، ۱۳۸

(۸۱) مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار ص ۱۱۱

(۸۲) اردو میں فن سوانح نگاری ص ۲۰۰

(۸۳) ایضاً ص ۲۰۵

(۸۴) اردو نثر میں سیرت رسولؐ۔ ص ۵۸۵

(۸۵) سیرۃ النبیؐ۔ جلد ا۔ ص ۳۶۳

(۸۶) ایضاً جلد ا۔ ص ۲۰۷

(۸۷) اختر وقار عظیم شبلی بحیثیت مورخ ص ۱۲۳، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

باب سوم

تالیفات اور رسائل

تاریخ بدءالاسلام

۱۸۸۳ء میں علامہ شبلی علی گڑھ میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ درس وتدریس کے ساتھ یہاں ان کے قلم سے عربی زبان میں جو پہلی تصنیف نکلی وہ تاریخ بدءالاسلام ہے۔ یہ کتاب سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) کی فرمائش پر درسی ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی اور ۱۸۹۱ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوئی۔(۱) اس کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''طلبہ میں ذات پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسن عقیدت اورواقفیت پیدا کرنے کے لئے عربی میں سیرت کا ایک مختصر رسالہ بدءالاسلام لکھااور وہ کالج کے نصاب تعلیم میں داخل ہوااور شاید اب تک ہے۔''(۲)

یہ رسالہ اگرچہ درسی ضرورت کی تکمیل کے لئے لکھا گیا تھا تاہم اس کی عام افادیت محسوس کی گئی، چنانچہ خود سرسید احمد خاںؒ نے جن کی خواہش پر یہ کتاب لکھی گئی تھی، اس کے فارسی ترجمہ کی خواہش کی، جسے مولانا حمیدالدین فراہیؒ (ف:۱۱رنومبر ۱۹۳۰ء) نے پورا کیا۔(۳) اور جو مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۸۹۱ء میں طبع ہوا۔ اس کا اردو ترجمہ آغاز اسلام کے نام سے میمونہ سلطان شاہ بانو بیگم نواب حمیداللہ خاں بھوپال نے کیا جو مطبع ظل السلطان بھوپال سے ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا۔ وجہ ترجمہ بیان کرتی ہوئی بیگم صاحبہ لکھتی ہیں:

''عرصہ سے میرا خیال تھا کہ میں اپنی بہنوں کی کوئی مذہبی خدمت انجام دوں۔ علیا حضرت (سلطان جہاں بیگم) کو بھی میرا یہ ارادہ معلوم تھا اس بنا پر حضور ممدوحہ نے شمس العلما علامہ شبلی نعمانی کے رسالہ بدءالاسلام کا فارسی ترجمہ عطا

فرما کر ارشاد فرمایا کہ اس کا اردو میں ترجمہ کرکے شائع کرادوں۔ چنانچہ میں نے ترجمہ شروع کر دیا اور الحمدللہ کہ اب وہ شائع ہو رہا ہے۔''(۴)

میمونہ سلطان شاہ بانو کا یہ ترجمہ بھی بے حد مقبول ہوا۔ اس کے درج ذیل ایڈیشن شایع ہوئے:

[ا] آغاز اسلام، ترجمہ بدء الاسلام، میمونہ سلطان شاہ بانو

- مطبع سلطانی، بھوپال، ۱۹۱۵ء، ۶۲ص
- مہتاب پریس، دہلی، غیر مورخہ، ۶۲ص
- رنگین پریس، دہلی، ۱۹۲۴ء، ۲۷ص
- یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۲ء،: بعنوان 'سیرت طیبہ'
- اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۷ء، مرتبہ جمیل احمد نقوی

بدء الاسلام کا ایک اور اردو ترجمہ حیات النبی کے نام سے تاج کمپنی کراچی نے شائع کیا ہے۔ محمد حمید اللہ اس کے مترجم ہیں۔(۵)

یہ رسالہ ۵۴ صفحات پر مشتمل ہے اختصار کے باوجود اس میں سیرت نبوی ﷺ کے تمام اہم اور ضروری مباحث آگئے ہیں۔ اس کا تعارف خود مصنف کے قلم سے ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ حالات نبویؐ اور عہد رسالت کے قابل ذکر واقعات کا ایک مجموعہ ہے، جس کو میں نے تاریخ ابوالفداء، کامل ابن اثیر اور شفا قاضی عیاض سے نقل کیا ہے اور موقع و مناسبت سے قرآنی آیات کو بھی ماخذ بنایا گیا ہے۔ یہ رسالہ گو بہ قامت کہتر ہے مگر امور سیرت کے مختلف النوع اور ضروری مطالب پر مشتمل ہونے کے سبب سے جامع اور کافی ہے۔''(۶)

مختلف عنوانات کے تحت اس میں مکی و مدنی زندگی کی مرقع آرائی کی گئی ہے۔ عہد مکہ کی تمام تفصیل اور اہل مکہ کے ظلم و ستم وغیرہ کے واقعات ''اسلام حضرت عمرؓ'' کے تحت قلم بند کئے گئے ہیں۔ دوسرے عنوانات یہ ہیں: ابتداء دعوت، ہجرت حبشہ، مقاطعہ بنی ہاشم، وفات ابوطالب اور حضرت خدیجہ، سفر طائف، قبائل کو دعوت اسلام، بیعت عقبہ اولیٰ و ثانیہ اور ہجرت۔

اس کے بعد مدنی زندگی کے حالات وواقعات ہیں جس کی تفصیل یہ ہے۔ تاسیس مسجد قبا، مواخاۃ، فرضیت روزہ، غزوہ بدر، غزوۃ السویق، غزوہ احد، غزوۃ حمراء الاسد، غزوۃ الرجیع، غزوہ بیر معونہ، بدر الثانیہ، غزوۃ الخندق، غزوہ بنی قریظہ، غزوہ بنی مصطلق، بیعت رضوان، بادشاہوں کے نام دعوت اسلام کے خطوط، غزوہ خیبر، حضرت خالد کا قبول اسلام، غزوہ موتہ، فتح مکہ، غزوہ حنین، غزوہ تبوک، وفود عرب، مرض وفات، اور وفات۔

ان دونوں ادوار کی تاریخ کے بعد علامہ شبلی نے کاتبین وحی کے اسماء، اسلحہ خانہ نبویؐ کی مختصر فہرست، عاملین صدقات اور ان کے تقرری وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ شمائل کے نام سے ایک مختصر نقشہ بھی دیا گیا ہے۔ ان مباحث سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ رسالہ سیرت کے کس قدر اہم مباحث پر مشتمل ہے۔ اس سے پوری سیرت طیبہ کا ایک اجمالی مرقع سامنے آجاتا ہے۔ چونکہ یہ رسالہ طلبہ کے لئے لکھا گیا تھا اس لئے ان کے معیار اور ذہنی سطح کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ مثلاً اس میں ان تمام مباحث سے صرف نظر کیا گیا ہے جو خاص طور سے معاندین اسلام کے یہاں زیر بحث رہے ہیں۔ جیسے اس میں صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت خدیجہؓ سے نکاح کی تفصیل درج ہے۔ بقیہ ازواج مطہرات کا ذکر نہیں۔ اسی طرح غزوہ بنی مصطلق کا ذکر انتہائی اختصار کے ساتھ اس لئے ہے کہ اس کے بعض واقعات مستشرقین کی توجہ کا خاص مرکز رہے ہیں اور ظاہر ہے یہ اور اس طرح کے دوسرے مباحث زیر بحث آتے تو یقیناً کتاب کا مقصد تالیف فوت ہوجاتا۔

علامہ شبلی کی اس ابتدائی دور کی تصنیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ابتداء ہی سے بڑی عقیدت ومحبت اور والہانہ شیفتگی تھی۔ ڈاکٹر انور محمود خالد لکھتے ہیں:

> ''اس رسالہ نے صرف طلبہ کے دلوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عقیدت ومحبت کے جذبات پیدا کئے بلکہ خود مصنف کے دل میں عشق رسول کی قندیل روشن کردی۔''(۷)

یہ جذبہ اور محبت ووالہانہ پن دن بہ دن ترقی کر کے خاتمہ بالخیر کے لئے سیرت پیغمبر خاتم کی شکل میں ظاہر ہوا۔ بدء الاسلام کو مقتدی خاں شروانی نے بجا طور پر سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ

وسلم کاتخم قرار دیا ہے۔(۸)علامہ شبلی کے عشق رسولؐ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم کی کتاب متعلقات شبلی۔مطبوعہ ادبی دائرہ اعظم گڑھ(مطبوعہ ۲۰۰۸ء)

بدء الاسلام سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی اس دور میں بھی سیرت نبویؐ کے مآخذ ومراجع پر خاص نظر رکھتے تھے اورحتی الامکان مستند مآخذ ہی کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔خود بدء الاسلام کے بارے میں اس کے سرورق پر لکھا ہے کہ:

مقتبساً من آیات القرآن وملتقطاً من کتب العلماء ذوی الصدق والایقان کتاریخ ابی الفداء والشفاء لقاضی عیاض والکامل لابن الاثیر۔(۹)	یہ رسالہ قرآنی آیات کے اقتباسات اورصدق وایقان سے معمور علماء کی کتابوں مثلاً تاریخ ابوالفداء، شفا قاضی عیاض اور کامل ابن اثیر کے منتخبات کا مجموعہ ہے۔

سیرۃ النبی میں علامہ شبلی نے ایک طویل اورمبسوط مقدمہ لکھا ہے۔جس میں سیرت نگاری کے اصول وضوابط،حزم واحتیاط اوراس کے مآخذ ومراجع پر مفصل بحث کی ہے،ابتدائی دور کی اس تصنیف میں اس طویل اورمبسوط مقدمہ کے ابتدائی نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔مثلاً علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> ''فن سیرت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی مثال صحن شاہی کی ہے۔جہاں جواہر وسنگریزے سب بکھرے پڑے ہوئے ہیں اوران کی تلاش وتحقیق میں وہی کامیاب ہوسکتا ہے جس کو چھان بین کا ملکہ ہواور وہ دقیق النظر بھی ہو، نیز اس کا علم گہرااورذہن رسا ہو،اگر کسی میں یہ اوصاف نہ ہوں تو اس کواس کوچہ میں قدم نہیں رکھنا چاہئے کیوں کہ اس سے بڑی لغزشیں پیدا ہوسکتی ہیں۔''(۱۰)

چنانچہ خود علامہ شبلی نے بدء الاسلام اسی حزم واحتیاط سے قلم بند کی ہے اورمولانا محمد عارف عمری کے الفاظ میں ''علامہ شبلی نے اس رسالہ میں کتب تاریخ اورقرآنی آیات کواس طرح باہم پرودیا کہ یہ سیرت کاایک مختصراوردلآویز مجموعہ ہوگیا ہے۔(۱۱)

اب ہم بدء الاسلام کے چند مباحث کا ذکر کرتے ہیں۔ظہور اسلام کے وقت اہل عرب کے مذاہب کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں:

وكانت للعرب يومئذ ديانات مختلفة فمنهم من كان يميل الى الدهر ويقول اِن هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْىٰ ومايُهلِكُنَااِلَّا الدّهرُ، ويقول اذا ذكر له البعث والنشر "ءَ اِذَا كُنَّاعظَاماً وَّرُفَاتاً اَئِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ" وَمنهم من كان يقرب بالوحدانية ولكن مع ذالك يعتقدان هنالك اشخاصاً من الملٰئكة والارواح تدبر اهل الارض فيما يرجع الى منافع الناس وعوايد هم ولذالك اتخذوا اصناما على هيئتهم المفروضة وقالوا "مَانَعْبُدُ هُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلىٰ اللّٰهِ زُلْفاً" ومنهم من كان يسمى الملئكة تسمية الانثىٰ فاما الفسوق والتفاجر وسوء التعامل والتظالم بالسبى وشيوع الربوا وكثرة النكاح وتعاود الحروب والواد وقتل الاولاد فكانوا كلهم فى ذالك على محجة واحدة و ديدن مشتركه۔ (۱۲)

آغاز اسلام کے وقت عربوں میں مختلف عقیدوں کے لوگ تھے۔ بعض عرب دہریت کی طرف مائل تھے اور کہتے تھے کہ ہماری تو یہی دنیا کی زندگی ہے اور بس (یہیں) مرنا اور جینا ہے اور زمانہ ہی ہم کو مار دیتا ہے اور جب ان سے دوبارہ زندہ کئے جانے اور حشر ونشر کا ذکر کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مر کر (گل سڑ جائیں گے) ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو جائیں گی تو کیا ہم کو اٹھا کر کھڑا کیا جائے گا۔ بعض لوگ وحدانیت کے قائل تھے مگر اس کے ساتھ یہ اعتقاد بھی رکھتے تھے کہ ملائکہ اور بعض دوسری روحیں انسانوں کے نفع ونقصان کی مجاز ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے بعض خیالی تصویروں کے بت تراش لئے اور کہتے تھے کہ ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ خدا سے ہم کو نزدیک کر دیں بعض عرب ملائکہ کو بیٹیاں تصور کرتے تھے۔ اس کے علاوہ فسق وفجور، بدمعاملگی، قیدی بنانے کی ظالمانہ روش، سود خوری، کثرت ازدواجی، جنگ جوئی، اولاد کو زندہ درگور کر دینا اور ان کو قتل کر دینا ان کی عام اور مشترک صفت تھی۔

غزوۂ بدر کے سلسلے میں علامہ شبلی کا نقطۂ نظر عام سیرت نگاروں کے برعکس ہے۔ عام سیرت نگاروں کا خیال ہے کہ حضورا کرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے ابوسفیان کے قافلہ پر حملہ

کے لئے نکلے تھے، مگر علامہ شبلی نے قرآن مجید سے استدلال کر کے اس نقطۂ نظر کی تردید کی ہے۔ سیرۃ النبی میں تو یہ موقف ان کا ہے ہی، بدء الاسلام کے زمانہ تصنیف میں بھی ان کا یہی موقف تھا۔ بدءالاسلام میں اس کا اجمالاً ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

ومن امرها ان قريشاً بعدماهاجر المسلمون الى المدينة لم يزالوا فى جد وطلب ليدركوهم ويكيدوا بهم فجاء ابوجهل سرا وخادع عياش ابن ربيعة ورده الى مكة فحبسوه وهكذا كانت صنيعتهم وكان رسول الله ﷺ ايضاً يبعث السرايا ليعرفوا اخبار قريش ويمنعوهم فجرت الىٰ الحرب وكانت وقعات ثم انه قدم لقريش قفل من الشام يقودهم ابوسفيان ومعه ثلاثون رجالا وبلغ ابى سفيان ان محمدا يريده فارسل الى مكة واعلم قريشاً بذالك فخرج الناس من مكة سراعا ولم يتخلف من الاشراف غير ابى لهب وكانت عدتهم تسعمأة وخمسين رجلا فهم مأة فرس ولما بلغ ذالك رسول الله ﷺ ندب الناس فخف بعضهم وثقل بعضهم و فيهم من اراد ان يغير على القافلة فماارتضىٰ بذالك رسول الله

غزوۂ بدر کا پس منظر یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ مین پناہ لی تب بھی کفار مکہ ان کے درپے آزار اور برابر کوشاں رہے کہ ان کو پکڑ لیں اور ان کو تختۂ مشق بنائیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابوجہل خفیہ طور پر مدینہ آیا اور عیاش ابن ربیعہ کو بہلا پھسلا کر مکہ لے گیا اور وہاں ان لوگوں نے ان کو قید کر دیا۔ اس طرح کی ان کی حرکتیں برابر جاری تھیں، ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کچھ دستے مرتب فرمائے تاکہ ان کی کارروائیوں کا علم ہو سکے اور اس کی روک تھام ہو سکے اسی اثنا میں قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام سے آ رہا تھا جس میں تیس افراد تھے اور ان کا قائد ابوسفیان تھا۔ ابوسفیان کو یہ خبر لگی کہ محمد ﷺ اس پر حملہ کرنے والے ہیں۔ چنانچہ اس نے مکہ خبر بھیج کر قریش کو خبر کرادی، اس خبر کا سننا تھا کہ مکہ کے لوگ دوڑ آئے، شرفاء مکہ میں ابولہب کے سوا کوئی نہیں باقی بچا اور ان کی تعداد نوسو پچاس تھی جن میں سو گھوڑ سوار تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے صحابہ کو

ﷺ وخرج من المدينة ليمنع قريشاً وذالك قوله تعالىٰ : كَمَا اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِن م بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقاً مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكَارِهُوْنَ يُجَادِلُوْنَكَ فِيْ الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ وَاِذْيَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وتوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُاَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِيْنَ۔ (١٣)

جنگ کے لئے آمادہ کیا۔ بعض صحابہ تو فوراً تیار ہو گئے مگر بعض حضرات کو تردد لاحق ہوا۔ کچھ لوگ یہ چاہتے تھے کہ قافلہ ابوسفیان پر ہلہ بول دیا جائے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا اور مدینہ منورہ سے قریش ہی کے مقابلہ کے لئے نکلے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے، تمہارے پروردگار نے تم کو گھر سے نکلنے پر آمادہ کیا اور مسلمانوں کا ایک گروہ ناخوش تھا وہ لوگ حق بات میں، بعد میں اس کے ظاہر ہونے کے تم سے جھگڑتے تھے (اور مارے ڈر کے پیچھے ہٹنے لگے) گویا ان کو زبردستی موت کی طرف ڈھکیلا جاتا ہے اور وہ موت کو دیکھ رہے ہیں اور جب خدا نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ دو جماعتوں میں سے ایک تمہارے ہاتھ آجائے گی اور تم چاہتے تھے کہ جس میں لڑنے کا بوتہ نہیں وہ تمہارے ہاتھ آئے اور اللہ کی مرضی یہ تھی کہ اپنے حکم سے دین حق کو قائم کرے اور کافروں کی جڑ کاٹ ڈالے۔

ایک اقتباس اور ملاحظہ ہو۔ اس میں علامہ شبلی نے دعوت توحید کے عنوان سے مشرکین کے طرز عمل کی وضاحت اور اس کی تردید کی ہے۔ لکھتے ہیں:

ولما دعاهم رسول الله ﷺ الى التوحيد والاسلام وانكر عليهم عبادة الاصنام اخذتهم العزة بالاثم

جب رسول اللہ ﷺ نے اہل عرب کو توحید اور اسلام کی طرف بلایا اور بت پرستی سے منع فرمایا تو ان میں گناہ کی ضد اور ہٹ دھرمی پیدا

فـاعـرضـوا واستهـزء واواكثروا من الـجـدال والـحـجاج وتثبتوا بحجج واهية وشبهـات سـاقـطة فمنهم من يقول "اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهاًوَّاحِداً" ومنهم مـن تـمسك بالتقليد الجامد فقال "مَا سَـمِـعْـنَـا بِهٰـذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ بَلْ نَتَّبِعُ مَآاَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَائنا فَلَمَّا اَحَسَّ مِـنْهُـمُ الْـكُفْرَ اثبت عليهم حجة الحق بـاسـتـدلالات لـطيـفة سهل المـاخذ سـمـح التـعـاطى لاتبعد عن محجتهم ولا تـخرج عن نطاق دركهم فاستدل عـلـى وجـودالـخـالـق بشـواهـد الفطرة وعجائب اٰثارها۔ (۱۴)

ہوئی۔ ان لوگوں نے حق سے منھ پھیرلیا اور استہزاء اور بحث ومباحثہ پر آمادہ ہوگئے، جب کہ ان کے الزامات بے بنیاد اور دلائل ساقط الاعتبار تھے۔ چنانچہ بعض نے یہ کہا کہ اس نبی نے سارے معبودوں کی جگہ صرف ایک معبود کو رکھا ہے اور بعض نے کورانہ تقلید کی بنیاد پر کہا کہ یہ بات تو ہم نے اپنے آباء واجداد سے نہیں سنی، ہم تو وہی بات مانیں گے جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو پایا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو ان کے کفر وعناد کا بخوبی اندازہ ہوگیا تو اثبات حق کے لئے ان کے سامنے ایسے لطیف دلائل پیش کئے جو ان کے فہم وادراک سے بالاتر نہ ہوں اور وجود خالق پر شواہد فطرت اور عجائب خلقت سے استدلال کیا۔

ان اقتباسات سے بدء الاسلام کے مباحث کے ساتھ اس کے اسلوب تحریر کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ طلبہ کے لئے اب بھی مفید اور نافع ہے۔ چوں کہ یہ رسالہ اب تقریباً نایاب ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ جدید انداز تحقیق کے مطابق مرتب کر کے اسے شائع کیا جائے۔ علامہ شبلی کے قدر دانوں کے لئے یہ ایک مفید کام ہوگا۔

حوالے

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی، یادرفتگاں ص۱۱۶، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۱۹۹۳ء۔

(۲) حیات شبلی، ص۱۴۹۔

(۳) مولانا سید سلیمان ندوی، مقالات شبلی حاشیہ ج۲ ص۱۳، دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۸۸ء۔

(۴) آغاز اسلام ص ۲۔

(۵) کتابیات شبلی ص ۱۴۱

(٦) بدء الاسلام، ص ۲۔

(۷) اردو نثر میں سیرت رسول ﷺ ص ۳۸

(۸) مقالات یوم شبلی، ص ۱۱

(۹) سرورق، تاریخ بدء الاسلام، مطبع مفید عام، آگرہ۔

(۱۰) تاریخ بدء الاسلام، ص ۲، ۳۔

(۱۱) ماہنامہ الرشاد، اعظم گڑھ اپریل ۲۰۰۲ء۔ ص ۸۔

(۱۲) تاریخ بدء الاسلام، ص ۴، ۵۔

(۱۳) تاریخ بدء الاسلام ص ۲۰، ۲۱۔

(۱۴) تاریخ بدء الاسلام، ص ۵۔

انٹرنس کورس کا سرورق

انٹرنس کورس فارسی

علامہ شبلی کے کئی علمی کام عام نگاہوں سے اس لئے اوجھل رہے کہ ان کے بلند اور عظیم الشان کارناموں کی تابانی نے ان کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں دیا۔ ان کی اسی طرح کی ایک کاوش الہ آباد یونیورسٹی کے امتحانات انٹرنس، انٹرمیڈیٹ اور بی.اے. فارسی کی نصابی کتابیں بھی ہیں۔ یہ مطبوعہ کتابیں اب نایاب ہیں۔

۱۸۹۵ء میں علامہ شبلی الہ آباد یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس اور بورڈ آف اسٹڈیز کے ممبر اور فیلو نامزد ہوئے۔ چنانچہ اسی سال نصاب سے متعلق ایک مطول یادداشت تیار کی اور پھر سنڈیکیٹ برائے امتحانات کی تجویز پر انٹرنس، انٹرمیڈیٹ اور بی.اے. کا نصاب تیار کیا جو یونیورسٹی سے منظوری کے بعد شائع ہوا۔

ا۔ انٹرنس کورس فارسی

علی العموم مولانا کے سوانح نگاروں نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن اس کے دو مطبوعہ نسخے موجود ہیں۔ ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں اور دوسرا ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب [بریلی] کے ذاتی ذخیرہ کتب میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف پہلے محقق ہیں جنہوں نے انٹرنس کورس فارسی کی طرف توجہ کی اور اس کے تعارف و تجزئے پر مشتمل ایک محققانہ مقالہ ماہنامہ معارف [نومبر ۱۹۹۶ء] میں لکھا۔ وہ انٹرنس کورس کے مشمولات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سب سے پہلے سعدی شیرازی کی گلستاں باب چہارم (درفوائد خاموشی) اور باب ہشتم (درآداب صحبت) کا انتخاب ملتا ہے۔ اس کے بعد سفرنامہ خسرو کا انتخاب ہے جس کے یہ عنوانات ہیں: صفت شہر مصر، صفت شہر مکہ، صفت زمین

عرب وعجم، یہ انتخاب بہت دلچسپ ہے۔اس میں اس عہد کے مصر، مکہ اور یمن کی تاریخ ، جغرافیہ ، عمارات ، صنعت وحرفت ، بازاروں ، پھلوں ، سلاطین اور عوامی خوش حالی کا بیان ملتا ہے۔اس کے بعد عبدالحمید لاہوری کے شاہ جہاں نامہ کا انتخاب شاہ جہاں کی ''عادت شریفہ وعادات منیفہ'' کے بیان میں ملتا ہے۔اس انتخاب کی نثر میں ادبی وزن وقار زیادہ ہے۔اس انتخاب سے ایک مغل شہنشاہ کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے جس کے ذریعہ اس کے آئین حکومت کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔اس کے بعد انتخاب نامہ خسرواں ہے جس کے عنوانات یہ ہیں: ''بستمین نوشیرواں'' اور ''بیت ویکمیں ہرمز'' یہ انتخاب صرف دس صفحات میں نوشیرواں کے حالات واقوال پر مشتمل ہے۔اس کے بعد عبداللطیف السطوجی التبریزی کے فارسی ترجمہ الف لیلیٰ کا انتخاب ملتا ہے۔(از شب پانصد وسی تا شب پانصد وچہل وسہ) جو سند بادحمال کے قصے پر مشتمل ہے۔تازی سے فارسی میں ترجمہ نہایت رواں ہے۔''(۱)

حصہ نثر (ص۱ تا ص۹۶) کے بعد حصہ نظم (ص۹۷ تا ۱۹۳) ہے۔سید لطیف ادیب صاحب کے الفاظ میں:

''اس کا آغاز انتخاب بوستاں (باب چہارم در تواضع) سے ہوتا ہے۔یہ حصہ نظم میں طویل ترین انتخاب ہے۔(ص۹۷ تا ۱۳۶) اس کے بعد انتخاب سکندر نامہ ہے۔(ص۱۳۷ تا ۱۵۲) جس کا عنوان ہے ''رفتن سکندر نزد نوشابہ بہ لباس سفارت''۔اس کے بعد ہشت بہشت کا انتخاب ہے۔(۱۵۳ تا ۱۵۸) عنوان ہے ''افسانہ گفتن آہوئے مشکدم ومشک بہ پوست باز کردہ از بطانہ بیروں آوردن۔'' اس کے بعد انتخاب مخزن اسرار ہے۔(ص۱۵۹ تا ص۱۶۳) عنوان ہے ''مقالہ سوم در اختلاف وانقلاب حدوث واختلال امور دنیا''۔اس کے بعد کلیات سعدی سے ایک قصیدہ اخذ کر کے انتخاب میں شامل کیا گیا ہے۔(ص۱۶۴ تا ۱۶۶) جس کا مطلع ہے:

بامداداں کہ تفاوت نہ کند لیل ونہار

خوش بود دامن صحرا وتماشائے بہار

اس کے بعد محتشم کاشی کے مرثیہ امام حسین کو اس انتخاب میں شامل کیا گیا ہے۔
(ص ۱۶۷ تا ص ۱۷۲) جس کے بند اول کا پہلا شعر ہے:

باز ایں چہ شورش است کہ در خلق و عالم است

باز ایں چہ نوحہ وچہ عزا وچہ ماتم است

اس کے بعد دیوان حافظ کا انتخاب ہے۔(ص ۱۷۳ تا ۱۸۸) تعداد غزلیات ۲۵ ہے۔ یہ انتخاب ردیف الف، تائے فوقانی، دال مہملہ، سین مہملہ شین معجمہ، میم، نون اور یائے تحتانی پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد عمر خیام کی رباعیات کا انتخاب ہے۔(ص ۱۸۹ تا ۱۹۳) رباعیات کی کل تعداد پچیس ہے۔''(۲)

حصہ نثر و نظم کے بعد انتخاب قواعد فارسی (ص ۱۹۴ تا ۲۲۴) ہے۔ اس کے اصل مؤلف کا نام درج نہیں۔ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب لکھتے ہیں:

''انتخاب قواعد میں فعل اسم، حرف، مصدر کی تعریف اور مصادر کے اقسام واشتقاق کا بیان ہے۔ خاتمہ انتخاب ''خواص حروف تہجی'' کے بیان میں ہے۔ اساتذہ فارسی کے اشعار بطور مثال افراط سے نقل کئے گئے ہیں۔''(۳)

بریلی نسخہ کے مقابلہ میں مولانا آزاد لائبریری کا نسخہ قدیم ہے۔ اس لئے کہ اس کے ٹائٹل کور پر یہ صراحت ہے کہ:

انٹرنس کورس فارسی

مجوزہ سنڈ یکیٹ برائے امتحان ۱۹۰۰ء

مرتبہ۔ جناب مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی المخاطب بہ شمس العلماء

پروفیسر مدرسۃ العلوم علی گڑھ وفیلو آف یونیورسٹی الہ آباد

در مطبع العلوم علی گڑھ طبع شد

جبکہ ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب صاحب کے نسخے کی کتابت ۱۹۰۰ء میں ہوئی ہے

جیسا کہ اس کے کاتب عثمان علی، نیاز علی اور رضا بیگ کی درج کردہ تاریخوں سے واضح ہوتا ہے۔ (۴) ضخامت اور انتساب کے لحاظ سے بھی کسی قدر اس کی تائید ہوتی ہے۔علی گڑھ کے نسخے کے صفحات ۹٦ ہیں اور یہ صرف نثر و نظم کے انتخاب پر مشتمل ہے جبکہ لطیف صاحب کے نسخے کے صفحات ۲۲۴ ہیں اور اس میں حصہ نثر و نظم کے علاوہ آخر میں ''انتخاب از قواعد فارسی'' کے عنوان سے انیس صفحات پر مشتمل قواعد کا اضافہ ہے۔نسخہ علی گڑھ کی قدامت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ یہ ۱۹۰۱ء میں اسلامیہ اسکول اٹاوہ کے طالب علم محمد محسن کے کے زیر درس رہا ہے۔(۵) جبکہ نسخہ بریلی ۱۹۱۰ء میں بریلی کے طالب علم سید عابد مہدی کے زیر مطالعہ تھا۔(٦) نسخہ بریلی کے ٹائٹل کور سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی اس وقت مدرسۃ العلوم کی ملازمت سے مستعفی ہو چکے تھے جبکہ نسخہ علی گڑھ پر صاف پروفیسر مدرسۃ العلوم لکھا ہوا ہے۔

نسخہ بریلی اور نسخہ علی گڑھ کے مشمولات و مندرجات سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں فرق ہے۔ پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی نے ڈاکٹر لطیف صاحب کے مضمون پر جو ضمیمہ لکھا ہے، اس میں انہوں نے اس کی نشاندہی کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب صاحب نے مذکورہ کورس کے محتویات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے باب دوم (انتخاب از سفر نامہ خسرو) کے تحت جو ذیلی سرخیاں درج کی ہیں۔ان میں ''صفت شہر مصر'' اور ''صفت شہر مکہ'' کے مابین علی گڑھ کے نسخہ میں دو ذیلی سرخیاں (صفت احوال سلطان، سیر سلطان) کا اضافہ ہے اور آخری سرخی ''صفت زمین عرب و یمن'' کے بجائے علی گڑھ کے نسخہ میں ''صفت زمین عرب وعجم'' درج ہے۔''(۷)

نسخہ بریلی کے ان اضافات سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے اس نصاب کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کی۔انٹرنس کورس نسخہ بریلی طبع پنجم ہے جیسا کہ اس کے ٹائٹل کور پر درج ہے۔ اس بنیاد پر نسخہ علی گڑھ کو طبع چہارم قرار دیا جا سکتا ہے۔بہر حال ان دونوں نسخوں کے علاوہ اب تک کسی تیسرے نسخے کا سراغ نہیں ملتا۔

انٹرنس کورس میں ابتدائیہ ہے اور نہ اختتامیہ، اس لئے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ علامہ شبلی

نے اس کے انتخاب میں کن اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ تاہم اس کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس دور کے معیار مذاق کے مطابق ایک عمدہ اور معیاری انتخاب تھا۔ اس کی ایک اہم خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب نے لکھا ہے کہ:

''انٹرنس کورس فارسی کے انتخاب نظم کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اس میں عشق مجازی اور اس کی جملہ کیفیات کا دخل نہیں ہے۔ تمام تر زور سبق آموز لٹریچر پر ہے جو مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کے اسلوب میں ہے۔ اس کا سبب یہی ہوسکتا ہے کہ علامہ شبلی ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے عہد مابعد کے دور اصلاح سے وابستہ تھے اور ان کی فکر کا مرکز اقدار اسلامی کا احیاء تھا۔''(۸)

موجودہ دور میں انٹرنس (ہائی اسکول) کے لئے جو فارسی نصاب رائج ہیں ان سے ۱۱۳؍برس پہلے کے اس نصاب سے اگر موازنہ کیا جائے تو شبلی کا مرتب کردہ نصاب بدرجہا بہتر ہے۔ کتاب کے آخر میں مولانا شبلی کا دیا ہوا یہ اشتہار ہے:

''حسب منشا قانون بستم ۱۸۶۸ء جملہ حقوق ایں کتاب محفوظ است البتہ بابو اننت رام بھارگو بی.اے. و بابو رام ناتھ بھارگو بی.اے. ساکنان الہ آباد محلّہ یحیٰ پور اجازت ترجمہ اردو، انگریزی از مؤلف حاصل کردہ اند ہر کسی را کہ ترجمہ اردو یا انگریزی درکار باشد از بابو صاحبان موصوف طلب تواند کرد۔''

المشتہر شبلی نعمانی پروفیسر مدرسۃ العلوم علی گڑھ

اس اشتہار سے ایک بات یہ بھی واضح ہوجاتی ہے کہ غالباً اس کورس کے اردو اور انگریزی ترجمہ کا بھی خیال تھا اور بھارگو برادران نے مؤلف سے اس کی اجازت لے لی تھی۔

۲۔ انٹرمیڈیٹ کورس فارسی

علامہ شبلی نے انٹرمیڈیٹ کورس فارسی بھی مرتب کیا تھا۔ اس کا ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ یہ ۳۰۲ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۸۹۷ء میں سید اصغر علی کے زیر اہتمام مطبع العلوم علی گڑھ سے طبع ہوا ہے۔ اس کے مشمولات یہ ہیں:

حصہ نثر

غالباً یہ طبع اول ہے۔اس کے کسی اور نسخے کا اب تک علم نہیں اور نہ معلوم ہوسکا کہ آیا یہ دوبارہ شائع ہوا یا نہیں۔اس کا جو نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہے۔وہ الہ آباد کے خان بہادر ابو محمد کے زیر مطالعہ رہا ہے اور ان کے ذاتی ذخیرہ کتب سے مولانا آزاد لائبریری نے خریدا ہے۔(۹)

۳۔بی.اے.کورس فارسی

اس کتاب کے کسی مطبوعہ نسخے کا علم نہیں۔اس کا ذکر محض حیات شبلی میں محمد مہدی

نائب مہتمم صیغہ تاریخ بھوپال کے حوالہ سے ملتا ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ:

''الہ آباد یونیورسٹی کے قیام کے وقت ایف اے اور بی اے کے امتحانات میں فارسی کورس نہایت آسان بنایا گیا تھا، ایک عرصہ تک جب طلبہ آسانی کے ساتھ اس میں کامیاب ہوتے رہے تو یونیورسٹی کے ایک گروہ نے فارسی کورس کے آسان ہونے کی شکایت کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی یونیورسٹی کی تعلیم میں ایک مضمون ہونے کے ناقابل سمجھی گئی، لیکن عین وقت پر مولانا (شبلی) نے نہایت قابلیت سے ایک کورس تیار کیا جس کا معیار اس قدر بلند تھا کہ فارسی کا وقار قائم رہ گیا اور اس کا اخراج ملتوی ہو گیا۔''(۱۰)

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے تیرہویں اجلاس منعقدہ کلکتہ [۲۷ تا ۳۰ دسمبر ۱۸۹۹ء] کی رپورٹ سے بھی مذکورہ واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے۔اس اجلاس میں الہ آباد یونیورسٹی کے بی.اے. کے نصاب سے فارسی کو خارج کرنے پر غور وخوض ہوا۔علامہ شبلی نے اس پر مفصل بحث کرتے ہوئے فارسی کی اہمیت واضح کی اور اپنے دلائل سے ثابت کیا کہ فارسی دوسری مشرقی زبانوں سے کسی طرح کم رتبہ نہیں۔(۱۱) اس اجلاس میں انہوں نے جو تقریر کی تھی اس سے نصابی کتابیں تیار کرنے کی بھی وضاحت ہوتی ہے لیکن اس میں بی.اے.کورس فارسی کی وضاحت نہیں۔بہر حال سید محمد مہدی کی فراہم کردہ معلومات کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کے مشمولات کا ذکر حیات شبلی میں کیا ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک ضخیم اور مبسوط انتخاب تھا۔وہ لکھتے ہیں:

''اس کورس کے نثر کے حصہ میں پہلے نظام الملک طوسی کے سیاحت نامہ کے ۲۲۵ صفحے ہیں پھر سو صفحوں میں ابوالفضل کی آئین اکبری کا ایک ٹکڑا ہے جس میں شعرائے اکبری کا تذکرہ بھی شامل ہے۔اس کے بعد خالص نظم ہے۔نظم میں پہلے شاہ نامہ فردوسی کے ننانوے صفحے ہیں۔اس کے بعد شعرائے متاخرین میں سے قاآنی کے قصائد کے پچاس صفحے ہیں پھر قدما میں منوچہری کے قصائد و مسمطات و اشعار کے اکیانوے صفحے ہیں۔''(۱۲)

علامہ شبلی نے ان انتخابات میں کن اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے، اس کی نشاندہی کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

''اس کورس کی نثر میں چند باتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ خالص فارسی ہو، دوسرے یہ کہ وہ روزمرہ کی باتوں کی تحریر کا سلیقہ سکھائے اور تیسری یہ کہ اس سے مسلمانوں کے آئین حکومت اور تمدن کا نقشہ کھنچ جائے اور ایک مقدم اور متاخر دونوں کا نمونہ پیش نظر ہو جائے۔'' (۱۳)

یہ نصاب عرصہ تک الہ آباد یونیورسٹی میں رائج رہا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ ۱۹۰۳ء یا اس کے بعد تک جاری رہا۔ (۱۴)، البتہ جناب سید لطیف ادیب صاحب کی تحقیق ہے کہ کم از کم ۱۹۱۰ء تک یہ نصاب یونیورسٹی میں نافذ رہا۔ (۱۵)

ایک صدی گذر جانے کے بعد آج ان نصابی کتابوں کا مطالعہ وجائزہ اس لئے ضروری ہے کہ ان سے یہ پتہ چل سکے کہ اس دور میں فارسی شعر و ادب کا کس قدر ذوق پیدا ہوا اور یہ کہ علامہ شبلی کے اس کام کی قدر و قیمت کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کتابوں کو محفوظ کیا جائے اور از سر نو ان کا مطالعہ کیا جائے اور نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ایڈٹ کر کے شائع کیا جائے تاکہ علامہ شبلی کی یہ کاوش دست برد زمانہ سے محفوظ ہو جائے۔

حوالے

(۱) ماہنامہ معارف اعظم گڑھ نومبر ۱۹۹۶ء، ص ۳۷۱، ۳۷۲۔

(۲) ایضاً ص ۳۷۲-۳۷۳۔

(۳) ایضاً ص ۳۷۴۔

(۴) ایضاً ص ۳۶۹۔۳۷۰

(۵) ایضاً مارچ ۱۹۹۷ء۔ ص ۲۰۷

(۶) ایضاً نومبر ۱۹۹۶ء۔ ص ۳۷۰۔

(۷) ایضاً مارچ ۱۹۹۷ء ص ۲۰۶۔۲۰۷

(۸) ایضاً نومبر ۱۹۹۶ء۔ ص ۳۷۳۔۳۷۴

(۹) ایضاً اپریل ۱۹۹۷ء۔ص ۲۰۸

(۱۰) حیات شبلی۔ص ۲۲۳۔

(۱۱) باقیات شبلی۔ص ۵۵۔۶۱

(۱۲) حیات شبلی ص ۲۲۳

(۱۳) ایضاً

(۱۴) حیات شبلی ص ۲۶۵۔

(۱۵) ماہنامہ معارف نومبر ۱۹۹۶ء، ص ۳۷۰

تذکرہ گلشن ہند

علامہ شبلی کی ذات علم و تحقیق سے عبارت تھی۔انھوں نے علم وادب اور تصنیف و تالیف کے میدان میں جو عظیم الشان کارہائے نمایاں انجام دیے اس کی ایک کڑی تذکرہ گلشن ہند کی تصحیح و تحشیہ اور اس کی اشاعت بھی ہے۔جس سے عام طور سے لوگوں کو واقفیت نہیں۔ان کی ضخیم اور مبسوط سوانح عمری حیات شبلی میں بھی اس کا ذکر نہیں آسکا ہے۔حدتو یہ ہے کہ گلشن ہند کا مقدمہ بابائے اردو مولوی عبدالحق [ف:۱۶راگست ۱۹۶۱ء] نے لکھا مگر انھوں نے بھی علامہ شبلی کے اس کارنامے کا کھلے دل سے اعتراف نہیں کیا اور جب ۱۹۳۴ء میں مشہور محقق ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ [ف:۲۵رستمبر۱۹۶۲ء] نے گلشن ہند کو گلزار ابراہیم کے ساتھ دوبارہ شائع کیا تو انھوں نے بھی اپنے دیباچے میں علامہ شبلی کا نام لینا گوارا نہ کیا۔اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ علامہ شبلی کی اس کاوش کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔

گلشن ہند

یہ مشاہیر شعرائے اردو کا ایک قدیم تذکرہ ہے۔جو اصلاً علی ابراہیم خاں کے فارسی تذکرہ ''گلزار ابراہیم'' کا ترجمہ ہے۔اسے مرزا علی خاں لطف نے ۱۸۰۱ء میں جان گل کرسٹ [ف:۱۸۴۱ء پیرس] کی فرمایش پر اردو کا جامہ پہنایا مگر مترجم مرزا علی خاں لطف نے اس میں اس قدر ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ کیا کہ اس کی حیثیت ایک علاحدہ تذکرہ کی ہوگئی ہے۔ مثلاً گلزار ابراہیم میں ۳۲۰ شعرائے اردو کا تذکرہ ہے مگر گلشن ہند میں صرف ۶۸ شعرا ہی جگہ پا سکے۔اس طرح سرے سے اس کی ترتیب ہی بدل گئی ہے۔ان ۶۸ شعرا کے تذکرہ میں مؤلف

نے بڑے اضافے کئے ہیں۔ محی الدین قادری زور کی تحقیق کے مطابق مرزا علی خاں لطف نے تقریباً تیس بتیس شعرا کے حالات اور نمونہ کلام میں اضافہ کیا ہے۔(۱) یہ اضافے بڑے وقیع اور بیش قیمت ہیں۔ بعض اضافے تو ایسے ہیں جن کا کسی اور تذکرہ میں ذکر نہیں اور نہ اس سے پہلے اہل علم ان سے واقف تھے۔ مثلاً عبدالقادر بیدل [ف: ۲۴ر نومبر ۱۷۲۰ء] بھی اردو میں شعر کہتے تھے۔ میر حسن نے ایک مثنوی لکھی تھی جس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو تھی۔ مرزا علی لطف نے میر حسن کے حالات میں اس مثنوی کا وہ حصہ جس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو ہے نقل کر دیا ہے۔ جس کا اس سے پہلے اہل علم کو علم نہ تھا۔ اسی طرح اہل اردو میر اثر کی مثنوی خواب و خیال کے محض نام سے واقف تھے، مرزا علی خاں لطف نے اس مثنوی کے چند اشعار بھی پہلی بار نقل کئے۔

مرزا علی خاں لطف نے گلزار ابراہیم کے متعدد مباحث کو حذف کر دیا ہے۔ خاص طور سے علی ابراہیم خاں مصنف گلزار ابراہیم کے بعض حالات اور بیانات کو۔ بہر حال گلشن ہند گلزار ابراہیم کا ترجمہ ہونے کے ساتھ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ مؤلف تذکرہ مرزا علی لطف نے بھی اسے ترجمہ کی بجائے اپنی تالیف ہی قرار دیا ہے۔(۲)

مرزا علی خاں لطف کے اس کارنامے سے اہل قلم واقف نہ تھے۔ ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۲ء میں حیدر آباد میں ایک زبردست سیلاب آیا جس نے بڑی تباہی و بربادی مچائی۔ یہ سیلاب کسی آفت زدہ اہل علم کا کتب خانہ بھی بہالایا۔ اس میں جو کتابیں برآمد ہوئیں ان میں یہ تذکرہ گلشن ہند بھی تھا، جو مولوی غلام محمد صاحب مددگار کیبنٹ دولت آصفیہ کے ہاتھ آیا۔ چنانچہ انھوں نے اسے علامہ شبلی نعمانی کی خدمت میں پیش کیا جو اس وقت حیدر آباد سے وابستہ اور انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے۔ اہمیت و افادیت کے پیش نظر ان کی خواہش تھی کہ اسے ایڈٹ کر کے انجمن کی طرف سے شائع کیا جائے، مگر عبداللہ خان ذمہ دار کتب خانہ آصفیہ کے الفاظ میں ''انجمن اپنی پیچ در پیچ طرز عمل کی وجہ سے نہ چھاپ سکی۔(۳) اسی زمانہ میں علامہ شبلی حیدر آباد اور انجمن ترقی اردو کی سکریٹری شپ سے مستعفی ہو گئے، تاہم گلشن ہند کی طباعت و اشاعت کا خیال ان کے دل سے نہ گیا۔ چنانچہ انھوں نے اس کی تصحیح و مراجعت کی، حواشی لکھے اور انجمن کے بجائے عبداللہ خاں

کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد سے اس کے طبع و اشاعت کی خواہش ظاہر کی۔(۴) چنانچہ موصوف نے ۱۹۰۶ء میں مولوی عبدالحق صاحب کے گراں قدر مقدمہ کے ساتھ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور سے طبع کرایا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے گلزار ابراہیم کے ساتھ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شایع کرایا۔ میرے پیش نظر گلشن ہند کا پہلا ایڈیشن ہے اور خوش قسمتی سے وہ مطبوعہ نسخہ ہے جو علامہ شبلی کے زیر مطالعہ رہا ہے۔ اس پر انھوں نے سرخ روشنائی سے متعدد نشان لگائے ہیں۔ بعض الفاظ، جملوں اور اشعار کو انڈر لائن کیا ہے۔ بعض الفاظ اور جملے بھی لکھے ہیں۔ مثلاً آبرو کی غزل پر ''غزل مسلسل سادہ و بے ردیف لکھا ہے۔'' (۵) یقین کے ایک شعر پر تشبیہ اور دوسرے پر تشبیہ مرکب لکھا ہے۔(۶) دو اشعار کے سامنے فنا لکھا ہے۔(۷) یک رنگ کے شعر پر صرف مرثیہ لکھ کر چھوڑ دیا ہے۔(۸)

نشانات اور اشارات سے علامہ شبلی کی منشا و مراد کیا تھی اس کا پتہ نہیں چلتا۔ غالباً علامہ دوبارہ گلشن ہند پر حواشی لکھنا چاہتے تھے۔ کاش وہ ایسا کر سکے ہوتے تو یقیناً اردو ادب کے سرمایہ میں ایک اضافہ ہوتا۔ پہلے ایڈیشن میں انھوں نے جو حواشی لکھے ہیں وہ بھی کم اہمیت کے حامل نہیں۔ یہاں ان کا ایک جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

گلشن ہند کی تصحیح و تدوین میں علامہ شبلی نے کن اصولوں کو پیش نظر رکھا، اس کی انھوں نے کہیں وضاحت نہیں کی ہے۔ البتہ ان کے قلم سے جو حواشی اور وضاحتی نوٹ ہیں، ان سے طریقۂ تصحیح و تدوین کا اندازہ کسی قدر ضرور ہوتا ہے اور اس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے ہی تحقیق و تدوین کے اصولوں سے بڑی حد تک کام لیا ہے۔ انھوں نے اصل سے [۱] تحقیق و مراجعت بھی کی ہے اور [۲] وضاحتی و تشریحی نوٹ بھی لکھے ہیں۔ [۳] بعض اضافے بھی کیے ہیں۔ [۴] املا کی تصحیح بھی کی ہے۔ اس کے علاوہ [۵] مفید علمی و تنقیدی حواشی بھی لکھے ہیں۔ ان ہی پانچ بنیادی امور سے تذکرہ گلشن ہند مزین ہو کر طبع و اشاعت کی منزل سے گزرا۔ یہاں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ مولانا کے اسی عمل سے قدیم تذکروں اور نادر کتابوں کی ترتیب و تدوین کا رجحان پیدا ہوا اور انجمن کی طرف سے متعدد قدیم اور نایاب کتابوں کو ایڈٹ کر کے شایع کیا گیا۔

تحقیق ومراجعت

گلشن ہند کی تصحیح وتدوین سے پہلے اردو میں تحقیق ومراجعت کے کسی کام کا علم مجھ بے بضاعت کو نہیں، اگر کوئی کام ہوا ہو تب بھی یہ امر یقینی ہے کہ اس کا عام رواج نہیں تھا اور نہ اس کے اصول متعین تھے اور نہ ہی اس موضوع پر کوئی تحقیقی کام ہوا تھا، اس لئے گلشن ہند کی تصحیح وتحقیق کو اردو میں متنی تصحیح وتحقیق کا اولین نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے متنی تحقیق کے سلسلہ میں جو کچھ کیا ہے اس کا تعلق اردو کے بجائے فارسی تاریخ سے ہے۔

تحقیق ومراجعت کا عام دستور یہ ہے کہ اصل سے مقابلہ وموازنہ کیا جائے تاکہ نقل میں اگر کوئی تسامح ہوگیا ہو تو اس کی اصلاح یا وضاحت کردی جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب دوسرے نسخے موجود ہوں، لیکن چونکہ گلشن ہند کا کوئی مخطوطہ اس وقت دستیاب نہ تھا، اس لئے اس سے مقابلہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ [بعد میں اس کے متعدد نسخے دریافت ہوئے۔] البتہ گلشن ہند کے اصل ماخذ گلزار ابراہیم اور بعض دوسرے شعرائے اردو کے تذکروں جیسے سخن شعراء ازعبدالغفور نساخ [ف:۱۴رجون ۱۸۸۹ء] وغیرہ سے اس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے ان سے مقابلہ کیا اور متعدد وضاحتی نوٹ لکھے۔ ان کے بعض حواشی سے بھی ان کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً مرزا محمد رضا امید کی غزل کا ایک شعر ہے:

بازار حور وحسن ملک جلوہ پری   بامن کی بیٹی ایک میری آنکھ میں کھڑی

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں بامن اصلاً برہمن ہے اور آخری لفظ کھڑی ہے جو دوسرے تذکروں میں پڑی ہے۔ علامہ شبلی نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ اور تذکروں میں کھڑی کے بجائے پڑی ہے جو درنظرم افتاد کا ترجمہ ہے۔(۹) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اورتذکروں سے اس کا موازنہ کیا تھا۔ ایک جگہ صراحتاً ''سخن شعرا'' کا نام بھی لیا ہے۔(۱۰)

وضاحتی وتشریحی نوٹ

فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر نثر کی جو کتابیں لکھی گئیں اس میں زبان و بیان کو سلیس،

عام فہم اور رشتہ وشگفتہ بنانے کی شعوری کوشش کی گئی۔ تذکرہ گلشن ہند میں بھی یہ خوبی موجود ہے۔ چونکہ مقفع و مسجع نثر لکھنے کا اس دور میں عام رواج تھا، اس لئے شعوری کوشش کے باوجود گلشن ہند میں بعض مقامات پر اس کے اثرات آ گئے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ یہ تذکرہ اپنی تالیف کے سو سال بعد شایع ہوا، اس لئے قدرتی طور پر وہ سلاست اور روانی نہیں جو انیسویں صدی کی ابتدا میں اردو نثر کا جوہر خاصہ تھی۔ اس لئے ضرورت تھی کہ ثقیل اور مبہم عبارتوں کی توضیح وتشریح کر دی جائے۔ قدیم دیہی اور عوامی الفاظ جواب تقریباً نا قابل فہم ہو چکے ہیں، ان کی نشان دہی بھی کر دی جائے تا کہ اصل مفہوم کے سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ چنانچہ علامہ شبلی نے گلشن ہند کی تصحیح میں خاص طور سے ان کی توضیح وتشریح کا اہتمام کیا ہے۔ اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

گلشن ہند کے مقدمہ میں مرزا علی خاں لطف کا ایک جملہ ہے ''جس کی سیف دشمن گداز کے مضمون نے دو مصرعہ آبدار کو بخشا رتبہ ذوالفقار کا'' علامہ شبلی نے ''یعنی ذوالفقار کا رتبہ بخشا'' لکھ کر اس جملہ کی وضاحت کی ہے(۱۱) اسی طرح اس عبارت ''جس کی بہار گلشن عدالت میں تحقیقات ہے چاک گریباں گل کی'' کی علامہ شبلی نے یوں وضاحت کی ہے ''یعنی گریبان گل کی چاک کی تحقیقات ہے۔(۱۲) گلشن ہند کے مولف کی ایک عبارت ہے ''کرم نام سی کی ندی سے'' علامہ شبلی نے اس کا مفہوم ''اس ندی سے جس کا نام کرم تھا'' لکھ کر بیان کیا ہے۔ (۱۳) مرزا علی لطف نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''اس میں بندوقوں کی مار سے نشان کے ہاتھی کا منھ پھر گیا۔'' یہ عبارت عام لوگوں کو بہ آسانی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی، چنانچہ علامہ نے اس کے حاشیہ میں صرف یہ لکھا ہے کہ ''یعنی وہ ہاتھی جس پر نشان سلطنت تھا۔''(۱۴) اس وضاحت سے عبارت کا مفہوم بہ آسانی سمجھ میں آ جاتا ہے۔

میر حیدر حیران کے حالات میں ایک جملہ ہے ''شاگرد رائے سرپ سنگھ دیوانہ تخلص استاذ کے'' علامہ شبلی اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس فقرہ میں قافیہ کی پابندی کی وجہ سے سخت تعقید پیدا ہوگئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سرپ سنگھ جن کا تخلص دیوانہ ہے اور جو استاد فن ہیں، حیران ان کے شاگرد ہیں۔''(۱۵)

علامہ شبلی نے متعدد مبہم اشعار کا مفہوم اوران کی فنی خامیوں کو بھی مختصر سے جملوں میں واضح کیا ہے۔ مثلاً ایک شعر ہے:

کی اس افغان بچے نے شوکت شاہی برباد   کون پہونچے گا خدا چھٹ مری ہاری کو

دوسرے مصرعے میں خدا چھٹ کی وضاحت ''سوائے خدا کے'' لکھ کر کی ہے۔ (۱۶) ظاہر ہے خدا چھٹ کو سمجھنا آسان نہ تھا۔ اسی طرح ایک اور شعر ہے:

حق طفلاں جو ہوا انیس برس میں تھا جمع   مار کر لے گئے ہاں چھوڑ سبک باری کو

دوسرے مصرعے میں سبک باری کی تشریح کرتے ہوئے علامہ نے لکھا ہے کہ ''یہاں صرف سبک باری اور تہی دستی چھوڑ گئے'' ہے۔ (۱۷)

شیخ ولی اللہ اشتیاق دہلوی کا ایک شعر ہے:

مجھے تو ڈھوکے تھا زاہد پر اک نگاہ سے آج   غرور کیا ہوا وہ تیری پارسائی کا

اشتیاق دہلوی نے پہلے مصرعہ میں لفظ ڈھوکے استعمال کیا ہے۔ علامہ شبلی نے اس کے معنی دینا بتایا ہے۔ (۱۸) خواجہ امین الدین امین عظیم آبادی کا ایک شعر ہے:

مرتے ہیں ہم تو اس کے لب آبدار پر   گر آب زندگی ہو تو مارے ہیں دھار پر

علامہ شبلی نے اس شعر کے دوسرے مصرعے میں آئے لفظ آب زندگی کی وضاحت اس طرح کی ہے:

''آب زندگی سے آب حیات مراد ہے جس پر خضر کا قبضہ کہا جاتا ہے۔'' (۱۹)

جرأت کا ایک شعر ہے:

دل بھڑکے ہے ٹک مصحف روجان دکھادے   سرگرم ہے آتش اسے قرآن دکھادے

دوسرے مصرعہ میں قرآن دکھانے کا مفہوم آسان نہیں تھا، کیونکہ اس کا ایک رسم سے تعلق ہے۔ علامہ شبلی نے اس پر جو وضاحتی نوٹ لکھا ہے، اس سے اس شعر کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:-

''جب گھر میں آگ لگتی ہے تو قرآن دکھاتے ہیں کہ اس کی برکت سے بجھ جائے۔'' (۲۰)

میر باقر حزیں کے اس شعر:

تو نہ ڈر ٹک اٹھا نقاب کے تئیں　　　میں سمجھالوں گا اضطراب کے تئیں

کے لفظ ''سمجھالوں'' کے بارے میں علامہ نے لکھا ہے کہ یہ تقطیع میں نہیں آسکتا اس لئے وہ ''سنبھالوں'' ہوگا۔(۲۱) اسی طرح محمد یار خاکسار عظیم آبادی کی غزل کے مقطع:

خاکسار عرش سے بھی دیکھا پرے تیرا مزاج

آپ میں اور آ ذرا اپنے تئیں پہچان عزیز

کے پہلے مصرعہ کے لفظ عرش کے بارے میں علامہ نے یہ وضاحت کی ہے کہ اس کا عین تقطیع سے گرتا ہے۔(۲۲) اس جملہ سے فن عروض پر علامہ کی گہری نظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

مرزا محمد رضا امید اصلا فارسی کے شاعر تھے۔ انھوں نے اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ گلشن ہند میں ان کے اردو کلام کے جو نمونے ہیں، ان پر بھی فارسی کا شبہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جو الفاظ و محاورات استعمال کئے ہیں ان میں بھی بڑی ثقالت ہے جس سے ان کے اشعار سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے ان کے کلام پر کئی وضاحتی نوٹ لکھے ہیں، جن سے ان کے اشعار کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مثلاً امید کی غزل کا ایک مصرعہ ہے۔

گفتا کہ ڈاڑھی جار مغل تجھ کو کیا پڑی

ڈاڑھی جار کی وضاحت ریش سوختہ لکھ کر علامہ نے کی ہے۔(۲۳) اسی غزل کے تیسرے شعر میں لفظ کرتار کا استعمال امید نے کیا ہے۔ ہندی الاصل ہونے کی وجہ سے اس کے معنی بتانا ضروری تھا چنانچہ علامہ نے کرتار کے معنی خدا کے لکھ کر وضاحت کی ہے۔(۲۴) اسی طرح اور بھی کئی اشعار پر مختصر سے نوٹ ہیں مثلاً آصف کے قطعہ کا دوسرا شعر یہ ہے:

جام عمر کا بھرتے ہیں لبریز　　　خلق کا عیش کا ایاغ ہوا

اس کے دوسرے مصرعے کی وضاحت علامہ شبلی کے الفاظ میں ''یعنی خلق کے عیش کا ایاغ لبریز ہوا'' ہے۔(۲۵) اسی طرح مرزا علی خاں لطف نے حمد کے جو اشعار لکھے ہیں ان میں ایک شعر یہ ہے:

چمن کے ہم نے معنی کی جو لی باس　　　تو ہر گل کی نئی بو ہے نئی باس

اس شعر کے پہلے مصرعہ کے بارے میں علامہ نے لکھا ہے کہ اس مصرعہ میں تعقید ہے۔ اصل عبارت یوں ہے معنی کے چمن سے جو ہم نے باس لی، باس لینا یعنی خوشبو سونگھنا وغیرہ۔(۲۶)

عام طور سے مورخین اورنگ زیب کو اس کے نام کی بجائے خلد مکاں لکھتے ہیں، مرزا علی خاں لطف نے بھی کئی جگہ خلد مکاں لکھا ہے، علامہ شبلی نے اس کی بھی وضاحت یعنی اورنگ زیب عالم گیر لکھ کر کی ہے۔(۲۷)

گلشن ہند میں ایک شعر کا پہلا مصرعہ مکمل نہیں ہے۔ اس میں کوئی ایک لفظ چھوٹا ہوا ہے، چونکہ علامہ نے اس کا مقابلہ بعض دوسرے تذکروں سے کیا ہے، اس لئے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً وہ مکمل مصرعہ انھیں کہیں نہیں مل سکا اس لئے انھوں نے بھی اس کو نامکمل ہی چھوڑ دیا البتہ حاشیہ میں خیال ظاہر کیا ہے کہ غالباً چھوٹا ہوا لفظ ''بہ ابہام'' ہے۔(۲۸) یہ قرین قیاس بھی ہے کیونکہ بہ ابہام لکھ دینے سے مصرعہ مکمل ہو جاتا ہے۔

طوالت کے خوف سے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ علامہ نے اس طرح کے متعدد وضاحتی وتشریحی حواشی اور فٹ نوٹ لکھے ہیں۔ ان کی افادیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ گو اب بھی بعض مباحث اور اشعار توضیح طلب رہ گئے ہیں تاہم جس قدر توضیحات ہیں ان سے نہ صرف تذکرہ گلشن ہند کے سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ قدیم اردو شعر وادب کو بھی سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

اضافات

گلشن ہند کی تصحیح میں حواشی کے علاوہ بعض اشعار کے اضافے بھی علامہ نے کئے ہیں، مثلاً شیخ محمد عابد دل عظیم آبادی کا تذکرہ مختصر تھا اور نمونہ کلام بھی درج نہ تھا۔ علامہ شبلی نے ان کے ذکر میں سخن شعراء از عبدالغفور نساخ سے ان کے یہ چار اشعار بطور نمونہ نقل کئے ہیں:

تیری زلفوں میں پھنسا دل یہی تقصیر ہوئی ۔۔۔ نقد جاں لیجئے حاضر ہے گنہ گار مع دل

نالے سدا بہر بھروں عمر کے بھرتے ہیں ۔۔۔ ہیں نزع میں ہم تجھ بن نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

جوں آئینہ بہ ستم رسیدہ ۔۔۔ رہتا ہے مدام آبدیدہ

تمہارے در پر جو دربان نے آستیں پکڑی　　برنگ نقش قدم ہم نے بھی زمیں پکڑی

اس اضافے کی خود علامہ نے بھی صراحت کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''اصل کتاب میں نمونۂ کلام نہیں تھا معلوم نہیں مصنف ہی کو نہیں ملا یا جس نسخہ سے ہم نے نقل کیا ہے، اس کے کاتب نے چھوڑ دیا ہے۔ مندرجہ بالا چہار شعر ہم نے سخن شعرا مصنفہ نساخ سے نقل کئے ہیں۔'' (۲۹)

اس کے علاوہ علامہ شبلی نے اور کوئی حذف و اضافہ نہیں کیا ہے، البتہ متعدد اہم شعرا کے کلام کو مولوی عبدالحق صاحب نے حذف کر دیا ہے۔ عبداللہ خاں لکھتے ہیں:

''اس کتاب کے چھپوانے میں خاص اہتمام کیا گیا ہے اور حتی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا ایک حرف بھی چھوٹنے نہ پائے، البتہ صرف اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ میر، سودا، درد اور مصنف کا نمونہ کلام جو اس تذکرہ میں نہایت کثرت کے ساتھ درج تھا، اس میں صرف عمدہ نمونہ چن لیا گیا ہے اور اس خدمت کو بھی مولوی عبدالحق صاحب کے ذوق سلیم نے انجام دیا ہے۔ اس کے سوا اس میں اور کوئی تصرف نہیں کیا گیا۔'' (۳۰)

مگر خود مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:

''مؤلف نے شعرا کا کلام جو بطور انتخاب درج کیا ہے اس میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں ان کے انتخابی کلام کو پبلشر نے کم کر دیا ہے۔ صرف اعلیٰ درجہ کے اشعار رکھے ہیں مگر جن شعرا کا کلام نہیں چھپا، ان کے کلام کو بجنسہ ویسا ہی رہنے دیا ہے۔ خود مؤلف نے اپنے کلام سے صفحے کے صفحے رنگ دئے تھے، اس میں بھی انتخاب کر دیا گیا۔'' (۳۱)

اس سے انتخاب و تصرف کی وجہ تو معلوم ہو جاتی ہے مگر کس نے انتخاب و تصرف کیا یہ نہیں معلوم ہوتا۔

صحت املا اور ناموزوں اشعار

گلشن ہند کی تصحیح میں علامہ شبلی نے املا کی اصلاح اور درستگی کی طرف بھی خاص توجہ دی ہے۔ مثلاً ایک لفظ ''کھلایا'' استعمال ہوا ہے۔ علامہ نے لکھا ہے کہ یہ کھلوایا ہے۔(۳۲) ایک دوسرا لفظ ''ہوجا گا'' لکھا ہے۔ علامہ نے ہوجائے گا لکھ کر تصحیح املا کی ہے۔(۳۳) اسی طرح میر شمس الدین فقیر کے ایک شعر میں لفظ ''پھاند'' استعمال ہوا ہے علامہ نے لکھا ہے کہ آج کل اسے باندھ بولتے ہیں۔(۳۴) امید کی ایک غزل کا مقطع ہے:

دست اغیار ہے زیر سر یار

آج امید کو ڈھب صحبت ہے

لفظ ڈھب پر حاشیہ میں علامہ شبلی نے اس کا املا کڈھب بتایا ہے۔''(۳۵)

قدیم شعرائے اردو نے بھی بعض الفاظ ایسے استعمال کئے ہیں جو لکھے کسی اور طرح سے جاتے ہیں اور ان کا تلفظ کچھ اور ہوتا ہے۔ تلفظ کی ذراسی بے توجہی سے اشعار ناموزوں اور بحروں سے گر جاتے ہیں۔ مثلاً قدما کے یہاں دیکھو کا دکھو،نہیں کا نہ، اور کوئی کا کُئی تلفظ ہے، تذکرہ گلشن ہند میں جہاں اس طرح کا تلفظ ہے، علامہ شبلی نے اس کی صراحت کردی ہے اور لکھا ہے کہ اس لہجہ میں نہ پڑھنے سے مصرعے ناموزوں ہوجائیں گے۔(۳۶)

علمی ادبی اور معلوماتی حواشی

گلشن ہند کی تصحیح میں متعدد علمی، ادبی اور معلوماتی حواشی علامہ شبلی کے قلم سے ہیں۔ مثلاً مولف تذکرہ نے شاہ ولی اللہ دہلوی کے تذکرہ میں ان پر اور شاہ عبدالعزیز صاحب پر تنقید کی ہے اور ان کی شان میں یہ شعر لکھا ہے:

شیر کے بچے میں غرش شیر سے افزود ہے

بھونک میں کتے کی، بلی کی سگی موجود ہے

اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مولف تذکرہ ان دونوں بزرگوں کی ہجو کر رہا ہے۔ علامہ شبلی اس شعر کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

''شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب دونوں کی مصنف نے ہجو ملیح
کی ہے اور اس شعر نے تو صاف پردہ اٹھادیا ہے۔'' (۳۷)

مولف تذکرہ نے شاہ ولی اللہ دہلوی کی دو کتابوں قرۃ العین فی ابطال شھادۃ الحسین اور جنت العالیۃ فی مناقب المعاویۃ کا ذکر کیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی اس کی تردید و تصحیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دونوں نام غلط ہیں پہلی کتاب تفضیل شیخین میں ہے، شہادت امام حسین علیہ السلام کی ابطال سے خدانخواستہ ان کو کوئی تعلق نہیں اور دوسری کتاب تو بالکل فرضی ہے۔ معاویہؓ کے مناقب میں ان کی کوئی کتاب نہیں۔'' (۳۸)

یہاں صاحب گلشن ہند سے یہ سہو ہوا ہے کہ انھوں نے شیخ ولی اللہ اشتیاق دہلوی کو جو شیخ عبدالاحد بن محمد سعید سرہندی کی اولاد میں تھے اور شاہ ولی اللہ ابن عبدالرحیم دہلوی کو ایک ہی شخص قرار دیا ہے، علامہ شبلی نے صاحب گلشن ہند کے اس اشتباہ کا ازالہ اپنے حاشیہ میں نہیں کیا ہے اور غالباً وہ اس اشتباہ کو نہ سمجھ سکے۔

سراج الدین علی خاں آرزو (ف: ۲۶رجنوری ۱۷۵۶ء بنارس) نے شیخ محمد علی حزیں ایرانی (ف: ۶۵-۱۷۶۴ء) کی شاعری پر ایک تنقیدی کتاب تنبیہ الغافلین لکھی تھی۔ مولف تذکرہ گلشن ہند نے آرزو کے تذکرہ میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ آرزو نے ناحق اپنی طبیعت مجوب کی اور دیوان شیخ کے بہت سے اشعار سقیم ٹھہرائے۔ علامہ شبلی نے حاشیہ میں مزید یہ وضاحت کی ہے کہ آرزو کی تنقید کے جواب میں مولوی امام بخش صہبائی (ف: ۱۸۵۷ء) نے ایک رسالہ قول فیصل کے نام سے لکھا ہے جس میں خان آرزو کے اکثر اعتراضات کے جوابات دئے ہیں۔ (۳۹) اسی طرح آرزو کے رسالہ موہبت عظمیٰ کے بارے میں علامہ نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ چھپ گیا ہے۔ (۴۰) آرزو کے ایک تذکرہ کا ذکر بھی مرزا علی لطف نے کیا تھا مگر اس کا نام انھوں نے نہیں لکھا ہے۔ اس کا نام مجمع النفائس ہے علامہ نے اس کی بھی نشان دہی کی ہے۔ (۴۱)

بہت سے اشعار ایسے ہیں جو ایک دوسرے کے مماثل ہیں یا ان میں ادنی تغیر پایا جاتا ہے۔ علامہ نے حواشی میں ان کی بھی صراحت کی ہے مثلاً شاہ نجم الدین آبرو کا ایک شعر ہے:

جہاں کے لوگ کہتے ہیں کمر ہے
کہاں ہے کس طرح کی ہے کدھر ہے

اس شعر پر علامہ نے لکھا ہے کہ یہی شعر بہ ادنی تغیر جرات کی طرف منسوب ہے۔ (۴۲) اسی طرح مرزا جعفر علی حسرت کے اس مصرعہ:

لودل تمہیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کروگے

کے بارے میں بھی علامہ نے لکھا ہے کہ یہ جرأت کی طرف بھی منسوب ہے مگر یہ صراحت نہیں کی کہ اصلاً یہ کس کا مصرعہ ہے۔ (۴۳) بعض ہم مضمون اشعار کی بھی علامہ شبلی نے نشان دہی کی ہے مثلاً خواجہ میر درد کے اس شعر:

تیری خوں آشامیاں مشہور ہیں اے تیغ یار
ایک قطرہ چھوڑے تو پیوے ہمارا ہی لہو

کے ہم مضمون شیخ ابراہیم ذوق کا یہ شعر حاشیہ میں لکھا ہے:

کہے ہے اس سے دم ذبح یہ گلو میرا
کمی جو مجھ سے کرے تو پئے لہو میرا

لیکن علامہ کا یہ بھی خیال ہے کہ ذوق کا شعر خواجہ میر درد کی بندش کو نہیں پہونچتا۔ (۴۴)

تذکرہ گلشن ہند جان گل کرسٹ کی فرمایش پر لکھا گیا ہے جس کی صراحت مرزا علی خاں لطف نے تمہید ہی میں کر دی ہے۔ جان گل کرسٹ کے کارناموں کا اہل اردو نے اعتراف کیا ہے اور متعدد مضامین اور کتابیں ان پر لکھی جا چکی ہیں۔ علامہ شبلی بھی ان کے مداح اور ان کے کاموں کے معترف ہیں۔ گلشن ہند میں جہاں ان کا ذکر آیا ہے اس کے حاشیہ میں لکھا ہے:

''یہ وہی گل کرسٹ صاحب ہیں جن کی ایما سے میرامن نے چہار درویش (باغ وبہار) لکھی درحقیقت اردو زبان کا ریفارمر یہی شخص ہے۔'' (۴۵)

مرزا علی خاں لطف نے ہندوستان کے گورنر جنرل وارن ہسٹنگز (Hastings) کا ذکر بھی کیا ہے اور اس کے نام کے ساتھ ان القاب کو بھی لکھا ہے جو اس کو شاہی دربار سے ملے تھے مثلاً عماد الدولہ اور امیر الممالک وغیرہ۔ علامہ شبلی نے اس پر ایک حاشیہ لکھا ہے اور اس تاریخی نکتہ کی

وضاحت کی ہے کہ:

''اس عہد میں ہندوستان کے گورنر جنرل دلی کے دربار سے خطاب حاصل کرتے تھے اور اس کو فخریہ تحریر و تقریر میں استعمال کرتے تھے۔''(۴۶)

انیسویں صدی کے شروع میں اردو مسجع و مقفع لکھی جاتی تھی ۔عام فہم اسلوب تحریر کسر شان خیال کیا جاتا تھا۔فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) میں عام فہم، سادہ اور سلیس زبان اس لئے استعمال کی گئی ہے کہ نو وارد انگریزوں کو ہندوستان پر حکمرانی میں آسانی ہو۔مرزا علی لطف لکھتے ہیں:

''مدعائے دلی اس صاحب عالی تدبیر (گل کرسٹ) کا یہ معلوم ہوا کہ ان فارسی کتابوں کے ہندی نثر کرنے سے مراد ہمیں یہ ہے کہ صاحبان انگریز تازہ ولایت سے جو آتے ہیں ہم ان کی تربیت کے لئے سارا یہ خون جگر کھاتے ہیں تاکہ ان کے ذہنوں میں آسانی سے یہ عبارت آوے اور ان کی طبیعت اس سے بخوبی مزہ اٹھاوے''۔(۴۷)

اس اقتباس پر علامہ شبلی نے ایک نوٹ لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

''اس فقرہ سے اندازہ کرو کہ اس وقت کے اہل قلم سادہ اردو لکھنے کو کس قدر خلاف شان سمجھتے تھے ۔مصنف صاحبان انگریز پر احسان رکھتا ہے کہ ان کی خاطر سے اس نے یہ ذلت گوارا کی۔''(۴۸)

گلشن ہند میں مرزا مظہر جان جاناں (ف: ۸/جنوری ۱۷۸۱ء) کا تذکرہ بھی ہے۔ ان کی تاریخ وفات پر علامہ شبلی کے قلم سے بے ساختہ یہ جملہ آ گیا ہے:

''کسی نے کیا بے مثل تاریخ آپ کی وفات کی کہی ہے عاش حمیدا مات شهیدا۔ لطف یہ کہ یہ الفاظ حدیث نبوی ﷺ کے ہیں۔''(۴۹)

خواجہ میر اثر (ف: ۱۷۹۵ء) کے تذکرہ میں ان کی مثنوی خواب و خیال کا بھی مرزا علی خاں لطف نے ذکر کیا ہے اور نمونہ کے طور پر اس کے چند اشعار بھی نقل کئے ہیں۔علامہ شبلی نے اس پر بھی ایک نوٹ لکھا ہے جس میں مثنوی خواب وخیال کے بارے میں مولانا حالی کے موقف پر

تنقید کی ہے۔علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ(مقدمہ شعروشاعری)میں لکھنو کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے،لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہوسکتی،اس لئے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اس کا طرز اڑایا تھا۔یہ اشعار اسی مثنوی کے ہیں۔اس کا فیصلہ خود ناظرین کرسکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ بن سکتی ہے۔؟''
(۵۰)

علامہ شبلی کے متعلق بابائے اردو مولوی عبدالحق کی رائے سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔مولوی صاحب علامہ کی تنقیص و مذمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔گلشن ہند کے مقدمہ میں انھوں نے علامہ شبلی کے تصحیح وتحشیہ اور اس کی طباعت کی کوششوں کا اعتراف تو درکنار ذکر کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔البتہ ان کے مذکورہ بالا حاشیہ کی تردید میں کئی صفحے سیاہ کرڈالے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''ہمیں تعجب ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے صرف اعتراف کا لفظ لکھا،حالانکہ مولانا حالی نے ان مثنویوں کی بے حد تعریف کی ہے۔سوائے ایک نقص کے جس سے خود مولوی شبلی صاحب کو بھی انکار نہیں ہوسکتا اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا کی شاعری کا اعتراف کیا ہے، بلکہ میر انیس کی شاعری کی اس قدر توصیف وثنا کی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں، یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ دبیر وانیس [انیس ودبیر] میں اتنا نہیں سراہا۔اکثر لوگوں کو جن کی نظر ظاہر بیں ہے اور سطح ہی پر رہتی ہے،مولانا حالی سے یہ شکایت ہے کہ لکھنؤ کی شاعری کی مذمت کی ہے، حالانکہ مولانا نے کہیں اپنے دیوان میں لکھنؤ کی شاعری پر بحث نہیں کی ہے، عام شاعری پر یا اردو شاعری کے نشوونما اور اس کے مختلف اصناف پر بحث

کرتے ہوئے تمثیلاً بعض اشعار یا کتب کا ذکر آ گیا ہے اور اس میں دلی لکھنو والے دونوں ہیں اس پر سے لوگوں نے ایسا گمان کر لیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ دیوان حالی میں کوئی خاص لحاظ اس کا نہیں کیا گیا اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اہل وطن اپنی اور اپنے یار دوستوں یا عزیزوں یا بزرگوں کی کتاب پر تقریظ سننے کے شائق ہیں تنقید کے روادار نہیں، مولانا حالی نے جو شاعری پر مقدمہ لکھا ہے وہ صرف ان کے دیوان کا مقدمہ نہیں بلکہ اردو میں فن تنقید پر پہلا مقدمہ ہے۔ اس میں جو بعض ایسی رایوں کا اظہار کیا ہے، وہ صرف ذوق سلیم اور عالی دماغ کا نتیجہ ہوسکتی ہیں تو لوگوں کے عام [بلکہ عامیانہ] خیالات کو صدمہ پہنچا اور وہ بت جنھیں وہ مدت سے پوجتے چلے آ رہے تھے یکا یک متزلزل ہو گئے اور ڈھ گئے۔ زیادہ تر یہ خیال گلزار نسیم کی نکتہ چینی سے پیدا ہو گیا ہے۔ مولانا نے اس پر خواہ مخواہ اس لئے نکتہ چینی نہیں کی کہ وہ ایک لکھنوی کی لکھی ہوئی ہے، بلکہ درحقیقت وہ اس رتبہ کی مستحق نہیں ہے جو لوگوں نے ناسمجھی سے اسے دے رکھا ہے۔ مجھے تو الٹی یہ شکایت ہے کہ مولانا نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا۔ صرف چند ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو اگرچہ صریح اور بین ہیں مگر اس قدر اور ایسی نہیں کہ جس سے اس کی پوری قلعی کھل جائے، حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کو اردو زبان سے کوئی تعلق ہی نہیں۔'' (۵۱)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا حالی کا مقدمہ شعر و شاعری اردو میں فن تنقید کا پہلا بڑا کارنامہ ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میں دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کی تخصیص نہیں کی گئی ہے، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ بغیر نام لئے مولانا حالی نے دبستان لکھنو پر سخت تنقیدیں بھی کی ہیں۔ رہا سوال مثنوی خواب وخیال سے نواب مرزا شوق [ف: ۳۰ر جون ۱۸۷۱ء] کے استفادے کا تو بعض اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ مثنوی خواب وخیال نواب مرزا شوق کی نظر سے ضرور گزری تھی اور بعض اشعار میں تو معمولی سا فرق ہے، مگر گلشن ہند میں خواب وخیال کے جو اشعار بطور نمونہ دئے گئے ہیں ءان سے ذرہ برابر بھی پتہ نہیں چلتا کہ مرزا شوق کی مثنوی اس سے مستفاد

ہے اور اس سے علامہ شبلی کے موقف کی بھی تائید ہوتی ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب کے اس خیال کو کہ مولانا حالی نے ''میر انیس کی شاعری کی اس قدر توصیف وثنا کی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔ یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ دبیر وانیس (انیس و دبیر) میں انہیں اتنا نہیں سراہا'' کس قدر خلاف حقیقت ہے اور پھر مولوی صاحب کا یہ فرمانا کہ ''مثنوی سحر البیان کا اردو زبان سے کوئی تعلق ہی نہیں'' درست نہیں۔

مثنوی گلزار نسیم کے متعلق مولانا حالی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے علامہ شبلی کی رائے اس کے برعکس ہے۔ان کی اس رائے کو چکبست (ف:۱۲رفروری ۱۹۲۶ء) نے دیباچہ گلزار نسیم میں نقل کر دیا ہے۔ نقادوں کے درمیان متضاد آرا کی یہ پہلی مثال نہیں ہے۔اس کے باوجود مولوی عبدالحق صاحب گلشن ہند کے مقدمہ میں چراغ پا ہو گئے ہیں اور لکھتے ہیں:

> ''افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس سے بڑھ کر ایک ریمارک مولانا حالی کی تنقید گلزار نسیم کے متعلق ایک خط میں لکھ دیا تھا جسے لالہ چکبست صاحب نے اپنے دیباچہ گلزار نسیم میں بہ طور سند کے درج فرمایا ہے۔تعجب ہے کہ ایک ایسے فاضل محقق اور صاحب ذوق کے قلم سے ایسے الفاظ نکلیں جو تحقیق اور ذوق سلیم سے کوسوں دور ہیں اور خصوصاً ایسی کتاب کی نسبت جو قطع نظر اس کے کہ اس مین زبان کا لطف نام کو نہیں سیکڑوں لفظی اور معنوی غلطیوں سے پر ہیں۔'' (۵۲)

مولوی عبدالحق کی ان خردہ گیریوں سے قطع نظر علامہ شبلی نے تذکرہ گلشن ہند کی تصحیح و مراجعت کی، املا کی درستگی پر توجہ دی، مفید اور معلومات افزا حواشی لکھے، اس کی اشاعت کے لئے فکر مند رہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ انھوں نے اس پر ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا تھا۔ (۵۳) جس کو مولوی عبدالحق صاحب نے معلوم نہیں کیوں شامل اشاعت نہیں کیا۔

حوالے

(۱) محی الدین قادری زور، دیباچہ گلزار ابراہیم مع گلشن ہند مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد دکن ۱۹۳۴ء

(۲) خاتمہ گلشن ہند،ص ۱۹۶، رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور

(۳) گلشن ہند، پبلشر کی التماس ص ۲

(۴) ایضاً

(۵) گلشن ہند ص ۲۶

(۶) ایضاً ص ۱۸۹

(۷) ایضاً ص ۱۸۸ و ۱۹۳

(۸) ایضاً ص ۹۶

(۹) ایضاً ص ۲۲

(۱۰) ایضاً ص ۱۰۲

(۱۱) ایضاً ص ۲

(۱۲) ایضاً ص ۴

(۱۳) ایضاً ص ۷

(۱۴) ایضاً ص ۸

(۱۵) ایضاً ص ۸۵

(۱۶) ایضاً ص ۱۱

(۱۷) ایضاً

(۱۸) ایضاً ص ۳۵

(۱۹) ایضاً ص ۴۲

(۲۰) ایضاً ص ۷۵

(۲۱) ایضاً ص ۸۳

(۲۲) ایضاً ص ۹۷

(۲۳) ایضاً ص ۲۲

(۲۴) ایضاً

(۲۵) ایضاً ص۱۴

(۲۶) ایضاً ص۱

(۲۷) ایضاً ص۱۷

(۲۸) ایضاً ص۱۳۰

(۲۹) ایضاً ص۱۰۲

(۳۰) ایضاً پبلشر کی التماس ص۲

(۳۱) ایضاً مقدمہ ص۲۴

(۳۲) ایضاً ص۶۹

(۳۳) ایضاً ص۷۰

(۳۴) ایضاً ص۱۲۹

(۳۵) ایضاً ص۲۲

(۳۶) ایضاً ص۲۶و۸۷

(۳۷) ایضاً ص۳۴

(۳۸) ایضاً

(۳۹) ایضاً ص۲۳

(۴۰) ایضاً ص۲۴

(۴۱) ایضاً

(۴۲) ایضاً ص۲۷

(۴۳) ایضاً ص۸۵

(۴۴) ایضاً ص۴۴

(۴۵) ایضاً ص۲

(۴۶) ایضاً

(۴۷) ایضاً ص۳

(۴۸) ایضاً

(۴۹) ایضاً ص۱۶۰

(۵۰) ایضاً مقدمہ ص۳۲

(۵۱) گلشن ہند مقدمہ ص۱۹-۲۰

(۵۲) ایضاً ص۲۱

(۵۳) ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء ص۲۶۲

محمڈن اینگلواورینٹل کالج میگزین

علی گڑھ میں علامہ شبلی کے تحقیقی کارناموں، لازوال تحریروں اور محققانہ کاوشوں نے ان کی عظمت علم وتحقیق کو قبول عام کا درجہ عطا کر دیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۴ء میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ کے ضمیمہ محمڈن اینگلواورینٹل کالج میگزین کو ارباب علی گڑھ نے خالص علم وتحقیق سے عبارت کرنا چاہا تو ان کی نگاہ انتخاب علامہ شبلی پر پڑی اور انھیں اردو حصے کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ خود مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> ''قریباً چار برس ہوئے کہ اس نام کا ایک رسالہ انگریزی اور اردو ملا ہوا علی گڑھ کالج سے نکلنا شروع ہوا۔ اول اول وہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا ضمیمہ بن کر نکلتا رہا لیکن ۱۸۹۴ء میں اس نے ایک مستقل رسالہ کی صورت اختیار کی۔ اس کے مضامین زیادہ تر کالج کی خبروں اور اس کے متعلقات پر محدود ہوتے تھے اور اس وجہ سے عام پبلک کو اس کے ساتھ چنداں دلچسپی نہ تھی۔
>
> اس خیال سے اس کے منتظموں نے اس کو زیادہ وسعت دینی چاہی تاکہ وہ بالکل ایک علمی میگزین بن جائے، جس میں کالج کی خبروں کے علاوہ مسلمانوں کے علوم وفنون تاریخ اور لٹریچر کے متعلق مفید اور پرزور مضامین لکھے جائیں۔ اس صیغہ کا اہتمام خاص میری سپردگی میں دیا گیا۔ میں اس رسالہ کے ترقی دینے میں حتی الامکان کوشش کروں گا۔''(۱)

اس کالج میگزین کو علمی آب وتاب دینے کے لئے علامہ شبلی نے سب سے پہلے اردو کے نامور اہل قلم، مصنّفین اور انشاپردازوں سے اس میں مضامین لکھنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ مولانا

حالی،نواب محسن الملک [ف:۱۹۰۷ء] ڈپٹی نذیر احمد [ف:۳/مئی ۱۹۱۲ء] اور منشی ذکاءاللہ [ف:۷/نومبر ۱۹۱۰ء] وغیرہ نے مضامین لکھنے کا وعدہ کیا۔(۲) اوران کے بعض مضامین شائع بھی ہوئے۔

اس سلسلہ میں علامہ شبلی نے یہ منصوبہ بھی بنایا کہ اس میں اسلامی سلطنتوں کے تمدنی اور انتظامی کارناموں پر علمی وتحقیقی مضامین قلم بند کئے جائیں اور پھر انھیں کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔(۳) چنانچہ خود انھوں نے متعدد معرکہ آراء تحقیقی مضامین سپرد قلم کئے، علماء کے فرائض [جون ۱۸۹۵ء] اسلامی حکومتیں اور شفاخانے [جولائی ۱۸۹۵ء] حقوق الذمیین [اپریل، مئی ۱۸۹۶ء] املا اور صحت الفاظ [مارچ ۱۸۹۸ء] سرسید اور اردو لٹریچر [جون ۱۸۹۸ء] جیسے گراں مایہ مقالات اسی رسالہ کی زینت بنے۔

اپنی تحریروں کے علاوہ سرسید، مولانا حالی، منشی ذکاءاللہ، بہادر علی، شیخ عبداللہ، حاجی محمد اسماعیل، حامد علی صدیقی اور ڈاکٹر ضیاءالدین [ف:۲۳/دسمبر ۱۹۴۷ء] کے علمی، ادبی، تاریخی اور تعلیمی مضامین کے ذریعہ علامہ شبلی نے اس میں علمی شان پیدا کرنے کی کوشش کی جو ان کا اس دور کا یقیناً ایک اہم کارنامہ ہے۔

اس کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے موضوعات متنوع تھے۔ ادب، تاریخ، تہذیب وتمدن، تعلیم، سوانح کے علاوہ کالج کی سرگرمیوں اور اس کی تنظیموں کی روداد وغیرہ بھی اس میں شائع ہوئیں۔ بعض انگریزی مضامین کے ترجمے بھی شائع ہوئے پروفیسر آرنلڈ کے مضمون جاپان کا اردو ترجمہ اسی میگزین میں شائع ہوا۔(۴)

قدیم اسلامی کتابوں کی اشاعت کی تجویز بھی علامہ شبلی نے اسی میگزین میں پیش کی تھی۔(۵) ان کا خیال تھا کہ یورپ میں قدیم اور نادر کتابوں کی تلاش وجستجو اور طبع واشاعت کے لئے متعدد انجمنیں قائم ہیں جو بیش بہا خدمات انجام دے رہی ہیں حتی کہ خود مسلمانوں کی نادرالوجود کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر شائع کر رہی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ یہ کام ہم خود انجام دیں اور دنیا کو بتائیں کہ مسلمانوں نے علوم وفنون کا کس قدر گراں مایہ ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔(۶)

ندوۃ العلماء کے تیسرے سالانہ اجلاس کی روداد بھی علامہ شبلی کے قلم سے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین (مئی ۱۸۹۶ء) میں شائع ہوئی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسی زمانہ

میں ان کی دلچسپی تحریک ندوہ سے ہوگئی تھی۔ سرسید کی وفات (۱۸۹۸ء) کے بعد اگر چہ علامہ شبلی نے حیدرآباد کا رخ کیا مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا دل ودماغ اب پورے طور پر تحریک ندوہ سے وابستہ ہو چکا تھا۔ ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''سچ یہ ہے کہ صرف ندوہ کے لئے میں نے کالج چھوڑا تھا گو واقعات اتفاقی کی وجہ سے اس کا موقع نصیب نہیں ہوا۔''(۷)

تہذیب الاخلاق کے بعد محمڈن اینگلواورینٹل کالج میگزین علی گڑھ تحریک کا دوسرا رسالہ تھا جس نے متنوع اثرات قائم کئے۔ علامہ شبلی کی اس دور میں اس رسالہ کی ادارت بھی کسی کارنامے سے کم نہیں۔

حوالے

(۱) محمڈن اینگلواورینٹل کالج میگزین، علی گڑھ جنوری ۱۸۹۶ء۔ ٹائٹل صفحہ۲۔

(۲) ایضاً۔

(۳) حیات شبلی ص۱۶۲۔

(۴) محمڈن اینگلواورینٹل کالج میگزین علی گڑھ، جنوری ۱۸۹۶ء ص۲۵۔

(۵) ایضاً، مئی ۱۸۹۶ء ص۲۱۶۔

(۶) ایضاً۔

(۷) مکاتیب شبلی ج ۱، ص۱۴۳۔

ماہنامہ الندوہ

تحریک ندوہ سے علامہ شبلی کی دلچسپی کے دو خاص پہلو نصاب تعلیم اور ماہنامہ الندوہ تھے۔(۱) چنانچہ جب وہ پوری طرح یکسو ہو کر ندوہ آئے تو ان دونوں امور کی طرف مکمل توجہ کی۔ انھیں الندوہ کا ایڈیٹر بنانے میں لیت ولعل سے کام لیا گیا۔(۲) تاہم وہ ایڈیٹر بنائے گئے گو مشترکہ ہی سہی۔(۳) لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ اگر وہ ایڈیٹر نہ ہوتے تو الندوہ-الندوہ نہ ہوتا۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کی ادارت [۱۸۹۴ء] کے دس سال بعد [۱۹۰۴ء] شبلی نے ماہنامہ الندوہ کی ادارت [۱۹۰۴] سنبھالی۔ ظاہر ہے اس کے تجربات یہاں کام آئے ہوں گے۔ دونوں رسالوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی علی گڑھ کے بالمقابل یہاں زیادہ آزادی کے ساتھ اپنے افکار و خیالات پیش کرتے ہیں۔ غالباً اس کی بڑی وجہ تحریک ندوہ سے ان کی ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی ہے۔

ماہنامہ الندوہ کی اشاعت کے حسب ذیل مقاصد تھے:

[۱] علوم وفنون پر ریویو
[۲] علوم قدیمہ وجدیدہ کا موازنہ
[۳] اثبات عقائد اسلامیہ از عقل
[۴] تحقیقات جدیدہ
[۵] کتب نادرہ قدیمہ پر ریویو
[۶] رپورٹ ماہوار ندوہ (۴)

ماہنامہ الندوہ کے دستور العمل میں بھی یہ مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ البتہ اس میں

حسب ذیل اضافہ ہے۔

[۷] اکابر سلف کی سوانح عمریاں جس میں زیادہ تر ان کے اجتہادات سے بحث ہوگی۔

[۸] نصاب تعلیم مروجہ پر بحث

[۹] علمی خبریں (۵)

الندوہ ان مقاصد کے ساتھ اگست ۱۹۰۴ء میں بڑی آب وتاب سے نکلا اور بہت جلد علمی دنیا میں ایک امتیازی درجہ حاصل کرلیا۔ شاید ہی کسی اور علمی رسالے کو اس قدر جلد ایسی مقبولیت ملی ہو۔ وہ ہر حلقے موافق ومخالف میں پڑھا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ان عربی اشعار سے اس کی شہرت ومقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

یقولون ان العلم والفضل والنھی حبیس علی المتقدم المتبصر

فلما تصفحنا صحائف ندوۃٍ وجدنا بان الفضل للمتاخر

ترجمہ: لوگ کہتے ہیں فضل وکمال اگلوں کا حصہ تھا مگر جب میں نے الندوہ کے صفحے دیکھے تو پایا کہ فضل وکمال پچھلوں ہی کا حصہ ہے۔(۶)

الندوہ کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے ندوۃ العلماء کے نامور فرزند مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''الندوہ کا اثر خصوصیت کے ساتھ نوجوان علماء اور فارغ التحصیل طلبہ پر بے حد پڑا اور نام نہیں لوں گا مگر بتا سکتا ہوں کہ بڑے بڑے مقدس آستانوں اور درس گاہوں کے حاشیہ نشینوں نے اس کے طرز نگارش اور پیرایہ بیان کی نقل اتاری اور اپنے اپنے دائرے میں ناموری حاصل کی اور ان سے دین وملت کو فائدہ پہنچا۔''(۷)

علامہ شبلی نے ماہنامہ الندوہ کے ذریعہ متعدد کام انجام دیئے۔ تحریک ندوہ کو بام عروج تک پہنچایا نصاب تعلیم پر نقد و بحث کا آغاز ہوا۔ علوم قدیمہ پر نقد وجرح کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے علاوہ علامہ شبلی نے اپنے افکار ونظریات تعلیم کی پیش کش بھی ماہنامہ الندوہ کے ذریعہ کی اور اسی کے ذریعہ، قدیم وجدید کی خلیج پاٹنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے کا سب سے اہم کارنامہ تصنیف

وتالیف کے لئے طلبائے ندوہ اور دیگر اہل قلم کی ذہنی ودماغی تربیت ہے۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی [ف:۴/اکتوبر ۱۹۵۶ء] مولانا ابوالکلام آزاد [ف:۲۲/فروری ۱۹۵۸ء] مولانا ضیاء الحسن ندوی، خواجہ عبدالواحد اور عبداللہ عمادی [ف:۲۸/اگست ۱۹۴۷ء] وغیرہ نے اسی رسالے سے ناموری حاصل کی اور نامور مصنف ہوئے۔

تصنیف وتالیف کے لئے علامہ شبلی نے یہیں مولانا سید سلیمان ندوی کی تربیت کی اور اس کے تمام گر سکھائے۔ انھیں الندوہ کا سب ایڈیٹر مقرر کیا۔ شذرات لکھنے کا انھوں نے یہیں آغاز کیا۔ سید صاحب کی ماہنامہ معارف کی ادارت اور اس کی خدمات کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہ سکے گی کہ یہ سب شبلی کی اسی تربیت کا نتیجہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد الندوہ ہی میں [اکتوبر ۱۹۰۵ء - مارچ ۱۹۰۶ء] علامہ شبلی کے زیر تربیت رہے۔ یہیں سے وہ علمی دنیا میں متعارف ہوئے۔ ارباب نظر جانتے ہیں کہ *الہلال* میں جو کچھ جلوہ گر ہوا اصلاً اس کا تخم ماہنامہ الندوہ ہی میں پڑا تھا۔ مولانا آزاد کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی بھی الہلال سے اس کے دور عروج میں وابستہ رہے، جن کی تربیت بھی علامہ شبلی نے الندوہ ہی میں کی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں ان کا پہلا مضمون تاریخ الندوہ میں شائع ہوا اور علامہ شبلی نے انعام سے نوازا، حوصلہ افزائی کی اور ان کے بڑے مصنف ہونے کی پیشین گوئی کی۔ (۸)

تصنیف وتالیف کی تربیت اور ذہنی ودماغی نشوونما کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کے بعد ہندوستان میں علم وفن کی جو بہار آئی اور اہل قلم اور ناموران علم وفن کی جو کہکشاں سجی وہ سب فیضان شبلی ہی کا پرتو ہے:

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

علامہ شبلی نے الندوہ کی ادارت کے زمانے میں احباب ومعاصرین اور خاص طور سے اپنے تلامذہ کو جو خطوط لکھے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مدیر کی حیثیت سے رسالے کے ایک ایک پہلو پر نظر رکھتے تھے۔ موضوعات، مقاصد اور معیار کا انھیں بڑا خیال رہتا۔ ایک مرتبہ اپنی بعض مصروفیات کی وجہ سے الندوہ کے لئے مضامین نہ لکھ سکے تو سب ایڈیٹر مولانا سید سلیمان

ندوی کولکھا کہ ’’عزیزی چندروز تک میرے مضمون سے اب پرچہ بالکل خالی رہے گا۔دیکھوایسانہ ہوکہ اپنی حیثیت سے گر جائے۔(۹)

مضامین کی ترتیب، کتابت وطباعت کا حسن، تصحیح وغیرہ کا وہ بڑا خیال رکھتے تھے۔ (۱۰)اورحسن ونفاست کے ساتھ اس کی اشاعت کے خواہش مند رہتے۔(۱۱)وہ ایک ایڈیٹر کے لئے ضروری خیال کرتے تھے کہ مضامین بغیر دیکھے شائع نہ ہوں۔(۱۲)اورایک دوماہ کے مضامین ہمیشہ موجود رہیں۔(۱۳)

ادب وانشاء اورتحریر کے معیار ومذاق کا بھی انھیں بڑا خیال رہتا۔مولانا عبدالسلام ندوی نے رسالہ ادیب الہ آباد پرتبصرہ کیااورلکھا کہ ’’حال میں الہ آباد انڈین پریس سے ’’ادیب‘‘ ظاہری شکل وصورت میں اس آب ورنگ سے نکلا کہ تمام لوگ پکار اٹھے کہ

اس طرح کا جمال ہو،ایسا شباب ہو۔(۱۴)

چونکہ یہ تبصرہ شذرات میں میں گیا تھا،اس لئے علامہ شبلی نعمانی نے تنبیہ کی اورمولانا عبدالسلام ندوی کولکھا کہ:

> ’’رسالہ ادیب کی نسبت تم نے جوریمارک لکھا ہے وہ ایڈیٹوریل میں لکھا ہے۔ جس سے قیاس ہوتا ہے کہ میرا لکھا ہوا ہے۔مجھ کواس سے نہایت افسوس ہوا۔ میراوہ طرز عبارت نہیں اور جومصرعہ تم نے نقل کیا ہے اس کو میں اپنے حق میں ازالہ حیثیت عرفی سمجھتا ہوں۔آئندہ احتیاط رکھو کہ ایسے مبتذل اور عامیانہ فقرے درج نہ ہونے پائیں۔‘‘(۱۵)

اس تنبیہ کے بعد مولانا عبدالسلام ندوی نے اس کی تردید کی۔(۱۶)مگر بالآخر علامہ شبلی کا خدشہ درست نکلا۔مولوی عبدالحلیم شرر نے ’’عذر گناہ بدتر از گناہ‘‘ کے عنوان سے ان پرسخت تنقید کی۔(۱۷)اسی طرح مولانا سیدسلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھا کہ ’’دونوں پرچوں میں تمہارامضمون بہت اچھا نکلا اب تم کوتصنیفی سلیقہ آچلا ہے،البتہ عبارت کی ابھی تک کمزوری باقی ہے۔‘‘(۱۸)

علمی رسالوں کے لئے علامہ شبلی علمی خبروں کوضروری خیال کرتے تھے۔ان کی کوشش

ہوتی تھی کہ الندوہ میں پابندی سے علمی خبریں شائع کی جائیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالسلام ندوی اپنی سب ایڈیٹری کے زمانہ میں اس کا اہتمام کرتے رہے۔ سید صاحب نے بھی اس کالم کو جاری رکھا۔ ایک مرتبہ کئی ماہ تک ناغہ ہوگیا تو علامہ شبلی نے تنبیہ کی اور لکھا کہ تم نے غلطی کی اور ہمیشہ یہ غلطی ہوتی ہے کہ الندوہ میں علمی خبریں نہیں دیتے جس کی وجہ سے اب کی ۲۰-۲۵ روپئے کا نقصان اٹھانا پڑا۔(۱۹)

علامہ شبلی نے کسی تنقید کا جواب سوائے المامون (۲۰) کے نہیں لکھا۔ ان کے ایک مضمون اسلام اور مسئلہ ارتقاء پر اعتراضات ہوئے۔ (۲۱) سید صاحب نے اس کا جواب لکھا۔(۲۲) علامہ شبلی نے اس پر ناراضگی ظاہر کی اور لکھا کہ ''اس سے کم ظرفوں کا حوصلہ بڑھتا ہے کہ ہم بھی اتنے ہیں کہ لوگ ہمارا جواب لکھیں۔(۲۳)، مگر پھر انھوں نے اس کی وضاحت کی کہ:

> ''گزشتہ پرچے میں جو مضمون مسئلہ ارتقاء پر نکلا تھا اس کا مقصد یہ نہ تھا کہ ہمارا یہ عقیدہ بھی ہے، بلکہ صرف یہ دکھلانا تھا کہ مسئلہ ارتقاء کا خیال ڈارون کا پیدا کیا ہوا کوئی نیا خیال نہیں ہے، بلکہ اس سے مدتوں پہلے بعض حکمائے اسلام کی بھی یہی تحقیق تھی۔'' (۲۴)

وہ مدیروں کے لئے اہل علم سے ربط وضبط اور خط وکتابت کو بھی لازمی قرار دیتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کو متعدد خطوط میں اس کی طرف متوجہ کیا ہے۔(۲۵)

خلاصہ یہ کہ علامہ شبلی نے ایک مدیر کی حیثیت سے الندوہ کے ہر پہلو پر نظر رکھی بلکہ اسے خوب سے خوب تر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بعد الندوہ کا وہ معیار قائم نہ رہ سکا اور بالآخر وہ بند ہوگیا۔ ایک عرصہ بعد مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (ف: ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء) نے دوبارہ جاری کیا مگر وہ بھی اسے باقی نہ رکھ سکے اور الندوہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔

ماہنامہ الندوہ نے دیرپا اثرات قائم کئے۔ اس کے بعد علمی افق پر جو بھی رسائل آئے انھوں نے کسی نہ کسی نوع سے اس کی تقلید کی۔ الندوہ کے جو نتائج نکلے مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں وہ یہ ہیں:

۱- اردو زبان میں علمی مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا کیا۔

۲- جدید تعلیم یافتوں کو اسلام کے مذہبی اور علمی کارناموں سے آشنا کیا۔

۳- علماء کو جدید مسائل سے روشناس کیا۔

۴- عربی خواں طلبہ میں اپنے پرانے ذخیروں سے کام لینے کا سلیقہ پیدا کیا۔

۵- اسلام اور تاریخ اسلام پر بہت سے اعتراضات کو رفع کیا۔

۶- قوم میں ندوہ کے مقاصد کی تبلیغ کی، اصلاح نصاب کی ضرورت سمجھائی اور عربی تعلیم کی اہمیت ذہن نشیں کی۔(۲۶)

ان نتائج کے پس منظر میں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آج ملک میں علم وتحقیق کی جو فضا بالخصوص تحقیقی مقالہ نگاری کا جو سلسلہ قائم ہے وہ سب براہ راست یا بالواسطہ علامہ شبلی ہی کا فیضان ہے۔ ماہنامہ الندوہ کے نصب العین اور اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ:

''الندوہ شبلی کے نیم جذباتی، دینی، تاریخی نقطۂ نظر کا شارح اور مبلغ تھا۔ عالمانہ اور فاضلانہ مقالات کے باوجود اس کا نصب العین یہ تھا کہ ملک میں ایک علمی اور ذہنی انقلاب پیدا ہو۔ اس کی ادبی حیثیت بلند تر تھی اور اس کے مقالات کی روح اثباتی اور ایجابی تھی۔ سرسید احمد خاں کی مشککانہ، منصفانہ اور جوابی دعوت سے اس کے مقالہ نگاروں کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ الندوہ کی دعوت کی اساس دینی اور قومی تاریخ پر تھی جس کو بعد میں الہلال ابوالکلام آزاد) نے جاری رکھا۔ دارالمصنفین کا رسالہ معارف بھی اسی نخل ادب کی ایک شاخ ہے۔''(۲۷)

حوالے

(۱) مکاتیب شبلی ج۱، ص۱۴۵

(۲) ایضاً ص۱۴۳-۱۴۵

(۳) علامہ شبلی کے ساتھ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی بھی ایڈیٹر مقرر رہوئے۔

(۴) نقوش لاہور مکاتیب نمبر ص۱۸۴

(۵) ماہنامہ الندوہ لکھنو، اکتوبر ۱۹۰۴ء آخری صفحہ ٹائیٹل

(۶) حیات شبلی ص۸۱۰

(۷) ایضاً ص۴۴۱

(۸) مکاتیب شبلی ج۲ص۲۰۹، بنام مہدی افادی

(۹) ایضاً ج۲ص۶۸

(۱۰) ایضاً ج۲ص۶۲و۶۴

(۱۱) نقوش لاہور مکاتیب نمبرص۱۸۵

(۱۲) ایضاً

(۱۳) مکاتیب شبلی ج۲ص۷۰

(۱۴) ماہنامہ الندوہ لکھنؤ، مارچ ۱۹۱۰ء ص۶

(۱۵) مکاتیب شبلی ج۲ص۱۴۹

(۱۶) ماہنامہ الندوہ، اپریل ۱۹۱۰ء

(۱۷) دلگداز، جون ۱۹۱۰ء ص۶-۷

(۱۸) مکاتیب شبلی ج۲ص۷۳

(۱۹) ایضاً ص۷۲

(۲۰) الماموں پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے سخت تنقید کی تھی جس کے جواب میں علامہ شبلی نے ایک مراسلہ لکھا تھا جو آزاد اخبار لکھنؤ میں ۲۲رفروری ۱۸۸۹ء کو شائع ہوا۔

(۲۱) مکاتیب شبلی ج۲ص۶۷

(۲۲) ایضاً

(۲۳) ایضاً ص۷۸

(۲۴) ماہنامہ الندوہ، اکتوبر ۱۹۰۷ء ص۱-۲

(۲۵) مکاتیب شبلی ج۲ص۵۶-۱۱۱

(۲۶) حیات شبلی ص۴۴۰

(۲۷) سرسید اور ان کے نامور رفقاص۲۱۲۔

روداد ندوہ

فکر وخیال کی ہم آہنگی کی وجہ سے علامہ شبلی کو تحریک ندوہ سے بڑی دلچسپی تھی۔ چنانچہ وہ اس کے آغاز ہی سے اس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے۔ تعلیم کی اہمیت وافادیت پر تقریریں کرتے۔ نصاب تعلیم اور درس نظامیہ کے حسن وقبح پر بحث کرتے۔ تحریک ندوہ اور دارالعلوم کی ترقی کے لئے تجویزیں پیش کرتے اور اس کے مستقبل کا لائحہ عمل بناتے۔ ان کی یہ تمام کوششیں اور کاوشیں اجلاس ندوہ کی رودادوں میں محفوظ ہیں۔ ۱۹۰۴ء میں جب وہ باقاعدہ معتمد تعلیم مقرر ہوئے اور ندوہ میں قیام کیا تو اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ندوہ پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ اس کے لئے چندہ کیا اور چندے کے لئے مختلف شہروں کے انفرادی اور وفود کے ساتھ دورے کئے۔ ماہنامہ الندوہ جاری کیا۔ اس کے لئے مسلسل مضامین ومقالات لکھے۔ تصنیف وتالیف کے لئے ہونہار طلبہ کی، تربیت کی۔ درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا۔ غرض وہ تمام کام کئے جس سے ندوہ کو اعتبار ووقار نصیب ہوا۔ اسی سلسلہ کی ان کی ایک تحریری کوشش و کاوش ندوہ کے اجلاسوں کی رودادیں بھی ہے۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۲ء کے درمیان انہوں نے متعدد اجلاسوں کی روداد قلم بند کی۔ بعض رودادوں پر مرتب کی حیثیت سے ان کا نام بھی ہے اور بعض رودادوں پر اگرچہ ان کا نام نہیں چھپا ہے تاہم عبارت اور طرز تحریر صاف بتا رہا ہے کہ یہ حرف انہیں کے قلم کے ہیں۔

ان میں ندوہ کے اجلاسوں کی تمام تفصیلات قلم بند کی گئی ہیں۔ ایجنڈے، قراردادیں، تجویزیں اور ان پر ہونے والی بحثیں اور تقریریں، نصاب تعلیم پر غور وخوض، ترمیم واضافہ، علماء و مدرسین کے فرائض، ندوہ کے مقاصد وغیرہ مختلف موضوعات کی تفصیل اس میں آ گئی ہے۔

ان رودادوں کی بڑی اہمیت ہے۔ان کے بغیر تاریخ ندوہ مکمل نہیں ہوسکتی۔علامہ شبلی نے یہ رودادیں بہت جی لگا کر لکھی ہیں۔اس کے ایک ایک حرف سے تحریک ندوہ اور مقاصد ندوہ سے ان کی گہری وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔

ان میں ہندوستان کے متعدد نامور فضلاء کی تقریریں اور تحریک ندوہ کی بقا و ترقی کے لئے مساعی جمیلہ کی داستانیں پوشیدہ ہیں۔خود علامہ شبلی کے کئی ایسے خطبات اور تقریریں اس میں محفوظ ہیں جو خطبات شبلی مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی میں شامل نہیں۔

جن اہل قلم نے تاریخ ندوہ پر کام کیا ہے، بالخصوص مولانا اسحاق جلیس ندوی مصنف تاریخ ندوۃ العلماء [دوجلدیں] انہوں نے ان رودادوں کا بھر پور اور بہ نظر غائر مطالعہ نہیں کیا، ورنہ شبلی نے ندوہ کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے، ان سے وہ بے خبر نہیں ہوتے اور ندوہ کے لئے ان کی کوششیں اور کاوشیں صاف طور پر سامنے آجاتیں اور یہ واضح ہو جاتا کہ ندوہ کو ندوہ کس نے بنایا، تحریک ندوہ کسی کے ذہن کی اختراع ہو لیکن روز اول سے اسے عملی جامہ پہنانے اور اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے والا شبلی کا مدمقابل کون تھا۔

یہ اگرچہ رودادیں ہیں اور دوبارہ ان کی اشاعت ممکن نہیں تاہم ان میں محفوظ مواد و معلومات کی روشنی میں صحیح تاریخ ندوہ سپرد قلم کی جاسکتی ہے۔اسی طرح دیگر علماء وشرکاء اجلاس کے ساتھ خطبات شبلی کو علیحدہ شائع کر کے محفوظ کیا جاسکتا ہے اور ان کی روشنی میں شبلی کے تعلیمی افکار کو زیادہ واضح طور پر پیش کیا جاسکتا ہے اور موجودہ دور میں اس کی معنویت پر کھل کر بحث ہوسکتی ہے۔

طوالت کے خوف سے تمام رودادوں کے بجائے محض ایک روداد جلسہ عطائے سند منعقدہ ۱۔۲ر مارچ ۱۹۰۷ء کا جس پر مرتب کی حیثیت سے علامہ شبلی کا اسم گرامی درج ہے، قدرے تفصیل سے ذکر کیا جاتا ہے۔اس روداد کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

عمریست کہ افسانہ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

ندوۃ العلماء کی ابتدائی تاریخ اگرچہ شروع سے اخیر تک اس قدر دلچسپ واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ ان پر نظر ڈالنے کے ساتھ ہی دفعۃً قوم کے

جوش، ہمت، فیاضی، بلند حوصلگی، زمانہ شناسی کی مجسم تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے لیکن ان واقعات میں سب سے عجیب تر اس کی ترقی وتنزل کا واقعہ ہے۔ ترقی وتنزل بجائے خود ایک بدیہی چیز ہے، اس لئے ہم کو صرف اس کے اسباب وعلل پر غور کرنا چاہئے کیونکہ اس سے ندوہ کی آئندہ کامیابیوں کا راستہ صاف ہوگا۔

شروع شروع میں قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے چونکہ ندوۃ العلماء کی ضرورت کا مسئلہ ایک جدید مسئلہ تھا اس لئے رؤساء، امراء، علماء غرض ہر طبقے کے لوگوں نے اس پر مختلف حیثیتوں سے بحثیں کیں جس کے نتائج مختلف صورتوں میں ظاہر ہوئے۔ چنانچہ قوم کا ایک بہت بڑا گروہ اس کی طرف زور و شور کے ساتھ لبیک کی صدائیں بلند کرتا ہوا بڑھا کہ ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا لیکن ان کے بخلاف ایک جماعت نے اپنے شور وغل سے اس صدا کے دبانے کی کوشش کی۔ اس لحاظ سے ندوہ کے متعلق نہایت ابتدائی زمانے سے موافقانہ اور مخالفانہ دونوں طرح کی کوششیں شروع ہوگئیں مگر باوجود اس کشمکش کے ندوہ کی ترقی کا ہر قدم آگے تھا لیکن چند سال سے ندوہ کی جو حالت ہے وہ اس لحاظ سے اگر چہ مسرت خیز ہے کہ اب بظاہر اس کا افق مخالفتوں کے گرد و غبار سے صاف نظر آتا ہے تاہم اس حیثیت سے نہایت افسوسناک ہے کہ اب اس کی ترقی کی رفتار ایک خاص حد تک پہونچ کر رک گئی ہے۔

یہ حالت روز بروز نمایاں ہوتی جاتی تھی، یہاں تک کہ اراکین انتظامیہ نے خاص طور پر اس کے اسباب وعلل پر توجہ کی اور واقعات اور متواتر تجربہ کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا کہ جب تک ندوہ اپنی حقیقی کامیابی کا کوئی نمایاں ثبوت قوم کے سامنے نہ پیش کرے گا یہ حالت نہیں بدل سکتی۔ اس لئے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ قوم کے سامنے سب سے پہلے ندوہ کی طرز تعلیم کا نمونہ پیش کیا جائے، جو اس کی تمام کامیابیوں کا سنگ بنیاد ہے۔''(۱)

ندوہ کی ابتدائی تاریخ اور جلسہ عطائے سند کے اسباب کے بعد اس کے ارتقا کی تفصیل ہے۔ بعدازاں شرکاء کا ذکر ہے۔ پھر دارالعلوم کی رپورٹ ہے، جس میں دارالعلوم کی ضرورت اور اس کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''دارالعلوم کی نسبت پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی ضرورت کیا ہے؟ جدید تعلیم یافتہ کہتے ہیں کہ عربی تعلیم آج کس کام کی ہے؟ اس سے کیا نتیجہ ہے؟ آج تمام قوم کو انگریزی تعلیم کی ضرورت ہے، اس کے بجائے لوگوں کو عربی کی طرف متوجہ کرنا قومی ضرورت کو پامال کرتا ہے۔

قدیم تعلیم یافتہ لوگوں کے نزدیک اس کا وجود اس لئے بیکار ہے کہ ملک میں اور سیکڑوں ہزاروں عربی مدرسے موجود ہیں، ان کے ہوتے ہوئے کسی نئے مدرسے کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ انگریزی علوم وفنون کا سیکھنا آج کل نہ صرف ضروری ہے بلکہ لازمہ زندگی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کے لئے صرف اسی قدر کافی ہے؟ کیا مسلمانوں کو اس کے سوا اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔؟''(۲)

پھر اس سوال کا جواب ڈھونڈتے ہوئے علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ:

''تھوڑی دیر کے لئے فرض کرو کہ تمام قوم نے انگریزی علوم وفنون حاصل کر لئے سیکڑوں ہزاروں اشخاص بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز ہو گئے۔ ادنیٰ عدالتوں سے لے کر ہائی کورٹ کی بنچیں تک مسلمانوں سے بھر گئیں۔ اس کے ساتھ دوسری طرف فرض کرو کہ تمام ملک عربی دانوں سے خالی ہوگیا۔ اب قرآن مجید کا مطلب سمجھنا ہوتو سیل صاحب کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ فقہ اسلامی کے مسائل کی تحقیق درکار ہوتو میکناٹن صاحب کی ضرورت ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور واقعات جاننا چاہتے ہیں تو سر ولیم میور، باسورتھ، مرگولیس کا دریوزہ گر ہونا پڑتا ہے۔ کیا کوئی مسلمان اس حالت کو گوارا کرسکتا ہے۔ بے شک یہ ممکن ہے اور اسلامی کالج اور اسکول اسی حد تک کر

سکتے ہیں کہ عقائد کی چند معمولی باتیں اور نماز و روزہ کے معمولی مسائل انگریزی کے ساتھ ساتھ سکھا دیئے جائیں گے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص بی اے اور ایم اے کی بھی ڈگریاں حاصل کرے اور تفسیر میں، حدیث میں، فقہ میں کمال بھی پیدا کر سکے اور جب یہ ناممکن ہے تو صرف دو صورتیں ہیں، یا قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر سے بالکل ہاتھ اٹھا لیا جائے یا انگریزی تعلیم کے ساتھ اس بات کی بھی کوشش کی جائے کہ علماء کا بھی ایک گروہ موجود رہے جو علوم مذہبی کا ماہر اور محافظ ہو اور دارالعلوم کا یہی مقصد ہے۔'' (۳)

پھر علامہ شبلی نے ان مقاصد کی مختلف انداز سے توضیح و تشریح کی ہے۔ ندوہ کی ابتدائی تاریخ لکھنے کے ساتھ دارالعلوم کے افتتاح، درجات تعلیم اور اصلاح نصاب تعلیم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اصلاح نصاب کی بحث کا یہاں نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''دارالعلوم کے قائم کرنے کا بہت بڑا مقصد طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم میں اصلاح کرنا تھا۔ اصلاح نصاب کے متعلق ندوہ کے اجلاسوں میں اس قدر بار بار بحثیں اور تقریریں ہو چکی ہیں کہ اب وہ ایک پامال مضمون ہو گیا ہے اور اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں تاہم موقع کی ضرورت سے اجمالاً عنوانات ذیل میں اس کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

[۱] موجودہ طریقہ تعلیم میں علوم غیر مقصودہ میں بہت سی کتابیں پڑھائی جاتیں ہیں اور جو علوم اصلی مقصود ہیں ان میں بہت کم، مثلاً صرف کی بہت سی کتابیں زیر درس ہیں اور ادب و بلاغت کی بہت کم۔

[۲] منطق و فلسفہ میں اس قدر کثرت سے کتابیں ہیں کہ تمام علوم و فنون کی کتابوں کا مجموعہ ملا کر بھی ان کی برابری نہیں کر سکتا۔

[۳] فن تفسیر جو سب سے ضروری فن ہے، اس میں بیضاوی کے صرف ڈھائی پارے ہیں۔ جلالین اتنی مختصر ہے کہ اس کے الفاظ قرآن مجید کے الفاظ سے بھی کم ہیں۔

[۴]علم کلام وعقائد جو اہم العلوم ہیں، اس میں صرف عقائد نسفی پڑھائی جاتی ہے جو نہایت مختصر اور معمولی درجہ کی کتاب ہے۔

[۵]ایسی کتابیں نہیں پڑھائی جاتیں جس میں اصل فن کے مسائل منقح طور سے بیان کئے گئے ہوں، بلکہ عموماً وہ کتابیں درس میں ہیں جن میں خارجی بحثیں زیادہ ہیں اور جن کے اغلاق و پیچیدگی کی وجہ سے طالب العلم پریشان ہوکر مسائل کو اچھی طرح ذہن نشین نہیں کرسکتا۔

[۶]علوم جدیدہ کی کوئی کتاب درس میں داخل نہیں

[۷]انگریزی زبان درس میں داخل نہیں۔(۴)

یہ تفصیل قلم بند کرنے کے بعد اجلاس ندوہ میں شریک تمام علماء کے اس سلسلے میں خیالات اور تجویزیں نقل کی ہیں، پھر انگریزی تعلیم کے ذکر میں لکھا ہے کہ ندوہ کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ایسے علماء تیار ہوں جو انگریزی زبان سے واقف ہوں اور زمانہ حال کی ضرورتوں کو سمجھ سکیں۔(۵)اس پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کے بعد تربیت کا ذکر کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ تعلیم سے زیادہ طلبہ کی تربیت کی ضرورت ہے۔(۶) پھر ان شعبوں مثلاً افتاء، مضمون نگاری، مجلس مکالمہ، دارالمعلومات اور کتب خانہ کا ذکر کیا ہے جن کی ندوہ کو اور اس کے طلبہ کو ضرورت ہے۔ندوہ کی عمارت، مالی حالت، امتحانات کے نتائج وغیرہ کی بھی تفصیلی رپورٹ لکھی گئی ہے۔ پھر اس اجلاس میں ہونے والی تقریروں کو نقل کیا گیا ہے اس میں مولانا سید سلیمان ندوی کی اردو و عربی تقریر بھی درج ہے جس میں علوم وفنون کی اہمیت وافادیت اور زمانہ حال میں اس کی ضرورت کا مختلف انداز اور مختلف عنوان سے ذکر ہے۔ اس کے بعد خود علامہ شبلی نے اپنی تقریر نقل کی ہے۔آخر میں شرکاء اجلاس کی فہرست اور طلبہ واساتذہ اور ملازمین کی فہرست ہے۔امتحانات کے نتائج اور نصاب تعلیم کا نقشہ بھی دیا گیا ہے اور سب سے آخر میں ایک طویل فہرست ان اشخاص کی ہے جنہوں نے ندوہ کو عطیات وچندے دئے۔

یہ اگرچہ ایک روداد ہے لیکن مولانا شبلی کے قلم نے اسے تعلیم اور نصاب تعلیم کے موضوع پر ایک اہم کتاب بنا دیا ہے اور درحقیقت یہ مسلمانوں کی جدید تعلیم کی تاریخ کا ایک

نہایت عمدہ باب ہے۔صحیح یہ ہے کہ اس کے مطالعے کے بغیر شبلی کے نظریہ تعلیم اور ان کے اصلاح نصاب کی کوشش وکاوش کو سمجھا نہیں جاسکتا۔

یہ ایک روداد کا حال ہے حقیقت یہ ہے کہ شبلی کے قلم سے ندوہ کی جو رودادیں شائع ہوئیں کم وبیش سب کا یہی حال ہے اور سب کی حیثیت روداد سے زیادہ ایک تعلیمی کتاب کی ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ یہ اپنے وقت کے سب سے بڑے ادیب وانشاپرداز کے قلم سے ہے۔

حوالے

(۱) روداد عطائے سند دارالعلوم مطبع احمدی علی گڑھ ۱۹۰۷ء۔ص ۱۔۲

(۲) ایضاً ص ۸۔۹

(۳) ایضاً ص ۹۔۱۰

(۴) ایضاً ص ۱۳۔۱۴

(۵) ایضاً ص ۱۶

(۶) ایضاً ص ۱۸

رسالہ وقف اولاد

علامہ شبلی کی شخصیت، حمیت وغیرت اسلامی کا نمونہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے کسی پہلو پر کوئی آنچ آتی تو وہ مضطرب ہوجاتے۔ان کی بیشتر تحریریں اسی حمیت کے زیر اثر وجود میں آئیں۔رسالہ وقف اولاد بھی دراصل اسی سلسلہ کی ایک کاوش ہے۔

عہد شبلی میں انگریز حکمرانوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو زیادتیاں کیں،ان میں ایک وقف علی الاولاد کو ناجائز قرار دینا بھی ہے۔اسلام میں وقف کا ایک مکمل نظام ہے اور ایسا نظام ہے جس کی نظیر کسی اور مذہب میں نہیں ملتی۔علامہ شبلی کے الفاظ میں:

> ''اسلام نے تمدن انسانی کی ترقی کے لئے جو مفید اور جدید اصول وضع کئے ہیں ان میں ایک مسئلہ اعظم یہ بھی تھا کہ خیرات اور صدقات کا مصرف جواب تک بیگانوں اور غیروں پر محدود تھا اسلام نے اس کو اپنے عزیز اولاد اور اقارب کے لئے بھی عام کر دیا،یعنی جس طرح ایک چیز فقرا اور محتاجوں کو خیرات دی جاسکتی ہے خود اپنی اولاد و اقارب کو بھی اسی طرح دی جاسکتی ہے۔اس کا ایک یہ نتیجہ تھا کہ جس طرح وہ جائیداد جو عام فقراء پر وقف کی جائے فروخت اور انتقال سے محفوظ رہتی ہے،اسی طرح وہ جائیداد بھی ہر قسم کے انتقالات سے آزاد رہے گی جو خاص اپنے اولاد و اقارب کو''وقف'' کے نام سے عطا کی جائے۔چنانچہ ابتدائے اسلام سے اس مسئلہ پر عمل شروع ہوا اور اب تمام ممالک اسلام میں جاری ہے۔''(۱)

مگر انگریزی حکام اور جج وقف کے اس اسلامی نقطہ نظر کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ان کا

خیال تھا کہ ’’اپنی اولاد پر وقف کرنا کوئی ایثار نفس اور فیاضی نہیں ہے۔ اولاد کو دینا گویا جائیداد کو اپنے ہاتھ میں رکھنا اور حفاظت جائیداد کا بندوبست ہے۔‘‘(۲) چنانچہ وہ اپنے اس موقف سے ہٹنے کو تیار نہ تھے اور مسلمانوں کی وقف جائیداد کے فیصلے انگریز جج اپنے اسی نقطہ نظر سے صادر کرتے تھے۔

اس سلسلے کا سب سے پہلا واقعہ کلکتہ ہائی کورٹ میں پیش آیا۔ جس میں انگریز ججوں نے اپنے موقف کے مطابق فیصلہ کیا تو مولوی امیر علی صاحب نے ایک جج کی حیثیت سے اس مسئلہ پر اپنے شریک ججوں کی مخالفت کی مگر ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی اور انگریز ججوں نے غیر اسلامی فیصلہ سنایا۔(۳) اسی طرح کا ایک اور مقدمہ وقف ابوالفتح محمد اسحاق بنام رسمیا چودھری ۲۳ر نومبر ۱۸۹۴ء میں بھی انگریز ججوں نے غیر اسلامی فیصلہ صادر کیا۔ اس کے بعد اس طرح کے متعدد مقدمات میں انہوں نے غیر اسلامی فیصلے سنائے اور وقف علی الاولاد کو ناجائز قرار دیا۔ اس کی بعض لوگوں نے مخالفت کی اس میں اولیت مولوی امیر علی کو حاصل ہے۔ انہوں نے ایک مدلل مضمون کے ذریعہ جو ۱۹۰۵ء میں انگریزی رسالہ ’’نائن ٹینتھ سنچری‘‘ میں شائع ہوا، اس کے خلاف آواز بلند کی۔(۴) نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی نے بھی وزیر ہند سے کہہ کر کوشش کی کہ وقف کے سلسلے میں اسلام کے موقف کو تسلیم کیا جائے۔(۵) اس کے بعد مولوی محمد یوسف صاحب وکیل کلکتہ ہائی کورٹ نے اس کے خلاف انگریزی میں ایک رسالہ لکھا جس میں وقف کے اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کی اور حکومت سے درخواست کی کہ وقف کے سلسلے میں اسلام کے موقف پر عمل کیا جائے، مگر حکومت نے مارچ ۱۹۰۸ء میں انہیں صاف جواب دیدیا کہ پریوی کونسل کے فیصلہ میں کوئی دست اندازی نہیں کی جاسکتی۔(۶)

۱۹۰۸ء میں علامہ شبلی بمبئی میں تھے۔ یہیں انہیں خیال آیا کہ پریوی کونسل کے فیصلہ کے متعلق ایک تحریک برپا کی جاسکتی ہے، اس لئے کہ مذکورہ فیصلوں کی وجہ سے مسلمانوں کی بہت سی جائیداد معرض تلف میں آ گئی ہیں اور مسلمانوں کی جائیداد کی حفاظت کا ایک مستحکم نظام فنا ہو رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں سب سے پہلے ہندوستان کے نامور قانون دانوں سے خط و کتابت کی۔ جس میں سید امام علی بیرسٹر پٹنہ، مولوی محمد شفیع بیرسٹر لاہور، نواب سید امیر حسن خاں

کلکتہ، مولوی حامد علی خاں بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ، نواب وقار الملک علی گڑھ، مولوی محمد شریف آنریری سکریٹری وقف کمیٹی لندن، مولوی مشیر حسین قدوائی بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ، نواب نصیر حسین خاں خیال کلکتہ، مولوی سید حسین بلگرامی، اور سید ظہور احمد بیرسٹر لندن کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان قانون دانوں نے تحریک بر پا کرنے پر نہ صرف اتفاق کیا بلکہ ہر طرح کے تعاون کی بھی پیش کش کی۔(۷) اس پیش قدمی سے علامہ شبلی کا حوصلہ اور بلند ہوا، چنانچہ انہوں نے ندوہ کے اجلاس ۱۹۰۸ء میں اس کی تجویز پیش کی، جسے مولوی خلیل الرحمٰن سہارن پوری کے علاوہ تمام ارکان نے منظور کرلیا۔(۸) اور یہ طے پایا کہ:

۱۔ ایک وقف ایسوسی ایشن یعنی وقف کی ایک کمیٹی مقرر ہو جس کے ممبر تمام اضلاع ہندوستان کے سر برآوردہ مسلمان، تعلقہ دار، زمیندار، عہدہ داران سرکاری، وکلا وغیرہ وغیرہ ہوں۔

۲۔ ایک فتویٰ تمام ہندوستان کے علماء کے دستخط سے مزین ہوکر تیار کرایا جائے۔

۳۔ ایک رسالہ لکھا جائے جس میں احادیث اور روایات فقہ سے وقف اولاد کو ثابت کیا جائے۔

۴۔ ایک عرض داشت مرتب ہوکر تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے اس پر دستخط کرائے جائیں اور وہ عرضداشت مع رسالہ وفتوے مذکورہ بالا کے حضور وایسرائے کی خدمت میں بھیجی جائے، جس کا مضمون یہ ہو:

> ''تمام مسلمانان ہندوستان اس تعبیر کو خلاف قانون اسلام سمجھتے ہیں جو پریوی کونسل نے وقف اولاد کے مسئلے میں کی ہے۔اس لئے ہم مسلمانوں کی درخواست ہے کہ گورنمنٹ ایک جدید قانون وقف اولاد کے متعلق حسب شریعت اسلام بنادے۔''(۹)

ان تجاویز کے تحت سب سے پہلے ایک وقف کمیٹی بنائی گئی اور علامہ شبلی کو اس کا سکریٹری نامزد کیا گیا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے رسالہ وقف اولاد قلم بند کیا اور قرآن، حدیث اور فقہ کی مستند کتابوں سے استدلال کر کے ثابت کیا کہ اسلام میں وقف علی الاولاد نہ صرف جائز ہے بلکہ یہ

صلہ رحمی کا بھی ایک ذریعہ ہے اور آغاز اسلام سے اس پر عمل ہوتا رہا ہے اور آج بھی اسلامی مما لک میں اس پر عمل کیا جاتا ہے۔

رسالہ کے شروع میں قضیہ وقف اور اس کے اسباب کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد اصل مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ شبلی رقمطراز ہیں:

''اصل یہ ہے کہ شریعت اسلام کا ایک یہ مسئلہ کہ اگر کوئی شخص اپنی جائیداد کو خدا کی راہ میں فقراء ومساکین کے لئے اس طرح مخصوص کردے کہ اصل جائیداد ہمیشہ محفوظ رہے گی اور اس کا منافع فقراء اور غربا کو ملتا رہے گا تو اس معاملہ کا نام وقف ہوگا اور وہ جائیداد ہمیشہ محفوظ رہے گی یعنی نہ فروخت ہو سکے گی نہ ہبہ ہو سکے گی، نہ وارثوں کو وراثت میں مل سکے گی، البتہ اس کا منافع فقراء کو ملتا رہے گا۔ وقف کی یہ صورت تمام اور مذہبوں میں بھی موجود ہے لیکن تمام اور مذاہب نے وقف کو غیروں اور بیگانوں کے لئے محدود رکھا ہے۔ لیکن اسلام نے اس کو وسعت دی ہے۔ اسلام نے یہ قرار دیا کہ اپنی آپ کی مدد کرنا، اپنی اولاد کی پرورش کرنا، انسان کا اصل فرض ہے، جس کے ادا کرنے پر انسان کو ثواب حاصل ہوتا ہے۔ اس بنا پر اسلام نے وقف کو اولاد اور اعزہ تک وسعت دی یعنی اگر کوئی شخص صرف اپنی اولاد پر کوئی جائیداد وقف کرے تو یہ وقف بھی جائز اور نافذ ہوگا۔''(۱۰)

قرآن مجید کی متعدد آیات سے وقف کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ پھر صحیح بخاری و مسلم اور ترمذی ونسائی کی متعدد روایات سے وقف علی الاولاد کے شواہد فراہم کئے ہیں۔ پھر ان روایات کو نقل کیا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے اپنی اولادوں پر وقف کیا تھا۔ اس کے بعد فقہ کی مستند کتابوں سے ثبوت فراہم کئے ہیں اور آخر میں پریوی کونسل کے شبہات کا مدلل جواب سپرد قلم کیا ہے۔

یہ رسالہ ۱۹۰۹ء میں مطبع احمدی علی گڑھ میں طبع ہوا۔ اور اجلاس ندوہ کی قرارداد کے مطابق ہندوستان کے تمام علماء کے پاس تائید واتفاق کی غرض سے بھیجا گیا۔ چنانچہ ہندوستان کے

تمام علماء نے اس کی تائید وتصدیق کی، شیعہ کانفرنس، مسلم لیگ اور متعدد انجمنوں نے بھی اس کی تائید وحمایت کی۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ ہماری تاریخ کی واحد تحریر ہے جس پر ہندوستان کے نہ صرف تمام علماء جس میں شیعہ وسنی اور اہل حدیث سب شامل ہیں، اتفاق کیا بلکہ جدید دانشوروں نے بھی اسے سراہا۔ اس رسالہ اور مسئلہ وقف اولاد کی تائید میں جو فتاویٰ اور تصدیقات آئیں ان کی تفصیلات علامہ شبلی نے ایک رسالے ''فتاویٰ علمائے ہندوستان'' مطبوعہ آسی پریس لکھنؤ (۱۹۱۰ء) میں جمع کردی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غیر منقسم ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا خطہ اور علاقہ ہو جہاں یہ رسالہ نہ پہونچا ہو اور وہاں کے علماء کبار اور مفتیان عظام نے اس کی تصدیق نہ کی ہو۔ رام پور، دیوبند، مظفرنگر، میرٹھ، علی گڑھ، کان پور، بنارس، لکھنؤ، غازی پور، دہلی، مرادآباد، کلکتہ، لاہور، سندھ، پشاور، امرت سر، پنجاب، مدراس، حیدرآباد غرض ملک کا ہر نمایاں شہر اور تمام مدارس اسلامیہ اور ان کے اساتذہ نے اس رسالہ کا مطالعہ کیا اور اس سے اتفاق کیا۔ یہاں محض مفتی ابوالمعارف محمد المدعو باکرم اللہ المجد دی الاحراری نقشبندی کی تائیدی تحریر نقل کی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے رسالہ وقف اولاد کو اول سے آخر تک دیکھا اور نہایت تحقیقی وتنقیدی نظر سے دیکھا اور اس کے مآخذ استدلال اور اصول کو اچھی طرح جانچا مگر کوئی سقم نظر نہیں آیا اور حرف بہ حرف مذہب حنفی کے مطابق پایا، حق سبحانہ تعالیٰ مؤلف کو جزائے خیر دے اور ان کو ان کی کوشش میں کامیاب کرے۔'' (۱۱)

علامہ شبلی نے تحریک وقف علی الاولاد برپا کرنے کے لئے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ کئی بار کلکتہ اور بمبئی گئے۔ کونسل کے ہندو مسلمان ممبروں سے ملاقاتیں کیں اور انہیں مسئلہ وقف کو سمجھانے اور انہیں راضی کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

مجوزہ قرارداد کے مطابق فارم طبع کرایا اور ملک کے بیشتر حصوں میں اسے بھجوایا اور تمام سربرآوردہ اشخاص سے خط وکتابت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً چالیس ہزار اشخاص نے اس سے اتفاق کیا اور تائیدی فارم پر دستخط کئے۔ (۱۲) ہندوستان کی تاریخ میں کسی ایک مسئلے پر برپا ہونے والی تحریک میں اس سے زیادہ کبھی دستخط نہیں کرائے جاسکے۔

علامہ شبلی نے عرض داشت بھی تیار کی اور اس کا انگریزی ترجمہ سر تیج بہادر سپرو سے کرایا۔بعض اور لوگوں نے بھی اسے انگریزی میں منتقل کیا جو اخبارات اور ملک کے قانون دانوں کے پاس بھیجی گئی اور یہ تحریک پورے ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک مسلمہ مسئلہ بن گئی۔ چنانچہ محمد علی جناح نے کونسل کی میٹنگ میں یہ مسئلہ اٹھایا اور انگریزی حکومت سے دریافت کیا کہ کیا مسلمانوں کی اس بے چینی کی خبر حکومت کو ہے؟ حکومت نے اقرار کیا۔اس کے بعد محمد علی جناح، مولوی مظہر الحق بیرسٹر پٹنہ اور دیگر قانون دانوں نے طے کیا کہ اسے ایک بل کی صورت میں کونسل میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ ۱۷/ مارچ ۱۹۱۱ء میں مسٹر محمد علی جناح نے مسئلہ وقف کو بل کی صورت میں پیش کیا۔انہوں نے اپنی مفصل تقریر میں علامہ شبلی کے فضل و کمال، تحریک ندوۃ العلماء اور وقف کے سلسلے میں ان کی مساعی کا مفصل ذکر کیا اور علامہ شبلی کے رسالہ وقف اولاد کے اقتباسات پیش کئے اور مولانا شبلی کی اس یادداشت کا بھی ذکر کیا جو انہوں نے تیار کرا کے حکومت کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔جس میں چالیس ہزار اشخاص کے دستخط تھے۔ مولوی مظہر الحق کی کوششوں سے کونسل کے ہندو ممبران نے بھی بل کی تائید کی۔ محمد علی جناح نے وقف کا جو بل پیش کیا تھا، اس کی بعض دفعات سے علامہ شبلی کو اختلاف تھا۔اس کے لئے وہ بمبئی گئے اور مسٹر محمد علی جناح سے ملاقات کی اور اپنے موقف سے مطلع کیا، چنانچہ انہوں نے علامہ شبلی کے نقطہ نظر کے مطابق مسودہ میں ترمیم کی۔ یہی ترمیم شدہ قرارداد حکومت نے منظور کی اور وقف علی الاولاد کا قانونی بل پاس ہوا۔ علامہ شبلی نے مسلمانوں کے لئے جو عملی جدوجہد کی مثلاً ندوۃ العلماء کا قیام، تعطیل جمعہ وغیرہ، وقف علی الاولاد اس سلسلے کا ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

حوالے

(۱) رپورٹ کارروائی انجمن وقف علی الاولاد جنوری ۱۹۰۸ء تا مارچ ۱۹۱۱ء۔ص ا۔
مرتبہ علامہ شبلی نعمانی، آسی پریس لکھنؤ ۱۹۱۱ء

(۲) رسالہ وقف اولاد۔ص ۳۔مرتبہ علامہ شبلی نعمانی مطبع احمدی علی گڑھ ۱۹۰۹ء

(۳) ایضاً ص ۲

(۴) حیات شبلی۔ص ۴۱۹۔طبع جدید ۲۰۰۸ء

(۵) رپورٹ کارروائی انجمن وقف علی الاولاد۔ص۱۱

(۶) ایضاً ص۲

(۷) ایضاً ص۳۔۱۲

(۸) حیات شبلی وقف اولاد ص۵

(۱۰) ایضاً ص۱۔۲

(۱۱) فتاویٰ علمائے ہندوستان ص۵۔مرتبہ علامہ شبلی نعمانی۔مطبع آسی پریس لکھنؤ۔۱۹۱۰ء

(۱۲) رپورٹ کارروائی وقف علی الاولاد ص۵

(۱۳) حیات شبلی۔ص۴۲۵۔۴۲۶

مجموعہ نظم

باب چہارم

فارسی مجموعه کلام

فارسی مجموعہ کلام

علامہ شبلی فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ان کی شاعرانہ عظمت اور بلند پایگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے کلام کو اساتذہ اور اہل زبان کا کلام تسلیم کیا جاتا ہے۔ مرزا احسان احمد ان کے شاعرانہ کمالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے نزدیک بہ حیثیت فارسی شاعران کا اصلی کمال ان کی خالص ایرانی طرز ادا ہے، جو بہت کم ہندی نژاد فارسی شعرا کے کلام میں نظر آتی ہے۔علامہ نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ہر جگہ زبان کے لحاظ سے اپنے صحیح ذوق فارسیت کا ثبوت دیا ہے، یعنی ہندوستان میں بیٹھ کر انھوں نے وہ زبان استعمال کی ہے جس پر اہل زبان کو بھی حرف گیری کی جرأت نہیں ہوسکتی۔''(۱)

علامہ شبلی کے مشق سخن کا آغاز بچپن ہی میں ہوا۔ دورطالب علمی میں مولانا فاروق چریاکوٹی اور دوسرے اساتذہ کی صحبت اور گھر کے ادبی ماحول نے ان کے شاعرانہ ذوق کو جلا بخشی۔ چنانچہ انھوں نے اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کی۔ان کی عربی شاعری سرسید احمد خاں کی مدح میں ایک قصیدہ اور چند اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ قصیدہ بطور یادگار اور نمونہ نقل کیا جاتا ہے۔اس کا ترجمہ مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ہے اور حیات شبلی سے نقل کیا گیا ہے۔

المجد یصحب علما حیثما یصل　　والعلم عن قومنا لازال یرتحل

بزرگی جہاں جہاں جاتی ہے، علم کو بھی ساتھ لے جاتی ہے، حالانکہ علم ہماری قوم سے رخصت ہو رہا ہے۔

نالوا من الذّل ما لا نالہ احد　　اذ لا یری فیھم علم و لا عمل

ہماری قوم کو وہ ذلت حاصل ہے جو کسی کو حاصل نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ ان میں نہ علم نظر آتا نہ عمل

ولا تــزال تــری یــنشــثُّ شـملهُـم فـی کُـلِّ یـومٍ وقـد ضـاقـت بهم حیل
ان کا شیرازہ برابر بکھر رہا ہے اور ان کے لیے تمام راستے بند ہوگئے ہیں۔

لا یـرغبـون الـی مـا کـان یـنـفعهـم فـجـلّ صنُعتهم لـلغی والـخـطـل
مفید چیزوں کی طرف ان کا میلان بھی نہیں ہے، ان کا تمام تر کارنامہ گم راہی اور پریشان رائی ہے۔

تـراهـم الیـوم فـی کـأبٍ و فـی قـلـقٍ فـلا افـاد فتیـلا مـا بـه اشتـغـلـوا
آج تم ان کو رنج وغم میں مبتلا دیکھ رہے ہو ان کے مشاغل نے ان کو ذرہ بھر بھی فائدہ نہیں پہونچایا۔

لا یــنتهــون وقــد ذاقــو وبـــالهــم عـن سـوء صـنـعٍ فـقـد باؤا بما عملوا
باوجودے کہ اپنی بداعمالیوں کا مزہ چکھ چکے لیکن ان سے باز نہیں آتے، نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے اعمال کا خمیازہ اٹھا رہے ہیں۔

وهـل یــجـــازیهـم الا بـمــا اکتسبـوا مـن کـان مـن عـنده الاحکام تنفصل
خدا جو معاملات کا فیصلہ کرتا ہے کیا اس کے سوا ان کو اور کوئی معاوضہ دے سکتا تھا

فـمـن سـعـی الیَـوم فـی اصلاح حالهم فـا اللّٰـهُ جـازیـه یـوم یـقطع الامل
پس جس شخص نے ان کی اصلاح کے لیے کوشش کی، خدا اس کو قیامت میں صلہ دے گا۔

ان کـنــت تسـئـلـنــی من هذه صفتـه قـلــت الامـام الهـمـام السیـد البـطـل
اگر تم مجھ سے پوچھو کہ وہ کون ہے؟ تو میں کہوں گا ، امام سردار، بہادر، سید،

هــو الَّــذی فــاق فـی ا لآفــاق مـنـزلةً ونــال مــا لـم تـنـلــه الاعصـر الاُول
وہ وہ ہے کہ تمام ملک میں بلند رتبہ ہوا، اور وہ بات حاصل کی جو قدما کو بھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

مـن اقبـل الـدیـن والـدّنیـا علیـه معـا والآن فــی نـجـحٍ مــا قـدر ام مشتغلٌ
جس کو ایک ساتھ دین و دنیا دونوں ملے اور اب تک اپنے مقاصد کی کام یابی میں مشغول ہے

نــال الــمـکــارم مـن آبـائــه ومشیٰ فـی الـمـکـرمـات عـلـی آثـار ما فعلوا
اپنے آبا و اجداد سے فضائل حاصل کیے اور اس شاہ راہ میں ان کے نقش قدم پر چلا

فـجــدّهٗ سیــد الاعــراب والـعـجـم قــد قــال یــا امتــی لـمّـا دنـا الاجـل
اس کے دادا عرب وعجم کے سردار تھے، اور ان کی موت کا وقت آیا تو صرف امتی کا لفظ ان کی زبان سے نکلا۔

وهٰـکــذا صُــنُــعُ هٰـذا السیـد الـعـلـم یـقـول یـا لهف قـومـی یسیء ما عملوا
اسی طرح اس نام ور سید نے کہا کہ افسوس میری قوم نے جو کچھ کیا، برا کیا،

یـا خیـر مـن سیـط حب القوم من دمه　　احسِـن ولا تبتـئـس من سوء ما عملوا

اے ان لوگوں میں بہتر جن کے خون میں قوم کی محبت پیوست ہوگئی ہے، عمدہ کام کر اور جو برائیاں قوم نے کیں، ان سے غم زدہ نہ ہو۔

اَحۡسِـنۡ الیهـمۡ ولـو جـازوك سیّـئةً　　ولا تبـال بـمـا قـالـوا ومـا فعـلـوا

ان کے ساتھ احسان کر، گو وہ تیرے ساتھ برائی کریں اور جو کچھ وہ کہیں اور جو کچھ کریں اس کی پروا نہ کر۔

یہ قصیدہ انہوں نے ۱۸۸۱ء میں لکھا تھا اور اسے خود سرسید احمد خاں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ [مورخہ ۱۵/اکتوبر ۱۸۸۱ء ج ۱۶، نمبر ۸، ص ۵-۱۱۷] میں شایع کیا۔

اس کے علاوہ تین شعر اور ہیں جو راقم کو اسکات المعتدی میں ملے۔ ان کے علاوہ علامہ کا کوئی عربی شعر دستیاب نہیں۔ البتہ اردو اور فارسی شاعری کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہے، جو ان کے بلند شعری ذوق کا آئینہ دار ہے۔ اولاً انھوں نے کس زبان میں طبع آزمائی کی، قطعی طور پر اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ فارسی شاعری میں ان کی پختہ مشقی، قادر الکلامی اور استادانہ رنگ کی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ شروع میں اسی زبان میں دادِ سخن دی ہوگی۔ ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس دور میں فارسی ہی اہل علم کی زبان تھی۔ بہت سے اہل علم کی طرح شبلی کو بھی اردو میں لکھنا پسند نہ تھا:

گرچہ مرا شیوہ فن ایں نہ بود　　حرف اردو زدن آئیں نہ بود

غالباً انھیں اسباب کی بنا پر مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کے فارسی کلام کو قدیم بتایا ہے۔ (۲) لیکن علامہ شبلی کا سب سے قدیم شعر جو دستیاب ہے وہ اردو کا ہے اور آٹھ نو سال کی عمر میں کہا گیا ہے:

پدر جس کا یوں صاحب تاج ہو　　پسر اس کا چادر کو محتاج ہو (۳)

علامہ شبلی کا سب سے قدیم دستیاب فارسی کلام وہ مثنوی ہے جو انھوں نے ۱۹/سال کی عمر میں روضہ اقدس کے سامنے بطور نذرانہ عقیدت پیش کی تھی۔ البتہ وہ مکمل دستیاب نہیں۔ محض چند اشعار مولوی محمد عمر [بینا پاروی] کی بیاض سے مولانا سید سلیمان ندوی کو ملے تھے، جسے انہوں نے کلیات شبلی فارسی میں درج کر دیا ہے۔ (۴)

اے بہ کرم کار جہاں کرد ساز　　مر ہمہ را پیش تو روئے نیاز

چو بہ درت آمدہ ام با امید　　از کرم خویش مکن نا امید

چوں بہ درت آمدم امیدوار   سایہ لطفے ز سرم بر مدار (۵)

شبلی مدۃ العمر قندِ پارسی سے لطف اندوز ہوتے رہے اور تقریباً ہر صنف میں دادِ سخن دی۔ افسوس کہ ان کے ابتدائی دور کا کلام جس بیاض میں تھا، وہ غازی پور میں ایک جلد ساز کے یہاں سے غائب ہوگئی۔(٦) اور ہم شبلی کی نوجوانی کی امنگوں اور حوصلہ مندیوں کی داستان سے محروم ہوگئے۔

۱۸۸۳ء میں علامہ شبلی جب علی گڈھ کالج سے وابستہ ہوئے تو ان کی تصنیفی صلاحیتوں کے ساتھ ان کی سخن سنجی اور ولولہ خیزیوں کے جوہر بھی خوب نمایاں ہوئے۔ یہاں کی مجالس اور تقریبات میں، امراء و روسا اور نوابین کی آمد پر ان کے قصیدے، مثنویاں اور ترکیب بند خاص طور سے مقبول ہوئے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں بھی وہ اپنا کلام بڑے جوش و خروش سے سناتے اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی سننے والے سر دھنتے، آنسو بہاتے اور قدر جاننے والے ان کی زبان کی فصاحت، معنی کی بلاغت اور طرز ادا کی خوبی مانتے۔(٧) ان کے فارسی کلام کی اصل داد بھی انھیں یہیں ملی۔علی گڈھ میں ان کی مقبولیت کا ایک سبب ان کے شاعرانہ کمالات بھی تھے۔اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ علامہ شبلی اپنی نظمیں، ترکیب بند اور قصیدے بڑے پرسوز لہجے میں سناتے تھے۔جس سے وہ دلوں میں اتر جاتے تھے۔اس لئے لوگوں کی خواہش ہوتی کہ وہ اپنا کلام ضرور سنائیں۔سرسید احمد خاں اور سید محمود وغیرہ کی فرمائشوں کا ذکر حیات شبلی اور مکاتیب شبلی میں ملتا ہے۔ [حیات شبلی ص ۱۴۸۔مکاتیب شبلی ج ا ص ۸۳]

علامہ شبلی کے پرسوز اور مؤثر لہجے کا ذکر اس عہد کے متعدد طلبہ اور اساتذہ نے کیا ہے۔ یہ لہجہ کالج میں اس قدر مقبول ہوا کہ طلبہ اس کی تقلید کرتے تھے۔ان کی یہ لے اتنی پھیلی کی علی گڑھ کالج کے طلبہ اور قومی جلسوں سے نکل کر مشاعرے کی محفلوں تک پہنچ گئی۔(٨) مولوی عبدالرزاق کانپوری نے علامہ شبلی کی اس خصوصیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''جب وہ کسی قومی نظم کو جوش و خروش میں پڑھتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا باربد جہری خسرو پرویز کے دربار میں نغمہ سنجی کر رہا۔حاضرین جلسہ پر وجد کی حالت طاری ہوجاتی تھی۔''(۹)

علی گڑھ کے بعد حیدر آباد اور لکھنؤ کے ادبی ماحول اور خاص طور سے بمبئی کے دلکش اور روح پرور مناظر نے ان کے ذوق شعری میں اک آگ سی لگا دی۔ انھوں نے مہدی افادی کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ:

''۱۹ برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں کی دلچسپیاں غضب کی محرک ہیں۔ آدمی ضبط نہیں کر سکتا۔ اپالو یہاں ایک عجیب سیر گاہ ہے اور چوپاٹی اس کا جواب ہے۔ خواجہ حافظ کے مصرعہ کو یوں بدل دیا ہے۔'' ع:

کنار آب چوپاٹی و گلگشت اپالو را

اس غزل کا ایک شعر یہ ہے:

بہ ہر سو از ہجوم دلبران شوخ و بے پروا　　گذشتن از سر رہ مشکل افتاد ست رہ رورا (۱۰)

واقعہ یہ ہے کہ فارسی شعر وادب شبلی کے ذہن ومزاج میں رچ بس گیا تھا۔ ایک طرف جہاں انھوں نے شعر العجم لکھ کر شعر فہمی کی داغ بیل ڈالی اور ہندوستان کے فارسی ادب میں ایک انقلاب برپا کیا، وہیں سخن شناسانِ پارسی کے سامنے دیوان شبلی، دستہ گل اور بوئے گل پیش کر کے ثابت کر دیا کہ فارسی میں سخنوری کے لئے ایرانی ہونا ضروری نہیں:

روشنم شد ز نواسنجی شبلی کامروز
ہند را نیز فغانی ہست و صفاہانی ہست

ان کا یہ خیال کہ ان کے کلام کی صحیح داد اہل ایران ہی دے سکتے ہیں محض شاعرانہ تعلیٰ نہیں بلکہ حقیقت کا ایک اظہار ہے:

شبلیا کیست کزو داد سخن می خواہی　　گر نظیری نہ بود شیخ حزیں می باید

شبلی نے شعر العجم میں شعر کے مفہوم اور ماہیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ایک ایک نکتہ واضح کر کے بتایا ہے کہ شاعری کیا ہے۔ ان تمام مباحث کا خلاصہ ان کا محض یہ ایک شعر ہے۔ فرماتے ہیں:

شعر اگر دامن دل می نہ کشد بانگ خراست　　نغمہ گر نیست دل آشوب بغوغا ماند

شبلی کی گراں قدر فارسی خدمات اور شاعری میں فنکارانہ مہارت، دست رس، خیالات

کی بلندی اور پختگی کو سامنے رکھا جائے تو مولانا آزاد کے اس خیال کی صداقت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ مرزا غالب پر نہیں بلکہ علامہ شبلی پر ہوا۔(۱۱)

علامہ شبلی کی زندگی میں ان کے چار مجموعے [۱] مجموعہ نظم [۲] دیوان شبلی [۳] دستہ گل اور [۴] بوئے گل شائع ہوئے۔

مجموعہ نظم

یہ علامہ شبلی کے فارسی کلام کا پہلا مجموعہ ہے۔ جو ۱۸۹۳ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے منشی قادر علی خاں صوفی کے زیر اہتمام شایع ہوا۔ اس میں ان کی درج ذیل نگارشات شامل ہیں:

[۱] قصیدہ عیدیہ، ۱۸۸۳ء

[۲] ترکیب بند، ۱۸۹۰ء

[۳] نامہ، بنام خواجہ امین الدین امین لکھنوی متضمن حالات سفر از لکھنو تا حیدر آباد، ۱۸۹۱ء

[۴] ترکیب بند، ۱۸۹۱ء بموقع سفر سر سید احمد خاں حیدر آباد

[۵] قصیدہ، ۱۸۹۰ء

[۶] قصیدہ متضمن حالات سفر روم، مئی ۱۸۹۲ء

[۷] قصیدہ بہاریہ ناتمام، ۱۸۸۸ء

[۸] مرثیہ نواب ضیاء الدین نیر، اکتوبر ۱۸۸۵ء

[۹] مرثیہ مولانا فیض الحسن سہارن پوری، ۱۸۸۷ء

[۱۰] مرثیہ جنرل عظیم الدین خاں، ۱۸۹۱ء

[۱۱] مثنوی ناتمام، ۱۸۸۵ء

[۱۲] دیباچہ سیرۃ النعمان

[۱۳] مثنوی ناتمام جون ۱۸۹۲ء، بمقام قسطنطنیہ

[۱۴] موکب ہمایونی یعنی برآمدن امیر المومنین خلافت پناہ فلک بارگاہ بگذاردن

نمازعید الضحیٰ

[۱۵] ترکیب بند در بزم دعوت، ۶؍دسمبر ۱۸۹۲ء واپسی سفرروم ومصروشام

[۱۶] تشبیب وغزل

چونکہ یہ علامہ شبلی کا پہلا مجموعہ کلام تھا۔اس لئے ان کی خواہش تھی کہ بغیر دیکھے اور بغیر اصلاح کے شائع نہ کیا جائے ۔ان کے کئی خطوط میں اس کا ذکر ہے۔ان کی خواہش تھی کہ استاذ گرامی مولانا محمد فاروق چریاکوٹی جوخود مسلم الثبوت شاعر تھے، ان کے کلام پر نظر ثانی کردیں، معلوم نہیں انھوں نے نظر ثانی کی یا نہیں تاہم ۱۸۹۳ء میں یہ مجموعہ شائع ہوا۔اس کے سر ورق پر مشمولات کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا ہے:

''مجموعہ نظم'' جس میں جناب مولانا مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی کی وہ فارسی نظمیں مناسب طور پر ترتیب دی گئی ہیں، جو مختلف قومی جلسوں اور خاص خاص تاریخی موقعوں پر لکھی گئی ہیں ۔اس کے ساتھ بعض قدیم مذاق کی نظمیں اور تشبیب وغزل کے اشعار ہیں۔ہر نظم کے شروع میں تاریخ تصنیف بھی لکھ دی ہے کہ زمانہ کی امتداد اور مختلف حالتوں کی اقتضاء نے کلام کے مدارج میں وقتاً فوقتاً جو تفاوت پیدا کیا ہے اس کا اندازہ ہو سکے۔''

''مجموعہ نظم'' شائع ہوا تو متعدد اہل علم نے اس پر تبصرہ کیا۔علامہ شبلی کے ایک حبیب خاص مولوی عبدالرزاق کان پوری نے لکھا ہے:

''اس کو کلیات کہنا چاہئے۔قدیم فارسی اور نئی طرز میں یہ قند وگلاب کا برف آمیز شربت تھا۔یہ جملہ قصائد اور ترکیب بند وغیرہ جدید انشا میں اچھوتے تھے جس کی کوئی نظیر موجود نہ تھی۔''(۱۲)

منشی ذکاء اللہ دہلوی نے بھی مجموعہ نظم پر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں تبصرہ کیا ہے اور شبلی کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف کیا ہے۔ [علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۸؍ستمبر ۱۸۹۳ء]

اس میں ان کے ابتدائی دور سے لے کر ۱۸۹۳ء تک کے قصائد، ترکیب بند، مراثی اور غزلیں شامل ہیں۔جس میں قدماء کی طرح سادگی، شائستگی اور رندی وسرمستی کے جذبات شعر کے

قالب میں ڈھلے ہیں۔اس سے ان کی اس دور میں شعر گوئی کی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔مختلف انداز کے چنداشعار ملاحظہ ہوں:

تاکے ز غم نہاں نہ گویم گویند مگو ، چساں نہ گویم
دارم جگرے و می توانم کافسانہ پاستاں نہ گویم
از عربدہ فلک نہ نالم از نیک و بد جہاں نہ گویم
از نالہ دل اثر نہ خواہم از داغ جگر نشاں نہ گویم
ایں جملہ ہمیں توانم اما نتواں کیں داستاں نہ گویم

ہوش می گفت بہ آں فتنہ گر ہوش ربائے
یک رہ از جلوہ بیارم کہ آیم برجائے
جائے راحت نہ بود سینہ پرسوز اے دل
آے و در سایۂ مژگان ترم می آسائے

زیں دو سہ حرف فزوں نیست مغاں راسخنے
کہ بہار آمد ، و ابر آمد ، و باراں آمد

دور دور گل وہل ہست کہ در جوش طرب
زاہد ازصومعہ در میکدہ مہماں آمد

مہر داغ دل عالم شدہ چونست وچہ ہست؟
اختراں دیدہ پرنم شدہ ، چونست وچہ ہست؟
شاہد روز مرگ کہ ؟ بہ ماتم بہ نشست؟
از چہ لیلائے شب آشفتہ ودرہم بہ نشست؟

در جلوہ گاہ حسن دل پارہ پارہ را ‏ شبلی! نگر کہ تا بہ چہ عنواں فروختم
نیمے ازاں بہ نرگس مستانہ باختم ‏ نیمے دگر بہ غمزہ پنہاں فروختم

ہاں وہاں گوش بدارید کہ می گویم باز
داستانے کہ غم افزا بود وزہرہ گداز

زاہد سادہ ہم از کلبہ تنہائی خویش ‏ با کہن خرقہ خود رفت بروں بہر نماز
باہمہ شوکت و فر باہمہ تمکین و شکوہ ‏ خلق در عید گہہ آمد زرہ صدق ونیاز
نفسے چند نشستند دو زانو وانگہ ‏ راست چوں سرو ستادند پے ذکر ونماز

خودگرفتم کہ بہ زلفش نہ فروشم دل ودیں
وربہ غارت بروں آں نرگس فتاں چہ کنم

چاکے از دست جنوں بہرہ من باشد دگر
ارمغانش نہ فرستم بہ گریباں چہ کنم

ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں سادگی وصفائی کے ساتھ زورِ کلام، رعایتِ لفظی، معاملہ بندی، واقعیت، واردات حسن وعشق کی مصوری، ان کا خاص جوہر ہیں۔ موضوعات میں پامال موضوعات کے ساتھ جدید رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ خاص طور سے نظمیں اس رنگ جدید کا پتہ دیتی ہیں۔ قصائد بالخصوص قصیدہ عیدیہ وغیرہ فکروفن کا عمدہ نمونہ ہیں۔ مرثیے تو سوز وغم کا ایسا نمونہ ہیں جن کی مثال ہندوستانی فارسی شاعری میں مشکل ہی سے ملے گی۔

دیوان شبلی

یہ علامہ شبلی کے فارسی کلام کا دوسرا مجموعہ ہے۔ ۷۰ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ منشی رحمت اللہ رعد کے زیر اہتمام مطبع نامی کان پور میں طبع ہوا۔ اس پہ سنہ اشاعت درج نہیں۔ قیاس ہے کہ یہ قیام حیدرآباد کے آخری دنوں میں شائع ہوا کیونکہ اس پر ''ناظم سررشتۂ علوم وفنون سرکار آصفیہ'' لکھا

ہوا ہے۔ چونکہ اس میں وہ ترکیب بند شامل ہے جو انہوں نے امرت سر میں منعقد ندوۃ العلماء کے اجلاس عام میں پیش کیا تھا اور یہ اجلاس ۱۰/اکتوبر ۱۹۰۲ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس لئے یہ دیوان اس کے بعد اور ندوہ آنے [۱۹۰۵ء] سے پہلے ہی شائع ہوا ہوگا۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے اس پر ایک مفصل ریویو لکھا ہے جو اردوئے معلیٰ علی گڑھ مارچ اپریل ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا ہے۔ اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قیام حیدرآباد کے آخری دنوں میں شائع ہوا ہے۔

حیات شبلی میں ''مجموعہ نظم'' اور ''دیوان شبلی'' کے متعلق صحیح تفصیلات درج نہیں ہیں۔ مجموعہ نظم کے ذکر کا عنوان ''کلیات شبلی فارسی ۱۸۹۳ء'' رکھا گیا ہے اور اس کا آغاز ان الفاظ سے کیا گیا ہے:

> ''ابھی اس زمانہ کو زیادہ نہیں گذرے تھے جب فارسی کا ایک دیوان اس عہد کے اہل ذوق کے سلسلہ تصنیفات کی پہلی کڑی ہوئی تھی، اس لئے کہ مولانا کو اپنی فارسی نظموں کے جمع اور طبع کا خیال بہت دنوں سے تھا۔'' (حیات شبلی ص۱۹۴ طبع جدید ۲۰۰۸ء)
>
> پھر آگے لکھتے ہیں:
>
> ''بہر حال اس قطع وبرید کے بعد ایک مختصر سا مجموعہ نظم شبلی مرتب ہوا اور منشی رحمت اللہ صاحب رعد کے نامی پریس سے......اہتمام سے چھپا۔''

(حوالہ سابق ص۱۹۶)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کے فارسی کلام (نظموں) کے دونوں مجموعے شاید سید صاحب کے نظر سے نہیں گذرے تھے۔ اس لئے کہ سید صاحب مجموعہ نظم سے پہلے دیوان شبلی کی اشاعت کا ذکر کرتے ہیں، حالانکہ وہ کم از کم ۱۲/سال بعد شبلی کے قیام حیدرآباد کے زمانہ میں شایع ہوا۔ اسی طرح انہوں نے مجموعہ نظم کو منشی رحمت اللہ رعد کے مطبع نامی کان پور میں طبع ہونا لکھا ہے۔ لیکن وہ مطبع مفید عام آگرہ سے منشی قادر علی خاں کے زیر اہتمام طبع ہوا ہے۔ اس کے برعکس ''دیوان شبلی'' منشی رحمت اللہ رعد کے نامی پریس سے چھپا ہے۔

دیوان شبلی کا ایک مطبوعہ نسخہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے۔

راقم نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ مجموعہ نظم میں چند معمولی تبدیلیاں کر کے اس کا نام دیوان شبلی رکھدیا گیا ہے۔ اس میں دو اضافے ہیں، ایک اضافہ قصیدہ کشمیریہ کا ہے اور دوسرا اضافہ ترکیب بند برائے مجلس عام ندوۃ العلماء منعقدہ ۱۰/اکتوبر ۱۹۰۲ء بمقام امرت سر ہے۔ مجموعہ نظم کے حصہ تشبیب وغزل میں بھی کوئی اضافہ نہیں ہے، بلکہ یہ دو اشعار:

آستان کہ باشد ایں کہ مرا — سجدہ بیخواست از جبیں بچکد
شبلی از چشم یار افتادم — ہمچو اشکے کہ بر زمیں بچکد

حذف کر دئے گئے ہیں۔

مجموعہ نظم اور دیوان شبلی کی بیشتر نگارشات کلیات شبلی مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی میں شامل ہیں۔ اس کا مفصل جائزہ آئندہ اوراق میں آ رہا ہے۔

دستہ گل

دیوان شبلی کے بعد ۱۹۰۸ء میں ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ''دستہ گل'' قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ ستمبر ۱۹۰۶ء سے اپریل ۱۹۰۷ء کے درمیان کہی گئی غزلوں کا مختصر مجموعہ ہے۔ اختصار کے باوجود دستہ گل اپنے اندر بڑی شاعرانہ معنویت رکھتا ہے۔ اس میں علامہ شبلی کی جو غزلیں شامل ہیں وہ فکر وفن کے لحاظ سے غزل کا بہترین نمونہ ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ غزل کے وہ روایتی اوصاف جو ہمارے نقادوں نے بیان کئے ہیں، وہ سب اس میں جمع ہو گئے ہیں۔ مولانا حالی نے دستہ گل کی غزلوں کو حافظ کی غزلوں سے تیز بتایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کو دیکھ کر میں نے اپنے مجموعہ کلام کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا۔ (۱۳)

حسن وعشق، ہجر ووصال، درد وفراق، نالہ شب، اور سوز وساز کی یہ شاعری جس مقام پر ہے اس کی مثال اس عہد کے کسی فارسی شاعر کے یہاں شاید ہی پائی جاتی ہو۔ ایسی خوب صورت، رنگین اور دلکش شاعری فارسی کے قدیم غزل گو شعرا کی یاد دلا دیتی ہے۔ شیخ محمد اکرام نے سچ لکھا ہے کہ:

''دستہ گل صحیح معنوں میں ایک پھولوں کا گلدستہ ہے اور پھول بھی ایسے جن کی

شادابی اورخوبی رنگ وبو کا ہندوستان کی فارسی شاعری میں جواب نہیں۔ یہ غزلیں الفاظ کے انتخاب، خیالات کی تازگی اورطرز ادا کی شستگی میں ترشے ہوئے ہیرے ہیں۔'' (۱۴)

ان غزلوں میں ایک لفظ بھی آورد نہیں بس آمد ہی آمد ہے۔ چنداشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

گرچہ رندی وہوس شیوہ دانا نبود　　حاجتم نیست کہ فرزانہ ودانا باشم
بادہ ہرچند تہ خرقہ تواں نیز کشید　　نرگس مست کسے خواست کہ رسوا باشم
دامن عیش زدستم نہ رود تا شبلی　　دامن بمبئی از کف ندہم تا باشم
نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ ونورا　　طراز مسند جمشید و فر تاج خسرورا

بہ ہرسو از ہجوم دلبران شوخ بے پروا　　گزشتن ازسر رہ مشکل افتادست رہ رورا
غمزہ اش طرح نہدرسم جفاکوشی را　　جلوہ یادت دہدم خویش فراموشی را
بنگر معجزہ حسن کہ آں نرگس مست　　بہم آمیختہ ہشیاری و مدہوشی را

دستہ گل کی غزلیں جس وقت کہی گئیں علامہ شبلی اس وقت شعرالعجم کی تالیف میں مصروف تھے۔ گویا فارسی شاعری کے تمام اہم نمونے ان کے سامنے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ دستہ گل میں فارسی غزل کے وہ تمام عناصر جلوہ گر ہیں جو غزل کو غزل بناتے ہیں۔ ایک بات یہ بھی محسوس ہوتی ہے کہ فارسی شاعری میں شعراء نے حسن کی دیویوں کے خال وخط اور نازنینان شوخ و بے پروا اور زہرہ ہائے شب کی جن خصوصیات اور انداز ناز وادا کا ذکر کیا ہے علامہ شبلی نے وہ تمام جلوے اپنے معشوق میں یکجا بیان کردیے ہیں اور وہ پیکر پیش کیا ہے جس کی کم از کم عہد شبلی میں مثال نہیں ملتی۔

ہرجا روئے روشن تو جلوہ ساز بود　　ہر ذرہ را نظر بہ جمال تو باز بود
ہر جا حدیث فتنہ ایام کردہ ایم　　روئے سخن بہ آں نگہ فتنہ ساز بود
آں شوخ را بہ صومعہ ہا چوں گذر فتاد　　یکبارہ عشق ہائے حقیقی مجاز بود

ساقی مست چو سوئے من مدہوش آید　　ساغر از کف نہد میکدہ بردوش آید
من بر آنم کہ کنار از ہمہ عالم گیرم　　گر مرا یک صنمے شوخ درآغوش آید
عاشق آں نیست کہ ہنگام تقاضائے وصال　　مہرش از بوسہ زنی برلب وخاموش آید
ایں غزل اول فیض اثر بمبئی است　　باش تا بادہ ایں میکدہ در جوش آید

چوں کہ یہ غزلیں بمبئی میں کہی گئیں اس لیے علامہ نے اسے اولاً بمبئیات کا نام دیا تھا لیکن بعد میں دستہ گل پسند کیا۔ بلاشبہ یہ دستہ گل ہی ہیں۔ افسوس کہ شبلی کے اس اعتراف کے باوجود کہ ''ہم نہ صرف پارسائی میں بلکہ رندی میں بھی عالم بے عمل ہیں۔'' (۱۵) شیخ محمد اکرام نے خطوط شبلی کے ساتھ دستہ گل اور بوئے گل میں بھی شبلی کی رنگین زندگی کے پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے غزلوں کے علاوہ وہ زندگی شاید ہی کہیں اور دستیاب ہو سکے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ حسن وعشق، عاشق ومعشوق، رندی وسرمستی کے جذبات غزلوں سے زیادہ اور کہاں دستیاب ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خطوط شبلی کے مکتوب الیہ کا نام دستہ گل کے اشعار کے پس منظر میں تلاش کر لیا گیا، حالانکہ واقعی وہ معشوق نہیں بلکہ روایتی شاعری کی طرح ''شاعر شبلی'' کا معشوق بھی محض جذبات تخیل اور شاعرانہ طرز تکلم کا ایک انداز ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس معشوق کا گھر بمبئی کے بجائے علی گڑھ میں بتایا ہے، جس پر محمد ابراہیم ڈار نے سخت تعجب کا اظہار کیا ہے۔ (۱۶) یہ دونوں نقطۂ نظر درست نہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شبلی کی شاعری کے پس منظر میں جزیرہ کی صحبت ہائے رنگین اور بمبئی کے دلکش قدرتی مناظر شاعر کے احساس وجذبات میں تلاطم پیدا کر دیتے ہیں۔ اس میں درد وسوز تو پیدا ہو سکتا ہے مگر وہ تلاطم ہائے دریا جو موجوں کی روانی کا سبب بنتا ہے اسے معشوق قرار دینا اور جا و بے جا تلاش کرنا نقادوں کا تعصب اور دلیل کم نظری ہے۔ ان نقادوں نے بالقصد شبلی کی رنگین زندگی کا خاکہ کھینچا۔ الفاروق کے مصنف، ندوہ کے معتمد تعلیم اور دو قومی نظریہ کے مخالف کے لیے اس سے بہتر خاکہ کھینچا بھی نہیں جا سکتا تھا، لیکن یہ سب قیاس آرائیاں ہیں حقیقت محض اس قدر ہے کہ یہ غزلیں غزل کے معنی ومفہوم کا عمدہ ترین نمونہ ہیں۔ مشہور نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے شیخ اکرام کے خیالات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''شیخ محمد اکرام صاحب اپنے موقف کی وکالت کے جوش میں یہ بھی بھول گئے کہ قوت شعر گوئی اور زور کلام بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور اس کے لیے کسی حقیقی یا فرضی معشوق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ورنہ وہ یہ ضرور دیکھ لیتے کہ سفر بیرونجات سے علی گڑھ واپسی پر شبلی نے جو ترکیب بند لکھا تھا اس میں اپنے ہی خیر مقدم میں انہوں نے مدرسۂ علی گڑھ کی زبانی کہلایا تھا:

قاصد خوش خبر امروز نوا ساز آمد
کز سفر یار سفر کردۂ ما باز آمد

شیخ صاحب یہ تو دیکھ لیتے کہ اس شعر کا دوسرا مصرع کم وبیش بالکل وہی ہے جو بقول ان کے شبلی نے محترمہ عطیہ فیضی کے 'برتر از شاہانہ' خیر مقدم میں لکھا تھا:

کز سفر یار سفر کردۂ ما می آید

اپنے مزعومات اور پہلے سے طے کردہ نتائج کی روشنی میں شعر کا مطالعہ کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ مزید دیکھنا ہو تو شبلی کے ناتمام قصیدۂ بہاریہ کے چند شعر دیکھیں۔ یہ وہی قصیدہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نو وارد ایرانی شاعر تقی الدین سنجر طہرانی نے اس کے چند شعر سن کر چپ چاپ علی گڑھ چھوڑ دیا تھا:

دوش ایں مژدہ بگوشِ گل و ریحاں آمد
کہ بہار آمد و بسیار بہ ساماں آمد
ابر گوہر ہمہ افشاند چو گریاں بگذشت
گل ہمہ زر بہ پراگند چو خنداں آمد
لالہ چوں مغ بچگاں چہرہ برافروخت بہ باغ
سنبل آشفتہ تر از طرۂ خوباں آمد

یہ دونوں کلام اس زمانے کے ہیں جب شبلی کو عطیہ فیضی، یا ان جیسی کسی لائق فائق، مگر عشوہ طراز، صاحب غنج دلال خاتون یا لیڈی کے وجود کی خبر بھی نہ تھی۔ انگریزی پڑھے ہوئے اصحاب بھول جاتے ہیں کہ شعر گوئی کے کچھ اصول، کچھ

رسومیات ہوتے ہیں۔اور وہ شعر کے موضوع پر (اگر کوئی واضح موضوع ہو بھی) ہمیشہ حاوی ہوتے ہیں۔مغربی شاعری بھی مدتوں اسی اصول پر کار بند رہی۔شیخ صاحب کے زمانے میں مغربی اصول بدل گئے تھے۔مگر شیخ صاحب کو لازم تھا کہ فارسی شاعری پر وہی اصول نافذ کرتے جو فارسی میں رائج تھے۔انہوں نے مغربی اصولِ تحقیق کا بھی احترام نہ کیا۔شبلی کے کچھ عشقیہ شعر عطیہ فیضی سے ملاقات کے پہلے کے ہیں اور انہوں نے ان اشعار کو بھی عطیہ عطیہ قرار دے ڈالا۔مختصر یہ کہ شیخ محمد اکرام، محمد امین زبیری وغیرہ کے پر جوش بیانات کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام پڑھنے والوں نے سمجھ لیا کہ شبلی کی فارسی غزلوں میں رندانہ جوش و سرمستی اور رنگینی اور بقول شیخ صاحب شبلی کے 'خواب ہائے رنگیں' کے بیان اور 'کسی ماہ تمام کی مدح سرائی کے گیت' کے سوا کچھ نہیں۔''

[سہ ماہی اردو ادب دہلی، اپریل تا جون ۲۰۱۱ء ص ۶۰-۶۱]

دستۂ گل کی غزلوں [ستمبر ۱۹۰۶ء-اپریل ۱۹۰۷ء] اور خطوط شبلی [۱۷/فروری ۱۹۰۸ء] کے اوراق میں بعد زمانی ہے۔یعنی یہ خطوط بعد کے ہیں۔شبلی کی شخصیت کو مجروح کرنے کے مقصد سے لکھنے والے نقادوں نے سیاق وسباق میں تبدیلی کی۔خطوط کے اندراج میں ردوبدل کیا، مثلاً خطوط شبلی کا خط نمبر [۲۷] ۱۲/اگست ۱۹۰۹ء کا ہے تو خط نمبر [۲۸] ۱۹/فروری ۱۹۰۸ء کا ہے۔اسی طرح خط نمبر [۳۰] ۳/نومبر ۱۹۰۹ء کا ہے تو خط نمبر [۳۱] ۱۴/اگست ۱۹۰۹ء کا لکھا ہوا ہے۔[خطوط شبلی ص ۶۲-۶۵] یہ غلط اندراجات بقول ڈاکٹر ابن فرید اس لئے کئے گئے کہ ان سے ''بعض واقعات بے وجہ ترتیب پا جاتے ہیں۔'' [ادیب علی گڑھ، شبلی نمبر ص ۲۹۳] اسی طرح ڈاکٹر وحید قریشی نے نفسیاتی تنقید کے نام پر بے سر و پا واقعات گھڑے۔ان تمام گوشوں پر ڈاکٹر ابن فرید نے اپنے مقالہ ''چوں بہ خلوت می رود'' [ادیب علی گڑھ، شبلی نمبر ص ۲۶۸-۳۰۳] میں بڑے محققانہ انداز میں بحث کی ہے اور ان کی تلبیسات کو واضح کیا ہے۔یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منشی امین زبیری، بابائے مولوی عبدالحق، ڈاکٹر وحید قریشی اور شیخ محمد اکرام اور ان کے ہم نواؤں نے ایسا کیوں کیا؟ راقم کا خیال ہے کہ علامہ شبلی کو یہ سزا مسلم لیگ کی مخالفت کی وجہ سے دی گئی۔ان

کا مشہور مقالہ ''مسلمانوں کی پولٹکل کروٹ''اسی زمانہ میں شایع ہوا۔ جس کے خلاف امرت سر اور فیض آباد میں تحریکیں برپا ہوئیں۔ علامہ نے ۱۳-۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ کو قوم کے لئے مضر قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف الہلال میں پے در پے نظمیں لکھیں۔ متحدہ ہندوستان میں مسلم لیگ پر یہ ایک ایسی زد تھی جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ منشی امین زبیری سے شیخ اکرام تک سب کے سب لیگ نواز تھے۔ منشی امین زبیری اور بابائے مولوی عبدالحق نے باری باری پاکستان کی راہ لی۔ ڈاکٹر وحید قریشی اور شیخ محمد اکرام تو پیدا ہی ان علاقوں میں ہوئے تھے جو مسلم لیگ کا مرکز تھے۔

اس کے باوجود دستہ گل ارباب ذوق کی نگاہوں میں قابل قدر ٹھہرا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۹ء میں ظفر الملک علوی نے الناظر بک ایجنسی لکھنو سے شایع کیا۔ ۱۹۱۷ء میں معارف پریس اعظم گڑھ سے بھی ایک ایڈیشن نکلا۔

بوئے گل

دستہ گل کے بعد ۱۹۰۸ء ہی میں ان کا چوتھا مجموعہ ''بوئے گل''، مطبع احمدی علی گڑھ میں طبع ہوا۔ اس کے سرورق پر سنہ اشاعت ۱۹۰۸ء ہی درج ہے اور اس میں جو غزلیں شامل ہیں وہ ۱۴/اکتوبر ۱۹۰۸ء سے ۵/نومبر ۱۹۰۸ء کے درمیان کہی گئی ہیں اس لئے قیاس ہے کہ یہ مجموعہ دسمبر ۱۹۰۸ء میں اشاعت کے لئے دیا گیا ہوگا مگر شایع ۱۹۰۹ء میں ہوا ہوگا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ایک خط سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۹۰۹ء ہی میں شایع ہوا۔ (۱۷)

اس میں دستہ گل کے بعد کی غزلیں ہیں۔ ان غزلوں میں بھی وہی سوز و گداز اور ہجر و فراق کی باتیں ہیں جو دستہ گل میں ہیں۔ مولانا حالی نے ایک خط میں اس کو بھی سراہا ہے اور شبلی کے فکر و فن کی داد دی ہے۔ [بحوالہ مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۹۰] چند غزلوں کے متفرق اشعار ملاحظہ ہوں:

پیک فرخندہ قدم مژدہ سرا می آید — کز سفر یار سفرکردہ ما می آید
رفت از شہر بداں ساں کہ نہالاں ز چمن — آمداں گونہ کہ در باغ صبا می آید
گوئیاں یوسف گم گشتہ بہ کنعاں آمد — یا نگار یمنی سوئے سبا می آید
فراق و ہجر دیار خوشی بود کہ درو — پس از گذشتن شب ہم سحر نمی آید

جدا زدوست شب ماہتاب راچکنم　　　کہ کار عارض او از قمر نمی آید

چناں بہ حلقہ آغوشم آں نگار آمد　　　کہ مہ بہ ہالہ ازیں خوب تر نمی آید
آں شوخ را بہ من سرآں پرس جونماند　　　یعنی گل مرا و مرا رنگ و بو نماند
ہر چند آں نوازش ظاہر ہماں بجاست　　　پیداست ایں کہ آں روش پرس وجو نماند
افسوں طرازی نگہ ناز را بہ بیں　　　چیزے بہ من نہ گفت ومرا گفتگو نہ ماند
یا آں روزے کہ من از سادہ لوحی ہائے خود　　　با عدو می گفتم از راز نہانے داشتم
شبلیا آں جلوہ نیرنگ ہائے بمبئی　　　بود تا وقتے کہ من خواب گرانے داشتم

بوئے گل کی غزلوں میں جذبات کا وہ تلاطم نہیں جو دستہ گل میں موجزن تھا۔ اس میں ایک ٹھہراو محسوس ہوتا ہے۔ خود علامہ شبلی کو اس کا اندازہ تھا کہ ایک ساز ہے تو دوسرا سوز۔ اس فرق نے بوئے گل میں ایک نئی روح اور نیا انداز قائم کیا۔

نہ ہمیں عاشق از جہاں بر خاست　　　کہ ہم از نام و نشاں برخاست
در فراق تو جملہ رنجورند　　　نرگس از باغ نا تواں بر خاست
شبلی خستہ دل مگر جاں داد　　　شورے از کوچہ فلاں بر خاست

از بسکہ طفل بودہ وکار آشنا نبود　　　جورے کہ کردہ است بہ طور جفا نہ بود
آں بزم ناز بسکہ زبیگانہ پرشدہ است　　　دیدم کہ جائے یک نگہ آشنا نبود
ہر گل متاع خویش بصد نازمی فروخت　　　گویا بہ باغ بند قبائے تو وا نہ بود
داغم کہ شبلی از مئے ونے بے نصیب ماند　　　با آں کہ ایں عزیز از اہل ریا نبود
از بسکہ جادہ ہائے غلط شاہراہ گشت　　　بے راہ رفتنم زطریق خطا نبود

فارسی شعروادب کے نکتہ شناس اندازہ کرسکتے ہیں کہ شبلی سخنوری کے کس مقام پر تھے۔ مجموعہ نظم فارسی، دیوان شبلی، دستہ گل اور بوئے گل کا یہاں انتہائی مجمل ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ ان تمام مجموعہ ہائے کلام کو مولانا سید سلیمان ندوی نے یکجا مرتب کر کے کلیات شبلی فارسی کے نام سے

شائع کر دیا ہے، جس کا مفصل ذکر آئندہ سطور میں ہوگا۔

برگ گل

گذشتہ صفحات میں مجموعہ نظم، دیوان شبلی، دستہ گل اور بوئے گل کا ذکر آچکا ہے۔ یہ مجموعے خود علامہ شبلی نے شائع کئے۔ ان کی وفات [۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء] کے بعد ''برگ گل'' کے نام سے ایک اور مجموعہ مولوی معین الدین قدوائی ندوی رئیس رسول پور (بارہ بنکی) نے ۱۹۲۳ء میں مرتب کیا۔ اس کا پہلا ایڈیشن انوار المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن دارالمصنّفین نے شائع کیا، جس پر تاریخ اشاعت درج نہیں ہے۔ قیاس ہے کہ یہ کلیات شبلی فارسی کی تدوین سے قبل شائع ہوا ہوگا، اس لئے کہ کلیات شبلی کی اشاعت کے بعد یہ مجموعے پھر کبھی شایع نہیں ہوئے۔

۲۶ر صفحات کے اس مجموعہ میں ایک مرثیہ (شیخ حبیب اللہ وکیل) چند قصائد، ترکیب بند، بعض قطعات اور بوئے گل کے بعد بلکہ ۱۹۱۳ء تک کی غزلیں شامل ہیں۔ بعض منظوم خطوط، سیرۃ النعمان اور الفاروق کے منظوم دیباچے بھی اس میں شامل ہیں۔ ان کی آخری فارسی غزل یہ ہے:

امشب این غلغلہ در کوچۂ و بازار افتاد
کہ فلان مئ زد و بیخود شد و سرشار افتاد
سخن از صومعۂ و اہل ورع چند کنی
کہ مرا کار بآن چشم قدح خوار افتاد
بسکہ غارت گرِ حسن تو جہاں برہم زد
یوسف از خانہ بدر جست و ببازار افتاد
چہ عجب گر نگہِ مست توافتد برمن
بادہ بیرون فتداز جام چو سرشار افتاد
شیوۂ مہر زخوبان نتوان داشت طمع
کہ مرا کار باین طائفہ بسیار افتاد

محتسب ام پی در جمع زحریفان بہ کمین
(شبلیا) رندی پنہان تو دشوار افتاد

یہ مجموعہ کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔اس میں علامہ شبلی کی شاعری کے تمام ادوار کے اہم نمونے ملتے ہیں۔

کلیات شبلی فارسی

گذشتہ صفحات میں جن مجموعہ ہائے کلام کا ذکر ہوا کلیات شبلی فارسی انہیں کا مجموعہ ہے۔ اسے مولانا سید سلیمان ندوی نے ترتیب دے کر ۱۹۲۵ء میں دارالمصنّفین اعظم گڑھ سے شائع کیا۔ دارالمصنّفین سے اس کا دوسرا ایڈیشن ایک عرصہ بعد ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔اس کا ایک محقق ایڈیشن ڈاکٹر محمد ریاض کی تحقیق وتدوین کے ساتھ ۱۹۷۷ء میں مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان نے شایع کیا۔راقم کے پیش نظر دارالمصنّفین کی اشاعت جدید ہے۔جس کی ضخامت کل سو صفحے ہے۔ اس میں ۱۳-قصیدے، ۵-مرثیے، ۶-مثنویاں، ۸۵-مکمل اور ۳۲-نامکمل غزلیں، ۷-قطعات اور آخر میں ابتدائی زندگی کے چند قصیدے اور غزلیں شامل ہیں اور یہی آخری حصہ مولانا سید سلیمان ندوی کا اضافہ ہے۔ یہاں مختلف اصناف سخن میں علامہ شبلی کی کاوشوں کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

قصیدہ:

کلیات شبلی میں ۱۳-مکمل اور بعض نا تمام قصیدے شامل ہیں جن میں چند بڑے معرکے کے ہیں مثلاً قصیدہ عیدیہ، قصیدہ کشمیریہ، قصیدہ بہاریہ، اور قصیدہ متضمن حالات سفر روم وغیرہ۔

شبلی کو قصیدہ نگاری کا خاص ملکہ حاصل تھا مگر ان کے قصیدے، قصیدہ نگاری کی عام روش سے قدرے مختلف ہیں۔جھوٹی خوشامد، مداحی اور بے جا تعریف وتوصیف شبلی کے مزاج کے خلاف بات تھی۔اس کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔اس لئے ان کے قصیدے ان روایتی عناصر سے پاک ہیں۔ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''انھوں نے اپنے قصائد میں جھوٹ کو کبھی اپنا شعار بنایا اور نہ ان لوازمات کی

پیروی کی، جن کو ایرانی شعرا نے قصیدے کا معیار حسن قرار دیا تھا۔'' (۱۸)

شبلی نے ذاتی اغراض کے لئے کبھی کسی کی شان میں قصیدہ نہیں کہا۔ اس طرح کے جو قصائد ان کے کلیات میں ہیں وہ قومی و ملی جذبات سے سرشار ہو کر لکھے گئے ہیں اور اپنے ممدوح کی مدح میں شبلی نے جو کچھ کہا وہ مبنی بر حقیقت تھے۔ بیگم بھوپال نے دارالعلوم ندوہ کی امداد میں ایک خطیر اضافہ کیا تو علامہ شبلی نے ایک قصیدہ کہا، جس میں بیگم سلطان جہاں بھوپال کی تعریف میں چند اشعار بے ساختہ زبان پر آ گئے تو اسے بھی ان کی غیور طبیعت نے گوارا نہ کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

شبلی غم زدہ را مدح شہاں شیوہ نہ بود
لیک لطفت ہمہ را بندہ احساں کردہ است

علامہ شبلی کے قصیدوں میں علی العموم واقعہ نگاری، منظر کشی، مناظر قدرت کی عکاسی اور قومی حمیت و غیرت کے جلوے نظر آتے ہیں۔ وہ علی گڈھ تحریک کے پر جوش داعی و مبلغ رہے۔ ملت کے ہمدرد، بہی خواہ اور مونس و غم خوار رہے۔ ان کے احساسات و جذبات پر قومی درد و سوز اور مسلمانوں کی پستی و زبوں حالی کے دلخراش واقعات کا بے حد اثر تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے قصیدوں میں انھیں احساسات و جذبات کی عکاسی کی۔ ان کا قصیدہ عیدیہ اس کی بہترین مثال ہے۔ اس میں انھوں نے عید کی خوشی، چہل پہل، روح پرور مناظر کے ساتھ مسلمانوں کی عظمت رفتہ، علمی، تہذیبی، تمدنی اور سیاسی تاریخ کی ایک جھلک اور موجودہ ذلت و نکبت کی تصویر کھینچ دی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حیف کایں شور طرب یک دو نفس بیش نماند — چہ کند عید بہ دردی کہ بود صبر گداز
جمع اسلام چو باشد ہدف تیر بلا — خود چو کج باخت بہ ایشاں فلک عربدہ ساز
فرق نبود بہ حقیقت ز محرم تا عید — آہ از فتنہ گری ہائے سپہر کج باز
خود ہماں جمع کہ می داشت بہم تیغ و قلم — خود ہماں قوم کہ بودہ است بہ ہر پایہ فراز
اینک آں قوم بہ حالیست کہ نتواں گفتن — خود بہ بیں تا بچہ انجام رسید آں آغاز

قصیدہ بہاریہ میں آمد بہار کی منظر کشی کی گئی ہے۔ اسی طرح قصیدہ کشمیریہ میں اپنے سفر کشمیر کی روداد، بیماری، علاج وغیرہ کے ذکر کے ساتھ کشمیر کے لازوال حسن و جمال، آب و ہوا،

دلکش مناظر، پھولوں، پھلوں، باغات، جھیل اور وہاں کے خوش نما قدرتی مناظر کو قصیدہ کی شکل میں ڈھالا ہے۔

علامہ شبلی کے قصیدے اس لحاظ سے بھی عام ڈگر سے ہٹے ہوئے ہیں کہ وہ بلاتمہید اور بغیر تشبیب کے اصل مدعا سے اس کا آغاز کرتے ہیں۔ قصیدہ نگاری کی تاریخ میں اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ ان کے قصیدوں کی جو سب سے بڑی خوبی ہے وہ یہ کہ وہ ایرانی شعرا کے برعکس عرب شعرا کی طرح ممدوح کی واقعی تعریف کرتے ہیں۔ خود انھوں نے اسی نظریہ قصیدہ نگاری کی شعرالعجم میں تحسین وستائش کی ہے۔

ان کے قصائد میں تشبیہات کثرت سے ہیں۔ البتہ انھوں نے ان میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ سادگی، برجستگی، جوش اور حسن ادا، ان کے قصائد کی دوسری خصوصیات ہیں۔ قصیدہ نگاری کی تاریخ پر پروفیسر محمود الٰہی کی بڑی گہری نظر ہے۔ وہ علامہ شبلی کی قصیدہ نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ قصیدے سے قومی بیداری اور حب الوطنی کی پیغام بری کا کام لینا چاہتے تھے۔ وہ اسلاف کے جوش انگیز واقعات سے حال کی مردہ دلی کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ مداحی کو وہ بڑے کام کی چیز سمجھتے تھے بشرطیکہ اس میں صداقت اور راستی ہو اور اس سے جذبات میں تحریک پیدا ہو۔ شبلی کی متعدد اخلاقی، سیاسی اور مذہبی نظمیں اسی اصول کی علم بردار ہیں۔ وہ مدح کرتے ہیں مگر قصیدے کی روش سے ہٹ کر۔ ان کی مدح نہ کسی مخصوص عروضی ترکیب کی پابند ہے اور نہ روایتی اجزائے ترکیبی کی حامل۔ وہ مسلمانوں کے شاندار کارناموں کو دہرا کر اپنے عہد کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔''(۱۹)

علامہ شبلی کے وہ قصیدے جو انہوں نے علی گڑھ کے زمانہ قیام میں ہندوستان اور بیرونی مشاہیر کی علی گڑھ آمد پر کہے وہ عموماً کلیات میں شامل نہیں۔ حالانکہ وہ فکری اور فنی لحاظ سے بڑے معرکے کے ہیں۔ ان کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔

ترکیب بند:

علامہ شبلی نے متعدد ترکیب بند کہے۔کلیات میں پانچ نظمیں ترکیب بند کے عنوان سے درج ہیں۔شبلی کے ترکیب بند بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔اس میں ان کے شاعرانہ جذبات و خیالات اور حکیمانہ انداز بیان نے بڑی جاذبیت اور دلکشی پیدا کی ہے۔یہ نظمیں شاہ کار کا درجہ رکھتی ہیں۔۱۹۰۲ء میں امرت سر میں منعقدہ ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسے میں علامہ نے جو ترکیب بند پیش کیا تھا،اس سے اس صنف میں ان کی مہارت اور پختگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے کہ پرسی چہ کسانیم و چہ ساماں داریم — آنچہ باہیچ نیرزد بہ جہاں آں داریم
مانہ آنیم کہ دیہیم سکندر طلبیم — مانہ آنیم کہ اورنگ سلیماں داریم
مانہ آنیم کہ برشیوہ ارباب حشم — روی ورا ہے بہ در دولت سلطاں داریم
مانہ آنیم کہ با حاجب و درباں باشیم — مانہ آنیم کہ بام و در و ایواں داریم

علامہ شبلی نے اپنے متعدد ترکیب بند میں مسلمانوں کے پرفخر کارناموں،عظیم الشان یادگاروں اور اسلاف کی مایہ ناز کاوشوں کا ذکر،عظمت اور بلندی کے ساتھ کر کے ان کو بیدار کرنے کی کوشش وسعی کی ہے۔جدو جہد پر آمادہ کیا ہے۔کھوئے ہوئے وقار کے حصول کے لئے مہمیز کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی کا راز قرآن وسنت کی اتباع میں مضمر ہے۔علما کو ان کے منصب سے آگاہ کیا ہے۔ان کے فرائض یاد دلائے ہیں۔جدید تعلیم یافتہ طبقے کو یورپ کی کورانہ تقلید سے اجتناب کا مشورہ دیا ہے اور واضح کیا ہے کہ جدید تعلیم کا حصول برا نہیں۔البتہ اس کی ظاہری چمک دمک اور خیرہ کن جلوے بے روح اور بے تاثیر ہیں۔اس لئے ضروری ہے کہ اپنے تشخص وامتیازات کو ہر قیمت پر باقی رکھا جائے۔

شبلی کے ترکیب بند میں تنوع اور رنگارنگی ہے۔فنی لحاظ سے بھی ان میں بڑی پختگی ہے۔جوش،روانی اور برجستگی بھی پائی جاتی ہے،تشبیہات میں جدت اور ندرت ہے اور جس طرح اردو میں مذہبی،اخلاقی،سیاسی اور تاریخی شاعری شبلی کا بڑا کارنامہ ہے،اسی طرح فارسی میں قومی و

ملی شاعری بھی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے سچ لکھا ہے کہ

''ہندوستان میں فارسی زبان میں نئی شاعری کی بنیاد بلاشبہ مولانا شبلی نے ڈالی اور اس میں نئے خیالات، قومی احساسات اور مذہبی جذبات کا ایسا زور بھرا کہ صرف زبان کی چاشنی اور محاوروں کی صحت کے نشہ کی جگہ جیسا کہ اب تک وہ تھی مسلمانوں کی قومی زندگی کے لئے آب حیات بن گئی۔'' (۲۰)

مرثیے:

کلیات میں حسب ذیل مرثیے شامل ہیں:

۱۔ مرثیہ نواب ضیاء الدین خاں نیر دہلوی۔ [۱۸۸۵ء

۲۔ مرثیہ مولانا فیض الحسن سہارن پوری۔ [۱۸۸۷ء]

۳۔ مرثیہ جنرل عظیم الدین خاں۔ [۱۸۹۱ء]

۴۔ مرثیہ شیخ حبیب اللہ۔ [۱۹۰۰ء]

۵۔ مرثیہ والدہ زہرا بیگم بہ زبان زہرا بیگم۔ [۱۹۰۹ء]

ان مراثی سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کو مرثیہ کہنے پر بھی پوری قدرت تھی۔ زبان میں سادگی، برجستگی اور حسن ادا بھی ہے، البتہ دوسرے اصناف میں شبلی کو جو مقام حاصل ہے، وہ ان کے مرثیوں کو حاصل نہیں۔ مرثیے کے لئے جو دلی جوش، اور یاس و غم اور جن دلی کیفیات کا ہونا ضروری ہے۔ علامہ شبلی کے مرثیے ان سے کسی قدر خالی ہیں۔ سوائے مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے مرثیہ کے۔ اس میں ان کا غم و اندوہ اور حزن و ملال پوری طرح جھلکتا اور شدت غم کا احساس ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

در یں آشوب غم عذرم بنہ گر نالہ زن گریم   جہانے را جگر خوں شد ہمی تنہا نہ من گریم
بہ تحسین صبوری چند بفریبی مرا ناصح   دمے بہ گذار تادر ماتم فیض الحسن گریم
بہ مرگش علم و فن در نالہ با من ہم نوا باشد   ہنر بر خویشتن گرید چو من برخویشتن گریم
گہے بے خود بہ برہم گشتن بزم ہنر نالم   گہے بے خویش بر روز سیاہ علم و فن گریم

عطیہ فیضی کی والدہ کا جو مرثیہ ہے اس میں بھی مرثیے کے عناصر ترکیبی پائے جاتے ہیں مگر اس کی بھی فضا مرثیہ کے مذکورہ خصائص سے خالی ہے۔ خود ان کے والد کا مرثیہ بھی تشبیب اور تغزل کے اثرات سے پاک نہیں رہ سکا۔ مجموعی طور سے شبلی کے مراثی کی فضا مرثیوں کے خصائص سے خالی ہے۔ شعور فن کی جلوہ گری تو ہے مگر اس میں جو اثر آفرینی، رقت آمیزی اور غم انگیز فضا ہونی چاہئے وہ نہیں ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ عہد شبلی میں اس کے برابر درجے کے بھی مراثی شاید ہی کہے گئے ہوں۔

مثنوی:

کلیات شبلی میں چند مثنویاں بھی شامل ہیں۔ مثنوی کے نام سے سیرۃ النعمان اور الفاروق کے منظوم دیباچے بھی کلیات کی زینت ہیں۔ البتہ ایک مثنوی ''موکب ہمایونی'' ہے۔ جس میں ترکی کے سلطان کی نماز عید اضحیٰ کی ادائیگی کے روح پرور منظر کی منظر کشی کی گئی ہے، وہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

غلغلہ برخاست کہ بادا نوید　　مہر جہاں تاب خلافت دمید
قاعدہ دولت و دیں را مدار　　آئینہ رحمت پروردگار
فاتحہ دولت و طغرائے دیں　　زیب دہ افسر و تاج و نگیں
تازگی بدر و حنین از تو ہست　　زیب و طراز حرمین از تو ہست
فرہ دین نبوی از تو ہست　　بازوے اسلام قوی از تو ہست

اس ناتمام مثنوی میں شبلی کے انھیں افکار و خیالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے جو قصیدہ عیدیہ، ترکیب بند وغیرہ میں علامہ نے پیش کئے تھے، یعنی اسلام کی عظمت و سربلندی کی خواہش وغیرہ بعض اور نامکمل مثنویاں بھی کلیات کا حصہ ہیں جو اپنی بہت سی خصوصیات مثلاً تسلسل، واقعہ طرازی، خیال بندی اور حسن ادا کی وجہ سے اثر انگیز ہیں۔

قطعات:

علامہ شبلی نے قطعات بھی وقتاً فوقتاً کہے۔ کلیات میں متعدد قطعات شامل ہیں۔ ایک

قطعہ الفاروق اور دوسرا دستہ گل سے متعلق ہے۔ شبلی کے حادثہ گزند پا پر متعدد قطعے کہے گئے۔ خود شبلی نے بھی ایک قطعہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

حالت از گردش ایام اگر گشت بتر — صبر فرما کہ ازیں نیز بتر می بایست
شبلی نامہ سیہ را بہ جزائے عملش — پابریدند وصدا خاست کہ سر می بایست

مسلم یونیورسٹی کے عنوان سے کلیات شبلی میں ایک طویل قطعہ شامل ہے۔ جس میں یونیورسٹی کے اغراض و مقاصد کے بیان کے ساتھ نظریہ تعلیم کو بھی موضوع بنایا ہے اور آخر میں سر آغا خاں کی مدح کی ہے۔

علامہ شبلی کے فارسی قطعات بس قطعات ہیں۔ ان میں کوئی ندرت نہیں اور نہ ہی شبلی نے اس میں کسی قسم کا اہتمام کیا ہے۔

غزل

علامہ شبلی کی شاعری کی اصل جولا نگاہ اور ان کے شعری کمالات کا مظہر ان کی غزلیہ شاعری ہے۔ وہ ایسے پختہ مشق اور قادرالکلام غزل گو ہیں جن کی ان کے عہد میں نظیر نہ تھی، ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ دستہ گل شائع ہوا تو اردو کے سب سے بڑے نقاد مولانا حالی نے لکھا کہ

> ''غزلیں کاہے کو ہیں شراب دوآتشہ ہے۔ جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی و بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ممکن ہے اس کے الفاظ میں زیادہ دل ربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بھی زیادہ گرم ہیں۔...... میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلام نثر و نظم جو کچھ ہے اس کو چھپوا کر شائع کر دوں مگر دستہ گل دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں۔'' (۲۱)

کلیات شبلی میں ۸۵ مکمل اور ۳۰ نامکمل غزلیں شامل ہیں۔ گو یہ غزلیں سب ایک رتبہ کی نہیں اور نہ ہی ایک عہد کی ہیں اور نہ ایک طرح کے حالات میں کہی گئی ہیں، تاہم بنیادی طور پر ان میں بڑی دل ربائی، بے باکی، جوش وخروش، اثر آفرینی اور نازک خیالی پائی جاتی ہے۔ مولانا

عبدالسلام ندوی نے ان کی غزل گوئی کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ہر دور کے نمونہ کلام کو پیش کر کے دکھایا ہے کہ دوراول کی غزلوں میں زبان نہایت صاف اور شستہ ہے۔ البتہ خیالات میں قدما کی سی سادگی ہے۔ دوسرے دور میں پختگی آئی حتی کہ ان کا کلام مستند شعراء کے برابر بلکہ ان سے بڑھ کر ہوگیا۔(۲۲) مولانا عبدالسلام ندوی نے شبلی کے تیسرے دور غزل گوئی کو ان کی حقیقی غزل گوئی سے تعبیر کیا ہے اور اس کی متعدد مثالیں دی ہیں، اس دور کی ایک غزل ملاحظہ ہو:

نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نو را — طراز مسند جمشید و فر تاج خسرو را
بہ ہر سو از ہجوم دلبران شوخ بے پروا — گذشتن از سر رہ مشکل افتادست رہرو را
فغاں از گرمی ہنگامہ خوبان زردشتی — بہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت وضو را
بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نہ خواہی یافت — کنار آب چو پاٹی و گلگشت اپا لو را
بیا شبلی بہ یاد پنجہ گیرائی مژگانش — دگر رہ پارہ سازم ایں قبائے زہد صد تو را

آخری دور کی بیشتر غزلیں بمبئی کی یادگار ہیں اور اسی لئے علامہ شبلی ان کو بمبئیات کا نام دینا چاہتے تھے مگر پھر دستہ گل تجویز کیا۔ اس میں حیدرآباد اور لکھنؤ میں کہی گئی غزلوں کو بھی شامل کیا ہے۔ ان کے اس دور کے دوسرے مجموعہ کلام کا نام بوئے گل ہے، اس کی غزلیں بھی اپنا جواب آپ ہیں۔

یہی وہ عہد ہے جس میں علامہ شبلی نے شعرالعجم لکھنے کا آغاز کیا اور فارسی شعروادب کی ایسی کتاب قلم بند کی جس کی اب تک نظیر نہیں۔ اس میں انھوں نے شعروشاعری کے جو رموز و آداب لکھے ہیں اور حسن و قبح کا جو معیار قرار دیا ہے، خود شبلی کی فارسی شاعری اس کا بہترین نمونہ ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ شبلی نے شعرالعجم میں جو کچھ لکھا اپنی شاعری میں عملی طور پر اسے برت کر بھی دکھلایا۔ خواجہ حافظ شبلی کے محبوب شاعر ہیں۔ شعرالعجم میں ان کا بڑے والہانہ انداز سے ذکر کیا ہے اور ان کے کلام پر جس دل جمعی اور دلچسپی سے تبصرہ کیا ہے وہ ان سے حد درجہ عقیدت کا مظہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اپنے اشعار کے ذریعہ بھی خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

گر خداوندی ہوس داری درا قلیم سخن — بندگی حافظ شیرازی بایست کرد

شبلی کی فارسی غزلوں پر حافظ کا دھوکہ ہوتا ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ شبلی نے ان کے

کلام سے بڑا فیض اٹھایا ہے۔ وہی انداز اور وہی لب ولہجہ اختیار کیا ہے جس کے لئے حافظ کا کلام امتیاز رکھتا ہے حتی کہ شبلی نے انھیں زمینوں میں دادِ سخن دی ہے جو حافظ کی محبوب زمینیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ کی غزلوں کی جو خصوصیات ہیں وہ شبلی کے یہاں بھی جلوہ گر ہیں۔ مثلاً رندی و سرمستی، رنگینی، جوش، روانی، حسن ادا، مبالغہ اور واردات حسن وعشق وغیرہ وہ تمام عناصر جو حافظ کے کلام کو میکدہ بنا دیتے ہیں، وہی اسلوب و انداز شبلی کی غزلوں کو بقول حالی شراب دوآتشہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً:

ساقی مست چو سوی من مدہوش آید ساغر از کف بنہد مے کدہ بردوش آید
چناں نہ شہرت عشق تو بر زبان انداخت کہ پردہ بررخ ایں کارمی تواں انداخت
چوں آگہی کہ فرصت عہد شباب چیست می خورد گر سخن ز عذاب وثواب چیست
دوش مستی خبر آورد کہ در عرصہ حشر گفتگو از خم و مینا و سبو خواہد بود
خود گرفتم کہ بہ زلفش نہ فروشم دل و دیں وربغارت برد آں نرگس فتاں چہ کنم

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی نے شبلی کی غزلوں پر حافظ کے اثرات کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

> ''مکمل غزلوں کو پڑھ کر ہر وہ شخص جو فارسی زبان کا ذوق رکھتا ہو اور شاعری کا مزاج آشنا ہو یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ شبلی کا مرتبہ پیروی حافظ میں غالب سے بھی اونچا اور کم از کم نظیری کے برابر ہے اور یہ شبلی کا انکسار ہے کہ وہ نظیری کی بجائے علی حزیں سے دادِ سخن کے طالب ہیں۔'' (۲۳)

شمس الرحمٰن فاروقی جو فارسی شعر وادب کے بھی بڑے اداشناس ہیں وہ علامہ شبلی کی غزلیہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شبلی کی فارسی غزلوں کو داخلی کیفیات اور عشقیہ جذبات کا غیر معمولی حسن اور اپنے پیش روؤں کی شاعری پر جگہ جگہ تخلیقی حاشیہ آرائی کہنا چاہیے۔ زبان کی شگفتگی اور روانی کے لحاظ سے اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ غزلیں اہل ایران تک پہنچی ہوتیں تو انہیں تسلیم کرنا پڑتا کہ غالب اور انیسویں صدی کے دیگر فارسی

شعرا کے برخلاف اس شاعر کی زبان پر کہیں بھی حرف نہیں رکھا جاسکتا کہ یہ خلاف محاورہ ہے یا طرز ایرانیاں سے مختلف ہے یا درجۂ فصاحت سے گری ہوئی ہے۔لوگ شیخ علی حزیں کا نام لیتے ہیں لیکن اصلیت یہ ہے کہ ان غزلوں کے ہم نوا بابا فغانی اور غزالی مشہدی ہیں اور ان کے فیضان کا سرچشمہ حافظ ہیں۔ یہ بات شیخ اکرام وغیرہ سے قصداً یا اتفاقاً نظرانداز ہوگئی کہ یہ غزلیں تھوڑی سی ہیں لیکن اس خرمن قلیل میں بھی کم سے کم بارہ غزلیں حافظ کی زمینوں میں ہیں اور دوسرے شعرا کی زمینوں میں غزلوں سے یہ تعداد بہت زیادہ ہے۔''

(سہ ماہی اردو ادب دہلی، اپریل تا جون ۲۰۱۱ء ص ۶۲)

بہرحال شبلی کی غزلیں ہندوستان کی فارسی شاعری کی تاریخ میں اپنی داخلی اور خارجی خوبیوں کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

حافظ کی طرح علامہ شبلی کا عشق مجازی ہے۔ وہ حسن کے خوگر ہی نہیں دلدادہ بھی ہیں انھوں نے واردات حسن وعشق کو جس خوبی سے برتا ہے اس نے ان کے کلام کو تازگی اور تابندگی عطا کی ہے۔ان کی عشقیہ شاعری کے اسباب ومحرکات تلاش کرنے والوں نے متعدد اسباب تلاش کئے ہیں اور ایک خارجی سبب کو جوذرا سی بات تھی افسانہ کردیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ شبلی کے عشقیہ رویے کو شاعرانہ انداز میں دیکھنا چاہئے ،حقیقت اور مجاز میں دیانت دارانہ انصاف ہونا چاہئے تھا مگر ایسا نہ ہوا بلکہ بمبئی کے بوقلموں مناظر، دلفریب حسن اور صحبت ہائے رنگیں کو شبلی شکنی کے لئے حربہ بنایا گیا اور شبلی کی اس وضاحت کے بعد بھی کہ ''ہم نہ صرف پارسائی میں بلکہ رندی میں بھی عالم بے عمل ہیں۔''(۲۴) کردارکشی کی گئی۔واقعہ یہ ہے کہ یہ محض شاعرانہ خیالات ہیں۔

کلیات شبلی کے اس جائزے سے گو علامہ شبلی کے شاعرانہ کمالات کے تمام جلوے نگاہوں میں آجاتے ہیں تاہم بہت سے ایسے جلوے جو نگاہوں کو خیرہ کرسکتے تھے اور جن سے شبلی کے شعری امتیازات، عہد بہ عہد کی ترقیوں اور ان کے شعری سفر کو سمجھنے میں زیادہ مدد ملتی وہ کلیات میں جگہ نہیں پاسکے۔غالباً یہی وجہ ہے کہ شبلی کا کلیات انتہائی مختصر ہے۔اس کے متعدد وجوہ ہیں ۔مثلاً:

۱-علامہ شبلی کا ابتدائی کلام جس بیاض میں تھا وہ غازی پور میں ایک جلد ساز کے یہاں سے غائب ہوگئی۔(۲۵)

۲-علامہ شبلی نے علی گڈھ میں سرسید احمد خاں اور سید محمود وغیرہ کی فرمائش پر اہل علم، امرا و روساء اور نوابین کی آمد پر جو قصائد لکھے اور اپنے خاص دلکش انداز میں پیش کئے اور جو علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ وغیرہ میں شائع ہوئے۔انہیں خود علامہ شبلی نے مجموعہ نظم اور دیوان شبلی میں جگہ نہ دی۔انہوں نے عدم شمولیت کے اسباب کا کہیں ذکر نہیں کیا،البتہ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کی وضاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''ذاتی طور پر مولانا نے ہمیشہ امرا کی مدح سرائی کو عار سمجھا لیکن قومی ضرورت کی بنا پر وہ اس ننگ کو گوارا کر کے فرمائشوں کی تعمیل کرتے تھے مگر یہ بات ان کو دل سے پسند نہ تھی اس لئے یہ فرمائشی نظمیں ان کے فارسی کلیات میں جگہ نہ پاسکیں۔''(۲۶)

ممکن ہے یہ خیال درست ہو لیکن جب خود مولانا سید سلیمان ندوی نے کلیات شبلی مرتب کیا تو انہوں نے بھی ان کو شامل نہیں کیا۔اس وجہ سے متعدد عمدہ قصیدے،بعض مثنویاں اور ترکیب بند وغیرہ سے شبلی کی فارسی شاعری کا مطالعہ وجائزہ لینے والے محروم رہے۔اور یہی وجہ ہے کہ کلام شبلی کی بازگشت اہل فارس تک نہ پہنچ سکی جہاں ان کی دیگر تصنیفات کے متعدد تراجم شایع ہوئے اور جسے ایرانی،تاجک اور افغانی اہل قلم نے سراہا اور ہاتھوں ہاتھ لیا

۳-اسی طرح علامہ شبلی کے قیام حیدرآباد کے بعض قصیدے بھی کلیات میں شامل نہیں۔

۴۔علامہ شبلی کی وفات کے بعد بعض قصائد، مراثی اور آخری دور کی غزلیں اور بعض قدیم مثنویوں کو یکجا''برگ گل''کے نام سے مولانا حاجی معین الدین قدوائی ندوی نے مرتب کیا، جو معارف پریس اعظم گڑھ سے ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔اس میں بھی علی گڈھ اور حیدرآباد کے زمانہ کا کلام شامل نہیں ہے۔اس کو مولانا سید سلیمان ندوی نے کلیات میں شامل کیا ہے۔حالانکہ اس میں ابتدائی دور کی بعض کمزور نگارشات بھی شامل ہیں۔حتیٰ کہ سیرۃ النعمان کا وہ دیباچہ بھی شامل ہے جو ان کے اولین مجموعوں میں شامل ہو چکا تھا۔

علامہ شبلی کا جو کلام کلیات میں شامل نہیں ہے، یہاں اس کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

ا۔علامہ شبلی علی گڑھ کالج سے ۱۸۸۳ء میں وابستہ ہوئے۔ اسی سال فروری میں حیدرآباد دکن کے مدارالمہام سرسالار جنگ نے انتقال کیا، وہ کالج کے خاص محسنوں میں تھے۔ چنانچہ اظہارِغم کے لئے ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ علامہ شبلی نے اس حادثہ پر ایک مرثیہ لکھا اور جلسہ تعزیت میں پڑھ کر سنایا:

آہ ایں چہ غم بود کہ جہانے است نوحہ گر　　ایں آہ چہ ماتم است کہ خوں شد دل وجگر
تنہا ہمیں نہ دولت و ملک است در خطر　　ہم شرع را نماند کنوں معنی دگر
سالار جنگ مرد جہاں گشت دیدہ تر　　شادی ز دل رمیدہ و دل زاں رمیدہ تر
ہم ملک را پناہ و ہم اسلام را مدار　　کز یمن او نظام ریاست شد استوار
آئین و رسم و داد ازو بود برقرار　　بیداد بیں کہ گردش چرخ ستم شعار
آں را کنوں بخاک برابر گرفتہ است　　ہر کس چو شمع زآتش غم در گرفتہ است
آں کو فلک بہ درگہ او سر نہادہ است　　افسر بہ فرق خود زمہ و خور نہادہ است
چرخش کنوں بخاک برابر نہادہ است　　طرح جفائے تازہ ستمگر نہادہ است
تا ایں خبر بکوچہ و برزن فتادہ است　　کار جہاں بنالہ وشیون فتادہ است
ایں سرورے کہ مثل نبودش کسے بدہر　　آئینہ دار طلعت او بودہ ماہ و مہر
ہم دانشش نصیب و ہم از داوریش بہر　　شاہے چنیں نگر کہ بہ یک جنبش سپہر
در تنگ نائے تیرہ مغاک آرمیدہ است　　خورشید زیر پردہ خاک آرمیدہ است
امروز فرد در ہمہ کشور جز او کہ بود　　پشت و پناہ شرع پیمبر جز او کہ بود
زیب و طراز مسند افسر جز او کہ بود　　باآسماں بجاہ برادر جز او کہ بود
اکنوں اگر کنارہ ازیں خاک داں گرفت　　آوازہ اش محیط زمیں و زماں گرفت
آں کس کہ بود دولت و دیں در پناہ او　　آں کس کہ آسماں نہ رسیدے بجاہ او
اکنوں کہ گشت خلد بریں جلوہ گاہ او　　رحم است بر ریاست و روز سیاہ او
مرگ کسے کہ ثانی و ہمتا نہ داشتست　　دردے کہ بود ہیچ مداوا نہ داشتست

آں داور جہاں کہ بہ دانش یگانہ بود ‏ ‏ ‏ ‏ پاکیزہ مشربے کہ بہ عالم فسانہ بود
فرزانہ مہترے کہ مثل در زمانہ بود ‏ ‏ ‏ ‏ تا بنگریم تیر اجل را نشانہ بود
خار است اینکہ بر ہمہ را در جگر نشست ‏ ‏ ‏ ‏ بار غم است اینکہ فلک را کمر شکست
در رفتنش اگر چہ جہانے بجاں بود ‏ ‏ ‏ ‏ اما ہر اُنچہ خواستۂ آسماں بود
باشد ہماں چہ سود بود چہ زیاں بود ‏ ‏ ‏ ‏ اکنوں دعاے شبلی دل خستہ آں بود
کورا بود بہ رحمت پروردگار جائے ‏ ‏ ‏ ‏ خود زیر سایہ حرم کردگار جائے

یہ مرثیہ حیات شبلی میں درج ہے، لیکن کلیات میں شامل نہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ شبلی کے مخصوص انداز سے اس کا رنگ ہلکا ہے۔(۲۷)

۲۔۱۸۸۴ء میں علامہ شبلی نعمانی نے حیراں وفراواں کے قافیہ اور چہ کنم کی ردیف میں علی حزیں کی غزل پر غزل لکھی۔ اس پر طلبہ نے طنز کیا۔ علامہ شبلی نے اس کی تفصیل مولوی محمد سمیع کے نام ایک خط میں لکھی ہے:

''چہ کنم کی ردیف کی غزل پر یہاں ایک لطیفہ ہوا۔ چند لڑکوں نے کہا کہ استاذ کی غزل پر غزل کہنے سے کیا حاصل:

ہمتائے فلک نہ ہوگا بادل

میں نے کہا:

دریا نہیں کار بند ساقی

غرض میری اور علی حزیں کی غزل خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز مصنف قیصر نامہ اور نیر دہلی کے پاس بغرض محاکمہ ارسال کی گئی۔ یہ وہی نیر ہیں جن کو غالب نے لکھا ہے:

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی

فارسی نہایت عمدہ کہتے ہیں اور غالب کے تلمیذ ارشد ہیں۔ دونوں نے تسلیم کیا کہ اہل زبان کا کلام ہے۔ نیر نے تو بہت تعریف لکھی اور لکھا کہ سلف کے کلام کے ہم پلہ ہے۔(۲۸)

مگر اس غزل کے محض دو شعر کلیات میں شامل ہیں۔(۲۹) حیات شبلی کی تصنیف کے زمانہ میں یہ مکمل غزل سید صاحب کے ہاتھ آئی۔(۳۰) انہوں نے لکھا ہے کہ آئندہ کسی اور موقع پر نقل کی جائے گی۔مگر اسے وہ حیات شبلی میں کہیں درج نہ کر سکے اور کلیات میں اب بھی یہ غزل نامکمل ہی ہے۔

۳۔۱۸۸۶ء میں وزیر الدولہ خلیفہ سید محمد حسن وزیر ریاست پٹیالہ، علی گڑھ تشریف لائے۔اس موقع پر علامہ شبلی نے سید محمود کی فرمائش پر فارسی کے چند بند پڑھے۔اس وقت کا سماں علامہ شبلی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''جلسہ دعوت میں سید محمود کی فرمائش سے میں نے چند بند فارسی میں لکھے اور کھانے کے بعد پڑھے۔عجیب سماں بندھ گیا تھا۔تمام حضار مجلس حقیقت میں بیتاب ہو گئے۔سید محمود اٹھ اٹھ کر ہر بند کو کئی کئی بار پڑھواتے۔وزیر صاحب نے بڑھ کر کہا کہ افسوس ہے کہ ان شعروں میں آپ نے میرا ذکر کیا ہے ورنہ میں اس کی پوری داد دیتا۔(۳۱)

اس کا پہلا بند یہ ہے:

اے دل ایں مایہ انتظار کہ بود　　　آخر ایں مستی از خمار کہ بود
چشم شوقت بہ رہ گذار کہ بود　　　ہوس سرمہ غبار کہ بود
ایں بہ بیں خانہ جلوہ گاہ کہ ہست
پردہ دیدہ فرش راہ کہ ہست

یہ بھی کلیات میں شامل نہیں اور اب کہیں دستیاب بھی نہیں۔

۴۔اسی طرح اقبال الدولہ، وقار الامرا، مدار المہام حیدر آباد دکن کی آمد پر شبلی نے ایک بڑا پرزور قصیدہ لکھا، جس میں ''مسلمانوں کے ادبار، علی گڑھ تحریک اور کالج کی خصوصیات'' کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا۔'':

در جہاں چوں سخن از شوکت واز شاں گذرد　　　نام دستور دکن بر سر عنواں گذرد
صدر جم مرتبہ نواب وقار الامراء　　　آں کہ گردوں بدرش بندۂ فرماں گذرد

اے خوشا بخت کہ آں داور جمشید حشم | بسر مدرسہ با ایں سر و ساماں گذرد
ایں دبستاں بہ مثل تازہ گلستانے ہست | خواجہ ابریست کہ بر طرف گلستاں گذرد
گذر افتادہ ہما کوکبہ جاہش را | تشنہ بنگر کہ برو چشمۂ حیواں گذرد
ابر دیدی کہ گہر ریز رود بر سر خاک | موکب خواجہ بہ ما نیز بدینساں گذرد
بہ مثل واقعۂ مور و سلیماں باشد | گر حدیث از شرف و پایہ مہماں گذرد
داد را مدح تو اندازہ ما نیست ولے | خوش بود گر سخن از عالم احساں گذرد
یادگار کرم دولت آصف جاہی است | بہ نظر ہر چہ دریں منزل و ایواں گذرد
میوزیم کو شرف نسبت نامش دارد | جائے آنست کہ از طارم کیواں گذرد
خاص و عامی ہمہ از فیض کفش سیراب اند | ابرہم بر چمن و ہم بہ بیاباں گذرد
صاحبا! گوش بہ من دار کہ تا شرح دہم | آں چہ بر ماز سیہ کاری دوراں گذرد
بود روزے کہ گراں پایگی رتبۂ ما | بیش ازاں بود کہ در وہم سخن داں گذرد
حالیا کار بآں بے سر و پائی بہ کشید | کہ بہ ما ہر کہ رسد برزدہ داماں گذرد
بگذرد از غم و آزار پیاپے بر ما | انچہ بر شیشہ ز اوفتادن سنداں گذرد
ہر چہ از بے کسی و ذلت و خواری بینی | خود عیان است و مپرس آں کہ بہ پنہاں گذرد
گر نہ ایں مکتب و ایں مدرسہ بر پا می گشت | بیم آں بود کہ ایں درد ز درماں گذرد
ایں مسیحا نہ اگر بہر مداوا می خواست | بیم آں بود کہ رنجور خود از جاں گذرد
بہ رسد بر در او ہر کہ بود طالب فن | آنکہ گوہر طلبد جانب عماں گذرد
گر بدیں گونہ بود گرمی ہنگامہ او | خود ز غرناطہ و بغداد و صفاہاں گذرد
ہر دم ایں مدرسہ لاریب گرمی گردد | اند کے باش کہ ایں قطرہ گہر می گردد
تا خود از دانش و فن نام و نشاں خواہد بود | جوئے ایں فیض بدیں گونہ رواں خواہد بود
تا ابد طالب فن روے بدو خواہد کرد | تا ابد قبلہ دانش طلباں خواہد بود
گر بدیں گو نہ بود مائدہ فیض دراز | یک جہاں زلّہ ربائے سر خواں خواہد بود
دوست افسانہ شادی بزباں خواہد راند | خصم را دیدہ حیرت نگراں خواہد بود

ہست چوں در کف قیصر و دارائے دکن	ایمن از فتنہ و آسیب زماں خواہد بود
ملک و ملت ہدف تیر حوادث بودہ است	آستانش حرم امن و اماں خواہد بود
آرزو ہاست در اندیشہ وا ز فضل خدائے	انچہ اندیشہ نمودیم ھماں خواہد بود
گر بہ آئین سلف بہرہ ربائیم ز علم	رخش اقبال دگر در تہ راں خواہد بود
باز در راہ طلب گرم بخیزیم ز جائے	خواب دو شینۂ ما چند گراں خواہد بود
می تواں غلغلہ اوج و ترقی انگیخت	تا کجے بر لب ما آہ و فغاں خواہد بود
بود آں ہم کہ بہ ما نیز گہے یار شود	چرخ تا چند بکام دگراں خواہد بود
ہاں بسنجی کہ نژاد عرب و آل لوے	ایں چنیں خستہ و رسوائے جہاں خواہد بود
آں چمن زار کہ پروردہ ابر کرم است	ہاں مندیش کہ تاراج خزاں خواہد بود
بس بود ایں کہ نہ داریم سر تاج و کلاہ	بخت زیں پیش چہ در فکر زماں خواہد بود
با ہمہ خستگی آں فطرت آبا باقی است	خاک گشتیم و ہنوز آں سر و سودا باقی است

مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ پورا قصیدہ حیات شبلی کے ایک حاشیہ میں درج کیا ہے۔ (۳۲) لیکن یہ بھی کلیات میں نہیں ہے۔

۵۔ ۱۸۸۸ء میں ایم اے او کالج کے پرنسپل مسٹر بک کے والد علی گڈھ آئے۔ ان کے ڈنر پر علامہ شبلی نے ایک قصیدہ پیش کیا۔ محمد امین زبیری نے یہ پورا قصیدہ ذکر شبلی (۳۳) میں درج کیا ہے۔

چنیں باشد چو دولت یار و طالع ساز گار آید	کہ جوزف بک بہ مہمانی کالج زاں دیار آید
بہ ہر سو جلوۂ رنگ مسرت را تماشا کن	کہ جوزف بک بسیر ہند باخویش و تبار آید
زمیں از عکس رنگِ موکبش در جلوہ پیرائی	چناں باشد کہ در صحرا بہارِ لالہ زار آید
زہے مجموعۂ اخلاقِ حسن صورت و سیرت	کہ رنگیں از نگارش در نظر گل در بہار آید
تنم بر خویش می بالد دلم برخود ہمی جوشد	کہ ہم چو صاحبے ممدوح را برما گزار آید
ز یُمنِ مقدمش ترتیب دارم بزمِ تو امشب	عروس آسا کہ در پیرایش نقش و نگار آید

خوشا ترتیب بزم آرائی ایں جلسۂ رنگیں　　　که حسنِ اتحادِ ہم دگر بر روے کار آید
بہ یک سومیز باں را میہماں در پہلوئے الفت　　　بہ یک سو میہماں را میزباں اندر کنار آید
تو گوئی خانۂ امشب صحنِ اشجار مسرت شد　　　که پیدا از در و دیوار شاخِ برگ و بار آید
زفر مقدمش گیرد بنائے کالج اعزازے　　　که قصرِ اعتبار قومِ مازیں استوار آید
کنوں مر افسرانِ کالج و اسکول را حاصل　　　ز تشریفِ قدومش صد وقار اندر وقار آید
مسلسل رشتۂ نظمم با مواجِ گہر مانند　　　که ہر بیتم ز وصفِ سلکِ دُرِّ شاہوار آید
سخن دل چسپ رنگیں تر و لیکن مختصر گفتم　　　که خوبی در سخن حاصل ز لطفِ اختصار آید
ترا اقبال و جاہ وحشمت از ہر سو فرا گیرد　　　گہے اندر یمیں باشد گہے اندر یسار آید

ہمیشہ دشمنانت را بہ ساغر زہرِ ناکامی
ترا دائم می نابِ مسرت خوش گوار آید

کلیات اس سے بھی خالی ہے۔

۶۔اسی سال وزیر اعظم حیدر آباد دکن علی گڈھ آئے تو شبلی نے سر سید کی فرمائش پر رودکی کے قصیدہ پر قصیدہ لکھ کر پڑھا، جو کلیات میں شامل نہیں۔ سید صاحب نے اس قصیدہ کے تین شعر حیات شبلی میں نقل کئے ہیں:

ہم چناں باشیم گرم گفتگو　　　قاصد از در ناگہاں آید ہمی
افگند شور مبارک باد و بس　　　ایں حدیثش بر زباں آید ہمی
آسماں جاہ از سوئے ملک دکن　　　جانب ہندوستاں آید ہمی (۳۴)

۷۔شبلی کے چھوٹے بھائی مہدی تکمیل تعلیم کے بعد واپس آئے تو اعظم گڈھ میں ایک جلسہ ہوا۔ شبلی نے اس موقع پر ایک نظم کہی، جس کے دو شعر یہ ہیں:

خار در دیدہ عدو شکنی　　　حاسداں را جگر گداز آئی
مابہ نادیدہ در رہت باشیم　　　که تو ناگہ زدر فراز آئی (۳۵)

۸۔۱۸۹۶ء میں ریاست حیدر آباد سے علامہ شبلی کو وظیفہ ملا۔ اس خوشی میں تقریب

ہوئی۔مولوی عزیز مرزا نے سپاس نامہ پیش کیا۔علامہ شبلی نے اس کے جواب میں ایک ترکیب بند پڑھا۔مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ''یہ ترکیب بند ہمارے پاس پورا نہ تھا اور کلیات میں شامل نہ ہوسکا۔''(۳۶) حالانکہ ۱۹۲۵ء میں مولوی نصیرالدین ہاشمی صاحب نے حیدرآباد سے اسے مولانا سید سلیمان ندوی کے پاس بھیج دیا تھا اور سید صاحب نے اسے ماہنامہ معارف [اکتوبر۱۹۲۵ء ص ۳۰۷-۳۱۰] میں شایع بھی کردیا تھا۔البتہ حیات شبلی میں نقل ہوا ہے۔(۳۷)

اے دکن ایکہ جہاں را سروسودا باتست ۔۔۔ اے کہ مجموعۂ صدیاس وتمنا باتُست
اے کہ صد نقش زہر پردہ بر انگیختہء ۔۔۔ اے کہ صد جلوہ گری ہائے تماشا باتست
زاہد استی کہ سرِ صدق و صفا ہست ترا ۔۔۔ شاہد استی کہ دلآویز ادایا باتست
ساز نیرنگی و صد نغمۂ رنگیں داری ۔۔۔ لوحِ ار ژنگی و صد پیکرِ زیبا باتست
یادگارِ حشم دیلم و سلجوق استی ۔۔۔ مایۂ دولتِ بغداد و بخارا باتست
داستاں ہائے عزیزاں ہمہ از بر داری ۔۔۔ خبر از قافلۂ یثرب و بطحا باتست
آں پراگندہ نژادِ عرب ونسلِ عجم ۔۔۔ یعنی آں دفتر اسلام مجزّا با تست
گرچہ شیرازۂ امت ہمہ ابتر شدہ است ۔۔۔ آں ورق ہائے پراگندہ بیک جا باتست
گرچہ زاں میکدہ اکنوں اثرے نیست بہ جائے ۔۔۔ جرعۂ چند ازاں شیشہ و مینا با تست
گرچہ آں تازہ چمن رفت بتاراجِ خزاں ۔۔۔ باز ہم بوئے خوشے زاں گلِ رعنا باتست

گرمیِ صحبتِ آں میکدہ سر جوشِ تو ہست
مصر و غرناطہ و بغداد در آغوشِ تو ہست

اے بزرگانِ گراں پایہ و ارکانِ دکن ۔۔۔ اے ہمہ شمع فروزندۂ ایوانِ دکن
ہرسرے موئے من امروز زبانے شدہ است ۔۔۔ بہ سپاس آوری منتِ اعیانِ دکن
پائے تا سر ہمہ در بند کرم ہائے شماست ۔۔۔ می تواں خواندنم از جملہ اسیرانِ دکن
با غریبے چومنے ایں ہمہ الطاف وکرم ۔۔۔ چہ کنم! گر نہ شوم بندۂ احسانِ دکن
ہم زگیرائی اخلاقِ دل آویز بود ۔۔۔ کہ بود رومی و شامی ہمہ مہمانِ دکن
بوئے خُلق است کہ دل می بردم ورنہ مرا ۔۔۔ نتواند کہ فریبد گل و ریحان دکن

یارب آں باد کہ ایں تخت گہِ دولت ودیں — سبز و خرم بود از فیض سلیمانِ دکن
میر محبوب علی خان نظام آصف جاہ — تاجدارِ دکن و قیصر و خاقانِ دکن
صدر جم مرتبہً نواب وقار الامرا — آنکہ صد پایہ فزود از شرفش شان دکن
واں دگر صدر نشینان و عزیزانِ وطن — کہ بود از دمِ شاں زینتِ ایوان دکن

ہمہ را بزمِ طرب با سرو ساماں باشد
شبلی خستہ ہم از حاشیہ بوساں باشد

۹۔ اسی سال ایک اور قصیدہ کہا جس کا ایک مصرعہ یہ ہے:

زیں سپس ندوہ وتدریس علوم عرب است

اس کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ یہ کالج کے احاطہ میں قابل اعتراض ٹھہرا اور مولوی سید علی بلگرامی کے مشورہ سے ضائع کر دیا گیا۔ (۳۸)

۱۰۔ علامہ شبلی نے بعض تاریخی مادے بھی نکالے ہیں، جو مکاتیب میں موجود ہیں۔ راجندر جو غالباً گھر کا ملازم تھا اس نے انتقال کیا تو علامہ کے منجھلے بھائی مہدی حسن بیرسٹر ایٹ لا کی خواہش پر درج ذیل تاریخ وفات کہی:

[ا]

چو را جندر پرشاد در خاک خفت — کہ غافل ز پیچ و خم مرگ بود
مرا بود سرمایہ زندگی — وفا بامنش تا دم مرگ بود
جہانے ز مرگش غمیں شد بہ بیں — کہ ہم سال مرگش غم مرگ بود (۳۹)

۱۳۰۰ھ

[۲]

آں گراں پایہ یار من راجندر — از جہان رفت و زیر خاک نہفت
خویشتن از میاں رمید و مرا — خان و ماں شکیب پاک برفت
چارہ چوں نیست جز شکیبائی — خود چہ آید کنوں زگفت و شنفت
از سر وصل او تواں بگذشت — گرچہ ایں حرف خود نیارم گفت

وانگہے سال مرگ او گفتم کافتابی بہ زیر خاک نہفت (۴۰)

۱۸۸۳ء ۱۸۸۹ء

۱۱۔علامہ شبلی کے خانوادے کے ایک فرد فرحت احمد تھے۔ان کے بھتیجے کی پیدائش پر تاریخ کی فرمائش کی گئی تو درج ذیل تاریخ نکالی:

[ا]

مرحبا مرحبا لمولود کہ بود بادہ ایاغ کمال
باز در پیش گاہ بزم وجود گشت روشن ازو چراغ کمال
مردم دیدہ ہنر فرحت کہ تواں یافت زو سراغ کمال
سال تاریخ را چو امر نمود گفت شبلی بہار باغ کمال (۴۱)

۱۳۲۰ھ

۱۲۔عطیہ بیگم یورپ گئیں تو ان کو وداعی نظم ''خدا حافظ'' بھیجی جو خطوط شبلی میں مکمل موجود ہے اور کلیات میں شامل نہیں۔

اے کہ دل بر سفر نہادستی زود ازیں منزل دراز آئی
ہم بصد جاہ و احتشام روی ہم بصد گونہ عز و ناز آئی
می روی گرچہ با سرو ساماں بیش ازیں ہم بہ برگ و ساز آئی
بروی سوے پیرس و لندن و زرہِ کعبہ و حجاز آئی
رسم و آئینِ شرع نہ گذاری رہ رو جادۂ نیاز آئی
نکتہ پیراے علم و فن باشی تا بہر پایہ سرفراز آئی
دوستاں دیدہ بر رہت باشندہ کہ تو ناگہ زدر فراز آئی
بہ سفر رفتنت مبارک باد بہ سلامت روی و باز آئی
و زپس آمدن بہ اعظم گڑھ
از رہ لطف یکہ تاز آئی
اے کہ دل بر سفر نہاد دستی زود ازیں منزل دراز آئی

ہم بصد جاہ و احتشام روی   ہم بصد گو نہ عز و ناز آئی (۴۲)

۱۳۔عطیہ فیضی کے نام دو اور قطعے بہ شکل غزل خطوطِ شبلی میں ہیں:

[۱]

نسیم صبح بیاؤ بہ مردمی پیش آئے   پیام بندہ بہ آں خاک آستاں برساں

وفورِ شوق شکیبانہ می تو اند شد   روا مدار د رنگ و ہمیں زباں برساں

متاع جان دہم ارپاے مزد می خواہی   وگر نہ لطف بفرمائے و رایگاں برساں

حدیث شوق نہ چنداں کہ درمیاں گنجد   ہر انچہ می بتوانی ازاں میاں برساں

تصرفے مکن از پیش خود درو چیزے   چنانکہ با تو بگویم تو ہم چناں برساں

بہ آستانۂ او سرنہ وز روے ادب   درود گوئی و دعایم زماں زماں برساں

بگو زمن کہ بہ اعظم گڑھ آمدن گفتی   بیاؤ مرتبۂ من بہ آسماں برساں

سلام شوق و دعائے بقائے دولت و جاہ   بہ نازلی و بہ زہرا یگاں یگاں برساں

[۲]

شوق تو از کجا بہ کجا می برد مرا   نزدیک شد کہ گردِ رہ کارواں شوم

تا بمبئی رسیدہ ام و زود تربود   کز بمبئی بہ سوئے جزیرہ رواں شوم

یہ دونوں قطعات کلیات میں شامل نہیں۔(۴۳)

۱۴۔ان کے علاوہ عطیہ فیضی کی بہن زہرا بیگم کے نام کے خطوط میں بھی کئی قطعات اورغزلیں ہیں جو کلیات میں جگہ نہ پاسکیں۔مثلاً

[۱]

دی یکے گفت کہ در ریختہ انشائے سخن   شیوۂ ہست کہ مخصوص زباں داں باشد

گفتم البتہ چنین است کہ گفتی ، اما   نیست چیزے کہ بروں از حد امکاں باشد

مرد دانا بتواند کہ بہ تحصیل و بہ سعی   باعرب حرف زند گرچہ زایراں باشد

مادریں حرف کہ پیکے برسانید بہ من   نامہ را کہ گراں قدر تراز جاں باشد

نامہ وا کردہ بہ دستش بسپردم کہ بہ من — ایں چنیں حرف بہ اردو زدن آسان باشد
نامہ را خواند و بفرمود کہ شک نیست دریں — کایں چنیں حرف زدن کار زباں داں باشد
کہ بود صاحب ایں نامہ و اصلش ز کجا است — اعتبارِ گہراز فرخِی کاں باشد
گفتمش ریختۂ خامۂ زہرا است ایں — کز دکن ہست و مرا ہمچو عزیزاں باشد
یارب آں دست و قلم در کنفِ حفظ تو باد — تا جہاں باشد و تا گنبد گرداں باشد

[۲]

بود بست و ششم و سیزدہ صد از ہجرت — کہ بزو نقش دگر بختِ ستم گارۂ ما
مہرباں مادرِ ما ، سایہ زما باز گرفت — آں ہمایوں نفس ، آں مونس و غم خوارۂ ما
آنکہ بازیگہ ما بود کنار و دوستش — آنکہ کرد از رگ جاں رشتۂ گہوارۂ ما
آہ از ان مہر و محبت کہ بدش می نامد — گر کسے گفت فلاں ہست پرستارۂ ما
خانۂ دولت ما تیرہ تر از شب گشتہ است — تا برفت آن ششمِ سبعۂ سیارۂ ما
مادرا تا بچہ حالی کہ نداری خبرے — زانچہ بگذشت بہ ما و دل صد پارۂ ما
خود ہماں غازۂ رنگیں کہ بہ رویم بستی — حالیا گرد یتیمے ست بہ رخسارۂ ما
اختر و مہر و مہ و چرخ ہمہ درکار ند — لیک کس مے نتواند کہ کند چارۂ ما
دہر ، ہر چند کہ آراستہ بزمی است و لے — بے تو با ہیچ نسازد دل آوارۂ ما
تا نہ بینی کہ فراق تو چہا کرد بہ ما — گاہے از خلد بروں آے بہ نظارۂ ما
بہر ما مرگ پدر ، مرگ نخستیں بودہ است — چوں روا داشتی ؟ ایں مرگ دگر بارۂ ما
شبلی ایں مرثیہ گفتم ز زبانِ زہرا — آنکہ صد لطف میاں داشتہ دربارۂ ما

[۳]

مشغول کار مدرسہ بودم کہ ناگہاں — دیدم کہ نامہ ہا ز پئے ہم رسیدہ است
زاں جملہ ہست نامۂ بے نقش و بے سواد — کز بارگاہ حضرت بیگم رسیدہ است
از جاے جستم و بگرفتم بدست شوق — گویا کہ خستہ ایست بہ مرہم رسیدہ است
بر سر نہادم و بہ ادب بوسہ دادمش — مانند تشنہ کہ بہ زمزم رسیدہ است

مہر از سرش گرفتم و ازجا در آمدم چوں دیدم ایں کہ کاغذ زرہم رسیدہ است

[۴]

نازم کہ ایں عطیہ و فیض امیرہ ایست کآوازہ سخاش بہ عالم رسیدہ است
ہر جا کہ نام او برسید ست در جہاں ہم فیض او رسیدہ وتوام رسیدہ است
آن بانوے خجستہ کہ از فرخ اختری نامش بہ اوج بر شدہ طارم رسیدہ است
آئینہ را اگر شرفِ دست بوس او ست ایں فیض ہم بہ خامہ و خاتم رسیدہ است
یارب بہ ظل رحمت خویشش نگاہ دار کزا بردست او بہ ہمہ نم رسیدہ است

۵-شبلی کا جو کلام ان کی زندگی میں شائع ہوا وہ دراصل ایک انتخاب تھا۔

۶-شبلی کا بہت سا فارسی کلام بوقت اشاعت دستیاب نہ ہوسکا۔متعدد مکاتیب سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

۷-غازی پور کے بعد علی گڈھ کے زمانہ قیام ۱۸۸۷ء میں ان کی بیاض کا ایک حصہ دوبارہ چوری ہوگیا۔(۴۴)

بہرحال ان تمام اسباب کے جو نتائج سامنے آتے ہیں وہ یہ کہ کلیات شبلی دراصل ناقص اور انتخاب کلام شبلی ہے۔مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

''مولانا نے قصداً اپنے کلام کا انتخاب بڑی بے دردی سے کیا اور صرف وہی نظمیں اور غزلوں کے وہی شعر لئے جو ان کے انتخاب میں آئے، جیسا کہ دیوان کے حصہ تشبیب وغزل کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے۔یہاں تک کہ چہ کنم والی غزل کے بھی دو ہی ایک شعر لئے،خود انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ان کی چھپی ہوئی نظمیں اس میں جگہ نہ پاسکیں۔''(۴۵)

موجودہ کلیات شبلی اور شبلی کی زندگی میں شائع ہونے والے مجموعہ ہائے کلام کے موازنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بعض اضافے کئے گئے ہیں۔خاص طور سے برگ گل کی شمولیت جسے مولانا حاجی معین الدین قدوائی ندوی نے جمع کیا تھا،مولانا سید سلیمان ندوی نے جوں کا توں شامل کردیا ہے۔چونکہ خود انھوں نے اس کی کوئی وضاحت نہیں کی،اس لئے یہ معلوم

نہیں ہوسکا کہ کن وجوہ سے شبلی کا دیگر کلام شامل کلیات نہ ہوسکا۔اس لئے کہ کلیات کی اشاعت میں مکمل اور پورا کلام شامل اشاعت کیا جاتا ہے۔

کلیات شبلی کے اختصار کے ان اسباب اور نتائج کا ماحصل یہ ہے کہ ان کے فارسی کلیات کی ترتیب وتدوین کی ضرورت پورے طور پر باقی ہے۔یقیناً اس سے ان کی فارسی شاعری کے تمام جلوے نگاہوں میں آجائیں گے۔

علامہ شبلی کے فارسی کلام کے جانبدارانہ مطالعے،متعصّبانہ رویےاور ترتیب وتدوین کی خامیوں کی وجہ سے شبلی کو ان کی فارسی شاعری کی صحیح داد نہ مل سکی۔ایسا کیوں ہوا؟اس کے اسباب پر جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔یہاں ان کے خیالات انہیں کے الفاظ میں پیش کئے جاتے ہیں:

ا۔شبلی کے ساتھ ایک بڑی زیادتی یہ بھی ہوئی کہ ان کی شاعری،خاص کر فارسی شاعری کو نظر انداز کیا گیا۔خود دارالمصنّفین نے ایک مدت تک شبلی کے کلیات کلام فارسی کو بازار میں آنے سے روکے رکھا،اور جب اسے شائع بھی کیا تو تدوین،تصحیح اور ترتیب کے نہایت ابتدائی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر شائع کیا۔شبلی کے زمانے میں ان کے فارسی کلام کی بہت قدر تھی۔حالی نے لکھا کہ ''دستۂ گل'' کو پڑھ کر مجھے اپنا فارسی کلام ہیچ معلوم ہونے لگا۔بہت سے اہل نظر کا خیال تھا کہ شبلی کا کلام شیخ علی حزیں کے کلام سے بلند تر ہے۔اس بات کو بھی سب مانتے تھے کہ اہل ایران کے محاورے اور مذاق سخن کی پابندی اور ایرانی طرز کی غزل گوئی پر قدرت کے اعتبار سے شبلی کے برابر ان کے زمانے میں کوئی بھی نہ تھا۔اور شبلی کے فارسی کلام میں روانی تو ایسی ہے کہ قدم قدم پر حافظ کی یاد دلاتی ہے۔لیکن بعد کے زمانوں میں شبلی کا فارسی کلام کمیاب کا کمیاب ہی رہا۔اور ہماری یونیورسٹیوں میں شاید ہی کوئی شعبۂ فارسی ایسا ہو جہاں شبلی کا کلام پڑھایا جاتا ہو یا ان پر کوئی تحقیقی مقالہ لکھا گیا ہو۔

[سہ ماہی اردو ادب دہلی،اپریل تا جون ۲۰۱۱ء ص ۵۷]

۲۔شبلی کے فارسی کلام کونظرانداز کیے جانے کی کئی وجہیں ہیں۔سب سے بڑی وجہ توشبلی کے فارسی کلام پر شیخ اکرام اوران کی طرح کے بعض اورصاحبان کی خیال آرائیاں ہیں۔ان خیال آرائیوں کا ماحصل یہ ہے کہ شبلی کی غزل (جوان کی فارسی شاعری کا بہترین سرمایہ ہے) صرف عطیہ فیضی کے صحبتوں اور ممبئی کی رنگین فضاؤں کی مرہون منت ہےاورشبلی کےان جذبات کا رندانہ اورسرشارانہ اظہار ہے جوعطیہ فیضی کے لیے شبلی کے دل میں تھے۔ان باتوں میں مبالغہ اتنا کیا گیا کہ پڑھنے والےخواہ مخواہ اس گمان میں گرفتار ہوگئے کہ شبلی کی غزلوں میں عطیہ فیضی کومحور بنا کر رندی اور عشق بازی کا کارخانہ کھولا گیا ہے، مثلاً شیخ صاحب نے لکھا کہ جب عطیہ یورپ سے واپس آئیں توشبلی نے''ایسا خیر مقدم لکھا جو بادشاہوں کوبھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔''اس''خیر مقدمی غزل'' کا مطلع تھا:

پیک فرخندہ قدم مژدہ سرا می آید
کز سفر یار سفر کردۂ ما می آید

یہ غزل کم وبیش مسلسل ہے[کم وبیش مسلسل میں نے اس لیے کہا کہ اس کے کم سے کم دوشعروں کا مضمون واجبی عاشقانہ ہے،کسی کے خیر مقدم کی بات نہیں ہے۔]اوراس میں ایک ولولہ اورروانی اور جوش ضرور ہے جوشبلی کی غزل گوئی کا خاصہ ہے۔لیکن اگر ایسا خیر مقدم بادشاہوں کوبھی نہ میسر آسکا ہےتو شیخ اکرام صاحب جن بادشاہوں کی بات کررہے ہیں وہ ان کے قصبے کے زمینداروں سے زیادہ اوقات نہ رکھتے ہوں گے۔بہرحال،اس بات کا کوئی ثبوت نہ ملا[اور تھا نہیں تو کہاں سے ملتا] کہ یہ غزل عطیہ کو پیش کی گئی تھی،تواکرام صاحب نے ایک اور قیاس اس طرح پیش کیا گویا وہ بالکل حقیقت ہو۔انہوں نے لکھا''شاید یہ خیر مقدم ضرورت سے زیادہ شوخ سمجھا گیا اور مولانا کی مصلحت پسند طبیعت نے گوارانہ کیا کہ اسے عطیہ تک پہونچائیں۔اس لیے خیر مقدم کا ایک اور قطعہ لکھا گیا۔''اب ذرالطف دیکھیے۔اس غزل کواکرام صاحب نے'ضرورت سے

زیادہ شوخ' قرار دیا ہے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ سارے اشعار بہت سنبھلے ہوئے اور وضاحت سے قطعاً عاری ہیں۔ ان میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے یہ گمان بھی گزر سکے کہ یہ عطیہ فیضی، یا کسی اور کے کہیں سے آنے کی خوشی میں لکھے گئے ہیں۔ شبلی کے چھوٹے سے دیوان فارسی میں ایسے ایسے شوخ شعر موجود ہیں کہ ان کے سامنے یہ غزل آمد نامہ کی طرح بے ضرر معلوم ہوتی ہے۔

'مصلحت پسند طبیعت' کا فقرہ شیخ صاحب نے صرف اس لیے لکھ دیا ہے کہ انہیں اس بات کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا کہ یہ اشعار محترمہ فیضی کو پیش کرنے کے ارادے سے لکھے گئے تھے، لہٰذا انہوں نے شبلی کی 'مصلحت پسندی' کا بہانہ تراش لیا اور یہ بھول گئے کہ خود انہیں کے بیان کے مطابق شبلی کو عطیہ فیضی کے بارے میں اپنے والہانہ تصورات کو برملا کرنے میں کوئی باک نہ تھا۔ بقول شیخ اکرام: ''شبلی نے اپنا مفہوم واضح کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔''

آخری بات یہ کہ اس 'خیر مقدمی' قطعے کا کلیات شبلی میں کوئی وجود نہیں جو بقول شیخ اکرام، اس 'ضرورت سے زیادہ شوخ' غزل کی جگہ شبلی نے لکھا تھا۔ قطعے کا پہلا شعر انہوں نے یوں درج کیا ہے:

نسیم صبح بیا و بہ مردمی پیش آ
پیام بندہ بہ آں خاک آستاں برساں

'بوے گل' میں یہ شعر درحقیقت ایک غزل کا مطلع ہے اور حسب ذیل ہے:

نسیم صبح بیا راحتے بجاں برساں
پیام بندہ بہ آں خاک آستاں برساں

شیخ اکرام صاحب کے نقل کردہ شعر کے پہلے مصرعے کے بارے میں مجھے شک ہے کہ شبلی نے ایسا سست مصرع کہا ہو۔''

[سہ ماہی اردو ادب دہلی، اپریل تا جون ۲۰۱۱ء ص ۵۷-۵۹]

۳۔شبلی کونقصان اس وجہ سے بھی پہونچا کہ ان کی شاعری کوان کے سوانح حیات کا ایک حصہ قرار دے دیا گیا اور ایک مفروضہ قائم کیا گیا کہ شبلی کوعطیہ فیضی سے کوئی عشقیہ قسم کا لگاؤ تھا اور ان کی فارسی غزلیں اسی لگاؤ کے اظہار میں لکھی گئی ہیں۔سوانح کو شاعری سے مربوط کرنے کی بدعت انگریزی تعلیم کی بدولت ہمارے یہاں عام ہوئی اور شبلی خود بھی ایک حد تک اس کے مرتکب ہوئے تھے۔ اب ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا گیا۔ پھر شبلی نے ان غزلوں میں جگہ جگہ ممبئ کا ذکر کر کے 'سوانحی تنقید نگاری' کے مردان میدان کو اور بھی کھل کھیلنے کا موقع فراہم کر دیا۔ پوچھنے کی بات یہ تھی کہ اگر ہمیں شبلی اور عطیہ فیضی کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہوتا تو ہم ان کی فارسی غزلوں کو شاعری کی حیثیت سے کس رتبے کا حامل سمجھتے ؟ اگر عطیہ فیضی کی جھالر اور گوٹے کے بغیر یہ کلام اعلا درجے کی شاعری سمجھے جانے کے قابل ہے تو بے وجہ ایک غیر ضروری بات کو بحث میں داخل کر کے ادب اور نقد ادب دونوں کا کیوں خون کیا جائے؟''

[سہ ماہی اردو ادب دہلی، اپریل تا جون ۲۰۱۱ء ص ۶۱-۶۲]

غزلیات شبلی

کلیات شبلی فارسی کی اشاعت کے تقریباً ۶۵ رسال بعد ۱۹۹۵ء میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار [پ: ۴ر فروری ۱۹۳۴ء] نے علامہ شبلی کی فارسی غزلوں کا ایک مجموعہ''غزلیات شبلی'' کے نام سے شایع کیا۔ یہ دراصل خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ کی طرف سے سر سید صدی تقریبات کے موقع پر شایع کیا گیا ہے۔ ۱۰۶ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ اصلاً دستہ گل، بوئے گل، برگ گل اور دیوان شبلی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔اسے جناب اولاد احمد صدیقی کی خواہش پر شایع کیا گیا۔اس کا انتساب بھی انہی کے نام ہے۔اس کا مقدمہ شیخ محمد اکرام کی''یادگار شبلی'' کا وہ اقتباس ہے جو انہوں نے مذکورہ مجموعہ ہائے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔ ظاہر ہے ان کے نقطہ نظر سے فاضل مرتب کو پورے طور پر اتفاق ہے۔ان کا خیال ہے کہ اس سے بہتر اور کوئی کیا لکھے گا۔ان کا یہ بھی خیال ہے

کہ دیگر اصناف سخن میں شبلی نے جو جوہر دکھائے ہیں وہ محض دیوان کی ہیئت مکمل کرنے کے لئے ہے۔(۴۶) فاضل مرتب کا خیال درست نہیں ہے۔جس نے علامہ کے قصائد، مراثی اور ترکیب بند بالخصوص قصیدہ عیدیہ، کشمیریہ، بہاریہ، مرثیہ مولانا فیض الحسن سہارن پوری اور مرثیہ جنرل عظیم الدین خاں پڑھا ہوگا، وہ بیدار صاحب کے ان خیالات سے اتفاق نہیں کرے گا۔

عطیہ شبلی

اکبر علی خاں عرشی زادہ (۱۹۴۰ء-۱۹۹۷ء) ادیب، شاعر، نقاد اور علامہ شبلی کے شیدائی تھے۔ ۱۹۷۸ء میں ماہنامہ تحریک دہلی کے سلور جبلی نمبر کے لئے انہوں نے علامہ شبلی کے مجموعہ غزلیات دستۂ گل، بوئے گل اور برگ گل کی ۲۶ ر غزلوں اور عطیہ فیضی (یکم جنوری ۱۹۶۷ء) کے خیر مقدم کی اردو میں ترجمانی کی۔اس ترجمانی میں مترجم نے اصل متن کے بہت قریب رہنے کی کوشش کی ہے، حتی کہ الفاظ ہی نہیں بلکہ آدھے آدھے مصرعے جوں کے توں ترجمے میں موجود ہیں۔ یہ شبلی شناسی کے باب میں ایک اہم کوشش تھی بلکہ علامہ شبلی کے شاعرانہ جذبات کی تفہیم و ترسیل کا ایک نوکھا اور مثالی کارنامہ ہے۔ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے عرشی زادہ کو یہ لکھ کر داد دی کہ:

> ''شبلی کا ترجمہ آپ نے اسی کیفیت میں کیا ہے جو اصل کلام میں ہے۔آپ کی شخصیت میں وہی رومانیت موجود ہے جس کی وجہ سے شبلی بدنام ہو رہے۔خیر ان کو تو عالم ہونے کی لاج رکھنی تھی آپ تو اس رومانیت کو باقی رکھیں۔آپ کی تحریروں میں جان اسی کی وجہ سے ہے۔''(۴۷)

بطور نمونہ یہاں دو غزلیں اور ان کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

[ا]

شبلی۔ستمبر ۱۹۰۶ء	عرشی زادہ
چند بے ہودہ بہ بند غم دنیا باشم	کب تک آلودہ فکرِ غم دنیا رہیے
زیں سپس با قدح و بادہ و مینا باشم	آج سے مست قدح نوشی صہبا رہیے

جبہ سائے حرم کعبہ چو بودم یک چند
بر در بتکدہ ہم ناصیہ فرسا باشم

مدتوں طوفِ حرم کرتے رہے ہیں کچھ دیر
درِ بت خانہ پہ بھی ناصیہ فرسا رہیے

گرچہ رندی و ہوس شیوۂ دانا نہ بود
حاجتم نیست کہ فرزانہ و دانا باشم

گرچہ رندی و ہوس شیوۂ فرزانہ نہیں
کیا ضروری ہے کہ فرزانہ و دانا رہیے

بادہ ہر چند تہ خرقہ تواں نیز کشید
نرگس مست کسے خواست کہ رسوا باشم

بادہ ہر چند تہ خرقہ بھی پی سکتے تھے
چشم ساقی کا مگر حکم ہے رسوا رہیے

مست و بر عربدہ تنگش بکشم در آغوش
تشنۂ وصلم و تا کے بحابا باشم

کیسے مستانہ اسے تنگ در آغوش نہ لیں
تشنۂ وصل میں تا کے بحابا رہیے

باہمہ دعوی تمکیں نہ تواں خواست زمن
کہ تو از پردہ بدر آئی و برجا باشم

ہے یہ مشکل بہمہ دعوی تمکین و شکیب
کہ وہ بے پردہ ہو اور آپ بھی برجا رہیے

جلوہ او نگذارد کہ برم بہرہ زوصل
بد مد صبح و ہماں محو تماشا باشم

وصل سے بڑھ کے ہیں وہ جلوے جو دل کہتا ہے
لاکھ ہو جائے سحر محو تماشا رہیے

محتسب دست بداماں من و من سرمست
دست در دامن محبوب خود آرا باشم

محتسب دست بداماں ہو مگر خود سرمست
دست در دامنِ محبوب خود آرا رہیے

دامن عیش زدستم نہ رود تا شبلی

دامنِ بمبئی ہاتھوں میں ہے جب تک شبلی

دامن بمبئ از کفِ ندہم تا باشم　　دامن عیش نہ چھوٹے گا شکیبا رہیے

[۲]

شبلی۔ستمبر۱۹۰۶ء	عرشی زادہ
نثار بمبئ کن ہر متاع کہنہ و نو را	نثارِ بمبئ کیجئے متاع کہنہ و نو کو
طراز مسند جمشید و تاج فر خسرو را	طراز مسندِ جمشید و فر تاج خسرو کو
بہ ہر سو از ہجوم دلبران شوخ بے پروا	ہجوم دلبران شوخ بے پروا ہے وہ ہر سو
گذشتن از سر رہ مشکل افتا دست رہرورا	گزرنا راستوں سے ہوگیا دشوار رہرو کو
فغاں از گرمی ہنگامہ خوبان زر دشتی	غضب ہے گرمیِ ہنگامہ خوباں زردشتی
بہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت وضورا	کیا ہے زلف و عارض میں بہم کیا ظلمت وضوکو
بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت	پلا ساقی ، مے باقی کہ جنت میں نہ پائے گا
کنار آب چوپاٹی و گل گشت اپالو را	کنار آب چوپاٹی و گل گشت اپالو کو
بیا شبلی بہ یاد پنجہ گیرائے مژگانش	مناسب ہے یہی شبلی بیادِ پنجہ مژگاں
دگر رہ پارہ سازم ایں قبائے زہد صد تورا	کریں پھر پارہ پارہ ہم قبائے زہد صدتو کو

حوالے

(۱)　مرزا احسان احمد۔مقالات احسان ص۶۳۔اعظم گڈھ۱۹۶۸ء

(۲)　مولانا سید سلیمان ندوی۔حیات شبلی ص۲۲۳۔دارالمصنفین اعظم گڈھ۱۹۸۴ء

(۳)　محبوب الرحمٰن کلیم۔شبلی کی اردو شاعری، ماہنامہ معارف اعظم گڈھ دسمبر۱۹۱۸ء ص۳۱۴

(۴) کلیاتِ شبلی فارسی ص ۱۰۰۔ طبع جدید ۲۰۰۴ء
(۵) کلیاتِ شبلی فارسی ص ۱۰۰۔ طبع جدید ۲۰۰۴ء
(۶) حیاتِ شبلی ص ۲۲۳
(۷) کلیاتِ شبلی ص ا
(۸) کلیاتِ شبلی ص ۱۰
(۹) مولوی عبدالرزاق کان پوری۔ یادِ ایام بحوالہ شبلی معاصرین کی نظر میں۔ ص ۷۶)
(۱۰) مکاتیبِ شبلی ج ۲ ص ۲۰۷۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ ۱۹۷۱ء
(۱۱) مولانا ابوالکلام آزاد۔ کاروانِ خیال ص ۹۳۔ مدینہ پریس بجنور (س-ن)
(۱۲) مولوی عبدالرزاق کان پوری۔ یادِ ایام بحوالہ شبلی معاصرین کی نظر میں۔ ص ۷۶
(۱۳) کلیاتِ نثرِ حالی ج ۲ ص ۲۹۲-۲۹۳
(۱۴) یادگارِ شبلی ص ۲۳۰
(۱۵) مکاتیبِ شبلی ج ا ص ۱۶۸ اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء
(۱۶) محمد ابراہیم ڈار، مضامین ڈار ص ۲۴۰، بمبئی (ب ت)
(۱۷) مکاتیبِ شبلی حصہ اول ص ۲۵۱، طبع جدید ۲۰۱۰ء
(۱۸) ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی۔ شبلی ایک دبستاں ص ۱۸۰۔ مکتبہ عارفین ڈھاکہ
(۱۹) ادیب شبلی نمبر ص ۱۳۹
(۲۰) حیاتِ شبلی ص ۲۲۳
(۲۱) کلیاتِ نثرِ حالی ج ۲ ص ۲۹۲
(۲۲) ماہنامہ ادیب علی گڈھ۔ شبلی نمبر ص ۱۴۱-۱۴۸۔ ستمبر ۱۹۶۰ء
(۲۳) سہ ماہی فکر و نظر علی گڈھ۔ شبلی نمبر ص ۱۷۹۔ جون ۱۹۹۶ء
(۲۴) مکاتیبِ شبلی ج ا ص ۱۶۸۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ طبع دوم ۱۹۲۸ء
(۲۵) حیاتِ شبلی ص ۲۲۳
(۲۶) ایضاً ص ۱۵۳

(۲۷) ایضاً ص۱۵۴

(۲۸) مکاتیب شبلی ج ا ص۷۵-۷۶

(۲۹) کلیات شبلی فارسی ص۵۶

(۳۰) حیات شبلی ص۱۳۰

(۳۱) مکاتیب شبلی ج ا ص۸۳، طبع جدید ۲۰۱۰ء

(۳۲) حیات شبلی ص۱۵۵-۱۵۶

(۳۳) محمد امین زبیری۔ ذکر شبلی ص۶۸۔ لکھنؤ ۱۹۴۶ء

(۳۴) حیات شبلی ص۱۵۷

(۳۵) ایضاً ص۲۲۴

(۳۶) ایضاً ص۲۷۵

(۳۷) ایضا

(۳۸) ایضاً ص۳۶۷

(۳۹) مکاتیب شبلی ج ا ص۵۷

(۴۰) ایضاً ص۵۸

(۴۱) ایضاً ص۴۷

(۴۲) محمد امین زبیری، خطوط شبلی ص۳۷-۳۸۔ آگرہ

(۴۳) ایضاً ص۱۰۹-۱۱۰

(۴۴) حیات شبلی ص۲۲۳

(۴۵) ایضاً ص۲۲۵

(۴۶) غزلیات شبلی۔ حرف آغاز ص چار۔ خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ۔ ۱۹۹۵ء

(۴۷) ماہنامہ تحریک دہلی، سلوی جبلی نمبر ۱۹۷۸ء ص۵۹۸

رسائل شبلی

بابِ پنجم

اردو مجموعہ کلام

اردو مجموعہ کلام

علامہ شبلیؒ کی جامع کمال شخصیت جن اوصاف وکمالات سے عبارت ہے اس میں ان کی اردو شاعری بھی شامل ہے۔ گو وہ ان کے دوسرے عظیم الشان علمی، ادبی اور تاریخی کارناموں کی خیرہ کن چمک دمک میں دبی سی نظر آتی ہے، تاہم واقعہ یہ ہے کہ ان کی اردو شاعری کے ذکر کے بغیر ان کی شخصیت کا ایوان سجانا مشکل ہے۔

علامہ شبلی کو ابتدا ہی سے شعروشاعری سے بڑی دلچسپی تھی۔ علی گڑھ کے زمانہ قیام میں ان کی مثنوی، قصیدے اور قومی مسدس بہت مقبول ہوئے اور ایک عرصے تک محفلوں کو گرم اور روح کو تڑپاتے اور بیدار کرتے رہے۔ ان کی مذہبی، اخلاقی، تاریخی اور سیاسی نظموں نے ملک میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی، جنگ طرابلس، حادثہ مسجد کان پور، مسلم لیگ اور جنگ عظیم سے متعلق ان کی نظموں سے کون ہوگا جو تڑپا اور رویا نہ ہوگا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ''علی گڑھ کالج، ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے جلسوں میں وہ بڑی دھوم دھام سے اپنی نظمیں پڑھتے اور اپنے قصیدے سناتے تھے، سننے والے سر دھنتے، آنسو بہاتے اور قدر جاننے والے ان کی زبان کی فصاحت، معنی کی بلاغت اور طرز ادا کی خوبی کو مانتے تھے۔''(۱)

ستمبر ۱۹۱۳ء میں حکومت بنگال نے ایک اردو مجموعہ اشعار پر پابندی عائد کی۔ اس میں ایک نظم علامہ شبلی کی بھی تھی۔ (حیات شبلی ص ۴۸۸، طبع جدید ۲۰۰۸ء) علامہ شبلی نے اس مجموعہ اشعار کا نام نہیں لکھا ہے۔ سید صاحب اس وقت کلکتہ میں تھے، انہوں نے بھی اس کے نام کی وضاحت نہیں کی۔ علامہ شبلی نے کئی خطوط میں (بنام عبدالحکیم دسنوی خط نمبر ۴، بنام سید سلیمان ندوی خط نمبر ۶۷) نظم کی ضبطی اور انگریز افسروں کی ناراضگی کا ذکر کیا ہے۔ بہر حال اس واقعہ سے شبلی کی

نظموں کے اثرات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اس کے باوجود شبلی کو عرصے تک نقادان شعروادب نے لائق اعتناء خیال نہیں کیا اور شعراء کے تذکروں میں ان کا نام تک نہیں لیا گیا۔خود ان کے شاگرد مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی شعرالہند میں ان کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ شبلی کا ذوق شعر وشاعری ایک مسلمہ حقیقت ہے۔وہ ایک پختہ اور قادرالکلام شاعر تھے۔ڈاکٹر سلام سندیلوی نے صحیح لکھا ہے کہ ''تمام نثر نگاروں میں آزاداور حالی کا ذکر بحثیت شاعر کے بھی کیا جاتا ہے لیکن شبلی کو اس محفل میں جگہ نہیں دی جاتی ہے۔ یہ شبلی کے ساتھ بے انصافی ہے۔ جہاں تک شاعرانہ صلاحیت کا تعلق ہے شبلی، آزاد اور حالی سے کم نہیں۔اس لئے شبلی کو مؤرخ اور نقاد کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تسلیم کرنا ہمارا فرض ہے۔''(۲)

البتہ علامہ شبلی نے اپنے دوسرے مشاغل علمی کی وجہ سے اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی۔ نہ کسی سے اصلاح لی اور نہ کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔سید ظفر الملک علوی (ف: فروری ۱۹۴۶ء) نے انھیں عزیز لکھنوی (خواجہ عزیز الدین، ف: ۲۰رجولائی ۱۹۱۵ء) کا شاگرد لکھا تو انھوں نے اس کی تردید کی:

> ''آپ نے اپنے پرچے میں لکھا ہے کہ خواجہ عزیزالدین صاحب کا شاگرد ہوں، خواجہ صاحب میرے مخدوم ہیں لیکن میں ان کا شاگرد نہیں۔ میں نہ شاعر ہوں نہ میں نے کسی شاعر سے اصلاح لی ہے۔ یہ جو کبھی کبھی موزوں کر لیتا ہوں شاعری نہیں، تفریح طبع ہے۔(۳)

بعض اہل قلم نے یہ سوال قائم کیا ہے کہ آخر شبلی نے مدۃ العمر شعر وشاعری سے شغف رکھنے کے باوجود اپنی شاعری کو تفریح طبع سے زیادہ اہمیت کیوں نہیں دی۔اس سلسلے میں امام شافعی کا یہ شعر شبلی کے نقطۂ نظر کا صحیح ترجمان ہے:

> وَلولا الشِّعرُ بِالعُلَمَاءِ یَذرِیٔ ☆ لَکُنتُ الیَومَ اَشعَر مِنْ لبیدٍ
>
> یعنی اگر شعر گوئی علماء کی شان کے منافی نہ ہوتی تو میں لبید بن ربیعہ سے بڑا شاعر ہوتا۔

شبلی کے ایک خط سے ان کے اس موقف کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ وہ زہرا فیضی

کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

ندوہ کی جھنجھٹ اور شاعری ساتھ ساتھ چلنے کی چیزیں نہیں ہیں، لیکن بہر حال چارہ بھی نہیں ہے۔ ندوہ فرض مذہبی اور شاعری فرض طبعی، کس کو چھوڑوں۔؟ پھر انھیں پر موقوف نہیں یک دل وصد ہزار سودا۔(۴)

یک دل وصد ہزار سودا ایک طرف، فرائض مذہبی پر وہ فرض طبعی کو کبھی فوقیت نہ دے سکے۔ ورنہ بقول عبدالقادر سروری (ف: ۱۱/ مارچ ۱۹۷۱ء)

اگر شبلی اپنی تمام قابلیتوں کے ساتھ اردو شاعری اور صرف شاعری کے لئے وقف ہو جاتے تو وہ حالی سے بہت آگے نکل جاتے۔ ان میں ایک شاعر کی تمام قابلیتیں قدرت کی طرف سے ودیعت تھیں۔ اگر یہ دوسرے فردوسی نہیں تو پہلے اقبال ضرور ثابت ہوتے۔(۵)

شبلی دوسرے فردوسی تو نہ بن سکے لیکن علامہ اقبال (ف: ۲۱/ اپریل ۱۹۳۸ء) کے پیش روضرور قرار پائے۔ اقبال کی شاعری بالخصوص مذہبی، اخلاقی اور بعض سیاسی نظمیں اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں، جس پر شبلی کا اثر اور تتبع صاف محسوس ہوتا ہے۔ اور نہ صرف علامہ اقبال بلکہ بعد کے متعدد شعرا مثلاً ظفر علی خاں اور ان کے بعد ماہر القادری اور حفیظ جالندھری وغیرہ کی شاعری پر اثرات شبلی صاف محسوس ہوتے ہیں۔ اس سے شبلی کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

شبلی کو شعر وادب کا ذوق بچپن ہی سے تھا، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کا مذاق شعری فطری اور خداداد تھا تو غلط نہ ہوگا۔ ان کے استاذ مولوی عبداللہ جیراج پوری (ف: ۱۸۹۰ء) کا بیان ہے کہ:

ایک رات کو میں سو رہا تھا، قریب ایک بجے کا وقت تھا، یک بیک میری آنکھیں کھل گئیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی شبلی ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں اور محو فکر ہیں۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک قطعہ تاریخ لکھ رہے ہیں۔(۶)

اسی دور طالب علمی میں کتب فروشوں کے یہاں بیٹھ کر شعراء کے دواوین کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا، جن کے اشعار بھی یاد ہو جاتے۔(۷) شعر گوئی کا آغاز بھی اسی دور میں ہوا۔

۹/۱۰ سال کی عمر میں چادر کی ضرورت تھی تو اپنے والد شیخ حبیب اللہ (ف: ۱۹۰۰ء) کو جو اعظم گڑھ کے مشہور وکیل اور بڑے سخن فہم تھے۔ ایک نظم لکھ کر پیش کی۔ جس کا ایک شعر یہ ہے:

پدر جس کا یوں صاحب تاج ہو
پسر اس کا چادر کو محتاج ہو(۸)

دور طالب علمی ہی میں فی البدیہہ مصرعے موزوں کرنا اور اساتذہ کے کلام پر مصرعے لگانا ان کے اسی ادبی ذوق کا پتہ دیتا ہے۔ مولانا فاروق چریا کوٹی (ف: ۱۹۰۹ء) سے جب وہ تحصیل علم میں مصروف تھے، ایک دن ننگے سر بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا چریا کوٹی نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور خوش طبعی سے فرمایا:

ہے گا چپت گاہ خلائق یہ سر

شبلی نے فی البدیہہ یہ مصرع موزوں کیا:

جتنے ہیں سر ان پہ ہے فائق یہ سر(۹)

شبلی کو ابتداء ہی سے شعر وسخن کا ماحول ملا۔ ان کے نانا قربان علی قنبر انصاری وکالت کے ساتھ شاعری بھی کرتے تھے۔ خود ان کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب ادب کا بہت ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ خاص طور سے فارسی شعر وادب کے وہ بڑے اداشناس تھے۔ ان کی شعر فہمی کا ایک واقعہ خود علامہ شبلی کی زبانی ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

میرا طالب علمی کا زمانہ تھا، ایک دن ایک صحبت میں کسی نے کلیم کا یہ شعر پڑھا:

سر بہ بستان چو دہد جلوہ یغمائی را
اول از سرو کند جامہ رعنائی را

والد مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے۔ میں نے کہا کپڑا اتارنے کو جامہ کشیدن بھی کہتے ہیں، اس لئے شاعر کند کے بجائے کشد کہتا تو زیادہ فصیح ہوتا۔ جامہ کندن گو صحیح ہے، فصیح نہیں۔ سب چپ ہو گئے۔ والد مرحوم نے ذرا سوچ کر کہا نہیں یہی لفظ شعر کی جان ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق باغ میں جب غارت گری کی شان دکھاتا ہے تو پہلے سرو کی رعنائی کا لباس اتار لیتا ہے۔ لباس

اتارنے کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ مثلاً کوئی شخص گرمی وغیرہ کی وجہ سے کپڑا اتار کر رکھ دے یا اس کا نوکر اتار لے۔ دوسرے یہ کہ سزا کے طور پر کسی کے کپڑے اتروالئے جائیں ،یا نچوالئے جائیں۔ فارسی میں ان کے لئے دو مختلف لفظ ہیں، جامہ کشیدن اور جامہ کندن۔ چونکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ معشوق ذلت کے طور پر سرو کا کپڑا اتار لیتا ہے،اس لئے یہاں جامہ کندن کا لفظ کشیدن سے زیادہ موزوں ہے۔ تمام حاضرین نے اس توجیہ کی بے ساختہ تحسین کی۔(۱۰)

اس ادبی ماحول میں نشو ونما کا نتیجہ تھا کہ اعظم گڑھ میں خود انھوں نے ایک ادبی فضا قائم کی اور ایسی محفلیں منعقد کیں جو داد سخن سے پر شور ہوتیں۔جس میں طرحیں دی جاتیں اور غزلیں پڑھی جاتیں۔(۱۱) شعر وادب کے اداشناس اور قادرالکلام شاعر مولانا فاروق چریا کوٹی کی صحبت نے شبلی کے ذوق ادب کو مزید جلا بخشی۔ چشمہ رحمت غازی پور گئے تو وہاں شمشاد لکھنوی [ف:۱۹/ دسمبر ۱۹۴۹ء] سے مشورہ سخن رہا۔ اسی طرح لاہور میں مولانا فیض الحسن سہارن پوری [ف:۶/ فروری ۱۸۸۷ء] علی گڑھ میں قیس اور اکبرالہ آبادی [ف:۹/ستمبر ۱۹۲۱ء] حیدرآباد میں داغ دہلوی [ف:۱۴/فروری ۱۹۰۵ء] اور لکھنؤ کی ادبی فضا، ماحول، شعروسخن کے چرچے، شعراء کی صحبت اور ان کے ذاتی ادبی مطالعہ ومشاہدہ نے ان کے ذوق شعری کو نکھارا۔لیکن چونکہ شبلی نے شعروشاعری کو تفریح طبع سے زیادہ اہمیت نہیں دی اس لئے ان کا شعری سرمایہ محدود ومختصر ہے۔

بوئے گل کی اشاعت کے بعد وہ اردو شاعری کی طرف متوجہ ہوئے اور متعدد نظمیں لکھیں،ان میں بعض ان کے اصلی نام سے اور بعض کشاف وصاف کے فرضی نام سے سے الہلال زمیندار اور مخزن وغیرہ میں شایع ہوئیں۔سانحہ مسجد کان پور اور مسلم لیگ پر ان کی سیاسی اور تاریخ اسلام کے اخلاقی واقعات پر نظمیں بے حد مقبول ہوئیں۔ چنانچہ دہلی، لاہور، علی گڑھ اور لکھنؤ سے ان کے کئی مجموعے شایع ہوئے۔ سب سے آخر میں مولانا سید سلیمان ندوی نے کلیات شبلی شایع کیا۔ یہاں ان مجموعوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

مثنوی صبح امید

علی گڑھ کالج میں علامہ شبلی کی جو ادبی کاوش سب سے پہلے منظر عام پر آئی وہ علی گڑھ تحریک کی حمایت میں لکھی گئی ان کی مثنوی صبح امید ہے۔ متوسط تقطیع کے ۲۴ صفحات اور ۳۵۳ اشعار پر مشتمل یہ مثنوی ۱۸۸۶ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شایع ہوئی۔ ۱۹۰۳ء میں مفید عام آگرہ ہی سے دوسرا ایڈیشن شایع ہوا۔ ایک ایڈیشن رنگین پریس دہلی سے شایع ہوا جس پر تاریخ اشاعت درج نہیں ہے۔ اس کا تفصیلی جائزہ کلیات شبلی کے ضمن میں آئندہ سطور میں ہوگا۔

نالۂ شبلی

یہ علامہ شبلی کی اردو نظموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ یہ راقم کو دستیاب نہ ہو سکا۔ البتہ مکاتیب شبلی میں اس کا پانچ جگہ [صفحات: ۱۰۹، ۱۱۰، ۲۳۱، ۲۴۰] یک سطری ذکر آیا ہے۔

۱۔ نالۂ شبلی دیکھا، اشعار غلط چھپے۔ میں نے ان کو لکھا تھا کہ پروف بھیج دیجئے گا، میں تصحیح کر دوں گا لیکن انہوں نے جواب تک نہیں دیا۔ [مکاتیب شبلی ج ا ص ۲۳۱، ۵/جنوری ۱۹۱۳ء]

۲۔ نالۂ شبلی کے چھاپنے والے مدعی ہیں کہ رقم کسی قومی کام میں دیں گے۔ مجھ سے پہلے پوچھا تک نہیں۔ [مکاتیب شبلی ج ا ص ۱۰۹، ۷/جنوری ۱۹۱۳ء]

۳۔ اردو میں تاریخی نظمیں جو میں نے الہلال میں لکھی تھیں علی گڑھ والے علاحدہ مع فوٹو چھپوا رہے ہیں۔ [مکاتیب شبلی ج ا ص ۱۱۰، ا/ستمبر ۱۹۱۳ء]

۴۔ جدید اردو نظمیں [نالۂ شبلی] تم آگرہ سے لائے ہوگے۔ پولٹکل نظمیں ایک صاحب چھاپ رہے ہیں، یہ بڑھاپے کا زور ہے۔ [مکاتیب شبلی ج ا ص ۱۱۰، ۲/جنوری ۱۹۱۴ء]

۵۔ لوگ شاکی ہیں کہ نالۂ شبلی کی قیمت بہت رکھی۔ [مکاتیب شبلی ج ا ص ۲۴۰، ۱۰/جنوری ۱۹۱۳ء]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نالۂ شبلی کا پہلا ایڈیشن آگرہ سے اور دوسرا ایڈیشن علی گڑھ سے شایع ہوا۔ آگرہ ایڈیشن کہیں دستیاب نہیں ہے البتہ علی گڑھ سے جو باتصویر مجموعہ چھپ رہا تھا وہ نالۂ شبلی ہی کے نام سے ۱۹۱۳ء میں مطبع احمدی علی گڑھ سے شایع ہوا۔ ۲۴ صفحات پر مشتمل اس

مجموعہ کو جناب محمود احمد عباسی نے مرتب کیا ہے۔ مقدمہ بھی انہیں کے قلم سے ہے۔ تصویریں بھی دی ہوئی ہیں، البتہ علامہ شبلی اور محمود عباسی کی تصاویر کے علاوہ دیگر تصاویر کی شناخت نہ ہوسکی۔

مجموعہ نظم شبلی

یہ علامہ شبلی نعمانی کی تاریخی اور مذہبی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس کے مرتب محمد قربان علی بسمل ہیں۔ ۲۷ رصفحات پر مشتمل یہ مجموعہ ۱۹۱۴ء کے آخر میں مطبع شاہ جہانی دہلی سے شایع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مطبع شاہ جہانی دہلی ہی سے ۱۹۲۹ء میں شایع ہوا۔ اس کے صفحات کی تعداد ۱۰۴ ہے۔ گویا دوسرے ایڈیشن میں اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ بھی راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔

تاریخی جواہر

تاریخی نظموں کا یہ مجموعہ ۱۹۱۵ء میں حکیم اظہر دہلوی نے مرتب کر کے شایع کیا تھا۔ مولوی عبدالحلیم شرر نے اس پر دلگداز [اگست ۱۹۱۶ء ص ۱۹۲] میں تبصرہ کیا ہے۔ انہوں نے اس کا ایک اشتہار [دلگداز ستمبر ۱۹۱۶ء ص ۲۱۶] بھی شایع کیا ہے۔ باوجود تلاش بسیار کے یہ دستیاب نہ ہوسکا اور نہ اس کی دیگر تفصیلات کسی اور ذریعہ سے مل سکیں۔

مجموعہ نظم شبلی اردو مع سوانح عمری

یہ مولانا شبلی کی مذہبی واخلاقی نظموں کا مجموعہ ہے۔ سیاسی نظمیں اس میں شامل نہیں ہیں۔ اس کے مرتب سید ظہور الحسن موسوی مؤلف ''تاریخ دربار'' (مطبوعہ دہلی: ۱۹۱۱ء) ہیں۔ جو جامع مسجد دہلی کے قریب کٹرہ نظام الملک کے رہنے والے اور قومی پریس دہلی کے مالک تھے۔ انہوں نے علامہ شبلی کی کئی کتابیں سیرۃ النعمان، المامون، سفرنامہ مصر و روم و شام، الفاروق، اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، الغزالی، سوانح مولانا روم وغیرہ شائع کیں۔ اصلاً وہ تاجر تھے اور اسی غرض سے انہوں نے یہ کتابیں چھاپیں۔ یہی نہیں کہ انہوں نے علامہ شبلی کی معروف کتابیں شائع کیں بلکہ کئی مضامین کو کتابچہ کی شکل میں شائع کیا۔ ان میں ازواج النبیؐ اور الہارون کے نام شامل ہیں، غالباً یہ دونوں سیرۃ النبی اور المامون کے اقتباسات پر مبنی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے سب سے پہلے علامہ شبلی کے ۱۵ رتاریخی مقالات کا مجموعہ ''مقالات شبلی'' کے نام سے ۱۹۱۵ء

میں شائع کیا۔ ان کے اسی سلسلہ مطبوعات کا حصہ یہ مجموعہ نظم شبلی بھی ہے جو ۱۹۱۶ء میں مہتاب پریس دہلی میں چھپ کر شائع ہوا۔ ۶۰ رصفحات پر مشتمل اس مجموعہ میں آخر میں مولانا عبدالحلیم شرر کا مفصل مضمون بطور سوانح عمری شامل ہے۔ مولانا شبلی کی وفات پر خان بہادر مولوی سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ نے جو دلدوز وفیاتی مضمون لکھا تھا وہ بھی اس میں شامل ہے۔ اس کے بعد سیدظہورالحسن کی ایک نظم ''رہنما سامنے ہے نقش قدم شبلی'' درج کی گئی ہے۔

علامہ شبلی پر کفر کے فتوے کے بعد سید عبدالسلام صاحب مالک مطبع فاروقی دہلی نے جو استفسار کیا تھا اور مولانا شبلی نے اس کا جو جواب لکھا تھا ''مولانا شبلی کے عقائد'' کے عنوان سے آخر میں نقل کیا گیا ہے۔ ٹائٹل کے دونوں اندرونی صفحات پر قومی پریس کی شائع کردہ علامہ شبلی کی تصنیفات کی فہرست ہے۔

اس مجموعہ کا دوسرا ایڈیشن جی اینڈ سنس دہلی کی طرف سے محض ایک سال بعد ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا البتہ خط کتابت جلی ہونے کے سبب اس کے صفحات کی تعداد ستر ہوگئی ہے اور مرتب نے اپنی نظم آخر سے نکال دی ہے۔

یہاں یہ لکھنا شاید نامناسب نہ ہو کہ مولانا شبلی کی زندگی کے آخری دنوں میں ان کی تصنیفات و تالیفات مقبولیت کے آسمان پر تھیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دہلی میں قومی پریس اور لکھنؤ میں الناظر پریس نے علامہ شبلی کی متعدد کتابیں شائع کیں۔

اس مجموعہ کلام پر ''شبلی بک ڈپو لکھنؤ'' کی مہر لگی ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ علامہ شبلی کے نام سے لکھنؤ میں بک ڈپو بھی قائم کیا گیا تھا۔ ممکن ہے اس کی تفصیل کہیں مل جائے کہ اسے شبلی کے نام کی نسبت سے کس نے قائم کیا تھا؟ وہ محض ایک بک ڈپو ہی تھا یا اس نے علامہ کی کتابیں بھی شائع کی تھیں۔

مجموعہ کلام شبلی

مولانا شبلی کے جو اردو مجموعہ کلام دہلی، لاہور اور لکھنؤ سے شایع ہوئے انہیں ناقص قرار دیتے ہوئے سید ظفر الملک علوی، ایڈیٹر الناظر لکھنؤ نے ۱۹۱۸ء میں یہ مجموعہ شایع کیا۔ یہ ڈیمائی

سائز کے ۱۰۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں شبلی کی سیاسی نظموں کے علاوہ ان کا تمام کلام یکجا ہو گیا ہے۔ سیاسی نظمیں کیوں شامل نہیں کی گئی ہیں؟ اس کا سبب بتاتے ہوئے مرتب نے لکھا ہے کہ ''[شبلی کی] جو نظمیں زیادہ مقبول ہوئیں افسوس ہے کہ پریس ایکٹ کے تحت ان کی اشاعت روک دی گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے میں ان کو جگہ نہیں دی گئی۔'' [گذارش، مجموعہ کلام شبلی صفحہ ج]

مذکورہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کی محض ایک نظم پر پابندی نہیں لگی تھی بلکہ ان کی تمام سیاسی نظمیں کسی ایکٹ کے تحت ممنوع اشاعت تھیں، غالبًا یہی وجہ تھی کہ سید ظہورالحسن صاحب نے بھی اپنے مجموعے میں سیاسی نظمیں شامل نہیں کیں اور سرورق ہی پر اس کی وضاحت کی کہ اس میں سیاسی نظمیں شامل نہیں کی گئی ہیں۔

سید ظفرالملک علوی نے نظموں کے علاوہ علامہ شبلی کی سات اردو غزلیں بھی شامل کی ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۵ء میں شبلی کا جو کلیات شایع کیا، جسے سب سے زیادہ مکمل قرار دیا جاتا ہے، اس میں اردو غزلیں شامل نہیں ہیں۔ حالانکہ ان کی جو غزلیں دستیاب ہیں ایسا نہیں ہے کہ وہ اس لائق نہیں ہیں کہ ان کا ذکر نہ کیا جائے۔ البتہ وہ صاحب سیرۃ النبی کے ضرور شایانِ شان نہیں ہیں۔ ان میں وہی حسن وعشق اور زلف وخال وخط کا بیان ہے جو روایتی غزل کا اصل سرمایہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ غزل اپنے دائرے ہی میں رہے تو غزل ہے۔ اسے نظم یا قومی ترانہ بنانا اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ غالبًا علامہ شبلی کا بھی یہی خیال تھا۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پوچھتے کیا ہو جو حال شب تنہائی تھا رخصت صبر تھی یا ترک شکیبائی تھا

بھلی تھی تقدیر یا بری تھی یہ راز کس طرح سے عیاں ہو
بتوں کو سجدے کئے ہیں اتنے کہ مٹ گیا سب لکھا جبیں کا

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہوگی تو کیوں ہوگی خیال روزہ وفکر وضو ہوگی تو کیوں ہوگی

جو دو دن بھی بسر کرلے گا اس قصر معلیٰ میں اسے خلد بریں کی آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی
کہاں یہ لطف یہ منظر یہ سبزہ یہ بہارستان عطیہ تم کو یاد لکھنؤ ہوگی تو کیوں ہوگی

نشہ آور تھی نگاہ مست ساقی اس قدر خود بخود لبریز مے ہر ساغر و پیمانہ تھا

یار کو رغبت اغیار نہ ہونے پائے گل تر کو ہوس خار نہ ہونے پائے
چپکے وہ آتے ہیں گلگشت کو اے باد صبا سبزہ باغ بھی بیدار نہ ہونے پائے

کچھ اکیلی نہیں میری قسمت غم کو بھی ساتھ لگا لائی ہے
شبلی زار سے کہدے کوئی مژدہ وصل صبا لائی ہے

ناتواں عشق نے آخر کیا ایسا ہم کو غم اٹھانے کا بھی باقی نہیں یارا ہم کو
درد فرقت سے ترے ضعف ہے ایسا ہم کو خواب میں بھی ترے دشوار ہے آنا ہم کو

ان اشعار سے واضح ہے کہ شبلی کی غزلیں روایتی قسم کی ہیں البتہ اس میں وہ واردات حسن وعشق کو خوبی سے برتتے ہیں اور وصل ووصال، ہجر وفراق اور غم عشق میں بے بسی و بے چارگی کے رمز وآداب کو فطری طور پر نبھاتے ہیں اور یہی ان کی غزلوں کی خوبی ہے۔

مولانا حالی نے شبلی کی فارسی غزلوں کو شراب دوآتشہ سے تشبیہ دی ہے اور حافظ کی غزلوں سے زیادہ گرم بتایا ہے، عبداللطیف اعظمی کا خیال ہے کہ حالی نے فارسی غزلوں کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ شبلی کی اردو غزلوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔(۱۲) علامہ شبلی خود کہتے ہیں:

یہ نظم آئیں یہ طرز بندش، سخنوری ہے فسوں گری ہے
کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرز علی حزیں کا

علامہ شبلی نے اپنے ابتدائی کلام کو زمانہ جاہلیت کی یادگار بتایا ہے۔(۱۳) شاید اسی بنا پر مولانا سید سلیمان ندوی نے اسے ان کے کلیات میں جگہ نہ دی ہو۔

غرض اردو غزلیں ظفر الملک علوی صاحب کے مجموعہ کے علاوہ کسی اور میں شامل نہیں۔
اس مجموعہ کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۲۴ء میں کلیات شبلی مرتبہ سید سلیمان ندوی کی اشاعت سے ایک سال پہلے الناظر پریس لکھنؤ ہی کی طرف سے شایع ہوا۔

کلیات شبلی اردو

مذکورہ بالا مجموعہ ہائے کلام کے بعد ۱۹۲۵ء یعنی سب سے آخر میں مولانا سید سلیمان ندوی نے کلیات شبلی مرتب کیا، جو دارالمصنّفین کی طرف سے شایع ہوا اور جس میں علامہ شبلی کی تمام نظمیں، قصیدے، مثنوی، مراثی، قطعات و رباعیات شامل ہیں۔ان نظموں کا پس منظر، اشاعت اول وغیرہ کی تفصیلات بھی مرتب نے لکھ دی ہیں۔علامہ شبلی کی شاعری پر ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے۔سید ظفر الملک علوی کے مجموعہ کے مقابلہ میں اس میں ۴۴؍نگارشات [نظم، قصیدہ، قطعہ، رباعی وغیرہ] کا اضافہ ہے۔غالباً یہی وجہ ہے کہ اس نے بڑی مقبولیت پائی۔اب تک اس کے مندرجہ ذیل ایڈیشن نکل چکے ہیں:

- ۱۹۲۵ء ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع اول، ۱۲۴ص
- ۱۹۴۰ء ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع دوم، ۱۲۱ص
- ۰۰۰۰ طبع سوم نہ مل سکا۔
- ۱۹۵۴ء ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ طبع چہارم، ۳۱+۱۱۸ص
- ۱۹۷۹ء ■ داتا پبلشرز، لاہور ۱۲۱ص
- ۱۹۸۱ء ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع پنجم، ۱۱۸ص
- ۱۹۸۷ء ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع ششم، ۱۱۸ص
- ۱۹۸۹ء ■ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۲۱ص
- ۲۰۰۵ء ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۱۸ص
- ۲۰۰۷ء ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۱۶ص
- ۲۰۱۲ء ■ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع جدید ۲۱۲ص

غزل

کلیاتِ شبلی اگرچہ سب سے زیادہ جامع اور مفصل ہے، تاہم اس میں علامہ شبلی کی اردو غزلیں شامل نہیں ہیں۔ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ چونکہ مجموعہ کلامِ شبلی [سید ظفر الملک علوی] کے علاوہ یہ غزلیں کسی اور مجموعہ میں شامل نہیں اور وہ اب نایاب ہے۔ اس لئے یہ تمام غزلیں یہاں درج کی جاتی ہیں:

[۱]

اثر کے پیچھے دلِ حزیں نے نشان چھوڑا نہ ہر کہیں کا
گئے ہیں نالے جو سوئے گردوں تو اشک نے رخ کیا زمیں کیا
بھلی تھی تقدیر یا بری تھی ، یہ راز کس طرح سے عیاں ہو
بتوں کو سجدے کیے ہیں اتنے کہ مٹ گیا سب لکھا جبیں کا
وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں ، وہ اگلی ہی سی شرارتیں ہیں
سیانے ہوں گے تو ہاں بھی ہوگی ، ابھی تو سن ہے نہیں نہیں کا
یہ نظم آئیں ، یہ طرز بندش ، سخنوری ہے ، فسوں گری ہے
کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی ، مزہ ہے طرز علی حزیں کا

[۲]

تیر قاتل کا یہ احساں رہ گیا — جاے دل سینہ میں پیکاں رہ گیا
کی ذرا دست جنوں نے کوتہی — چاک آ کر تا بداماں رہ گیا
دو قدم چل کر ترے وحشی کے ساتھ — جادۂ راہ بیاباں رہ گیا
قتل ہو کر بھی سبکدوشی کہاں — تیغ کا گردن پہ احساں رہ گیا
ہم تو پہونچے بزم جاناں تک مگر — شکوۂ بیداد درباں رہ گیا
کیا قیامت ہے کہ کوے یار سے — ہم تو نکلے اور ارماں رہ گیا
دوسروں پر کیا کھلے راز دہن — جب کہ خود صانع سے پنہاں رہ گیا

جذبۂ دل کا ذرا دیکھو اثر　　تیر نکلا بھی تو پیکاں رہ گیا
جامۂ ہستی بھی اب تن پر نہیں　　دیکھ وحشی تیرا عریاں رہ گیا
ضعف مرنے بھی نہیں دیتا مجھے　　میں اجل سے بھی تو پنہاں رہ گیا
اے جنوں تجھ سے سمجھ لوں گا اگر　　ایک بھی تار گریباں رہ گیا
حسن چمکا یار کا ، اب آفتاب　　اک چراغِ زیر داماں رہ گیا
لوگ پہونچے منزل مقصود تک　　میں جرس کی طرح نالاں رہ گیا
بزم میں ہر سادہ رو تیرے حضور　　صورت آئینہ حیراں رہ گیا

یاد رکھنا دوستو اس بزم میں
آکے شبلی بھی غزل خواں رہ گیا

[۳]

پوچھتے کیا ہو جو حال شب تنہائی تھا　　رخصت صبر تھی یا ترک شکیبائی تھی
شب فرقت میں دل غمزدہ بھی پاس نہ تھا　　وہ بھی کیا رات تھی کیا عالم تنہائی تھا
میں تھا یا دیدۂ خوں نابہ فشاں تھی شب ہجر　　ان کو واں مشغلۂ انجمن آرائی تھا
پارہائے دل خونیں کی طلب تھی پیہم　　شب جو آنکھوں کو مری ذوق خود آرائی تھا
رحم تو ایک طرف پایہ شناسی دیکھو　　قیس کو کہتے ہیں مجنوں تھا ، صحرائی تھا
آنکھیں قاتل سہی پر زندہ جو کرنا ہوتا　　لب میں اے جان تو اعجاز مسیحائی تھا
خون رورودیے بس دو ہی قدم میں چھالے　　یاں وہی حوصلہ بادیہ پیمائی تھا
دشمن جاں تھے ادھر ہجر میں درد و غم و رنج　　اور ادھر ایک اکیلا ترا شیدائی تھا
انگلیاں اٹھتی تھیں مژگاں کی اسی رخ پیہم　　جس طرف بزم میں وہ کافر ترسائی تھا
کون اس راہ سے گزرا ہے کہ ہر نقش قدم　　چشم عاشق کی طرح اس کا تماشائی تھا
خوب وقت آئے نکیرین جزا دے گا خدا　　لحد تیرہ میں کیا عالم تنہائی تھا

ہم نے بھی حضرت شبلی کی زیارت کی تھی
یوں تو ظاہر میں مقدس تھا پہ شیدائی تھا

[۴]

تیس دن کے لئے ترک مے وساقی کرلوں — واعظ سادہ کو روزوں میں تو راضی کرلوں
پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل وکمال — ورنہ حاسد تیری خاطر سے میں یہ بھی کرلوں
اے نکیرین قیامت ہی پہ رکھو پرسش — میں ذرا عمر گذشتہ کی تلافی کر لوں
کچھ تو ہو چارۂ غم بات تو یکسو ہو جائے — تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کرلوں
اور پھر کس کو پسند آئے گا ویرانۂ دل — غم سے مانا بھی کہ اس گھر کو میں خالی کرلوں
جورگردوں سے جو مرنے کی بھی فرصت مل جائے — امتحان دم جاں پرور عیسیٰ کرلوں
دل ہی ملتا نہیں سفلوں سے وگر نہ شبلی
خوب گذرے فلک دوں سے جو یاری کر لوں

[۵]

ناتواں عشق نے آخر کیا ایسا ہم کو — غم اٹھانے کا بھی باقی نہیں یارا ہم کو
دردفرقت سے تری ضعف ہے ایسا ہم کو — خواب میں بھی ترے دشوار ہے آنا ہم کو
جوش وحشت میں ہو کیا ہم کو بھلا فکر لباس — بس کفایت ہے جنوں دامنِ صحرا ہم کو
رہبری کی دہن یار کی جانب خط نے — خضر نے چشمۂ حیواں یہ دکھایا ہم کو
دل گرا اس کی زنخداں میں فریب خط سے — چاہ خس پوش تھا اے وائے نہ سوجھا ہم کو
واہ کاہیدگی جسم بھی کیا کام آئی — بزم میں تھے پہ رقیبوں نے نہ دیکھا ہم کو
قالب جسم میں جان آگئی گویا شبلی
معجزہ فکر نے اپنی یہ دکھایا ہم کو

[۶]

کچھ اکیلی نہیں میری قسمت — غم کو بھی ساتھ لگا لائی ہے
منتظر دیر سے تھے تم میرے — اب جو تشریف صبا لائی ہے
نکہتِ زلفِ غبار رہ دوست — آخر اس کوچہ سے کیا لائی ہے
موت بھی روٹھ گئی تھی مجھ سے — یہ شب ہجر منا لائی ہے

مجھ کو لے جا کے مری آنکھ وہاں　　اک تماشا سا دکھا لائی ہے
آہ کو سوے اثر بھیجا تھا　　واں سے کیا جانیے کیا لائی ہے
شبلی زار سے کہہ دے کوئی
مژدۂ وصل صبا لائی ہے

[۷]

یار کو رغبت اغیار نہ ہونے پائے　　گل تر کو ہوس خار نہ ہونے پائے
اس میں در پردہ سمجھتے ہیں وہ اپنا ہی گلہ　　شکوۂ چرخ بھی زنہار نہ ہونے پائے
فتنۂ حشر، جو آنا تو دبے پاؤں ذرا　　بخت خفتہ مرا بیدار نہ ہونے پائے
ہائے دل کھول کے کچھ کہہ نہ سکے سوز دروں　　آبلے ہم سخن خار نہ ہونے پائے
چپکے وہ آتے ہیں گلگشت کو اے باد صبا　　سبزہ بھی باغ میں بیدار نہ ہونے پائے
پھر کہیں جوش میں آ جائیں نہ یہ دیدۂ تر　　سامنے ابر گہر بار نہ ہونے پائے
باغ کی سیر کو جاتے تو ہو، پر یاد رہے　　سبزہ بیگانہ ہے، دوچار نہ ہونے پائے
جمع کر لیجیے غمزوں کو مگر خوبیِ بزم　　بس وہیں تک ہے کہ بازار نہ ہونے پائے
آپ جاتے تو ہیں اس بزم میں لیکن شبلی
حال دل دیکھیے اظہار نہ ہونے پائے

یہ غزلیں علی گڑھ اور علی گڑھ جانے سے پہلے کی ہیں اور مکاتیب شبلی سے لی گئی ہیں۔
خطوط شبلی [مرتبہ: امین زبیری] میں دو اور غزلیں شامل ہیں، جو آخری دور کی ہیں اور نسبتاً بہتر ہیں:

[۸]

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہوگی تو کیوں ہوگی　　خیال روزۂ وفکرِ وضو ہوگی تو کیوں ہوگی
جو دو دن بھی بسر کر لے گا اس قصر معلیٰ میں　　اسے خلد بریں کی آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی
ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے　　یہاں فکر مے جام وسبو ہوگی تو کیوں ہوگی
جناب نازلی بیگم کو اور نواب صاحب کو　　کسی شے کی جو دل میں آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی
کہاں یہ لطف، یہ منظر، یہ سبزہ، یہ بہارستاں　　عطیہ! تم کو یاد لکھنؤ ہوگی تو کیوں ہوگی

[۹]

یاد صحبت ہائے رنگیں جو جزیرہ میں رہیں — وہ جزیرہ کی زمیں تھی ، یا کوئی میخانہ تھا
لطف تھا ، ذوق سخن تھا ، صحبت احباب تھی — مطرب و رود و سرود ، ساغر و پیمانہ تھا
سبزۂ وگل سے بھرا تھا دامن کہسار سب — غیرت خلد بریں ہر گوشۂ ویرانہ تھا
غنچۂ گل کا تبسم تھا ، ہر اک دم برق ریز — عندلیبوں کی زباں پر نالۂ مستانہ تھا
نشہ آور تھی نگاہ مست ساقی اس قدر — خود بخود لبریز مے ہر ساغر و پیمانہ تھا
اب نہ وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ وہ لطف سخن — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا (۵۳)

جنوری ۱۹۷۱ء میں مجلّہ کریسنٹ لاہور کا شبلی نمبر شایع ہوا۔اس میں علامہ شبلی کی ایک غیر مطبوعہ غزل شامل ہے۔مرتب نے عکس بھی شایع کر دیا ہے۔مگر اس کی وضاحت نہیں کی ہے کہ یہ غزل انہیں کہاں سے ہاتھ آئی۔غزل یہ ہے:

[۱۰]

وہ مجوب وصال آئے کہیں سے
ٹپکتا ہے نگاہ واپسیں سے

عدو افسانہ غم کیا کہے گا!
یہ مضموں کچھ ادا ہوگا ہمیں سے

انہیں افسانہ غم ڈرتے ڈرتے
سنایا کچھ کہیں سے، کچھ کہیں سے

نکل جاتی ہے کیا بچ بچ کے تاثیر
ہمارے نالہ ہائے آتشیں سے

تڑپنے کو ہمارے عرصہ حشر
بھلا کیا ہوگا اتنی سی زمیں سے

[کریسنٹ، لاہور، جنوری ۱۹۷۱ء ص ۰۰]

اسی طرح یہ اشعار بھی کلیات میں نہیں ہیں:

صریر خامہ شبلی کی آتش افشانی
یہ مان لیجے کہ ہے بھی پر اس میں دم کیا ہے

بے خودی وصل کی حظ کب مجھے لینے دیتی　　وہ جو آتے ہیں تو میں آپ سے باہر ہوتا

[مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۱۴۱]

ضعف میں بھی یہ مرے تیر فغاں کا زور ہے　　روک لے اس کو کہاں یہ آسماں میں زور ہے
نیست تھی اس کی کمر پر تو نے ثابت کر دیا　　واہ واتسنیم کیا تیرے بیاں میں زور ہے

[شبلی نامہ ص ۳۶]

باوجود اس کمی کے یہ سب سے اہم مجموعہ کلام ہے۔ اس کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی نے متعدد اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، مثنوی، قصیدہ، مسدس، مرثیہ، قطعہ، رباعی اور غزل وغیرہ میں جو سرمایہ انھوں نے چھوڑا ہے، وہ اپنی عظمت فکر وفن کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ بالخصوص ان کی مذہبی، اخلاقی، تاریخی اور سیاسی نظمیں اردو کے شعری سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ ذیل میں ان کے اردو کلام کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

مثنوی

علامہ شبلی نے اردو میں محض ایک مثنوی صبح امید لکھی مگر یہی ایک مثنوی اپنے موضوع ومواد، سادگی و برجستگی، زور بیان اور علو جذبات کی وجہ سے اردو مثنوی کی تاریخ میں شبلی کو زندہ جاوید کر گئی۔ اس کی افادیت اور فکری وفنی عظمت کا اعتراف متعدد نقادوں نے کیا ہے۔ مولانا حالی کے مسدس سے موازنہ کرتے ہوئے اختر جونا گڑھی لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ مسدس حالی کا سا قبول عام مثنوی صبح امید کونصیب نہیں ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ نفس شاعری اور فن کے لحاظ سے مثنوی کا درجہ بلند ہے۔اس میں جو آمد، زورِ سخن اور جوش بیان پایا جاتا ہے، وہ مسدس میں نہیں ہے۔خصوصاً مسدس میں جو یاس انگیز حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے، وہ جادۂ عمل پر گامزن ہونے کی تحریک نہیں پیدا کرتا۔ برخلاف اس کے مثنوی کا ایک ایک شعر قوم کے شاندار ماضی سے ایک امید افزا مستقبل کی طرف رہنمائی کرتا اور مردہ دلوں میں تازہ روح پھونکتا ہے۔''(۱۴)

یہاں تک کہ کلیم الدین احمد (ف:۲۲رد سمبر۱۹۸۳ء) نے بھی صبح امید کی تعریف کی بلکہ اسے مسدس حالی سے بھی بہتر قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''زبان کے اعتبار سے مثنوی صبح امید، حالی کی مسدس پر فوقیت رکھتی ہے۔ مسدس حالی کی زبان بے رنگ و بے مزہ ہے۔ مثنوی صبح امید کی سادگی بے لطفی کا سبب نہیں ہوتی۔ شبلی پر زور، محکم اور مختصر طریقہ سے وہ باتیں کہہ جاتے ہیں جن کا بیان مسدس میں طوالت، کمزوری اور بے مزگی کے ساتھ ہے۔''(۱۵)

مثنوی صبح امید شبلی کے زمانہ قیام علی گڑھ کی یادگار ہے۔ یہ ۱۸۸۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور ۱۸۸٦ء میں شائع ہوئی۔ یہ وہ دور ہے جب شبلی تحریک علی گڑھ کے ایک فرد اور پر جوش داعی تھے۔ یہ مثنوی اسی تحریک کا خوش آئند مرقع ہے، جسے علامہ شبلی نے صبح امید سے تعبیر کیا ہے۔

۳۵۳- اشعار پر مشتمل یہ مثنوی پنڈت دیا شنکر نسیم (ف:۱۸۴۵ء) کی مثنوی ''گلزار نسیم'' کی بحر اور طرز میں ہے اور اس لحاظ سے منفرد ہے کہ مثنوی میں پہلی بار حسن وعشق کے فرسودہ، فرضی اور افسانہائے رنگیں کے بجائے قومی عروج وزوال کی داستان سنائی گئی ہے۔ جس میں روشن مستقبل کی خاطر جدوجہد کے لئے اکسایا گیا ہے اور شعوری طور پر قومی روح کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور قوم کو یاد دلایا گیا ہے کہ:

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام — جب قوم تھی مبتلائے آلام
وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی — جو تاج تھی فرق آسماں کی

تھے جس پہ نثار فتح واقبال ‌ ‌ ‌ ‌ کسری کو جو کرچکی تھی پائمال
گل کردئے تھے چراغ جس نے ‌ ‌ ‌ ‌ قیصر کو دیئے تھے داغ جس نے
وہ نیزہ خوں فشاں کہ چل کر ‌ ‌ ‌ ‌ ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھوئیں اڑا دیئے تھے ‌ ‌ ‌ ‌ اٹلی کو کنوئیں جھکا دیئے تھے

اس کے بعد مسلمانوں کی عسکری فتوحات کے ساتھ ان کی علمی فتوحات کا ذکر ہے:

بایں ہمہ جاہ وشوکت وفر ‌ ‌ ‌ ‌ اقلیم ہنر بھی تھے مسخر
ہیئت میں بلند پایہ اس کا ‌ ‌ ‌ ‌ تھا فلسفہ زیر سایہ اس کا
منطق میں ہوئے جو گرم جولاں ‌ ‌ ‌ ‌ تھامے تھا رکاب مصر و روما
جو فلسفیان ہند وچیں تھے ‌ ‌ ‌ ‌ خرمن سے اس کے خوشہ چیں تھے

عروج وشباب کی داستان سنانے کے بعد شبلی قوم کی پستی وزبوں حالی اور انحطاط وزوال کی تصویر کھینچتے ہیں:

یہ قوم کی تاج آسماں تھی ‌ ‌ ‌ ‌ اب کوئی گھڑی کی میہماں تھی
پامال ہوا تھا بوستاں کیا ‌ ‌ ‌ ‌ آئی تھی بہار پر خزاں کیا
پستی نے دبالیا فلک کو ‌ ‌ ‌ ‌ خورشید ترس گیا چمک کو
وہ فلسفہ کہن ہمارا ‌ ‌ ‌ ‌ گنجینۂ علم وفن ہمارا
وہ اوج کمال نکتہ دانی ‌ ‌ ‌ ‌ یعنی وہ مسائل معانی
منقول کی انتہائے تکمیل ‌ ‌ ‌ ‌ آئین واصول جرح وتعدیل
معقول کو فقہ کو ادب کو ‌ ‌ ‌ ‌ ہم ہاتھ سے کھوچکے ہیں سب کو

اپنے عصر وعہد کی روش اور پست خیالی کو اس طرح بیان کیا ہے:

بے ہودہ فسانہائے پاریں ‌ ‌ ‌ ‌ زلف وخط وخال کے مضامیں
وہ نوک مژہ کی نیزہ بازی ‌ ‌ ‌ ‌ وہ ترک نگہ کی فتنہ سازی
یہ طرز خیال تھا ہمارا ‌ ‌ ‌ ‌ یہ فن یہ کمال تھا ہمارا
جغرافیہ وجود سارا ‌ ‌ ‌ ‌ ہرچند کے ہم نے چھان مارا

کی سیر بھی گرچہ بحر و بر کی　　لیکن نہ خبر ملی کمر کی

اخلاقی پستی اور سماجی کمزوریوں کی تصویر ملاحظہ ہو:

اپنی تو ہمیں نہ کچھ خبر تھی　　اوروں کے عیوب پر نظر تھی
تکفیر ہمارا ہی چلن تھا　　زندیق تو تکیہ سخن تھا
اللہ رے یہ وفور غفلت　　سمجھے تھے رواج کو شریعت

اس کے بعد صدائے جانکاہ اور آہ دلگیر جیسے الفاظ کے ساتھ علی گڑھ تحریک کا ذکر ہے:

ماتم تھا یہی کہ آئی ناگاہ　　اک سمت سے اک صدائے جانکاہ
اس شان سے تھی وہ آہ دلگیر　　پہلو میں اثر بغل میں تاثیر
ڈوبی ہمہ تن جو تھی اثر میں　　نشتر سی اتر گئی جگر میں

سرسید کی انقلاب آفریں شخصیت کی مرقع آرائی ملاحظہ ہو:

صورت سے عیاں جلال شاہی　　چہرے پہ فروغ صبح گاہی
وہ ریش دراز کی سپیدی　　چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم　　توقیر کی صورت مجسم
وہ ملک پہ جان دینے والا　　وہ قوم کی ناؤ کھینے والا

پروفیسر عبدالقادر سروری نے لکھا ہے کہ شبلی نے اشاروں اشاروں میں سرسید کا جیسا پاکیزہ کردار کھینچ دیا ہے وہ حالی کی حیات جاوید سے بھی نہ ہوسکا۔(۱۶) سرسید کی اس تصویر کے بعد ان کی تقریروں کی اثر انگیزی اور عمل کی طرف مائل کرنے کا انداز، قوم کے امراض اور مریض غم کی چارہ گری، سرسید اور ان کے رفقاء کے افکار و خیالات کی عکاسی، مدرسوں کی پستی، سرسید کے تعلیمی افکار، مدرستہ العلوم اور دوسرے ضمنی موضوعات کو شبلی نے اپنے خاص انداز میں نظم کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ تصویر میں روح پھونک دی ہے۔

آخر میں شبلی معترضین سرسید سے تنقید کے بجائے عمل اور اعتراض کے بجائے کام کا جوہر دکھانے کی اپیل کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ گذرے ہوئے دن لوٹ آئیں گے اگر ہم میں پہلے جیسا ولولہ اور حوصلہ پیدا ہو جائے، کیونکہ قوم اپنی اصل میں اب بھی باقی ہے۔ فرماتے ہیں:

اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی　　اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی
اس حال میں بھی روش وہی ہے　　دن ڈھل بھی گیا تپش وہی ہے
اس جام میں ہے شراب باقی　　اب تک ہے گہر میں آب باقی
گو خوار ہیں طرز وخو وہی ہے　　مرجھا گئے پھول بو وہی ہے

یہ مثنوی فکر وفن کا نمونہ ہے۔اس میں وہی ایجاز واختصار اور بلاغت پائی جاتی ہے جس کے لئے مثنوی گلزارنسیم شہرت رکھتی ہے۔علامہ شبلی نے متعدد مقامات پر استعاروں سے کام لے کر دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔فصیح الفاظ، بلند معنی، دلپذیر ترکیبیں، نازک استعارے اور تشبیہات، سلاست وروانی اور شستگی وبرجستگی وغیرہ مثنوی کی جو خصوصیات ہیں وہ سب اس میں جلوہ گر ہیں اور اس لحاظ سے یہ مثنوی قدیم مثنویوں سے یکسر مختلف اور ممتاز ہے کہ حسن وعشق کے فرضی واقعات سنانے کے بجائے عبرت ونصیحت اور سبق آموزی کے لئے مثنوی میں عبرت آمیز پہلو بیان کئے گئے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اسے اہل سخن نے پسند کیا۔(۱۷) علی گڑھ میں تو یہ گویا ترانہ بن گئی تھی۔رام بابو سکینہ لکھتے ہیں:

''یہ کتاب ایک زمانہ میں اس قدر مقبول اور علی گڑھ کالج کے طلبہ کو اتنی پسند تھی کہ اکثر اوقات وہ اس کو اسٹیج پر خوش آوازی سے پڑھتے اور لوگوں کے دلوں کو بے چین کرتے تھے۔''(۱۸)

ڈاکٹر سلام سندیلوی نے سچ لکھا ہے کہ قدیم مثنویاں ہماری آنکھوں میں نیند تو لاسکتی ہیں مگر روح کو بیدار نہیں کرسکتیں۔شبلی کی مثنوی ہماری روح کو بیداری کا پیغام ہے۔(۱۹)

مرثیہ

علامہ شبلی کے اردو کلام میں مثنوی کی طرح مرثیہ بھی ایک ہی شامل ہے، جو انھوں نے اپنے بھائی مولوی محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ الہ آباد کی وفات پر لکھا تھا اور یہی ایک مرثیہ ان کی مرثیہ گوئی پر مکمل دسترس کا پتہ دیتا ہے۔ایسا پر درد اور اثر انگیز مرثیہ ہے کہ اس کو پڑھ کر مشہور عربی مرثیہ نگار خنساء کی یاد تازہ ہوجاتی ہے:

یہ بھی اے جان برادر جانے کا ہے طور اپنے بچوں کہ نہ کچھ فکر نہ تدبیر نہ غور
ابھی آنے بھی نہ پایا تھا ترے اوج کا دور کیا ہوا تجھ کو کہ تو ہوگیا کچھ اور سے اور
چھوڑ کر بچوں کو بے صبر وسکوں جاتا ہے
کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے
آہ! اے مرگ کسی شی کی نہیں تجھ کو تمیز تیری نظروں میں برابر ہے گہر اور پشیز
میں نے مانا ترے نزدیک نہ تھا وہ کوئی چیز رحم کرنا تھا کہ چھوڑے ہیں کئی اس نے عزیز
لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

پورا مرثیہ درد واثر کی تصویر ہے۔فنی لحاظ سے بھی یہ ایک مثالی مرثیہ ہے۔عربی اور فارسی مراثی کی تاریخ اورفن مرثیہ گوئی پرعلامہ شبلی کی گہری نظرتھی۔اس مرثیہ کے کہنے سے پہلے وہ موازنہ انیس ودبیر جیسی معرکہ آرا کتاب قلم بند کر چکے تھے اور مراثی انیس ودبیر کے حسن وقبح کو بیان کر چکے تھے،اس لئے جب خود انھوں نے مرثیہ لکھا تو اس میں میر انیس کا نقش قائم کر دیا۔

بھائی کی وفات سے انھیں سخت صدمہ پہنچا تھا،اس لئے ان کے مرثیہ میں فکر وفن کے ساتھ درد واثر کے عناصر کی بھی بہتات ہے اور یہی وجہ ہے کہ نقادوں نے اس کی عظمت کا اعتراف کیا۔کلیم الدین احمد نے لکھا ہے کہ مرثیہ مولانا اسحاق،شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔(۲۰) عبداللطیف اعظمی نے غالب کے مرثیہ سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مرثیہ شبلی اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔(۲۱)

قصیدہ

دور آخر میں جن لوگوں نے قصیدے کو ترقی دی ان میں علامہ شبلی کا نام نمایاں ہے۔ انھوں نے فارسی اور اردو میں متعدد قصیدے لکھے اور اپنے مخصوص ترنم میں پیش کئے،جن کی عرصے تک دھوم رہی۔انھوں نے اس صنف سخن کو نیا رنگ وآہنگ عطا کیا۔ اچھوتی تشبیہات و استعارات سے اس میں خاص روح اور نغمگی پیدا کی۔کلیات شبلی میں چار قصیدے شامل ہیں۔

جسٹس سید محمود [ف: ۸/مئی ۱۹۰۳ء] کی شادی [۱۸۸۶ء] پر انھوں نے جو قصیدہ لکھا تھا، وہ ان کا بہترین قصیدہ ہے۔ اس باغ و بہار قصیدہ کا وہی انداز ہے جو محسن کاکوروی [ف: ۲۴/اپریل ۱۹۰۵ء] کے قصیدہ:

ع : سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

کا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

پھر ہوا باد بہاری کا جو عالم میں عمل   چھالیا سبزہ نوخیز نے سب دشت وجبل
ناز سے سوئے چمن جاتی ہے پھر باد بہار   جھومتے آتے ہین پھر صحن چمن میں بادل
نوعروسان چمن کے ہیں نرالے انداز   کہ صبا گود میں لیتی ہے تو جاتے ہیں مچل

قصیدے کی اس اٹھان سے شبلی کے جوش وسرمستی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس میں شبلی نے سید محمود کی مدح وستائش کی ہے مگر یہ مدح وستائش قصیدے کی روایتی مدح سے یکسر مختلف ہے۔ اس میں ان کی حقیقی مدح کی گئی ہے۔ ممدوح کو قومی خدمت کے لئے مائل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

باپ کی طرح سے تو قوم کا بن پشت و پناہ
جانشینی کے لئے کون ہے تجھ سے افضل

مقطع میں استعارے سے کام لیتے ہوئے شبلی نے کس قدر خوب صورت تعلّی کی ہے۔ فرماتے ہیں:

مجھ کو خود حسن طبیعت پہ ہے اپنے وہ غرور   کہ لکھوں مدح تو اپنا ہی لکھوں علم وعمل
میں بھی ہوں عنصری وقت جو محمود ہے تو   میں بھی ہوں ناز سلف تو ہے اگر فخر اول

اس قصیدے کے بارے میں ڈاکٹر سلام سندیلوی نے لکھا ہے کہ یہ انشاء، سحر اور قدر بلگرامی کے قصائد سے کم تر نہیں، بلکہ افادیت کے اعتبار سے ان شعراء کے قصائد سے برتر ہے۔ (۲۲)

اس کے علاوہ شبلی نے چند اور قصیدے بھی لکھے ہیں۔ قصیدہ اردو جو ۱۸۹۳ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھا گیا جس کا مطلع ہے:

بجا ہے آج اگر اس بزم میں یہ زیب وساماں ہیں
یہ ان کی بزم ہے جو یادگار نسل عدناں ہیں

یہ بڑا پر زور قصیدہ ہے اور اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ شبلی نے اس سے قوم کی بیداری کا کام لیا ہے۔ عبرت و غیرت کے پہلو نمایاں کئے ہیں۔ روشن مستقبل کے امکانات کی امید دلائی ہے، بالفاظ دیگر یہ قومی عظمت و سر بلندی کا آئینہ ہے۔ البتہ اس قصیدے میں فنی لحاظ سے یہ کمی پائی جاتی ہے کہ یہ قصیدے کی عروضی ترکیب میں نہیں ہے۔

قصیدہ اردو کے نام سے ایک اور قصیدہ ہے جو ۱۸۹۴ء میں پڑھا گیا، اس کا مطلع یہ ہے:

بزم احباب ہے پر جوش ہے جلسہ کیسا
جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشہ کیسا

یہ قصیدہ بھی بڑے معرکے کا ہے۔ اس میں قصیدہ نگاری کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ بالخصوص اچھوتی تشبیہات نے اس میں خاص تاثر پیدا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے قصیدہ نگاری کے باب میں ایک اضافہ قرار دیا جاتا ہے۔ خاص طور سے اس میں جو رجائی رجحانات پائے جاتے ہیں، وہ شبلی کی ایک انفرادیت ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اپنے ہی ہاتھ میں ہے عقدہ کشائی اپنی — کیا زمانے کا گلہ، چرخ کا شکوہ کیسا
دیکھنا ذرے کا چمکے گا ستارہ اک دن — دیکھنا قطرہ یہ بن جاتا ہے دریا کیسا
تم بھی سن لوگے حریفو! کبھی انشاء اللہ — قافلہ قوم کا منزل پہ وہ پہنچا کیسا

شبلی کا یہ قصیدہ بھی روایتی ڈگر سے مختلف ہے۔ ان کا ایک اور قصیدہ جو سلطان عبدالحمید خاں کی مدح میں ہے۔ بہاریہ تشبیب، لطیف استعارات اور نازک تشبیہات کی وجہ سے ایک جدا انفرادی شان رکھتا ہے۔ شبلی نے جو قصیدے کہے ہیں اس کا انداز عام اور روایتی قصیدہ نگاری سے قدرے مختلف ہے۔ بعض قصیدے قصائد کی بحر میں نہیں ہیں۔ اسے شبلی کی جدت کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے عام روش سے ہٹ کر قصیدے کہے، لیکن اپنے مقصد کے لحاظ سے ان کے قصیدے بہت کامیاب ہیں وہ قصیدوں سے قومی بیداری اور حب الوطنی کا کام لینا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کے قصیدے فن کے ساتھ فکری عظمت کے بھی علمبر دار ہیں۔

مسدس

علامہ شبلی کو مسدس سے بڑی دلچسپی تھی۔ دوسری صنف سخن میں بھی وہ مسدس کا انداز اختیار کرتے تھے۔ ان کا قومی مسدس جو علی گڑھ کے تماشائے عبرت میں پیش کیا گیا تھا خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس میں انھوں نے اسلام کے مد و جزر کو بڑی خوبی سے نظم کیا ہے، ۱۴۰ بند پر مشتمل یہ قومی مسدس حالی کے مسدس سے کم رتبہ نہیں، بلکہ تاثیر میں اس سے بڑھا ہوا ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں:

ہم نے مانا بھی کہ دل سے یہ بھلا دیں قصے   یہ سمجھ لیں کہ ہم ایسے ہی تھے اب ہیں جیسے
یہ بھی منظور ہے ہم کو کہ ہمارے بچے   دیکھنے پائیں نہ تاریخ عرب کے صفحے
کبھی بھولے بھی سلف کو نہ کریں یاد اگر
یادگاروں کو زمانے سے مٹادیں کیونکر

مرو و شیراز و صفاہاں کے وہ زیبا منظر   بیت حمرا کے وہ ایوان وہ دیوار وہ در
مصر و غرناطہ و بغداد کا ایک ایک پتھر   اور وہ دہلی مرحوم کے بوسیدہ کھنڈر
ان کے ذروں میں چمکتے ہیں وہ جوہر اب تک
داستانیں انھیں سب یاد ہیں ازبر اب تک

درد و اثر میں ڈوبے ہوئے اس مسدس کو کئی لحاظ سے اہمیت حاصل ہے۔ شعریت، نغمگی، رنگینی اور شگفتگی اس کی خاص خصوصیات ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض نقادوں نے مسدس حالی پر اس کو فوقیت دی ہے۔ (۲۳) مگر مولانا سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ شاعرانہ استادی کے لحاظ سے یہ مولانا حالی کے مسدس سے کم ہے۔ (۲۴) نقادوں کی تضاد بیانی اپنی جگہ حقیقت یہی ہے کہ یہ مسدس مولانا حالی کے مسدس کے مقابلہ میں شعریت، نغمگی اور اثر انگیزی میں فوقیت رکھتا ہے۔

رباعی

علامہ شبلی نے رباعیاں بھی کہی ہیں۔ کلیات شبلی میں ان کی تین رباعیاں ہیں جو سب کی

سب ان کے حادثہ گزند پا سے متعلق ہیں۔

ہلنا بھی جگہ سے گرچہ ہے دشوار — اس پر بھی خدا کا شکر ہے احسان ہے
یعنی کہ پہنچ چکا ہوں جس منزل تک — یاں سے سفر عدم بس اب آسان

ہرچند کہ زخم سخت جاں فرسا تھے — آثار ہلاک سربسر پیدا تھے
ممنون ہوں ضبط کا اس حال میں بھی — گو پاؤں کٹے مگر قدم برجا تھے

مقبول نہیں ہے بے نوائی میری — آلودہ نخوت ہے گدائی میری
تقدیر نے پاؤں کاٹنے پر بس کی — ناقص ہے ابھی بے سروپائی میری

ان رباعیوں میں پہلی رباعی، اخرب واخرم کی متداول بحر میں ہے اور مطلع سے بھی محروم ہے۔ اس لئے اسے فنی نقطہ نظر سے صحیح نہیں قرار دیا جاسکتا۔ البتہ دوسری اور تیسری رباعیاں فنی لحاظ سے درست ہین اور اظہار خیال اور بیان جذبات کے لحاظ سے بھرپور رباعی کا درجہ رکھتی ہیں۔ گزند پا کا واقعہ خود ان کا تھا اس لئے تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہیں اور آپ بیتی کا درجہ رکھتی ہیں۔

قطعات

علامہ شبلی نے قطعات بھی کہے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ استعارات سے کام لے کر انھوں نے بڑی بڑی باتیں کہہ دی ہیں، جن کے نثر میں بیان کے لئے ایک دفتر درکار ہوتا۔ اپنی پوری زندگی اور کاموں کو ایک قطعہ میں اس طرح بیان کیا ہے:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چند مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

اسی طرح سیرۃ النبیؐ کی تالیف وتدوین کے بارے میں یہ قطعہ کہا ہے:

فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حال سرور عالم — دبیر چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے
صدا یہ بارگاہ عالم قدوس سے آئی — کہ ہے یہ اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے

سیرۃ النبیؐ کی تالیف کے عزم مصمم اور والی بھوپال کے تعاون کا ذکر ایک قطعہ میں کیا

ہے۔فرماتے ہیں:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہرصورت — کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زرافشاں ہے
رہی تالیف وتنقید روایت ہائے تاریخی — تواس کے واسطے حاضر مرادل ہے مری جاں ہے

غرض دوہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جن میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

طلبا سے فرماتے ہیں:

کئے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے — یہ قصہ جب کا ہے باقی تھا جب عہد شباب اپنا
اوراب تو سچ یہ ہے جو کچھ امیدیں ہیں وہ تم سے ہیں — جواں تم ہو لب بام آچکا ہے آفتاب اپنا

سرسید احمد خاں اپنے سیاسی مطمح نظر کے برخلاف کالج کے مفاد میں انگریزوں کے ہم زبان ہو گئے تھے،اس پر شبلی نے یہ قطعہ کہا:

کوئی پوچھے تو میں کہدوں گا ہزاروں میں یہ بات — روش سید مرحوم خوشامد تو نہ تھی
ہاں مگر یہ ہے کہ تحریک سیاسی کے خلاف — ان کی جو بات تھی آورد تھی آمد تو نہ تھی

شبلی کے قطعات کے بارے میں حسرت موہانی نے لکھا ہے کہ پختگی کلام، برجستگی مضمون آزادی خیال، ندرت بیان اور خوبی طرز غرض ہر حیثیت سے یہ قطعے اپنا جواب نہیں رکھتے۔(۲۵)

شبلی کے قطعات، قطعہ کی مروجہ تعریف پر پورے نہیں اترتے۔انھیں مختصر نظم کا نام بھی دیا جا سکتا ہے، تاہم یہ ایک طرح کی ایجاد تھی جس میں اگر شعراء نے طبع آزمائی کی ہوتی تو یقیناً اردو ادب میں ایک اضافہ ہوتا۔

مطائبات

اردو میں مطائبات، شبلی کی اختراع ہیں۔مہدی افادی لکھتے ہیں:

''اردو میں ان کے مطائبات نظم کو جو جدید پیداوار ہیں، ان کے سلسلہ کمالات سے علاحدہ کر کے دیکھئے جن میں لطائف ادبی کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔یہ رنگ بھی انہی کا حصہ ہے۔شوخی کے ساتھ سنجیدگی، یہ معلوم ہوتا ہے دور سے

زبان کی بلائیں لے رہی ہیں۔‘‘(۲۶)

اکبرالٰہ آبادی سے ان کے قریبی مراسم تھے۔شبلی کے قیام الٰہ آباد کے زمانہ میں انھوں نے شبلی کو دعوت دی اور لکھا کہ:

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی ــــــ بس بات یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اٹھاؤ آج کی رات ــــــ کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیا ــــــ سمجھ لو اس کو پلاؤ قلیا

شبلی نے معذرت کی اور عذر لنگ اس طرح بیان کیا:

آج کی دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال ــــــ لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف وکرم کا مجھے انکار نہیں ــــــ حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں میں
لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا ــــــ اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی ــــــ جیتے جی مردہ ہوں مرحوم ہوں مغفور ہوں میں

نواب محسن الملک کے بعد علی گڑھ کالج کی نظامت کے لیے نواب وقارالملک کا نام پیش کیا جا رہا تھا مگر ایک اور شخص بھی اس کے لئے کوشاں تھا، جو قومی حمیت وغیرت سے عاری تھا۔ شبلی اسے دجال کہتے ہیں اور وقارالملک کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وقارالملک اگر ہوں جانشیں مہدی اعظم ــــــ تو اس تجویز کا منکر تو کوئی ہو نہیں سکتا
تعجب ہے کہ اک دجال بھی ہے اس کی کوشش میں ــــــ مگر ظاہر ہے یہ دجال مہدی ہو نہیں سکتا

شبلی کے ان مطائبات نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور بعد کے بعض شعراء نے اس میں طبع آزمائی بھی کی۔ مطائبات شبلی منظوم پر اب تک کوئی مضمون یا مقالہ نہیں لکھا گیا۔ لیکن نثری مطائبات پر ایس جالب مظاہری نے ۱۲۸ صفحات کی ایک کتاب ’’مطائبات شبلی‘‘ کے نام سے لکھی ہے، جو ۱۹۶۳ء میں علوی بکڈ پو بمبئی سے شایع ہوئی۔

مذہبی، اخلاقی اور تاریخی نظمیں

علامہ شبلی سے پہلے مذہبی، اخلاقی اور تاریخی نظمیں لکھنے کا عام رواج نہ تھا۔ انھوں نے

اس کا آغاز کیا اور اس رنگ وآہنگ اور لب ولہجے میں یہ نظمیں کہیں جس کی مثال اس سے پہلے کے ذخیرہ ادب میں نہیں ملتی۔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی:

''مولانا نے تاریخی اور اخلاقی نظموں کے دو الگ سلسلے شروع کئے۔ جن میں سے ہر ایک اپنی خوبی اور بلندی کے لحاظ سے اردو کے بڑے بڑے ضخیم دیوانوں کے مقابلہ میں بھاری ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اردو ادب میں ان کی کوئی مثال نہیں اور نہ اب تک ان کی تقلید کی جا سکی۔ ان نظموں نے ایک طرف اسلامی تاریخ کے انمول موتیوں کو ایک دھاگے میں پرو کر قومی اخلاق کے حسن کو دوبالا کیا۔ دوسری طرف ہماری زبان کی شاعری میں صحیح واقعات کو نظم کرنے کے بہترین نمونے پیش کئے۔ اکثر کہا گیا ہے کہ بہترین شاعری وہ ہے جس میں جھوٹ یعنی مبالغہ اور خیال آرائی کا حصہ زیادہ ہو مگر مولانا کی ان نظموں نے یہ دکھا دیا کہ واقعیت کی سطح پر بھی شاعری کا کمال دکھایا جا سکتا ہے۔'' (۴۷)

ان نظموں کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں تاریخ کی سچائیاں بھی مضمر ہیں اور بیان واقعہ میں کہیں تخیل اور مبالغے سے کام نہیں لیا گیا ہے، بلکہ ایک حقیقت نگار مورخ کی طرح پورے واقعہ کو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ واقعیت کے ساتھ شعریت، طرز ادا کی چستی، اثر انگیزی اور استعارات کی نازک خیالی بھی موجود ہے۔ سلاست و روانی بھی کہیں متاثر نہیں ہوتی۔ ہجرت نبویؐ، اہل بیت رسولؐ کی زندگی، ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر، مساوات اسلام، عدل فاروقی کا نمونہ، جرأت وصداقت، ہمارا طرز حکومت، عدل جہانگیری، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا انصاف وغیرہ بلند پایہ مذہبی، اخلاقی اور تاریخی نظمیں شبلی کی شاعرانہ عظمت اور رچے ہوئے تاریخی شعور کی مثالیں ہیں۔

شاعری کا اگر بنیادی مقصد اصلاح تسلیم کر لیا جائے تو شبلی کی اخلاقی شاعری اس میں سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوگی۔ تاثیر وتاثر میں ڈوبی ہوئی یہ نظمیں بیداری قلب وروح کی ضامن ہیں اور یقیناً قلب کو حرارت اور روح کو بالیدگی عطا کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر طوالت کے

باوجود شبلی کی نظم ''ہمارا طرز حکومت'' یہاں نقل کی جاتی ہے:

کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی ان ممالک پر — مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان ودل پر تھا
قرابت راجگان ہند سے اکبر نے جب چاہی — کہ یہ رشتہ عروس کشور آرائی کا زیور تھا
تو خود فرماں دہ جے پور نے نسبت کی خواہش کی — اگرچہ آپ بھی وہ صاحب دیہم وافسر تھا
ولی عہد حکومت اور خود شاہنشہ اکبر — گئے آمیر تک جو تخت گاہ ملک وکشور تھا
ادھر راجہ کی نور دیدہ گھر میں حجلہ آرا تھی — ادھر شہزادے پر چتر عروسی سایہ گستر تھا
دلہن کو گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے — کہ کوسوں تک زمیں پر فرش دیبائے مشجر تھا
دلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پر جو لائے تھے — وہ شاہنشاہ اکبر اور جہانگیر ابن اکبر تھا
یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطر محبت کی — کہ جن سے بوستان ہند برسوں تک معطر تھا
تمھیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا — کہ اورنگ زیب ہندو کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا

شبلی کی مذہبی، اخلاقی اور تاریخی نظموں میں واقعہ نگاری، منظر نگاری، تصویر کشی اور غیر معمولی تاثیر کے جوہر بدرجہ اتم موجود ہیں، بلکہ ان نظموں کے یہی وہ اوصاف ہیں جو شبلی کو دوسرے نظم نگاروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ انھیں نظموں کو دیکھ کر ڈپٹی نذیر احمد نے کہا تھا:

تم اپنی نثر کو لو نظم کو چھوڑو نذیر احمد
کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی

کلیات شبلی میں مندرجہ ذیل مذہبی اور اخلاقی نظمیں شامل ہیں:

ہجرت نبویؐ، تعمیر مسجد نبویؐ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلم اور عفو، اہل بیت رسول کی زندگی، ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر، مساوات اسلام، خلافت فاروقی کا ایک واقعہ، عدل فاروقی کا ایک نمونہ، اظہار وقبول حق، جرأت وصداقت، نظام حکومت اسلام، ہمارا طرز حکومت، عدل جہانگیری، اسلام کے تنزل کا اصلی سبب، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا انصاف، شغل تکفیر، مذہب یا سیاست، خواتین عرب کا ثبات واستقلال وغیرہ۔

علامہ شبلی کی یہ نظمیں اسلامی تاریخ کے بعض واقعات وروایات پر مبنی ہیں۔ رسول اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین اور دیگر اکابرین کے مرقعے اور تاریخ اسلام کے اخلاقی واقعات کونظم کا موضوع بنا کرشبلی نے اخلاق سلف کوزندہ کرنے کی کوشش کی ہےاور واضح کیا ہے کہ انسانی جذبات واحساسات کوصحیح سمت،انہیں نصیحت آمیز واقعات سے دی جاسکتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے سچے واقعات کوسلیس اورشگفتہ زبان میں نظم کر کے شعریت اورواقعیت کوایک نیا قالب عطا کیا ہےاورثابت کردیا ہے کہ شاعری بغیرتصنع اورمبالغے کے بھی کی جاسکتی ہے۔

مذکورہ نظموں کے تجزیے میں متعدد نقادوں نےتحسین وستائش اورفکروفن کی بلندی کا اعتراف کیا ہے۔پروفیسرآل احمدسرور نے''اہل بیت رسول کی زندگی''''مساوات اسلام'' اور ''عدل جہانگیری''کوفکروفن کانمونہ قراردیا ہے۔خاص طور پرعدل جہاں گیری کےاس شعر:

اس کی پیشانی نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جاکے بن جاتی تھی اوراق حکومت پہ شکن

کی بے حدستائش کی ہے اورلکھا ہے کہ''اردو میں اس معجز بیانی کی کوئی دوسری مثال اس وقت میرے ذہن میں نہیں۔'' [فکرونظر،علی گڑھ،شبلی نمبرص۱۳]

علامہ شبلی کی نظموں کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی نظموں کے ذریعہ ملک میں قومی یک جہتی اوررواداری کے جذبات کوفروغ دیتے ہیں۔عدل جہانگیری اس سلسلہ کی ایک مثالی نظم ہے۔البتہ شبلی کی نظم نگاری کے جوہران کی سیاسی نظموں میں زیادہ کھلتے ہیں۔

سیاسی نظمیں

کلیات شبلی میں شبلی کی سیاسی نظمیں سب سے زیادہ اہم ہیں۔وہ نہ صرف ان کا بلکہ شعر وادب اورتاریخ وسیاست کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔عالم اسلام کے سیاسی حالات،مسلمانوں کی پستی وزبوں حالی اورذلت ورسوائی پرشبلی جس طرح تڑپے اور بےقرار ہوئے ہیں شعراء کے یہاں اس کی مثال شاید ہی ملے۔اصلاً ان کے یہی خونیں آنسونظم کے پیکر میں ڈھلے ہیں اوریہی وجہ ہے کہ تاثیراوراثر انگیزی کے لحاظ سے ان نظموں کا اردوادب میں جواب نہیں۔اس سلسلہ کی نظموں میں

سب سے اہم اور قابل ذکر وہ نظم ہے، جو انھوں نے شہر آشوب اسلام کے نام سے لکھی تھی اور جو رفاہ عام لکھنؤ کے اجلاس عام میں پڑھی گئی تھی۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کبتک — چراغ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کبتک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کردیئے ٹکڑے — فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کبتک
مراکش جاچکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے — کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض خستہ جاں کبتک
یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے — اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کبتک

مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ جب یہ نظم پڑھی گئی تو اس کا یہ اثر تھا کہ صدر سے لے کر پائیں تک ماتم برپا ہو گیا۔(۲۸) بلاشبہ اس وقت کے عالم اسلام کے جو حالات تھے اس نے مسلمانوں کو سراپا جوش وعمل بنادیا تھا۔ ایک طرف اٹلی نے ترکی پر حملہ کر کے طرابلس کو چھین لیا تھا تو دوسری طرف بلقان بھی ترکی پر حملہ آور تھا، جس سے ترکوں کو شدید نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس سے مسلمانوں میں سخت ہیجان برپا تھا اور ان کے جذبات مشتعل اور برانگیختہ ہو گئے تھے۔ اس پر آشوب زمانے میں شبلی کے علاوہ شاید ہی کسی نے عالم اسلام کی صورت حال اس پرسوز اور دردانگیز لہجے میں بیان کی ہو۔ عالم اسلام پر جو کچھ گذر رہی تھی وہ تمام کارروائیاں انگریزوں کی طرف سے یا پھر ان کی شہ پر ہو رہی تھیں جو خود کو انسانیت نواز اور امن کا علمبردار بتاتے تھے۔ شبلی کہتے ہیں:

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو — یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ حشر انگیزیاں کبتک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے — ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کبتک
یہ مانا گرمی محفل کے ساماں چاہئے تم کو — دکھائیں ہم تمھیں ہنگامہ آہ وفغاں کبتک
یہ مانا قصہ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے — سنائیں تم کو اپنے درد دل کی داستاں کبتک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا — ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کبتک

علامہ شبلی کا خیال تھا کہ دولت عثمانیہ کا زوال دراصل شرع ملت کا زوال ہے اور پھر اگر یہ خلافت محفوظ نہ رہی تو توحید گلبانگ اذاں، احترام سجدگاہ قدسیاں کہاں محفوظ رہ سکیں گے۔

زوال دولت عثماں زوال شرع ملت ہے — عزیز وفکر فرزند وعیال وخانماں کبتک
خدا را تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں — نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کبتک

آخر میں متنبہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

جو گونج اٹھے گا عالم شور ناقوس کلیسا سے   تو پھر یہ نغمہ توحید وگلبانگ اذاں کبتک
کہیں اڑکر یہ دامان حرم کو بھی نہ چھوآئیں   غبار کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کبتک
حرم کی سمت بھی صیدافگنوں کی جب نگاہیں ہیں   تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کے آشیاں کبتک

عالم اسلام کے حالات سے شبلی کس قدر دل برداشتہ تھے، ان کے اس شعر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں   کہ اب امن وامان شام ونجد وقیرواں کبتک

شہرآشوب اسلام کے بڑے دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے بس یہ ذکر کرنا کافی ہوگا کہ ایک صدی بعد مشہور ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی نے اس کے چھ بندوں کا انتخاب کرکے ''مژدہ'' کے نام سے تضمین کی۔ بلکہ عمدہ تضمین کی۔

[ا]

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کبتک
چراغ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کبتک

زوال ملت اسلامیہ کے نوحہ خواں شبلی   مبارک ہو کہ کروٹ لے رہا ہے آسماں شبلی
مٹائے گا ہمارا کون اب نام ونشاں شبلی   دھواں گرما چکا اڑنے کو ہیں چنگاریاں شبلی

[۲]

بکھرتے جاتے ہیں شیرازہ اوراق اسلامی
چلیں گی تند باد کفر کی یہ آندھیاں کبتک

یقیناً موت کا پیغام ہے تنظیم کی خامی   جگا بھی تو دیا کرتا ہے اکثر درد ناکامی
اکٹھا ہو رہے ہیں منتشر اوراق اسلامی   چھپیں گی قصر سلطانی میں اب یہ آندھیاں شبلی

[۳]

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کبتک

ہمارے خون سے دامان گلستاں ہو چلا رنگیں خزاں کے دام میں جکڑے پڑے ہیں سنگدل گلچیں
خوشا تہذیب انسانی کے استادوں کو لے ڈوبی وہ حشر انگیزیاں شبلی وہ ظلم آرائیاں شبلی

[۴]

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پہ ہوگا اس کا امتحاں کبتک
لیا ہے یہ سبق ہم نے خود اپنے خوں شدہ دل سے ستم کی خو بدل سکتی نہیں فریاد بسمل سے
تڑپ کر چھین لیں گے تیغ ہم اب دست قاتل سے ہماری گردنوں پر اب نہ ہوگا امتحاں شبلی

[۵]

یہ مانا گرمی محفل کے ساماں چاہئیں تم کو؟
دیکھائیں ہم تمہیں ہنگامہ آہ وفغاں کبتک
افق پر کروٹیں لینے لگا جمہور کا پرچم نئے سانچے میں ڈھلتا جا رہا ہے عرصۂ عالم
ہمارے ہمھوں سے جن کی محفل ہو چلی برہم وہ کیا دیکھیں گے اب ہنگامۂ آہ وفغاں شبلی

[۶]

یہ مانا قصہ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے درد دل کی داستاں کبتک
وہ گل شعلہ بنے جن پر ستم کروٹ بدلتا تھا وہ رات آخر ہوئی جس میں چراغ ظلم جلتا تھا
ہمارا قصۂ غم سن کے جن کا جی بہلتا تھا قریب ختم آ پہنچی انہیں کی داستاں شبلی

متعدد نقادوں نے کیفی اعظمی کی اس تضمین کو سراہا ہے اور اس کو فکر شبلی کی ارتقا کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ کیفی اعظمی کے دیوان ''سرمایہ'' (معیار پبلی کیشن دہلی، طبع دوم ۲۰۰۸ء) میں شہر آشوب اسلام کے چھ بندوں میں تین بند کے پہلے مصرعے غلط نقل کئے گئے ہیں، آئندہ اشاعت میں ان کی تصحیح ضروری ہے۔

علامہ شبلی کی سیاسی نظموں میں خیر مقدم ڈاکٹر مختار انصاری بھی ایک بڑی پر اثر نظم ہے۔ ڈاکٹر انصاری جنگ بلقان میں طبی وفد لے کر گئے تھے۔ وہ واپس آئے تو علامہ شبلی بمبئی میں تھے۔

وہیں یہ نظم لکھی اور خیر مقدمی جلسے میں پڑھی گئی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نئے سب انقلاب گردش گردوں بھی دیکھے ہیں   مسلمانوں کے تم نے طالع واژوں بھی دیکھے ہیں
کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں   تمہارا درد دل سمجھیں گے کیا ہندوستاں والے
زنان بے نوا کے چہرہ محزوں بھی دیکھے ہیں   یتیموں کے سنے ہیں نالہ ہائے جاں گزا تم نے
بلاد مغربی کے یہ نئے قانوں بھی دیکھے ہیں   گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا

آخر میں فرماتے ہیں:

تو تم نے وہ رموز قوت مکنوں بھی دیکھے ہیں   سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں   عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہوکر پھر ابھر آئے

علامہ شبلی ان نظموں کے ذریعہ مسلمانوں کی غم گساری کرتے ہیں اور اس انداز سے کرتے ہیں کہ انگریز دشمن معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا قومی وملی نظریہ وشعور یہ احساس دلاتا ہے کہ انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونا چاہئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ نظمیں آزادی وحریت کی نقیب ہیں۔

۱۹۱۲ء مچھلی بازار کان پور کی مسجد کے وضوخانہ کے انہدام اور پھر مسلمانوں پر گولیاں برسانے کی وجہ سے ملک میں انگریزوں کے خلاف غم وغصہ اور نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی تھی، اس پر علامہ شبلی نے کئی نظمیں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دیکھا قریب جاکے تو زخموں سے چور تھے   کل مجھ کو چند لاشہ بے جاں نظر پڑے
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں   کچھ طفل خورد سال کہ چپ ہیں خود مگر
جو خاک وخوں میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں   کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادہ فنا
ہم کشتگان معرکہ کان پور ہیں   پوچھا جو میں نے کون ہو تم آئی یہ صدا

سانحہ کان پور پر انھوں نے جو نظمیں لکھیں ان میں ان کی قومی حمیت وغیرت اپنے شباب پر ہے۔ وہ خود خون کے آنسو روئے اور پورے ملک کو رلایا۔ حقیقی شاعری یہی ہے کہ جو جذبہ واثر شاعر کے دل پر ہو وہی جذبہ پڑھنے والے کے دل پر بھی قائم کردے۔ انھیں افسوس تھا کہ وہ بمبئی میں رہ کے محروم سعادت رہے:

کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محروم سعادت ہے

اسی زمانہ میں جنگ بلقان کا واقعہ پیش آیا اس سے شبلی کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں رہے اوران کا جگر شق ہوگیا۔ مگر اس کے باوجود جو چند قطرہ خوں بچا، وہ کانپور کے زخمیوں کی نذر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

اگرچہ صدمہ بلقان سے جگر شق ہے   اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی
کہ کان پور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے   بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرہ خوں

عدد اور ظہور میں رسول عربؐ کی قوم کے کم ہونے کی وجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ مسلمان جنگ بلقان اور واقعہ کان پور میں بے دردی سے شہید کئے جارہے ہیں:

کیوں گھٹ رہی ہے آج عدد میں ظہور میں   کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسول عرب کی قوم
کچھ بیلقاں کی خاک میں کچھ کان پور میں   سن لو وہ گنجہائے گراں مایہ دفن ہیں

شبلی کے واقعہ گزند پا کا ذکر متعدد مقامات پر ہے۔ مگر کہیں انھوں نے اس پر اظہار تاسف نہیں کیا لیکن جب علماء کو زنجیریں پہنائی گئیں تو اس پر انھوں نے کس قدر خوب صورت شاعرانہ تلمیح کی ہے:

ان کا کیا ذکر جو اس درد میں شامل ہی نہیں   ہم قدم آپ کا ہونا تو بہت دشوار ہے
یعنی افسوس میں زنجیر کے قابل ہی نہیں   پاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہے صدمہ

شبلی کی ان نظموں سے آزادی وحریت کے جو جذبات برانگیختہ ہورہے تھے انگریزی حکام کی ان پر نظر تھی اور وہ شبلی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے اور بالآخر ان کی نظم ''جنگ یورپ اور ہندوستانی''، شبلی کی گرفتاری کا جواز قرار پائی لیکن چونکہ اس سے پہلے انھوں نے وفات پائی، اس لئے وہ اس سعادت سے محروم رہے۔ جنگ عظیم پر ان کی یہ نظم پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے:

آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں   ایک جرمنی نے مجھ سے کہا ازرہ غرور
اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں   برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم
آئیں شناس شیوہ پیکار بھی نہیں   باقی رہا فرانس تو وہ رند لم یزل
دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں   میں نے کہا غلط ہے ترا دعویٔ غرور

ہم لوگ اہل ہند ہیں جرمن سے دس گنے تجھ کو تمیز اندک وبسیار بھی نہیں
سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور پھر وہ کہا جو لائق اظہار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

علامہ شبلی کی شاعری کا ایک اہم موضوع مسلم لیگ ہے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی تو اس کے مقاصد سے شبلی کو اختلاف تھا۔ لیگ کے طرز سیاست سے بھی وہ نالاں رہے۔ اس لئے انھوں نے اپنی شاعری میں اس پر سخت چوٹیں کیں۔

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں ملک میں ولولہ ہے شور بھی کہرام بھی ہے
مختصر اس کے فوائد کوئی پوچھے تو یہ ہیں محسن قوم بھی ہے خادم حکام بھی ہے

شبلی کانگریس کے حامی دوقومی نظریہ کے مخالف اور ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔ مسلم لیگ سے اختلاف کا اصل سبب ان کی یہ فکر تھی۔ اپنے معترضین کے جواب میں کہتے ہیں:

معترض ہیں مجھ پہ مہربانان قدیم جرم یہ ہے میں نے کیوں چھوڑا وہ آئین کہن
میں نے کیوں لکھے مضامین سیاست پے بہ پے کیوں نہ کی تقلید طرز رہنمایان زمن
کانگریس سے مجھ کو اظہار برأت کیوں نہیں کیوں حقوق ملک میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن

ان کو یہ بات پسند نہ تھی کہ ہندو جدوجہد سے کامیابی حاصل کریں تو مسلم لیگ اس میں حصہ دار بن جائے:

سعی بازو سے ملیں جب ہندوؤں کو کچھ حقوق اس میں کچھ حصہ ملے ہم کو بھی بہر پنجتن
یعنی جا کر شیر جب جنگل سے کر لائے شکار لومڑی پہنچے کہ کچھ مجھ کو بھی اے سرکار زمن

ایک نظم میں شبلی نے مسلم لیگ سے یہ درخواست کی ہے کہ وہ ملک کے مسائل کو انگریزی حکومت کے سامنے اٹھائے۔ پولس کے مظالم، مقدمات کے حالات، کاشت کاروں کی حالت، حکومت کا جبر وقہر وغیرہ مسائل کو اگر پر زور انداز میں نہیں تو کم از کم اشاروں میں کہا جائے اور جب انھیں اس سلسلے میں مایوسی ہوتی ہے تو طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جناب لیگ نے سب کچھ یہ سن کے فرمایا مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے

مسلم لیگ سے متعلق جو نظمیں شبلی نے کہی ہیں ان میں خاص خوبی ڈرامائی کیفیت اور طنز نگاری ہے۔ آخر کے اشعار میں وہ ایسا رخ اختیار کرتے ہیں کہ مسلم لیگ کی حالت قابل رحم ہو جاتی ہے۔

مسلم یونیورسٹی پر ان کی جو نظمیں کلیات میں شامل ہیں، وہ ملی حمیت اور علی گڑھ سے جذباتی تعلق کا پتہ دیتی ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ علامہ شبلی کو ایم اے او کالج سے غایت تعلق تھا۔ ان کی زندگی کے سب سے قیمتی اور خوب صورت دن اسی کے احاطے اور سرسید احمد خاں کی معیت میں گذرے تھے۔ سرسید کی نظر میں حالی اور آرنلڈ کے ساتھ وہ بھی کالج کے قابل افتخار لوگوں میں سے تھے۔ ان کے علی گڑھ کے احباب کی ہمیشہ خواہش رہی کہ وہ کالج واپس آ جائیں۔

اس کی متعدد کمیٹیوں کے وہ رکن بھی رہے۔ ۱۹۱۰ء میں کالج کو یونیورسٹی بنانے کی جد جہد کے لئے جو کمیٹی بنی تھی علامہ شبلی اس کے بھی رکن نامزد ہوئے۔ چنانچہ اس کے لئے انہوں نے بڑی تگ و دو کی۔ اس کے اجلاسوں میں پابندی سے شریک ہوتے۔ شملہ وفد میں بھی وہ شامل تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یونیورسٹی بنانے میں ان کا بھی حصہ ہے۔

یہی دور ہے جس میں علامہ شبلی طنزیہ نظمیں لکھ رہے تھے۔ اس میں چند نظمیں مسلم یونیورسٹی سے متعلق بھی لکھی ہیں۔ جس میں بعض جزئی اور وقتی باتوں پر طنز کیا ہے اور اس قدر عمدہ طنز کیا ہے کہ شاید ہی اس کی دوسری مثال مل سکے۔ یہاں اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں بعض معاملات کے تصفیے کے لئے ایک جلسے میں قرار داد پیش کی گئی کہ وائسرائے کے پاس ایک وفد بھیجا جائے۔ اس تجویز کی خواجہ غلام الثقلین نے شدید مخالفت کی۔ مگر جب ان کا نام وفد میں شامل کر لیا گیا تو وہ بالکل خاموش ہو گئے۔ اس واقعہ پر شبلی کا طنز ملاحظہ ہو:

تھی سفارت کی جو تجویز بظاہر موزوں
اہل مجلس بھی بظاہر نظر آتے تھے خموش
دفعتاً دائرہ صدر سے اٹھا اک شخص
جس کی آزادی تقریر تھی غارت گر ہوش

اس نے اس زور سے تجویز پہ کی ردوقدح
چونک اٹھے وہ بھی جو بیٹھے ہوئے تھے پنبہ بگوش
اہل مجلس نے جو بدلا ہوا دیکھا انداز
ڈر ہوا یہ کہ کہیں اور نہ بڑھ جائے خروش
صدر محفل نے بلاکر اس سے آہستہ کہا
کہ '' تو ہم شامل وفد ستی وایں مایہ مجوش''
بادہ جام سفارت مے مرد افگن تھا
ایک ہی جرعہ میں وہ شیر جری تھا خاموش
اب نہ وہ طرز سخن تھا نہ وہ آزادی رائے
نہ وہ ہنگامہ طرازی تھی نہ وہ جوش خروش
جس کی تقریر سے گونج اٹھتا تھا اجلاس کا ہال
اب وہ پیکر تصویر تھا بالکل خاموش
سخت حیرت تھی کہ اک ذرہ خاکستر تھا
وہ شرارہ جو ابھی برق سے تھا دوش بدوش
دیکھتے ہیں تو حرارت کا کہیں نام نہیں
ہوگیا شعلہ سوزندہ بھڑک کر خس پوش
اہل ثروت سے یہ کہہ دو کہ مبارک ہو تمہیں
للہ الحمد ابھی ملک میں ہیں رائے فروش

اس طرح کی بعض اور وقتی نظمیں کلیات شبلی میں ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی، محمد امین زبیری وغیرہ نے انہیں سرسید اور علی گڑھ کی مخالفت کے ضمن میں پیش کیا ہے، لیکن یہ حقیقت نہیں۔

اسی طرح کی وقتاً فوقتاً لکھی جانے والی نظموں کی بنیاد پر پروفیسر آل احمد سرور نے شبلی کی شاعری کو کبھی کبھی کی موج قرار دیا ہے۔(۲۹) اور فی الواقع یہ صحیح بھی ہے مگر کبھی کبھی کی موج اپنے اندر کتنی شدت پوشیدہ رکھتی ہے اور شبلی کی دریائے سخن کی موجوں نے کتنوں کو پیچ وخم اور گرداب

سے نکالا اور ساحل مراد تک پہنچایا، اس کا اندازہ کبھی کبھی کی موجوں کی طغیانی اور شدت سے لگایا جاسکتا ہے۔شبلی کے جذبات کی شدت کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی سیاسی نظمیں آج بھی دلوں کو گرم اور دماغ کو مشتعل کرتی ہیں اور آئندہ بھی کرتی رہیں گی۔

غرض کلیات شبلی مختصر ہونے کے باوجود مختلف النوع شاعری کا مجموعہ ہے۔ اس لئے اس کی قدر و قیمت میں اور اضافہ ہوگا۔

حوالے

(۱) کلیات شبلی ص ۱، مرتبہ سید سلیمان ندوی دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۸۷ء طبع ششم

(۲) ڈاکٹر سلام سندیلوی، مولانا شبلی کی اردو شاعری، ادیب شبلی نمبر ص ۱۵۴

(۳) مکاتیب شبلی ج ۱، ص ۳۴۱۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء

(۴) خطوط شبلی ص ۱۰۴، مرتبہ امین زبیری ظل السلطان بک ایجنسی بھوپال (ب ت)

(۵) عبدالقادر سروری، جدید اردو شاعری ص ۱۳۴، حیدرآباد ۱۹۳۲ء

(۶) محبوب الرحمٰن کلیم، علامہ شبلی اور ان کی شاعری، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۱۸ء ص ۳۱۴

(۷) مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی ص ۷۱، دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء طبع چہارم

(۸) ماہنامہ معارف، دسمبر ۱۹۱۸ء ص ۳۱۴

(۹) ایضاً

(۱۰) علامہ شبلی شعر العجم ج ۴، ص ۱۴، دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۸۶ء طبع ہشتم

(۱۱) محمد یحییٰ تنہا، سیر المصنّفین ج ۱، ص ۴۰۷، غازی آباد ۱۹۲۴ء

(۱۲) مہدی افادی، افادات مہدی ص ۲۱۳، گورکھپور

(۱۳) مکاتیب شبلی ج ۱، ص ۱۴۱

(۱۴) اختر جوناگڑھی، علامہ شبلی بحیثیت شاعر، تماہی ہندوستانی الہ آباد ۱۹۳۶ء ص ۴۴۴

(۱۵) کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر ص ۴۳، عظیم پبلشنگ ہاؤس پٹنہ (ب ت)

(۱۶) جدید اردو شاعری ص ۱۳۷

(۱۷) مکاتیب شبلی ج ا،ص ۹۶

(۱۸) رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو حصہ دوم ص ۶۷، منشی تیج کمار لکھنؤ ۱۹۶۹ء طبع چہارم

(۱۹) ادیب شبلی نمبر ص ۱۵۸

(۲۰) جدید اردو شاعری ص ۴۴

(۲۱) عبداللطیف اعظمی، مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں ص ۱۸۸، شبلی اکادمی دہلی ۱۹۴۵ء

(۲۲) ادیب شبلی نمبر ۱۵۷

(۲۳) ایضاً ص ۱۵۸

(۲۴) کلیات شبلی ص ۱۱

(۲۵) ایضاً

(۲۶) ایضاً ص ۴۴۰

(۲۷) خلیق انجم، شبلی کی علمی وادبی خدمات ص ۲۰۹، انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۹۰ء

(۲۸) کلیات شبلی ص ۱۸-۱۹

(۲۹) مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں مقدمہ ص ۱۵

باب ششم

مقالات وخطبات

مجموعہ مقالات

اردو میں مقالہ نگاری سرسید علیہ الرحمہ کا کارنامہ ہے۔ علامہ شبلی نے اسے مزید ترقی دی بلکہ خالص تاریخی مقالہ نگاری کے آغاز کا سہرا علامہ شبلی کے سر ہے۔ انھوں نے سیکڑوں علمی، ادبی، تاریخی، تعلیمی، تنقیدی اور فلسفیانہ مضامین ومقالات لکھ کر سرمایہ اردو میں گراں قدر اضافہ اور سرسید احمد خاں کی روایت کو مزید ترقیوں سے ہمکنار کیا۔ ان کے تاریخی مقالات نے علم وتحقیق کے میدان میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض تاریخی مقالات مثلاً مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، کتب خانہ اسکندریہ، حقوق الذمیین اور الجزیہ وغیرہ کو جو شہرت ومقبولیت ملی وہ اس دور کی بہت سی کتابوں کے بھی نصیب میں نہ آئی۔

علامہ شبلی کی زندگی میں ان کے مضامین کا ایک مجموعہ رسائل شبلی ۱۸۹۸ء میں ان کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا تھا جس کی دوبارہ اشاعت ممکن نہ ہوئی۔

رسائل شبلی

علامہ شبلی نے علی گڑھ میں بلند پایہ کتابوں کے ساتھ معرکہ آراء تحقیقی مقالات بھی سپرد قلم کئے، ان میں بعض مقالات علم وتحقیق کے لحاظ سے کتاب سے بھی بڑھ کر درجہ رکھتے ہیں۔ مثلاً الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ اور حقوق الذمیین وغیرہ۔ ان میں مولانا شبلی نے مؤرخین یورپ کی بعض غلط بیانیوں کی تردید کی ہے اور مضبوط دلائل وبراہین سے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں پر علم دشمنی اور ظلم وجبر کا الزام محض الزام ہے، حقیقت سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔

افادیت کے پیش نظر ان تاریخی اور تحقیقی مقالات کو ''رسائل شبلی'' کے نام سے خود

علامہ شبلی نے ۱۸۹۸ء میں مطبع العلوم علی گڑھ سے شایع کیا۔اس کا ایک ایڈیشن اسٹیم پریس امرتسر سے شایع ہوا۔۱۹۱۱ء میں ایک اور ایڈیشن شیخ عبدالعزیز نے امرتسر ہی سے شایع کیا۔ رسائل شبلی میں مندرجہ ذیل مقالات شامل ہیں:

[۱] اسلامی حکومتیں اور شفاخانے [۲] اسلامی کتب خانے [۳] حقوق الذمیین ۔ [۴] الجزیہ [۵] میکنکس اور مسلمان [۶] خطبہ ندوۃ العلماء اجلاس اول [۷] النظر فی السفر الی المؤتمر [۸] کتب خانہ اسکندریہ [۹] تراجم ۔[۱۰] اسلامی مدارس ۔[۱۱] قدیم تعلیم

ان مقالات کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''یہ مضامین زیادہ تر مسلمانوں کی تہذیب وتمدن سے متعلق ہیں۔ان میں یا تو اسلام کے آئینہ سے اس کے گردوغبار کو صاف کیا گیا ہے جو یورپین تعصب کی آندھی نے اس پر ڈالا تھا یا مسلمانوں کے عہد زریں کے مرقع کی کوئی پرانی تصویر جو نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی دوبارہ منظر عام پر لائی گئی ہے۔''(۱)

علامہ شبلی کے یہ وہ تاریخی اور تحقیقی مقالات ہیں جن کی اردو زبان میں مثال بھی شاید ہی ملے۔اردو میں ان مقالات کی بدولت تحقیقی مقالہ نگاری کا آغاز ہوا بلکہ آج بھی اس طرح کے جو مقالات سپرد قلم کیے جاتے ہیں وہ دراصل اسی روایت شبلی کا حصہ ہیں۔

رسائل شبلی علامہ شبلی کے مؤرخانہ شعور وآگہی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔چونکہ ان مقالات کا مفصل ذکر مقالات شبلی کے ضمن میں آئے گا، اس لیے یہاں اس کی تفصیلات سے صرف نظر کیا جاتا ہے، البتہ رسائل شبلی کے مقدمہ کا ذکر ضروری ہے۔اس میں انھوں نے ان مقالات کا سبب تحریر بیان کیا ہے چونکہ یہ دیباچہ کہیں اور شائع نہیں ہوا اور اب رسائل شبلی تقریباً ناپید ہے۔ اس لیے طوالت کے باوجود اس کا بڑا حصہ نقل کیا جاتا ہے۔مولانا شبلی لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے اگلے کارناموں کا غلغلہ سب سے پہلے اُس گروہ نے بلند کیا جو آج نیا گروہ کہلاتا ہے، اگر چہ اس مقصد کے لیے ان بزرگوں کو تاریخی تحقیقات سے بالذات سروکار نہ تھا لیکن چونکہ قوم کو حوصلہ اور غیرت دلانے کے لیے اس سے زیادہ کوئی افسون کارگر نہ تھا کہ ''تمہارے اسلاف نے یہ یہ کارہائے نمایاں

کیے تھے، تم کو بھی انہیں کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔'' اس لیے یہ بزرگ جب کبھی تقریر یا تحریر کے ذریعہ سے لوگوں کو گرمانا چاہتے تھے تو خواہ مخواہ اُن کو اسلاف کے کارناموں کا حوالہ دینا پڑتا تھا۔ رفتہ رفتہ اِن پُرفخر واقعات کی طرف زیادہ توجہ مبذول ہوتی گئی یہاں تک کہ تاریخی تحقیقات کی ابتدا ہوئی اور بعض بعض اہل قلم نے خاص اس بحث پر جستہ جستہ مضامین لکھے، لیکن چونکہ یہ ان کا اصلی کام نہ تھا۔ اس لیے جو کچھ ہوا وہ ایک سرسری کارروائی سے زیادہ نہ تھا۔

اسی اثنا میں ۱۸۸۷ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کی تحریک سے میں نے ایک رسالہ لکھا جس میں یہ بحث تھی کہ مسلمانوں نے دنیا کی کیا کیا زبانیں سیکھیں اور غیر قوموں کے کون کون سے علوم وفنون کے ترجمے کیے۔ نیز یہ کہ مسلمانوں نے دنیا میں ہر جگہ کس قدر بڑے بڑے مدارس اور دارالعلوم تعمیر کیے۔ یہ رسالہ اگرچہ ناتمام تھا یعنی پہلی بحث کا استقصا نہیں کیا گیا تھا، تاہم چوں کہ ہماری زبان میں اس وقت تک اس مضمون کے متعلق اس قدر سرمایہ بھی نہیں مہیا ہوا تھا، نہایت مقبول ہوا اور یونانی تراجم کی آواز تمام ملک میں گونج اٹھی۔

قبول عام کی بنا پر مجھ کو خیال پیدا ہوا کہ قوم میں تاریخ کا صحیح مذاق پیدا ہو گیا ہے جو قوم کی علمی ترقی کی جان ہے لیکن واقعات سے ثابت ہوا کہ یہ محض دھوکا تھا۔ مقبولیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ قوم میں عموماً استخواں فروشی اور اسلاف پرستی کی خاصیت موجود ہے، اس لیے بزرگوں کی عظمت کی نسبت جو کچھ صحیح یا غلط کہا جاتا ہے خواہ مخواہ اس کو قبول ہو جاتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ باوجود اس شوروغل کے جو اسلامی ترقیوں کی نسبت کیا جاتا ہے، تحقیقات میں کچھ اضافہ نہیں ہوا۔ بلکہ وہی چند واقعات ہیں جو سیکڑوں پیرایہ میں بار بار بیان کیے گئے اور کیے جاتے ہیں۔ نئی تحقیقات کا کسی کو خیال تک نہیں آتا۔

قوم کی بدمذاقی کے خیال نے مجھ کو بالکل افسردہ کر دیا تھا لیکن یورپ میں جو

اورینٹل کانفرنس قائم ہے۔اس کی کارروائیوں نے ایک نئی تحریک دل میں پیدا کی۔اس کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ مشرقی قوموں کی (جس میں مسلمان بھی داخل ہیں۔) ہرقسم کی علمی وعملی ترقیوں کے حالات بہم پہنچائے۔چنانچہ پہلے سال جواس کا اجلاس ہوا اس میں یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے علم وادب اور صنائع کے متعلق ایک مبسوط مجموعہ کیا تیار کیا جائے۔کانفرنس کے سلسلہ سے الگ یورپ میں اور بہت سے لوگ اپنے ذاتی شوق سے مسلمانوں کے متعلق ہرقسم کی تحقیقات میں مصروف ہیں۔چنانچہ ایک جرمنی عالم نے نہایت تحقیقات کے ساتھ ایک مبسوط کتاب اس عنوان پر لکھی ہے کہ ''مسلمانوں نے خاص علم طب کی کیا کیا کتابیں یونانی زبان سے ترجمہ کیں۔'' یہ دیکھ کر مجھ کو خیال ہوا کہ جو کام اورقومیں کررہی ہیں وہ دراصل ہمارا کام ہے اور یہ ایک بے غیرتی کی بات ہے کہ ہم اپنے کام میں دوسروں کا احسان اٹھائیں۔اس خیال سے میں نے اس سلسلہ کو پھرشروع کیااور مختلف عنوانوں پرمضامین لکھے۔

ان میں سے تراجم کا مضمون جس کو میں نے لکھنؤ کی کانفرنس میں پیش کیا تھا اورجس کے ساتھ مدارس اسلامیہ کے حالات بھی شامل تھے، اُس کے متعلق نہایت کثرت سے نئی معلومات بہم پہنچیں۔یونانی ،سریانی، پہلوی، ژند قبطی، سنسکرت، ہرایک زبان کے ترجموں کی بہ نسبت معتد بہ سرمایہ ہاتھ آیااورسیکڑوں کتابوں کے نام دریافت ہوئے جوان زبانوں سے عربی میں ترجمہ کی گئیں، اس بناپر میں نے اس مضمون کوایک مستقل مضمون قرار دیا اور مدارس اسلامیہ کے حالات الگ عنوان سے لکھے۔تاریخی سلسلہ کے علاوہ اور جومضامین اس مجموعہ میں ہیں اُن غلط فہمیوں کے متعلق ہیں جو یورپ میں اسلام اوراہل اسلام کی نسبت پھیلی ہوئی ہیں۔

یورپ نے صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں،مسلمانوں کے متعلق بہت سے متعصّبانہ خیالات قائم کرلیے تھےاوروہ اب تک قائم ہیں۔یورپ کے عربی داں مصنّفین

نے جو تعصب سے پاک ہیں، ان غلطیوں کو کسی قدر کم کیا ہے، لیکن بالکل مٹا نہیں سکے۔ یہی غلطیاں ہیں جنھوں نے یورپ کی قوموں کو اسلام اور اہل اسلام سے اجنبی بلکہ متنفر بنا رکھا ہے اور اگر وہ بالکل دور کر دی جائیں تو قوی اُمید ہے کہ دونوں قوموں کی باہمی بیگانگی بہت کم ہو جائے اور یورپ کو مذہب اسلام کی خوبیاں نظر آتی جائیں۔

ان میں مہتم بالشان بحثیں جزیہ، غیر مذہب والوں کے حقوق اور کتب خانہ اسکندریہ کی بحثیں ہیں۔ جزیہ کا مضمون مستقل رسالہ کی صورت میں پہلے شائع ہو چکا تھا لیکن اب اس میں نہایت مفید اور ضروری معلومات بڑھا دیے گئے ہیں جن کے بغیر وہ مضمون گویا ناتمام تھا۔ دوسرا مضمون اب تک کتاب یا رسالہ کی شکل میں چھپ کر شائع نہیں ہوا تھا۔ کتب خانہ اسکندریہ کا مضمون پہلے چھپ کر شائع ہو چکا ہے اور اس میں کچھ ترمیم یا اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔‘‘(۲)

رسائل شبلی چونکہ خود علامہ شبلی کا مرتب کردہ ہے اس لیے اس کو یادگار کے طور پر شائع ہونا چاہیے۔ اس کی افادیت تو بہر طور مسلم ہے۔

مقالات اور انتخاب مقالات

رسایل شبلی کے بعد مقالات شبلی کے متعدد مجموعے شایع ہوئے۔ جن کی فہرست اور مندرجات یہ ہیں:

۱۔ مقالات شبلی انوار المطابع لکھنؤ ب ت

مندرجات

[۱] مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی [۲] برج بھاشا اور مسلمان [۳] موبدان مجوس اور سلطنت تیموریہ [۴] المعتزلہ والاعتزال [۵] علوم جدیدہ [۶] الملل والنحل اور ابن حزم ظاہری [۷] ابن رشد [۸] یونانی منطق کی غلطیاں [۹] ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر [۱۰] زیب النساء [۱۱] ہمایوں نامہ [۲] مآثر رحیمی اور عبدالرحیم خان

خاناں[۱۳] جہاں گیراور تزک جہاں گیری[۱۴] علامہ ابن تیمیہ۔

۲۔ مقالات شبلی، آسی پریس، لکھنو غیر مورخہ ۲۳۴ص

۳۔ مقالات شبلی، آصفی پریس، لکھنو غیر مورخہ ۲۳۴ص

۴۔ مقالات شبلی، انوار المطابع، لکھنو غیر مورخہ ۱۲۰ص

۵۔ مقالات شبلی، ایم ثناء اللہ، لاہور غیر مورخہ ۲۶۴ص

۶۔ مقالات شبلی، رنگین پریس، دہلی ۱۹۲۳ء ۱۱۲ص

۷۔ مقالات شبلی، سلطان حسین اینڈ سنس، کراچی، ۱۹۶۴ء، ۲۴۰ص

۸۔ مقالات شبلی، شاہ جہانی پریس، دہلی غیر مورخہ ۱۲۰ص

۹۔ مقالات شبلی، مقبول پریس، دہلی غیر مورخہ ۱۹۶ص

غالباً یہ اول الذکر مجموعہ مقالات کی مختلف اشاعتیں ہیں۔ ان پر اگرچہ سنہ اشاعت درج نہیں ہے تاہم قدامت کے لحاظ سے یہ تمام ایڈیشن مولانا سید سلیمان ندوی کے مرتبہ مقالات شبلی کی آٹھ جلدوں سے پہلے شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ پانچ اور انتخاب مقالات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی کے مرتبہ مقالات شبلی کے بعد شائع ہوئے۔ ان کی اور ان کے مندرجات کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ انتخاب مقالات شبلی

مرتبہ علاء الدین خالد۔ اردو اکیڈمی کراچی۔ ۱۹۶۰ء، ص ۱۲۰

مندرجات

[۱] ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر [۲] سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر [۳] مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم۔

۲۔ انتخاب مضامین شبلی

مرتبہ رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ ۱۹۷۲ء، ص ۴۰۸

طبع دوم: مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۴۰۸

مندرجات

[۱] تعارف۔ رشید حسن خاں۔ ص ۵-۱۶ [۲] فن بلاغت۔ ص ۱۹-۲۷ [۳] سرسید اور

اردولٹریچر۔ص ۲۸-۳۶ [۴] املا اورصحت الفاظ۔ص ۳۷-۴۱ [۵] حقائق اشیا اور معشوق حقیقی۔ص ۴۲-۴۷ [۶] تحفۃ الہند۔ص ۴۸-۵۸ [۷] بھاشا اور مسلمان۔ص ۵۹-۷۱ [۸] شعرالعرب۔ص ۷۲-۸۹ [۹] عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ۔ص ۹۰-۹۷ [۱۰] فلسفہ اور فارسی شاعری۔ص ۹۸-۱۰۵ [۱۱] ہمایوں نامہ۔ص ۱۰۶-۱۱۷ [۱۲] جہاں گیر اور تزک جہاں گیری۔ص ۱۱۸-۱۴۹ [۱۳] مناقب عمر بن عبدالعزیز۔ص ۱۵۰-۱۵۹ [۱۴] کتب خانہ اسکندریہ۔ص ۱۶۰-۱۹۷ [۱۵] تمدن اسلام مصنفہ جرجی زیدان کی پردہ دری۔ص ۱۹۸-۲۴۱ [۱۶] الجزیہ۔ص ۲۴۲-۲۵۳ [۱۷] حقوق الذمیین۔ص ۲۵۴-۲۹۱ [۱۸] مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم۔ص ۲۹۲-۳۲۸ [۱۹] ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر۔ص ۳۲۹-۳۵۷ [۲۰] غیر قوموں کی مشابہت۔ص ۳۵۱-۳۵۷ [۲۱] خلافت۔ص ۳۵۸-۳۶۳ [۲۲] مسلمانوں کو غیر مذہب کی حکومت کا محکوم ہو کر کیوں کر رہنا چاہئے۔ص ۳۶۴-۳۶۹ [۲۳] قضا وقدر اور قرآن مجید۔ص ۳۷۰-۳۳۸ [۲۴] قرآن مجید میں خدا نے قسمیں کیوں کھائیں؟ ص ۳۸۹-۳۹۵ [۲۵] اعجاز القرآن۔ص ۳۹۶-۳۹۹ [۲۶] علوم القرآن۔ص ۴۰۰-۴۰۸۔

۳۔ انتخاب مقالات شبلی

مرتبہ رضی کاظمی۔اردو پبلشرز لکھنؤ۔۱۹۷۳ء۔ص ۱۱۲

مندرجات

[۱] علامہ شبلی نعمانی تذکرہ وتبصرہ۔ص ۵-۱۴ [۲] ہندوستان میں اسلامی حکومت کا اثر تمدن پر ص ۱۵-۴۵ [۳] سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر۔ص ۴۶-۵۸ [۴] مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم۔ ص ۵۹-۱۱۲۔

۴۔ انتخاب رسائل شبلی

شائع کردہ ایوان اردو پٹنہ۔۱۹۶۲ء۔ص ۱۷۵

مندرجات

[۱] اسلامی حکومتیں اور شفا خانے [۲] اسلامی کتب خانے [۳] حقوق الذمیین [۴] الجزیہ [۵] میکنکس اور مسلمان [۶] خطبہ [۷] اسلامی مدارس ودارالعلوم

۵۔انتخاب مقالات شبلی

نسیم بک ڈپو حیدرآباد۔۱۹۶۹ء۔ص ۴۷

مذکورہ انتخابات میں تنوع اور ضخامت کے لحاظ سے سب سے اہم انتخاب رشید حسن خاں مرحوم کا ہے۔ وہ اردو کے نامور محقق تھے۔اس انتخاب پر انہوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ ان کی تحقیقی بصیرت کا ایک نمونہ ہے۔

کتابچے

علامہ شبلی کے مقالات کی عظمت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے متعدد مضامین و مقالات رسالہ کی شکل میں مختلف مقامات سے شائع ہوئے بلکہ ان کے کئی کئی ایڈیشن نکل کر مقبول ہوئے۔شعرالعجم میں شامل شعراء کے جو تذکرے علاحدہ علاحدہ شائع ہوئے ان کا ذکر شعرالعجم کے ضمن میں آچکا ہے، یہاں ان مضامین کی فہرست درج کی جاتی ہے جو ان کے علاوہ رسالے کی صورت میں علاحدہ شائع ہوئے۔

[۱] اسلام اور پردہ

- صدیقی ٹرسٹ، کراچی، غیر مورخہ، ۲۶ص

[۲] اسلام کی عالم گیر خدمات

- مکتبہ حجاب، کراچی، طبع اول، دسمبر ۱۹۶۲ء، ۱۶۷ص
- سہیل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، غیر مورخہ، ۱۵۰ص

[۳] اسلامی حکومت اور ہندوستان میں اس کا تمدنی اثر

- الناظر پریس، لکھنو، ۱۹۱۹ء، ۲۵ص
- الناظر پریس، لکھنؤ ۱۹۲۷ء ۲۸ص

[۴] اسلامی مدارس اور دارالعلوم

- الناظر پریس، لکھنو، غیر مورخہ، ۵۲ص

[۵] جہاں گیر اور تزک جہانگیری

- ادبی دنیا، لاہور، غیر مورخہ
- نول کشور پریس، لکھنؤ، غیر مورخہ، ۳۶ص
- نول کشور پریس، لاہور، غیر مورخہ، ۴۸ص

[۶] زیب النساء بیگم
- نول کشور لکھنؤ، غیر مورخہ
- انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۴ء، ۱۵ص

[۷] فطرۃ الاسلام
- لال باغ کوٹھی، لکھنو، غیر مورخہ

[۸] کتب خانہ اسکندریہ
- مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۹۲ء، ۶۷ص
- مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۹۴ء، ۶۷ص
- مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۹۰۲ء، ۶۷ص

[۹] رسالہ متعلق مسئلہ وقف اولاد
- احمدی پریس، علی گڑھ، ۱۹۰۹ء

انتخابات شبلی

اب تک علامہ شبلی کے مقالات کے منتخب مجموعے شائع ہوئے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کی منتخب تحریروں اور اقتباسات کا ایک مجموعہ ''انتخابات شبلی'' کے نام سے دارالمصنّفین سے شائع کیا۔ شاعری کی حقیقت، فصاحت و بلاغت۔ میر انیس اور مرزا دبیر کا موازنہ اور میر انیس و مرزا دبیر کے متحد المضمون مرثیے کے عنوان سے علامہ شبلی نے شعرالعجم اور موازنہ انیس و دبیر میں جو کچھ لکھا تھا انتخابات شبلی میں انہیں یکجا کر دیا گیا ہے، جس سے ادب، شاعری اور تنقید کے سلسلے میں علامہ شبلی کے خیالات یکجا ہو گئے ہیں۔

۱۶۳ رصفحات پر مشتمل یہ انتخاب دراصل مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی فرمائش پر کیا

گیا تھا۔ چنانچہ عرصہ تک یہ ایف اے کے نصاب میں شامل رہا۔ درسی ضرورت کے پیش نظر اس کے کئی ایڈیشن دارالمصنّفین سے شائع ہوئے اور اب تک شائع ہو رہا ہے جس کے تفصیل یہ ہے:

[ا] انتخابات شبلی، سید سلیمان ندوی

دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۴۰ء، طبع اول، ۲۲۰ص

- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۵۰ء، طبع دوم ۲۲۰ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۸۲ء، طبع سوم، ۲۲۰ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء، ۱۶۳ص

اسلام اور مستشرقین

علامہ شبلی کا ایک اہم موضوع اسلام اور مستشرقین تھا۔ اپنی کتابوں اور مضامین و مقالات میں جہاں جہاں اس پر انہوں نے اظہار خیال کیا تھا مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی نے ان سب کو یکجا کر دیا ہے۔ اسے دارالمصنّفین، اعظم گڑھ نے ۱۹۸۶ء میں شایع کیا۔ یہ ۲۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

مقالات شبلی [مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی]

علامہ شبلی کی تحریروں کی جمع و تدوین اور ان کی اشاعت کے سلسلے کا سب سے اہم کارنامہ مولانا سید سلیمان ندوی کا ہے۔ انہوں نے علامہ شبلی کے تمام مضامین و مقالات رسائل و جرائد سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کئے اور انہیں آٹھ جلدوں میں موضوع کے لحاظ سے مرتب کر کے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۸ء کے درمیان دارالمصنّفین اعظم گڑھ سے شائع کیا۔ ان کی اشاعت اول کے ساتھ اب تک کی تمام معلوم اشاعتوں کی تفصیل یہ ہے:

[ا] مقالات شبلی، حصہ اول

- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع اول، ۱۹۳۰ء، ۲۴۸ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع اول، ۱۹۵۴ء، ۲۴۱ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء، ۲۲۹ص

- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء، ۲۶۴ص

[۲] مقالات شبلی، حصہ دوم

- دارالمصنّفین اعظم گڑھ، طبع اول، ۱۹۳۱ء، ۱۰۳ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۳۴ء، ۱۰۳ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۵۰ء، ۱۰۳ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع پنجم، ۱۹۶۴ء، ۱۰۴ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۸۴ء، ۱۰۳ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۸۵ء، ۱۰۳ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۸۸ء، طبع دہم، ۱۰۳ص
- عشرت پبلشنگ ہاؤس انارکلی، لاہور، غیر مورخہ، ۱۱۲ص

[۳] مقالات شبلی، حصہ سوم

- دارالمصنّفین اعظم گڑھ، طبع اول، ۱۹۳۲ء، ۱۷۷ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع دوم، ۱۹۵۵ء، ۱۷۷ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۲۰۰۹ء، ۱۷۶ص

[۴] مقالات شبلی، حصہ چہارم

- دارالمصنّفین اعظم گڑھ، طبع اول، ۱۹۳۴ء، ۱۸۹ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع دوم، ۱۹۳۴ء، ۱۸۹ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع سوم، ۱۹۵۶ء، ۱۸۹ص
- عشرت پبلشنگ ہاؤس انارکلی، لاہور، غیر مورخہ، ۲۱۵ص

[۵] مقالات شبلی، حصہ پنجم

- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع اول، ۱۹۳۶ء، ۱۳۸ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع دوم، ۱۹۵۵ء، ۱۳۱ص

[۶] مقالات شبلی، حصہ ششم

- دارالمصنّفین اعظم گڑھ، طبع اول، ۱۹۳۷ء، ۲۴۰ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۳۷ء، ۲۴۰ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۵۱ء، ۲۴۰ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۲۰۰۹ء، ۱۹۰ص

[۷] مقالات شبلی، حصہ ہفتم

- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع اول، ۱۹۳۸ء، ۱۰۷ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۶۵ء، ۱۰۷ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء، ۹۲ص

[۸] مقالات شبلی، حصہ ہشتم

- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع اول، ۱۹۳۸ء، ۲۰۳ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع دوم، ۱۹۷۲ء، ۲۱۷ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۲۰۰۰ء، ۱۸۵ص
- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء، ۲۱۲ص

ان مجموعوں کی حیثیت کسی تصنیف سے کم نہیں۔ اس لیے یہاں ان کا علاحدہ۔علاحدہ تعارف وتجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

مقالات شبلی جلد اول۔ مذہبی

یہ علامہ شبلی کے مذہبی مضامین کا مجموعہ ہے۔اس میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں:

[۱] تاریخ ترتیب قرآن [۲] علوم القرآن [۳] اعجاز قرآن [۴] قرآن مجید میں خدا نے قسمیں کیوں کھائیں [۵] قضاوقدر اور قرآن مجید [۶] یورپ اور قرآن کے عدیم الصحۃ ہونے کا دعویٰ [۷] مسائل فقہ پر زمانہ کی ضرورتوں کا اثر [۸] وقف علی الاولاد [۹] پردہ اور اسلام [۱۰] الاسلام [۱۱] مسلمانوں کو غیر مذہب کا محکوم ہوکر کیوں کر رہنا چاہئے [۱۲] غیر قوموں کی مشابہت [۱۳] خلافت [۱۴] حقوق الذمیین [۱۵] الجزیہ [۱۶] اختلاف اور مسامحت

جیسا کہ عنوانات سے ظاہر ہے ابتدائی چھ مضامین کا تعلق قرآن مجید سے ہے۔ پہلے مضمون میں جمع وتدوین قرآن کی تاریخ ہے۔ تدوین قرآن کے بارے میں مخالفین اسلام اور شیعوں کی طرف سے جو تنقید کی جاتی رہی ہے ان کی بہ دلائل تردید کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ یہ اعتراضات لغو اور بے بنیاد ہیں اور بلاشبہ قرآن پاک ہر طرح کی تحریف سے پاک ہے۔

اس موضوع پر بے شمار تحریریں ہیں مگر مولانا شبلی کی یہاں بھی انفرادیت باقی ہے۔ انھوں نے جس قطعیت اور مضبوط دلائل کے ساتھ جمع وتدوین قرآن کی تاریخ قلم بند کی ہے، اس سے تاریخ قرآن پر ان کی گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

دوسرے مقالہ میں علوم القرآن پر قدما کی تصنیفات اور ان کی تفسیر، فقہ، ادب، تاریخ، نحو، لغت اور کلام کے متعلق کاوشوں کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے اور دکھایا ہے کہ قدما نے کس قدر وسیع سرمایہ علوم القرآن سے متعلق یادگار چھوڑا ہے۔

تیسرے مقالہ میں قرآن پاک کے اعجاز پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں اس عام نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے کہ فصاحت وبلاغت قرآن معجزہ ہے بلکہ انھوں نے قرآن پاک کا اعجاز اس کی ہدایت وحکمت اور تزکیہ نفس کو قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''قرآن مجید اگر فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے معجزہ قرار دیا جائے تو ایسا معجزہ ہوگا جو نبوت کا خاصہ نہیں، کیونکہ انشاپردازی لازمۂ نبوت نہیں، لیکن اگر قرآن مجید کو تزکیہ نفس اور موعظت وحکمت کے لحاظ سے معجزہ کہا جائے تو یہ معجزہ بھی ہوگا اور خاصہ نبوت بھی۔ هذا هو الحق فماذا بعد الحق الا الضلال۔''(۳)

چوتھے مقالہ میں قسم کی تعریف اس کا مقصد ومدعا اور پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں قسمیں کیوں کھائیں، اس کے اسباب بیان کئے ہیں۔ یہ مقالہ دراصل مولانا فراہی کے رسالہ امعان فی اقسام القرآن کا خلاصہ ہے۔

پانچویں مقالہ میں قضا وقدر کا مفہوم اور اس سلسلے میں قرآن مجید کا موقف بیان کیا ہے اور اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ اس عقدہ لاینحل کا پورا مطلب واضح ہوکر سامنے آجاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تمام تقریر کا حاصل یہ ہے کہ عالم سلسلہ اسباب پر قائم ہے۔سبب کے ساتھ مسبب کا وجود ضروری ہے۔سلسلہ اسباب خدا نے پیدا کیا ہے۔انسان کا ارادہ اور خواہش بھی منجملہ اسباب کے ہے۔ اس بنا پر انسان اپنے افعال کا سبب اور خالق ہے،لیکن علۃ العلل ہونے کے لحاظ سے ان افعال کا خالق بھی خدا ہی ہے۔انسانی افعال کے جو لازمی نتائج ہیں یعنی عذاب وثواب وہ خود بخود اس سلسلہ اسباب کے بنا پر وجود میں آتے ہیں۔انسان کی فطرت میں خدا نے برائی کا مادہ بھی رکھا ہے اور ایسا کرنا حکمت کا اقتضا تھا۔اس اصول کے سمجھنے کے بعد تمام اعتراضات رفع ہو جاتے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید میں اس بحث کو ہر پہلو کے لحاظ سے فیصل کر دیا ہے۔''(۴)

اس سلسلے کے آخری مضمون میں قرآن پاک کے عدیم الصحۃ ہونے کے یورپ کے الزام کی تردید ہے۔تمام اعتراضات کا مدلل جواب دینے کے بعد ان کو طعنہ دیتے ہوئے علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ''قرآن مجید ہزاروں دلائل سے بھی انجیل نہیں بن سکتا۔''(۵)

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے علامہ کے ان قرآنی مقالات کو تحقیق اور ترجمانی کا بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔(۶)

ایک مقالہ میں اس عام خیال کی تردید کی ہے کہ فقہ ایک دست شل ہے۔فقہاء نے زمانے کی ضرورتوں کے زیر اثر اجتہاد سے جو کام لیا ان کی تفصیلات قلم بند کر کے ثابت کیا ہے کہ فقہ اسلامی میں ترقی اور اقتضائے ضروریات کی موافقت کی پوری پوری قابلیت اور صلاحیت ہے۔(۷)

وقف علی الاولاد پر علامہ شبلی کا جو مضمون اس حصے میں شامل ہے وہ اپنے موضوع پر اردو میں ایک منفرد تحریر ہے۔اس کا مفصل ذکر باب دوم میں آ چکا ہے۔

پردہ کے سلسلے میں اغیار ایک طرف خود مسلمانوں میں بڑا نزاع رہا ہے۔مولانا شبلی نے ایک مقالے میں اسلام میں پردہ کی تاریخ اور اس کی مذہبی حیثیت اور اس کی اہمیت بڑے دل نشیں انداز میں واضح کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ پردہ بہر حال ضروری ہے۔اس موضوع پر مولانا سید

ابوالاعلیٰ مودودیؒ (ف:۲۲؍ستمبر ۱۹۷۹ء) نے ایک اہم کتاب ''پردہ''، لکھی ہے مگر نقش اول کی اہمیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔

اسلام میں غیر مسلموں کے جو حقوق ہیں ان پر اردو میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، متعدد ضخیم کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ اس سلسلے کے آغاز کا سہرا بھی علامہ شبلی ہی کے سر ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون حقوق الذمیین میں بہت تفصیل سے اس پر بحث کی ہے۔ یورپ کے مورخین کے الزامات کی فہرست میں یہ فرد جرم بھی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ ہر طرح کے ظلم وزیادتی کو روا رکھا اور اس کا سبب یہ بتایا کہ چونکہ اسلام میں غیر مسلموں کے لئے کوئی اصول وضابطہ اور قانون نہیں ہے، اس لئے یہ مظالم روا رکھے گئے۔ علامہ شبلی کے عہد میں ان اعتراضات کی لے تیز ہوگئی تھی اور بار بار اس کا اعادہ کیا جارہا تھا۔ اسی زمانہ میں لندن ٹائمز [۲؍جنوری ۱۸۹۵ء] میں پادری ملکم مارل نے ایک مضمون لکھا جس میں بڑے طمطراق سے ثابت کیا کہ اسلام میں عیسائیوں کے لئے نہایت ظالمانہ قوانین ہیں اور مسلمان حکمراں ہمیشہ اسی پر عمل کرتے ہیں۔ دلی کی عیسائی مشنری نے اس مضمون کا ترجمہ چھاپ کر شائع کیا اور اس کے دیباچے میں لکھا کہ یہ مضمون اس قدر مدلل ہے کہ ٹائمز کا مسلمان مضمون نگار اس کا جواب نہ دے سکا۔ (۸) علامہ شبلی کا خیال تھا کہ ذمیوں کے حقوق کا مسئلہ ایسا مہتمم بالشان اور وسیع ہے کہ اگر اس کا قطعی فیصلہ کردیا جائے تو یورپ کی غلط فہمیوں کا سارا طلسم ٹوٹ جائے گا۔ (۹) چنانچہ انھوں نے اس طلسم کو توڑنے کے لئے یہ مضمون لکھا اور ان اعتراضات کی پرزور تردید کی اور نہایت مدلل انداز میں ثابت کیا کہ جزیہ کے ذریعہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بے شمار حقوق واختیارات عطا کئے تھے۔ مثلاً اگر کوئی دشمن ان پر حملہ کرے گا تو ان کی مدافعت کی جائے گی اور ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائے گا۔ ان کی جان ومال، زمین اور عزت وآبرو محفوظ رہے گی۔ ان کے قافلے اور کاروان تجارت بھی محفوظ رہیں گے۔ ان کی تمام چیزیں انھیں کے قبضے میں رہیں گی۔ پادری، راہب اور گرجوں کے پجاری اپنے عہدوں پر باقی رہیں گے اور انھیں برطرف نہیں کیا جائے گا۔ صلیبوں اور مورتوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ ان سے عشر لیا جائے گا نہ ان کے ملکوں میں فوج بھیجی جائے گی۔ ان کو مذہب اور عقیدہ کی آزادی حاصل ہوگی۔ یہ حقوق ان لوگوں کو

بھی حاصل ہوں گے جو اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں۔

علامہ شبلی نے اس مقالہ میں دکھایا ہے کہ مذکورہ بالا حقوق ذمیوں کو کم وبیش ہر دور میں حاصل رہے۔ خلفائے راشدین سے لے کر شاہ جہاں تک مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ذمیوں کو جو حقوق ملے ان کی تفصیل علامہ شبلی نے پیش کی ہے، اور متعدد تاریخی واقعات سے استدلال کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں نے ذمیوں کا اپنے دورِ حکومت میں پورا پورا خیال رکھا۔ انھیں بڑے بڑے مناصب عطا کئے اور انھیں مذہب وعقیدہ کی بنیاد پر کبھی شرم سار نہیں ہونا پڑا۔ (۱۰)

ایک دوسرے مضمون میں غیر مسلم حکومتوں میں مسلمانوں کے انداز محکومی اور طرز زندگی کی وضاحت کی ہے۔ یہ مقالہ بھی ایک اعتراض ہی کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ غیر قوموں کی مشابہت، خلافت، اختلاف اور مسامحت جیسے اہم مضامین بھی اس حصہ کی زینت ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور جس میں بعض جزئی اختلافات کی حقیقت کو قرآن وسنت کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔

اس حصہ کا ایک گراں قدر مقالہ الجزیہ ہے، جس کا ذکر تصنیفات شبلی باب اول میں آچکا ہے۔

ان مذہبی مضامین ومقالات کے اس تعارف سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ شبلی مذہبی علوم پر کس درجہ بلند نگاہ اور دستگاہ رکھتے تھے۔ علامہ شبلی کو عام طور سے مورخ اور سوانح نگار ثابت کر کے ان کے بلند عالمانہ وقار کو کم کرنے کی شعوری کوشش کی گئی حالانکہ وہ علم کے اس بلند مقام پر تھے جہاں تک ان کے معاصرین کی رسائی مشکل ہے، ان کی دوسری خدمات سے صرف نظر کرنے کے باوجود ان کے مذکورہ بالا مقالات کے پس منظر میں ان کے مقام ومرتبہ کی تعیین کرنی ہو تو بلا شبہ وہ ماہر قرآنیات، محدث، فقیہ اور عالم دین کے اونچے اور بلند ترین مقام پر نظر آتے ہیں۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ہے کہ وہ مقالہ نگاری کرتے تو کبھی ابن تیمیہ، کبھی امام غزالی، کبھی امام ابو یوسف، کبھی ابن خلدون، کبھی ابن خلکان اور کبھی شاہ ولی اللہ نظر آتے۔ (۱۱) ممکن ہے کہ کسی کوتاہ نظر کو اس میں مبالغہ نظر آئے لیکن ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ شبلی اپنی ہمہ گیری اور جامعیت کی وجہ سے اپنے عہد کے سب سے ممتاز عالم وفاضل اور علوم

دینیہ کے ماہر اور یگانہ عصر تھے۔

مقالات شبلی جلد دوم۔ ادبی

علامہ شبلی نے خالص ادبی وتنقیدی کتابوں کے علاوہ وقتاً فوقتاً ادبی وتنقیدی مقالات بھی سپرد قلم کئے، جو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڑھ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، زمیندار لاہور، وکیل امرت سر، ماہنامہ حسن حیدرآباد، ماہنامہ معارف علی گڑھ اور ماہنامہ الندوہ لکھنؤ وغیرہ میں شائع ہوئے۔ مقالات شبلی جلد دوم ان کے ادبی مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔

[۱] عربی زبان [۲] فن بلاغت [۳] نظم القرآن وجمہرۃ البلاغۃ [۴] شعرالعرب [۵] عربی وفارسی شاعری کا موازنہ [۶] سرسید مرحوم اوراردو لٹریچر [۷] املا اورصحت الفاظ [۸] اردو ہندی [۹] بھاشا زبان اور مسلمان [۱۰] تحفۃ الہند (ہندی صنائع بدائع)

پہلے مضمون عربی زبان میں عبرانی اور سریانی زبانوں سے موازنہ ومقابلہ کر کے دکھایا ہے کہ عربی ان زبانوں سے قدیم ہے۔ علامہ نے ان زبانوں کے بعض قواعد وضوابط الفاظ اور اس کی حقیقت، قدامت، قدر مشترک ومختلف، ایک ایک چیز کی اس طرح وضاحت کی ہے جس طرح ایک قدآور ماہر لسانیات۔ حالانکہ موجودہ لسانیات کا اس وقت وجود بھی نہیں تھا۔

دوسرے مضمون میں بلاغت کی تعریف، اس کی حقیقت وماہیت کے ساتھ ارسطو وغیرہ کے افکار وخیالات پر نقد وتبصرہ ہے۔ بلاغت پر جو کتابیں قلم بند ہوئیں ان کی قدر وقیمت سے بھی بحث کی گئی ہے۔ غرض بلاغت کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کر کے دلائل سے اس عام خیال کی تردید کی گئی ہے کہ بلاغت کی ایجاد کا سہرا یونانیوں کے سر ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کا ایجاد کردہ ہے۔ (۱۲)

تیسرا مقالہ مولانا حمید الدین فراہی کے رسالہ نظم القرآن وجمہرۃ البلاغۃ پر طویل تبصرہ ہے۔ جس میں ان کی کتاب اور اس کے مباحث، طرز استدلال اور نظم قرآن کے سلسلے میں ان کے موقف کی تعریف وتحسین کی گئی ہے۔

چوتھا مقالہ شعرالعرب ہے۔ جو دراصل ابن رشیق قیروانی کی کتاب العمدہ کا تعارف وتجزیہ اور اس کے اہم مباحث کا خلاصہ ہے۔ عرب میں شاعری کی ابتداء، عربی شاعری کا مرتبہ، اس کی خصوصیات اور اثرات وغیرہ پر علامہ نے العمدہ کے حوالے سے بڑی عمدہ روشنی ڈالی ہے۔

دراصل علامہ شبلی شعرالعجم کے طرز پر شعرالعرب لکھنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شعرالعجم سے زیادہ اہم اور مقدم فرض شعرالعرب کی تدوین تھی مگر اس کے پڑھنے اور سمجھنے والے کہاں سے آتے، اس لئے شعرالعجم کو فوقیت دی۔ یہ مقالہ اسی سلسلہ کا آغاز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اقتضائے حالات کے لحاظ سے مجھ کو شعرالعجم سے پہلے شعرالعرب لکھنا چاہئے تھا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ قومی ضروریات کی فہرست میں شعرالعجم کا نمبر سیکڑوں نمبروں کے بعد آنے کی چیز ہے، لیکن کیا کیا جائے شعرالعرب لکھتا تو سمجھنے والے کہاں سے آتے۔.................. یہ سب کچھ سہی لیکن یہ کانٹا مرتے دم تک دل سے نہیں نکل سکتا کہ عربی شاعری اس قدر وسیع، پراثر اور قومی جذبات سے لبریز اور اس کے متعلق ہماری زبان میں ایک حرف بھی نہیں۔ زیادہ افسوس یہ کہ شعرالعرب کے لئے کچھ بہت زیادہ کدوکاوش کی ضرورت نہیں کسی قدیم تصنیف کو سامنے رکھ لیا جائے اور انہی عنوانوں کو پھیلا کر کچھ نئے مذاق کا رنگ چڑھا کر لکھ دیا جائے تو اچھی خاصی تالیف ہوجائے گی۔ اس قسم کی قدیم تصنیفوں میں سب سے پہلے اور سب سے جامع ابن رشیق قیروانی کی کتاب العمدہ ہے۔............ اتفاق سے اب کی ڈاک میں جو مصری کتابیں آئیں ان میں کتاب العمدہ کا بھی ایک نسخہ تھا۔ یارگم گشتہ کے ملنے سے جو خوشی ہوئی اس کا بیان نہیں ہوسکتا۔ شعرالعرب کی یاد پھر تازہ ہوگئی۔ کتاب تو جب لکھی جائے گی لکھی جائے گی لیکن سردست اس کا ریویو لکھتا ہوں، جس سے شعرالعرب کی داغ بیل پڑ جائے گی۔'' (۱۳)

اس کے بعد عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ ہے جس میں عربی شاعری کی خصوصیات بیان کرکے اس کی فوقیت دکھلائی گئی ہے۔ آخر میں فارسی شاعری کی ترجیحی خصوصیات کی تفصیل ہے۔

افسوس کہ شعر العرب کا یہ سلسلہ چند مضامین سے آگے نہ بڑھ سکا اور علمی دنیا ایک اہم کتاب سے محروم رہ گئی۔ بعد میں ان کے شاگرد اور شعر الہند کے مصنف مولانا عبدالسلام ندوی نے اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہا مگر وہ بھی اسے مکمل نہ کر سکے۔

ایک مضمون میں جو سرسید احمد خاں کی وفات پر لکھا گیا تھا، ان کے ادبی کارناموں اور اردو زبان پر ان کے احسانات کی تفصیل قلم بند کی گئی ہے اور دکھلایا ہے کہ سرسید مرحوم کی کوششوں سے اردو ذرہ سے آفتاب بن گئی۔

املا اور صحت الفاظ کے مسائل آج بڑی اہمیت کے حامل ہیں اس پر متعدد اہل علم نے کتابیں سپرد قلم کی ہیں۔ علامہ شبلی نے ایک خط کے جواب میں یہ مقالہ اس وقت لکھا تھا جب وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کے مدیر تھے۔ اس میں انھوں نے املا اور صحت الفاظ کی اہمیت واضح کی ہے۔

اردو ہندی کا تنازع بہت پرانا ہے۔ اس پر آج اردو میں ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ ۱۹۱۲ء میں انگریزی حکومت نے ورنا کولر کمیٹی بنائی جس نے یہ سفارش کی تھی کہ ایک ایسا نصاب مرتب کیا جائے جس میں اردو، ہندی دونوں زبانوں کو ایک الفاظ اور عبارت کے ساتھ پڑھا جائے بالفاظ دیگر اس کا رسم الخط ایک یعنی دیوناگری ہو۔

علامہ شبلی اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ انھوں نے اس تجویز کی مخالفت کی اور اپنے جن خیالات کا اظہار کیا وہ اردو ہندی کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے اردو ہندی کی جدا جدا ہیئت، قواعد کے اختلاف، دیسی ہندی کا مفہوم، دونوں زبانوں کو ایک الفاظ اور عبارت میں پڑھانے کے مسائل وغیرہ کی تفصیل سے وضاحت کی۔ یہ بحث اس قدر مدلل اور مؤثر تھی کہ اس کا فیصلہ خود ہندی ممبروں کی تائید سے مولانا شبلی کے موقف کے مطابق ہوا اور ۱۹۱۲ء میں اردو ہندی بننے سے بچ گئی۔ یہ مقالہ اب بھی اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے اہمیت رکھتا ہے اور اس کے دلائل اب بھی بڑے کام کے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس موضوع پر بعد میں جو تحریریں وجود میں آئیں ان میں اس مقالہ سے استفادہ نہیں کیا گیا اور نہ کہیں اس کا حوالہ دیا گیا۔

ایک مضمون میں ہندی زبان کے سلسلے میں مسلمانوں کی خدمات اور ان کی کاوشوں

کا ذکر ہے۔ یہ دراصل ایک ہندو ایڈیٹر کے اس اعتراض کے جواب میں لکھا گیا ہے کہ مسلمانوں نے تعصب کی وجہ سے ہندی زبان وادب پر کبھی توجہ نہ دی۔ مولانا شبلی نے اس مضمون میں ہندی زبان کے لئے مسلمانوں نے جو کاوشیں کیں اس کی تفصیلات قلم بند کی ہیں۔ مسلمانوں کی بے تعصبی دکھلائی ہے۔ آخر میں چیلنج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے ہندو دوستوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمانوں سے زیادہ بے تعصب قوم نہ صرف دنیا کی پچھلی تاریخ بلکہ موجودہ اور آئندہ زمانہ بھی قیامت تک نہ پیش کر سکے گا۔'' (۱۴)

اس مجموعہ کا آخری مقالہ تحفۃ الہند ہے جس میں ہندی صنائع وبدائع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ان مضامین سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی ایک ماہر لسانیات بھی تھے۔ متعدد دوسری زبانوں مثلاً عبرانی، سریانی اور ہندی وغیرہ کے قواعد، خصوصیات اور عہد بہ عہد کے ارتقا پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور وہ نہ صرف عربی، فارسی اور اردو کے لسانی مسائل پر گہری نگاہ رکھتے تھے بلکہ عبرانی، سریانی اور ہندی لسانیات کی جزئیات سے بھی واقف تھے۔

افسوس کہ اب تک علامہ کے اس پہلو کو ہمارے نقادوں نے لائق اعتناء نہیں سمجھا۔ ضرورت ہے کہ شبلی کے لسانی شعور کا مطالعہ کیا جائے اور دکھایا جائے کہ وہ کس درجہ کے ماہر لسانیات تھے۔

مقالات شبلی جلد سوم۔ تعلیمی

ماہر تعلیم کی حیثیت سے علامہ شبلی کا مقام ومرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ انیسویں صدی کی دو بڑی تعلیمی تحریکوں علی گڑھ اور ندوہ سے وابستہ رہے۔ دونوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی تمام تر صلاحیتیں، صحت کی پروا کئے بغیر قوم کے روشن مستقبل کے لئے صرف کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار ان دونوں تحریکوں کے صف اول کے رہنماؤں میں ہوتا ہے۔

وہ ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ پہنچے تو انھیں علی گڑھ تحریک میں قومی فلاح و بہبود کے جلوے نظر آئے۔ چنانچہ وہ اس سے اس طرح وابستہ ہو گئے کہ ان کا شمار سرسید علیہ الرحمہ کے نامور رفقاء میں

ہوا۔لیکن تعلیم کے سلسلے میں ان کا مطمح نظر سرسید سے قدرے مختلف تھا۔ان کا خیال تھا کہ قوم کے لئے محض جدید تعلیم ہی کافی نہیں۔جدید نافع کے ساتھ قدیم صالح بھی ضروری ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''ہم نے بارہا کہا ہے اور اب پھر کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے لئے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے، نہ قدیم عربی مدرسوں کی۔ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے جس کا ایک جزو مشرقی اور دوسرا مغربی ہے۔'' (۱۵)

یہی وجہ ہے کہ تحریک ندوہ برپا ہوئی تو اسے اپنے دلی جذبات واحساسات سے ہم آہنگ دیکھ کر وہ اس سے وابستہ ہو گئے۔واقعہ یہ ہے کہ اس تحریک کو اصلاً انھیں نے بام عروج تک پہنچایا اور اس تحریک کی کامیابی ان کی زندگی کا بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

تعلیم اور اپنے نظریہ تعلیم کے عام فروغ واشاعت کے لئے علامہ شبلی نے متعدد تعلیمی مضامین لکھے۔زیرنظر مجموعہ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے انھیں کو یکجا کر دیا ہے۔اس کا پہلا مقالہ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ہے جو علامہ مرحوم کی علی گڑھ میں پہلی نثری کاوش تھی اور کتابی صورت میں شائع ہوئی۔اس کا ذکر مستقل تصنیفات کے باب میں آچکا ہے۔دوسرے مقالہ میں ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ کے حالات وسوانح، تحصیل علم، اخلاق وعادات تصنیفات، درس وتدریس، درس نظامیہ اور اس کی خصوصیات وامتیازات، اس کی مقبولیت کے اسباب وغیرہ کی تفصیل قلم بند کی ہے۔اس مضمون کے لکھنے کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آج تمام ہندوستان میں عربی کا جو نصاب ہے وہ نظامیہ کے نام سے مشہور ہے، لیکن یہ سخت تعجب ہے کہ اکثر لوگوں کو معلوم نہیں کہ یہ نصاب کب بنا اور کس نے بنایا۔حال کی ایک تصنیف میں اس کو نظام الملک وزیر دولت سلجوقیہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔پرانے تعلیم یافتہ اس قدر جانتے ہیں کہ اس کے بانی ملا نظام الدین صاحب لکھنوی ہیں لیکن اس سے زیادہ ان کو بھی واقفیت نہیں۔'' (۱۶)

ملا نظام الدین کے درس نظامیہ کی تفصیل قلم بند کرنے کے بعد موجودہ دور میں رائج اور ملا صاحب کی طرف منسوب نصاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس موقع پر یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ موجودہ درس جو نظامیہ کے نام سے مشہور ہے، دراصل نظامیہ نہیں ہے۔ اس میں بہت سی کتابیں ایسی اضافہ ہوگئی ہیں جو ملا صاحب کے عہد میں موجود بھی نہ تھیں۔'' (۱۷)

مضمون کے آخر میں علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ درس نظامیہ میں بہت کچھ ترمیم و اضافہ کی ضرورت ہے۔ (۱۸) اسی کے متعلق ایک اور مضمون میں ہندوستان کے کیمبرج درس نظامیہ کی پوری تاریخ قلم بند کی ہے۔ ملا نظام الدین کے والد ملا قطب الدین شہید کے حالات و سوانح، شہادت، لکھنؤ میں سکونت، عالم گیر کا فرمان، ملا نظام الدین کا علم و فضل اور ان کے فرزند ملا عبد العلی بحر العلوم وغیرہ کے فیوض و برکات کی تفصیل کے بعد سلسلہ نظامیہ کی علمی حالت کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے اور دکھایا ہے کہ تمام ہندوستان میں علم کی جو بہار آئی ہے، وہ اسی خانوادے کا فیضان ہے اور خاکسار (شبلی) کو بھی اسی سلسلہ شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ (۱۹)

اس مفصل مضمون میں نہ صرف ملا نظام الدین اور ان کے خانوادے کا بلکہ اودھ کی علمی حالت کا ایک جامع مرقع آ گیا ہے۔

ایک مضمون ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم پر ہے۔ تحریک ندوہ کا غلغلہ ہی نصاب تعلیم میں اصلاح کے نام پر بلند ہوا تھا مگر عرصہ تک اس میں کامیابی نہیں ملی۔ اس سلسلے میں خود علامہ شبلی کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مخالفین اصلاح نصاب نے راہ میں کانٹے بچھائے اور بڑی دشواریاں پیدا کیں۔ جس کی کسی قدر تفصیل مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام مکاتیب میں موجود ہے۔ اس مقالہ میں علامہ شبلی نے اصلاً انہی کا جواب دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بے شبہ اس نئے راستے کے اختیار کرنے میں نہایت مشکلات پیش آئیں گی لیکن اگر ندوہ میں اس قدر بھی ہمت اور حوصلہ نہیں کہ وہ ان مشکلات کا مقابلہ کرے تو اس کو سرے سے اصلاح نصاب کا نام لینا نہ چاہئے۔ یہ سخت بد دیانتی ہے کہ تمام دنیا میں اصلاح نصاب کا غل مچایا جائے اور ایک ذرہ اصلاح نہ کی جائے۔'' (۲۰)

اس کے بعد انھوں نے یہ سوال کیا ہے کہ ہمارے علمی تنزل کا سبب کیا ہے اور اس کے

جواب میں انھوں نے قدیم نصاب تعلیم کا مفصل جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ اس نصاب میں کیا کیا خامیاں ہیں اور اس سے کس قدر نقصان پہونچ رہا ہے۔ ضمناً مخالفین اصلاح نصاب کے اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے۔ علامہ شبلی نے اصلاح نصاب کے سلسلے میں جو تجاویز پیش کی ہیں اگر انھیں کلیتاً تسلیم کر لیا گیا ہوتا تو یقیناً ہمارا موجودہ تعلیمی منظر نامہ زیادہ روشن اور زیادہ تابناک ہوتا۔

اس سلسلے کے دوسرے مضمون میں فن نحو کی مروجہ کتابوں کا جائزہ علامہ نے پیش کیا ہے۔ نحو کی حقیقت و ماہیئت اور اس کے مقاصد بیان کر کے علامہ شبلی نے نحو کی مروجہ کتابوں کی خامیاں دکھلائی ہیں۔

قدیم تعلیم کے ہم نوا قدیم تعلیم کو اور جدید تعلیم یافتہ جدید تعلیم کو ترقی کا زینہ قرار دیتے تھے۔ علامہ شبلی کے عہد میں یہ ایک اہم موضوع تھا۔ وہ دونوں کی ضرورتوں کے قائل تھے۔ چنانچہ ایک مضمون ''تعلیم قدیم و جدید'' میں انھوں نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے اور تفصیل سے دکھلایا ہے کہ دونوں تعلیم کے حدود کیا ہیں۔ مقاصد کیا ہیں اور دونوں سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے کے بعض اعتراضات کو بھی رفع کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہی مضمون دراصل علامہ شبلی کے نظریہ تعلیم کا خلاصہ ہے۔ اسی موضوع پر ایک اور مضمون میں اظہار خیال کیا ہے۔

اس مجموعہ کے دو آخری مقالات بھی اسی موضوع پر ہیں۔ پہلا مضمون وہ رپورٹ ہے جو ریاست حیدرآباد کی مشرقی یونیورسٹی کے نصاب کے سلسلے میں انھوں نے تیار کی تھی۔ یہ رپورٹ علامہ شبلی کے نظریہ تعلیم کی مکمل عکاس بلکہ نمونہ ہے۔ دوسرا مضمون علی گڑھ منتھلی میں شائع ایک تحریر احیاء علوم عربیہ کا جواب ہے۔ جس میں مضمون نگار نے علوم عربیہ کی تحقیر کی تھی۔ علامہ شبلی نے اس کے کئی اقتباسات نقل کر کے بڑے سخت الفاظ میں تنقید کی ہے اور مضمون نگار کی بے علمی، دروغ گوئی اور کم مایگی دکھلائی ہے۔ ضمناً علی گڑھ کالج پر بھی تنقید کی ہے اور آخر میں افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ:

> ''عربی کی تحقیر نے ثابت کر دیا کہ قوم واقعی ذلت کے اخیر درجہ پر پہنچ گئی ہے،
> کیوں کہ کوئی قوم اس وقت تک ذلیل نہیں ہوتی جب تک کہ وہ خود اپنے آپ کو
> ذلیل نہ سمجھے اور یہ درجہ اب قوم کو حاصل ہو گیا۔'' (۲۱)

علامہ شبلی کے ان تعلیمی مقالات اور خیالات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تعلیم پر ان کی

کس قدر گہری نگاہ تھی اوران کا نظریہ تعلیم کیا تھا۔ وہ اپنی قوم میں کیا کیا اصلاح چاہتے تھے اوران کی ترقی کے لئے انھوں نے کس قدر جدوجہد کی، کیا کیا عملی کوششیں کیں، کیسے کیسے مفید اور قیمتی مشورے دئے۔ یقیناً ان کے نظریہ پر عمل کیا گیا ہوتا تو مسلمان آج ذلت ونکبت کے جس درجہ پر ہیں نہ پہنچتے اور دنیا میں ان کا بڑا مقام اور وزن ہوتا۔ کاش مخالفین شبلی نے قومی ہمدردی اور دوراندیشی سے کام لیا ہوتا۔

علامہ شبلی کی تعلیمی خدمات اوران کے نظریہ تعلیم پر اب تک کوئی بھرپور مطالعہ سامنے نہیں آسکا ہے۔ ندوہ کے اختلافات کے پس منظر میں ڈاکٹر عبیداللہ فراہی نے ایک اہم کتاب ''علامہ شبلی کا نظریہ تعلیم''، ضرور لکھی ہے۔ مگر یہ کتاب علامہ شبلی کی تمام تعلیمی خدمات کا مکمل احاطہ نہیں کرتی۔

مقالات شبلی جلد چہارم۔ تنقیدی

یہ علامہ شبلی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے نادر ونایاب کتابوں کی اشاعت پر بطور تنقید وتبصرہ اور تعارف کے لکھے تھے۔ چونکہ ان سے علامہ شبلی کی تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے اس لئے انھیں تنقیدی مضامین کا نام دیا گیا ہے۔ اس حصہ مین مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں:

[۱] طبقات ابن سعد [۲] مناقب عمر بن عبدالعزیز [۳] بلاغات النساء [۴] عمر خیام کا جبر ومقابلہ [۵] تجارب الامم ابن مسکویہ [۶] لغت فرس [۷] الفصل فی الملل والنحل [۸] تفسیر کبیر امام رازی [۹] کتاب الکافی فی الکحل [۱۰] ہمایوں نامہ [۱۱] مآثر رحیمی [۱۲] تزک جہاں گیری [۱۳] النظر فی السفر الی الموتمر [۱۴] تلفیق الاخبار [۱۵] تمدن اسلام جرجی زیدان [۱۶] معرکہ مذہب وسائنس [۱۷] ہومر کے الیڈ کا ترجمہ۔

پہلے مضمون میں طبقات ابن سعد کا تعارف ہے۔ ۱۲/جلدوں پر مشتمل یہ کتاب اسلامی تاریخ کا ایک اہم ماخذ ہے۔ اس کتاب کے مخطوطات دنیا بھر کے کتب خانوں میں منتشر تھے۔ جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ نے تمام جلدوں کو حاصل کیا اور ایڈٹ کر کے شہنشاہ جرمن کی اعانت سے شائع کیا۔ یقیناً یورپ کا اسلامی دنیا پر یہ بہت بڑا احسان تھا۔ علامہ شبلی نے اپنے مضمون میں نہ

صرف طبقات ابن سعد کا تعارف کرایا ہے بلکہ یورپ کی اس خدمت کا شکریہ بھی ادا کیا ہے کہ ان کی بدولت یہ کتاب شائع ہوئی۔

علامہ شبلی نے طبقات کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی تفصیل اور جامعیت قرار دیا ہے، جو متاخرین کی کتابوں میں نہیں ملتی۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ چونکہ مصنف کا زمانہ عہد نبوت کے قریب ہے اس لئے ابن سعد نے واقعات کو بہ سند متصل لکھا ہے، جس میں چار یا پانچ راوی سے زیادہ نظر نہیں آتے۔

دوسرے مضمون میں علامہ ابن جوزی کی کتاب سیرۃ العمرین کے ایک حصہ مناقب عمر بن عبدالعزیز پر نقد وتبصرہ ہے، جس میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے مفصل حالات زندگی اور مناقب کی تفصیل ہے۔ اس کو سلطان صلاح الدین کے عہد میں اسامہ بن منقذ نے دو حصوں میں تقسیم کر کے مناقب عمر بن عبدالعزیز کو علاحدہ مرتب کیا۔ علامہ شبلی نے سفر مصر کے دوران اس کا مطالعہ کیا تھا اور پہلے حصہ سے جس میں حضرت عمر فاروقؓ کے حالات ہیں، استفادہ کیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ ابن منقذ نے اصل کتاب میں جو کچھ تصرف کیا ہے، وہ صرف روایتوں کے اسناد کا حذف کرنا اور مکرر طرق روایت میں سے ایک کا انتخاب کر لینا تھا۔ (۲۲)

۱۹۰۰ء میں اسے بھی یورپ کے ایک فاضل نے مرتب کر کے شائع کیا۔ چونکہ یہ کتاب نہایت اہم معلومات پر مشتمل ہے، اس لئے علامہ شبلی نے اس پر ریویو لکھا اور بہت تفصیل سے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حالات ومناقب اس کتاب سے نقل کئے۔ علامہ شبلی نے اسے ایک عمدہ سوانح عمری قرار دیا ہے، البتہ مصنف پر یہ تنقید کی ہے کہ صحیح اور ثابت شدہ واقعات کے ساتھ بعض لغو اور دوراز کار قصے بھی نقل کئے ہیں۔ علامہ شبلی نے اس کی مثالیں بھی نقل کی ہیں۔ انھوں نے مصنف کے اس رویے پر بھی تنقید کی ہے کہ اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے وہ حالات جو امور سلطنت سے متعلق تھے، انھیں قلم انداز کر دیا ہے۔

تیسرے مضمون میں بلاغات النساء پر نقد وتبصرہ ہے جو تیسری صدی ہجری کی تصنیف ہے اور جس میں خواتین کی تقریریں اور خطبات جمع کئے گئے ہیں۔ اس میں حضرت عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت زینبؓ، اور حضرت ام کلثومؓ کے خطبات کے علاوہ ان خواتین کے خطبے ہیں جو حضرت

علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے معرکوں میں شریک تھیں۔ چونکہ ان خطبات سے ان محترم خواتین کی فصاحت و بلاغت کے ساتھ جنگی اور معاشرتی زندگی میں ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اس لئے علامہ شبلی نے اس کی تفصیل قلم بند کی ہے اور لکھا ہے کہ:

''کس کو خیال تھا کہ عورتیں بھی کسی زمانہ میں یہ پوزیشن رکھتی تھیں کہ ان کی تقریریں اور گفتگو قلم بند اور مدون کی جائیں، لیکن اس وقت ہمارے سامنے جو کتاب ہے............وہ اسی خاص موضوع پر ہے۔''(۲۳)

تیسرے مضمون میں عمر خیام کی کتاب جبر و مقابلہ کا ذکر ہے۔ عمر خیام کے بارے میں عام خیال تھا کہ وہ محض رباعی گو شاعر تھا لیکن اس کتاب نے ثابت کر دیا کہ وہ ایک بڑا ریاضی داں بھی تھا۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ شبلی نے دکھایا ہے کہ خیام ایک بڑا ماہر ریاضی داں تھا۔ ان کا خیال ہے کہ اس موضوع پر قدماء کی جو کتابیں ہیں وہ خیام کی نظر سے نہیں گذریں، البتہ ہندوستان کے ریاضی دانوں کے کچھ قاعدے ضرور اس کے پیش نظر رہے تاہم وہ محض اس فن کی ابتدائی چیزیں ہیں۔

خیام نے اس فن کی جو تاریخ قلم بند کی ہے، علامہ شبلی نے اسے اختصار سے نقل کیا ہے اور خیام نے جو اضافے کئے ہیں ان کی بھی نشاندہی کی ہے۔

ایک مضمون میں علامہ شبلی نے مشہور مورخ و فلسفی ابن مسکویہ کی نایاب کتاب تجارب الامم پر تبصرہ کیا ہے اور ابن مسکویہ کے نظریہ تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فن تاریخ کو یورپ نے جس مقام پر انیسویں صدی عیسوی میں پہنچایا، مسلمانوں نے اسے پانچویں صدی ہجری سے قبل ہی اس معیار تک پہنچا دیا تھا۔ مگر اسی دور میں تاریخ سے بے اعتنائی شروع ہوگئی، جس کا ذکر ابن مسکویہ نے تجارب الامم میں کیا ہے۔ علامہ شبلی نے ابن مسکویہ کے اصول تاریخ کی تعریف کے ساتھ اس کے بعض اصولوں پر تنقید بھی کی ہے۔ اس مضمون کے لکھنے کا سبب تجارب الامم اور ابن مسکویہ کے نظریات سے اہل علم کو متعارف کرانا معلوم ہوتا ہے۔

ایک مضمون میں لغت فرس از اسدی طوسی کا تعارف ہے۔ طوسی، فردوسی کا ہم عصر اور اس کا بھانجا تھا۔ وہ فارسی لغت کا پہلا مدون ہے۔ لغت فرس بھی یورپ کے ایک فاضل پاول

ہارن کی کوششوں سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔اس کے تعارف میں علامہ شبلی نے دکھایا ہے کہ چونکہ طوسی نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ مقامات کے لغات لکھے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان علاقوں میں اہل زبان رہتے تھے۔طوسی کے لغت کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس نے قدماء کے کلام سے استدلال کیا ہے جس سے بہت سے ایسے شعراء جن کا کلام ناپید ہے، اس میں ان کا کلام محفوظ ہو گیا ہے۔علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ اس لغت سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی میں اس وقت تک عربی الفاظ کی آمیزش بہت کم تھی۔

علامہ ابن حزم کی کتاب الملل والنحل پر بھی علامہ شبلی نے نقد وتبصرہ کیا ہے۔ابن حزم کے حالات بھی مختصراً لکھے ہیں۔اس کے بعد کتاب کے مشمولات پر بحث کی ہے۔چونکہ اس کتاب میں مختلف مذاہب کے عقائد وخیالات پر بحث ونقد ہے،اس لئے علامہ ابن حزم نے تفصیل سے عقائد پر بحث کی ہے اوران کا رد لکھا ہے،جس میں بعض اسلامی فرق کا بھی رد لکھا گیا ہے۔سحر اور عورتوں کی پیغمبری وغیرہ مسائل پر بھی ابن حزم نے بحث کی ہے۔ان کا خیال ہے کہ عورتیں پیغمبر ہو سکتی ہیں۔علامہ شبلی نے اس سے صرف نظر کیا ہے۔البتہ یہ ضرور کہا ہے کہ اس سے موجودہ دور میں خواتین کے متعلق جو بحث کی جاتی ہے اس کا رواج پہلے بھی تھا۔

ایک مضمون میں امام رازی کی تفسیر کبیر پر تبصرہ ہے۔علامہ شبلی نے اسے مہتم بالشان تفسیر قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ ان سے پہلے جس قدر تفسیریں وجود میں آئیں وہ کسی خاص موضوع سے تعلق رکھتی ہیں،مگر تفسیر کبیر احادیث آثار، بلاغت،فقہی اقسام وغیرہ تمام موضوعات پر مشتمل ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔انھوں نے ابومسلم اصفہانی اور کعبی وغیرہ سے استفادہ کیا ہے،لیکن وہ معتزلہ سے کبیدہ خاطر تھے،اس لئے جابہ جا ان پر سخت تنقیدیں بھی کی ہیں۔ انھوں نے محدثین کی تفسیروں سے بہت کم استفادہ کیا ہے اور بعض نامعتبر مفسرین کے خیالات بھی اس میں آ گئے ہیں۔

علامہ شبلی نے حدیث،تفسیر،تاریخ،ادب،فقہ،لغت کی کتابوں کے علاوہ ایک مضمون میں طب کی کتاب کتاب الکافی فی الکحل کا تعارف کرایا ہے۔یہ کتاب انھیں حکیم اجمل خاں کے کتب خانے میں ملی تھی۔یہ کتاب خاص آنکھ کے امراض سے متعلق ہے۔علامہ شبلی نے اس کتاب

کے حوالے سے دکھلایا ہے کہ خاص اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئیں جن کی تعداد اٹھارہ ہے۔ اس کتاب میں ان آلات کی تصویریں اوران کے نام بھی دیئے گئے ہیں، جو آنکھ کے علاج میں استعمال ہوتے ہیں۔ علامہ شبلی نے ان آلات کے نام اوران کی تصویریں بھی درج کی ہیں اور دکھلایا ہے کہ مسلمان طبیب امراض چشم میں کس قدر ماہر تھے اور یہ فن کس قدر ترقی یافتہ تھا۔

ایک مضمون میں ہمایوں نامہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ہمایوں نامہ گلبدن بیگم کی تصنیف ہے جو بابر کی بیٹی ہمایوں کی بہن اور اکبر کی پھوپھی تھیں۔ یہ کتاب انھوں نے اکبر کی فرمائش پر لکھی تھی۔ یہ عہد ہمایوں کی ایک معتبر تاریخ ہے۔

ہمایوں نامہ ایک عرصہ سے نایاب تھی۔ انگریز مصنفہ مس بیورج نے کئی سال کی تلاش وتفحص اور تحقیق وتدقیق سے اسے مرتب کر کے ۱۹۰۲ء میں شائع کیا۔ علامہ شبلی نے اسی نسخہ کا تعارف کرایا ہے اور مس بیورج کی محنتوں کی تعریف وتحسین کی ہے۔

ہمایوں نامہ کے مشمولات کے حوالہ سے علامہ شبلی نے گلبدن بیگم کی مورخانہ صلاحیت اور سلیقہ تحریر وتصنیف کی داد دی ہے اور دکھایا ہے کہ وہ تاریخ نویسی کے اصول وآداب سے بخوبی واقف تھیں۔ چنانچہ انھوں نے جہاں سیاسی واقعات لکھے ہیں وہیں عہد ہمایوں کی تہذیبی وتمدنی تاریخ بھی لکھی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جزئی واقعات بھی سپرد قلم کئے ہیں۔ باوجود تعلق کے طرفداری سے بھی کام نہیں لیا ہے۔ ان کا طرز تحریر بھی مورخانہ انشاپردازی اور سادہ واقعہ نگاری کا نمونہ ہے۔ چشم دید واقعات کے علاوہ جو واقعات تاریخ قلم بند کئے ہیں ان کا حوالہ بھی دیا ہے، جس سے ان کی مورخانہ ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس تعارف کا مقصد بھی تاریخ ہند کے مآخذ ومراجع کی نشاندہی اور ذوق تاریخ کو عام کرنا معلوم ہوتا ہے۔

ایک مقالہ میں عبدالباقی کی مشہور تاریخ مآثر رحیمی کا جائزہ ہے۔ یہ کتاب دوہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع کے ہزار صفحات میں عہد اکبری کے علماء، فضلاء، ادباء، شعراء اور اہل علم کے حالات وواقعات ہیں۔ آخری ہزار صفحات میں اکبر کے سپہ سالار عبدالرحیم خان خاناں کی زندگی کے تمام حالات وسوانح قلم بند کئے گئے ہیں۔ جس میں اس کی پیدائش، وطن، تعلیم وتربیت، اخلاق وعادات، فضل وکمال شاعری وانشاء پردازی کے علاوہ اس کے علمی ذوق،

کتب خانہ سے دلچسپی، اہل علم کی قدر دانی، علم پروری وادب نوازی وغیرہ اوصاف کی تفصیلات ہیں۔اس مبسوط کتاب میں خان خاناں کے رفاہی وعوامی کاموں کا بھی ذکر ہے۔ صنعت وزراعت، تعمیرات مثلاً باغ، حمام، سرائیں تعمیر کرانے کا بھی ذکر ہے۔ نیز اس کی ایجادات واختراعات مثلاً جہازوں کی تیاری اورابری وعکسی کاغذ کے بنانے کا بھی ذکر ہے۔ یہ کتاب عہد اکبری کی تاریخ کا ایک معتبر ومستند ماخذ تصور کی جاتی ہے۔اس کے مصنف کا نام عبدالباقی ہے وہ ایران کا باشندہ اورایک معزز خاندان کا فرد تھا۔ علامہ شبلی نے اپنے تبصرے میں یہ تمام تفصیلات قلم بند کی ہیں اورآخر میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں ''تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ خان خاناں کی خوبیاں ہی خوبیاں گنائی گئی ہیں نکتہ چینی کا نام نہیں۔'' مگر پھر یہ توجیہ پیش کی ہے کہ یہ اس دور کا عام مذاق تھا۔(۲۴)

یورپ کے مورخین نے جہاں گیر پر بھی متعدد الزامات لگائے ہیں۔ایک مضمون میں تزک جہاں گیری کے حوالہ سے ان الزامات کی علامہ شبلی نے پردہ دری کی ہے۔تزک جہاں گیری، جہاں گیر کا روزنامچہ ہے اوراسی کے قلم سے ہے۔شروع میں علامہ شبلی نے اس کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ علامہ شبلی کا خیال ہے کہ تزک جہاں گیری میں جہاں گیر نے اپنے تمام صحیح اور سچے واقعات لکھے ہیں۔تصنع بناوٹ اورملمع سازی سے احتراز کیا ہے۔خوبیاں اورخامیاں دونوں کوڈنکے کی چوٹ پرلکھا ہے اورکوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی ہے اور ہرواقعہ کوانتہائی سادگی صفائی اور بے تکلفی سے ادا کیا ہے۔ جہاں گیر کے حالات وواقعات بلکہ اس کے ہرقسم کے خیالات کے معلوم کرنے کا سب سے معتبر ماخذ یہی کتاب ہے۔

علامہ شبلی نے تزک جہاں گیری سے جہاں گیر کے حالات وواقعات مثلاً سلطنت کے کاموں سے دلچسپی، عدل وانصاف، رعایا پروری ودادرسی اوراس کی توجہ وخبر گیری، حکومت کی پالیسی، ہندوؤں سے تعلقات اوران کے ساتھ حسن سلوک، علماء وفضلاء اوراہل علم کی بلاامتیاز مذہب وعقیدہ قدردانی وغیرہ کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ساتھ ہی اس کی علم دوستی معارف پروری اوراس کی ذاتی دلچسپی، علم الحیوان سے شغف، مصوری سے لگاؤ، جغرافیائی تحقیق، صناعی وصنعت گری، مذاق سپہ گری اورشجاعت وبہادری وغیرہ کے واقعات کو بہ ترتیب لکھا ہے اور پھر مورخین

یورپ اوران کے مقلدین کو باور کرایا ہے کہ جہاں گیر کن خوبیوں کا مالک اوراسلاف کا کیسا نمونہ تھا، اس پر جوالزامات عائد کئے جاتے ہیں وہ بالکل لغواور بے سروپا ہیں۔

احمد زکی آفندی کے سفرنامہ النظر فی السفر الی الموتمر کا ذکر بھی ایک مضمون میں ہے۔ احمد زکی نے یورپ کی مشرقی کانفرنس کے نویں اجلاس ۱۸۹۲ء منعقدہ لندن میں شرکت کے لئے مختلف ملکوں کا سفر کیا اوراپنا سفرنامہ لکھا، علامہ شبلی نے تفصیل سے اس سفرنامہ کا تعارف کرایا ہے۔ ضمناً متعدد سفرناموں کا بھی ذکر کیا ہے۔ احمد زکی نے برنڈزی، نیپولی، اٹلی، فلورنس، بینزا، جنیوا، فرانس، لندن، پرتگال، اسپین کے حالات اس سفرنامے میں لکھے ہیں۔ علامہ شبلی نے شکوہ کیا ہے کہ اصل کانفرنس پر بھر پور روشنی نہیں ڈالی گئی۔ چونکہ احمد زکی نے اس سفرنامے میں ہر جگہ اسلامی معلومات کے جوہر دکھائے ہیں، اس لئے یہ سفرنامہ دلچسپ ہوگیا ہے۔ مسافر نے یورپ کی ترقی کے اسباب تلاش کرتے ہوئے یورپ کی خصوصیات مثلاً کام میں مستعدی، مشغولیت اورانہماک، قومی خدمت کے خیال کوان کی ترقی کا راز قرار دیا ہے۔ غالباً یورپ کی ترقی کے اسباب کا اظہار ہی اس تبصرے کا باعث ہوا۔

عورتوں کی حالت، معاشرتی زندگی، عجائب خانے، کارخانے، کتب خانے، عبادت گاہیں، مدارس، گارڈن، تعلیم وتدریس، یونیورسٹی اورکالج وغیرہ مختلف عناوین کے تحت ان ممالک سے متعلق تفصیلات قلم بند کی ہیں۔ علامہ شبلی اس کی وسعت معلومات کے اعتراف کے باوجود نکتہ چیں ہیں کہ اس کے طرز تحریر میں یورپ کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ علامہ شبلی نے ان کی نشاندہی بھی کی ہے۔

ترکوں کی تاریخ پر بہت کم علمی کام ہوئے یہی وجہ ہے کہ تلفیق الاخبار جب شائع ہوئی جس میں ترک وتاتار کی تاریخ ہے تو علامہ شبلی نے اس پر ایک مفصل مضمون لکھا اور تاتاریوں کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے قبول اسلام کے واقعات اوران کے عام حالات کی تفصیل بھی سپرد قلم کی ہے۔

علامہ شبلی نے جرجی زیدان کے رد میں ایک کتاب الانتقاد لکھی ہے۔ جس کا ذکر باب اول میں آچکا ہے، اس کا انھوں نے اردو میں خلاصہ تیار کیا تھا۔ یہ خلاصہ بھی مقالات شبلی کے اس

حصہ میں شامل ہے۔

ڈریپر کی مشہور کتاب معرکہ مذہب وسائنس کو ظفر علی خاں نے اردو جامہ پہنایا۔ علامہ شبلی نے اس کا تعارف بھی تفصیل سے ماہنامہ الندوہ میں کرایا۔ اس کتاب کا نام اگرچہ ''معرکہ مذہب وسائنس'' تھا، لیکن تمام مباحث محض اسلام اور سائنس تک محدود رہے۔ لطف یہ کہ فاضل مصنف نے اسلام کو نصرانیت کی ایک شاخ قرار دیا تھا، اس لئے علامہ شبلی نے اس کا مفصل جائزہ لیا اور مصنف کی غلطیوں اور دروغ بیانیوں کی پردہ دری کی۔ البتہ فاضل مترجم کی تعریف کی ہے۔

بحیرا راہب کے واقعہ کو بھی ڈریپر نے موضوع بحث بنایا تھا۔ علامہ شبلی نے تاریخی حوالوں سے اس پر بحث کر کے مصنف کے نقطۂ نظر کی تردید کی ہے۔ کتب خانہ اسکندریہ کا قدیم الزام بھی دہرایا ہے جس کی تردید شبلی کی علمی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے۔ ڈریپر نے اگرچہ مسلمانوں کے علوم وفنون کا ذکر کیا ہے لیکن ہر جگہ اس کا تعصب بھی صاف جھلکتا ہے۔ علامہ شبلی نے اس کی بھی تصریح کی ہے۔ مصنف نے ان تمام علمی مسائل ومباحث کا ذکر تفصیل سے کیا ہے جو مذہب سے متصادم رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ابن رشد کی کاوشوں کا بھی ذکر ہے۔

آخری مقالہ میں ہومر کی ایلیڈ کے عربی ترجمے کا ذکر ہے۔ ہومر کے بارے میں علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> ''اگر یہ سوال ہو کہ کل دنیا کا سب سے بڑا شاعر کون ہے تو مختلف قوموں کی زبان سے مختلف جواب ہوں گے عجم فردوسی کا نام لیں گے، انگریز شکسپیر کو پیش کریں گے، رومی ورجل کے حق میں ووٹ دیں گے، عرب امرأ القیس کو مقابلہ میں لائیں گے، غرض کسی شخص پر اتفاق عام نہ ہو سکے گا، تاہم وطن پرستی سے قطع نظر کر کے اگر کسی شخص پر اتفاق عام ہو سکتا ہے تو وہ یونان کا شاعر ہومر ہے۔''(۲۵)

پھر علامہ شبلی نے ایلیڈ کے عربی ترجمہ پر روشنی ڈالی ہے اور مترجم پروفیسر سلیمان بستانی کی تعریف کی ہے کہ انھوں نے محنت سے ترجمہ کیا اور ایک شاندار مقدمہ بھی لکھا، جس میں ہومر کا بعض عربی شعراء سے موازنہ کیا ہے۔ اس کی فصاحت وبلاغت دکھلائی ہے اور عرب شعراء کے ہم

مضمون اشعار بھی نقل کئے ہیں۔علامہ شبلی نے البتہ اس پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ شعرائے جاہلیت جنہیں یونان کا نام تک معلوم نہیں، ان کے مضامین ہومر سے لڑ جاتے ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے خاص طور سے عنترہ کا نام لیا ہے۔(۲۶)

علامہ شبلی کے مضامین کئی لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ان کے عہد میں اردو میں نادر و نایاب کتابوں کے تفصیلی جائزے کا عام رواج نہیں تھا۔علامہ شبلی نے اس طرح کے مسلسل مضامین لکھ کر اس کی داغ بیل ڈالی اور خاص طور سے تبصرہ نگاری کو ایک نیا رجحان دیا۔

ان کے تقریظ وتبصرے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مکمل کتاب کا تعارف کراتے ہیں۔ایک ایک جزئی واقعات کی تفصیل قلم بند کرتے ہیں اور پھر قابل تحسین کی تحسین اور قابل نقد واقعات پر تنقید کرتے ہیں، جو واقعات مصنف نے نظر انداز کر دئے ہیں ان کا کہیں کہیں اضافہ کر دیتے ہیں، غرض مکمل کتاب کا جائزہ پیش کر دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی کے ان تنقیدی مضامین سے ان کے نظریات تنقید کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے اور صاف ثابت ہوتا ہے کہ ان کا تنقیدی شعور بہت بلند تھا۔

اس حصہ میں جن کتابوں پر نقد وتبصرہ ہے ان کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مثلاً تاریخ وتہذیب اسلامی، تاریخ ہند، طب، سفرنامہ، ترجمہ، ریاضی، ادب وبلاغت، لغت، تفسیر، شاعری وغیرہ۔ان متنوع موضوعات کی کتابوں پر علامہ شبلی لکھتے ہیں تو مصنف کی معلومات ایک طرف وہ خود اپنے علم ومطالعہ کا دفتر اور خزانہ پیش کر دیتے ہیں اور اسی وسیع علم ومطالعہ کی بنیاد پر وہ حتمی رائے قائم کرتے ہیں۔اس سے ان کی جلالت علمی کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔

مقالات شبلی جلد پنجم۔سوانحی

علامہ شبلی کے تاریخی مقالات دونوعیت کے ہیں۔ ایک سوانحی، دوسرے خالص تاریخی۔مولانا سید سلیمان ندوی نے دونوں کو علاحدہ علاحدہ شائع کیا ہے۔اس حصہ پنجم میں سوانحی مضامین ہیں۔

ماہنامہ الندوہ میں علامہ شبلی نے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کا مقصد ان کی

اور تحریروں کی طرح یہی تھا کہ مسلمان یورپ کے بجائے اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقف ہوں اور ان کی عظمت و سربلندی سے خود اپنی سربلندی کا سامان کریں۔ اس سلسلہ کا پہلا مضمون حضرت اسماء وہند کے نام سے ہے۔ اس میں تاریخ اسلام کی دو عظیم ماؤں: حضرت اسماء والدہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ اور ہند والدہ حضرت امیر معاویہؓ کی شجاعت و بہادری، استقلال وثبات اور دلیری و آزادی سے متعلق واقعات نقل کر کے ان کی نہایت مؤثر اور لائق تقلید سیرت بیان کی گئی ہے۔

دوسرے مضمون میں فرقہ معتزلہ کی اجمالی تاریخ قلم بند کی گئی ہے، جس میں اعتزال کی ابتداء وارتقاء، عروج، معتزلہ کے عقائد وخیالات اور علمائے معتزلہ کی خدمات اور ان کے کارہائے نمایاں کا ذکر ہے۔ اس مقالہ میں علامہ شبلی کے تاریخی اصول صاف ظاہر ہیں اور ان کے نظریہ تاریخ کے اہم عناصر صحت واقعہ، روایت ودرایت، قیاس واجتہاد، علوم وفنون سے واقفیت اور صاحب تذکرہ کے دونوں پہلوؤں کی تصویر وغیرہ واضح نظر آتے ہیں۔ یہ مقالہ اگرچہ مکمل نہ ہوسکا تاہم اردو میں اپنے موضوع پر ایک منفرد تحریر ہے۔

اس مقالہ اور بعض دوسری تحریروں میں شبلی نے معتزلہ کے افکار پر جس طرح بحث کی ہے اور جس قدر معتزلہ کی تعریف کی ہے۔ غالباً اسی کی بنیاد پر مولانا سید عبدالحئی حسنی نے علامہ شبلی کو معتزلی قرار دیا ہے۔ [نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۷۴، دائرۃ المعارف حیدرآباد، طبع اول ۱۹۷۰ء] حالانکہ یہ واقعہ نہیں بلکہ یہ شبلی کو مجروح کرنے کی ایک کوشش تھی۔ علامہ شبلی ماتریدی اور غالی حنفی تھے اور ان کا عقیدہ وہی تھا جو اہل سنت والجماعت کا ہے، تاہم وہ نہ صرف معتزلہ کے افکار وخیالات سے بخوبی واقف تھے بلکہ اشاعرہ اور ماتریدیہ اور بعض دوسرے فرق اسلامی کے عقائد وخیالات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔

اس حصہ کا تیسرا مقالہ ابن رشد پر ہے۔ علامہ شبلی، ابن رشد کے بڑے مداح تھے اور اسے عظمت رفتہ کا نمونہ تصور کرتے تھے۔ اس مقالہ میں اس نامور فلسفی کی ولادت سے وفات تک کے حالات بہ ترتیب لکھے ہیں، جس میں ابن رشد کی تعلیم وتربیت، اخلاق وعادات، فضل وکمال، تصنیفات، فلسفہ سے دلچسپی اور فلسفہ میں مرتبہ، اس کے افکار کی یورپ میں اشاعت

ومخالفت وغیرہ کی تمام تفصیلات اجمالی طور پر قلم بند کی ہیں۔ یہ مقالہ گو مکمل نہ ہوسکا تاہم بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس مقالہ سے پہلی بار مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ ہمارے اسلاف فلسفہ میں بڑے بلند رتبے کے حامل تھے اوران کے کارنامے بڑے عظیم الشان ہیں۔

علامہ شبلی کو جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، ناموران اسلام سے خاص دلچسپی تھی۔اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو مغرب کی علمی ترقیوں کے رعب واثر سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے علامہ ابن تیمیہ کے حالات اورکارنامے اسی خواہش کے تحت اس مضمون میں لکھے۔انھیں علامہ شبلی صحیح معنوں میں مجدد قرار دیتے تھے۔(۲۷)

اس مضمون میں علامہ ابن تیمیہ کے نام ونسب، ولادت ووطن، تعلیم وتربیت، فضل وکمال،علوئے مرتبہ اوران کے عظیم الشان کارناموں کے ساتھ ان کی پرآشوب زندگی کے واقعات کو اپنے خاص اسلوب تحقیق وتحریر کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کی تجدیدی خدمات کا نہایت عمدہ مرقع سامنے آ گیا ہے۔اس مقالہ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ ابن تیمیہ پر اردو میں پہلا مقالہ تھا جس کے ذریعہ اردوداں طبقہ علامہ ابن تیمیہ کی عظمت وبلند پایگی سے واقف ہوا۔

ایک مقالہ میں چوتھی صدی ہجری کے مشہور عربی شاعر متنبّی کے مختصر حالات وسوانح اور اس کے شاعرانہ کمالات کا ذکر ہے۔اس کی شاعری کے محاسن ، ہم عصر شعراء میں اس کے مقام ومرتبہ کے ذکر کے ساتھ اس کی شاعری کے عیوب کا بھی ذکر ہے۔اس کے موضوعات شاعری اور قدماء سے بعض مقامات پر موازنہ بھی کیا گیا ہے اور دکھایا ہے کہ متنبّی کا بچپن چونکہ صحرائے عرب میں گزرا تھا اس لئے بہت سے شریفانہ اخلاق اس کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔

متنبّی نے نبوت کا دعویٰ کیا، پھر توبہ کی اور شاعری کو ذریعہ معاش بنایا،اس کے اشعار اورقصیدے بڑے مقبول ہوئے۔علامہ شبلی نے اس کی اس طرح کی تمام تفصیلات قلم بند کی ہیں ۔آخر میں اس کے عبرت ناک انجام کا ذکر ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں موبدان مجوس کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے،اس لئے مغربی اہل قلم نے اس کا سبب مسلمان حکمرانوں کا تعصب بتایا۔اس کے جواب میں علامہ شبلی نے مقالہ ''موبدان مجوس'' لکھ کران کے اس الزام کی تردید کی۔ یہ مقالہ بھی اس حصہ میں شامل ہے۔اس

مقالہ میں پارسیوں کے ان مذہبی پیشواؤں کا مختصر حال لکھا ہے جو اسلامی دور حکومت میں عرصہ تک ہندوستان میں سکونت پذیر تھے اور جن کی خدمات کو مسلمان اہل علم نے بھی سراہا۔ علامہ شبلی کا خیال ہے کہ ان موبدان مجوس کو ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں مکمل طور پر مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ملک کی دیگر قوموں اور باشندوں کی طرح ان کو کسی قسم کی نہ تکلیف پہنچائی گئی اور نہ تعصب سے کام لینے کا کوئی واقعہ تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

انڈین میگزین اینڈ ریویو میں عالمگیر کی بیٹی شہزادی زیب النساء کی نہایت بھونڈی اور بدنما تصویر پیش کی گئی اور اس کی شخصیت پر عشق و عاشقی کے رکیک اور ناروا الزامات عائد کئے گئے تو علامہ شبلی نے ایک مضمون میں تاریخی شہادتوں سے ان الزامات کا جائزہ لے کر ثابت کیا کہ یہ الزامات فضول اور بے سروپا ہیں۔ یہ مضمون بھی اس تاریخی حصہ میں شامل ہے۔

علامہ شبلی نے اس مضمون میں نہ صرف الزامات کے جوابات لکھے بلکہ شہزادی کی اصل شخصیت سے لوگوں کو واقف کرایا۔ اس میں اس کی تعلیم وتربیت اخلاق و عادات، فضل و کمال، شاعری اور اس کی علم پروری وغیرہ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

زیب النساء نے شادی نہیں کی تھی۔ یہی ایک بات ہے جس نے مغربی اہل قلم کو رکیک حملوں کا موقع فراہم کر دیا اور انھوں نے یہ باور کرایا کہ مغل بادشاہ اپنی لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے تھے، حالانکہ خود عالمگیر نے اپنی دوسری لڑکیوں کی شادیاں کی تھیں۔

زیب النساء پر ایک الزام یہ لگایا گیا تھا کہ عاقل خاں سے اس کا تعلق عشق و محبت کا تھا اور وہ اس سے ملنے چوری چھپے محل میں آیا کرتا تھا، ایک مرتبہ عالم گیر کو محل میں اس کی موجودگی کا علم ہو گیا، چنانچہ وہ محل میں آیا تو عاقل خاں ڈر سے حمام کی دیگ میں چھپ گیا۔ عالم گیر نے انجان بن کر اسی دیگ میں پانی گرم کرنے کا حکم دیا جس میں وہ چھپا تھا۔ اخفائے راز کے ڈر سے عاقل خاں نے جان دے دی لیکن اف نہ کیا۔

علامہ شبلی نے اس فرضی واقعہ کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ ان تمام تذکروں میں جہاں عاقل خاں کے حالات ہیں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ علامہ شبلی نے یہ مقالہ مستند ماخذوں مثلاً مآثر الامراء، مآثر عالمگیری، عالمگیر نامہ، سرو آزاد، خزانہ عامرہ، ید بیضاء، مخزن الغرائب، وغیرہ کی

روشنی میں لکھا ہے اور نہایت تحقیق و تدقیق سے اس صریح بہتان کی تردید کی ہے۔

زیب النساء پر اردو میں یہ پہلی تحریر تھی جس سے انگریز مورخین کی غلط بیانی کا پردہ چاک ہوا اور زیب النساء کے اعلیٰ علمی وادبی ذوق وصلاحیت اور اچھے کردار سے نئی نسل کو واقفیت ہوئی۔ اس مضمون کو نول کشور پریس لکھنو نے کتابچہ کی شکل میں شایع کیا۔

ایک مختصر مضمون میں نامور مورخ غلام علی آزاد بلگرامی کے حالات وسوانح قلم بند کئے گئے ہیں اور مختصراً ولادت سے وفات تک کے حالات، فضل وکمال اور ان کی تصانیف کا تعارف کرایا گیا ہے، آزاد بلگرامی کثیر التصانیف مصنف ومورخ گذرے ہیں، اگرچہ متعدد موضوعات پر ان کی کتابیں ہیں تاہم ان کا اصل میدان تاریخ تھا۔ فن تاریخ میں ان کی تصانیف کو خاص مقام حاصل ہے۔ سروآزاد، ید بیضاء، مآثر الکرام، خزانہ عامرہ، روضۃ الاولیاء، سبحۃ المرجان وغیرہ آج تاریخ ہند پر داد تحقیق دینے والوں کے لئے ناگزیر مراجع کی حیثیت سے معروف ہیں۔ علامہ شبلی نے آزاد کی تصویر اس عمدگی سے کھینچی ہے کہ ان کی پوری زندگی اور کارنامے آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔

اس مجموعہ کا آخری مضمون مصر کے نامور محقق ومصنف فرید وجدی بک پر ہے۔ وجدی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے فلسفہ جدیدہ سے اسلام کی تطبیق کی کوشش کی چونکہ یہ خاص علامہ شبلی کے ذوق کی چیز تھی، اس لئے وہ بھی ان کے ممدوح ٹھہرے۔ یہ مضمون گو مختصر ہے لیکن وجدی کے کارناموں کا مرقع ہے۔

علامہ شبلی نے جب یہ مضمون لکھا تھا وجدی اس وقت نوجوان تھے اور ان سے بڑی توقعات تھیں۔ علامہ شبلی نے ان کی تعریف وتحسین کے ساتھ ان کی بعض کمیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ فرید وجدی کے کمالات کے اعتراف کے باوجود ہم کو کسی قدر افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ان کی مذہبی معلومات سطحی اور سرسری ہین، اس لئے حدیث یا قرآن مجید کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو ان کی کم مایگی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ (۲۸)

علامہ کے سوانحی مضامین کا یہ مجموعہ ان کے مورخانہ شعور سے زیادہ ان کی دینی وملی حمیت کا آئینہ دار ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں پر کسی قسم کے ناروا اعتراضات برداشت نہیں کر سکتے تھے جن مقاصد کے پیش نظر یہ مقالات لکھے گئے اب اکیسویں صدی میں بھی ان کی افادیت کم نہیں۔

مقالات شبلی جلد ششم۔تاریخی

مقالات شبلی کا یہ حصہ چند اہم تاریخی مقالات کا مجموعہ ہے۔اس میں جہاں علامہ شبلی نے چند تاریخی غلط فہمیوں کی تردید کی ہے وہیں عظمت رفتہ کے نقوش ابھارنے کے لئے بعض موضوعات پر روشنی بھی ڈالی ہے۔

اس حصہ کا پہلا مقالہ تراجم ہے۔جو ۱۸۸۷ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی تحریک پر علامہ شبلی نے سپرد قلم کیا تھا۔اس میں انھوں نے مسلمانوں کی علم دوستی اور معارف پروری کی طویل داستان بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں نے دنیا کی کون کون سی زبانیں سیکھیں اور دوسری قوموں کے کون کون سے علوم وفنون کی کتابوں کے اپنی زبان میں ترجمے کئے اور اس میں کس قدر شغف وانہماک اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

اس مقالہ میں مورخین یورپ کے اس الزام کی تردید بھی کی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں غیر قوموں کے علوم وفنون، تہذیب وتمدن اور ان کے آثار کو برباد کر دیا تھا، بلکہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے دوسروں کے علمی خزانوں سے پوری طرح واقفیت حاصل کی، اس کے لئے دارالترجمے قائم کئے، فارسی، سریانی، یونانی، سنسکرت اور لاطینی زبان کے ماہر مترجمین کا انتظام کیا اور مختلف علوم وفنون مثلاً فلسفہ یونان، ہیئت، جبرومقابلہ، حساب، علم الآلات، جغرافیہ، طب، جامٹری وغیرہ کی اکثر اہم کتابوں کا ترجمہ کرایا۔ان مترجمین اور ان کی مترجمہ کتابوں کی ایک طویل فہرست بھی علامہ شبلی نے اس مقالہ میں درج کی ہے اور ان کے علوم وفنون سے مسلمانوں کی گہری دلچسپی کے واقعات لکھ کر ثابت کیا ہے کہ:

> ’’عہد وسطیٰ میں مسلمانوں نے دنیا کی تمام قوموں کا علمی سرمایہ اپنی زبان میں منتقل کر لیا تھا اور اگر مسلمانوں کا دنیا میں قدم نہ آتا تو یونان، مصر، ہند وفارس کے تمام علمی ذخیرے آج برباد ہو چکے ہوتے۔‘‘(۲۹)

اسلام اور مسلمانوں پر مورخین یورپ کے من گھڑت اور بے سروپا الزامات میں یہ الزام بہت مشہور کیا گیا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب مسلمانوں نے مصر واسکندریہ فتح کیا

توانھوں نے وہاں کے قدیم اور مشہور یونانی کتب خانہ کو جو بطلیموسیوں کی یادگار اور صدیوں کا علمی خزانہ تھا جلا کر خاک کر دیا اور دنیا کو ایک عظیم علمی میراث سے محروم کر دیا۔ اس کی آڑ میں دراصل یہ ثابت کرنا تھا کہ اسلام اور مسلمان علم کے دشمن ہیں۔

اس الزام کے جواب میں علامہ شبلیؒ نے مورخانہ قلم اٹھا کر بدلائل ثابت کیا کہ مسلمانوں پر یہ الزام سراسر غلط ہے۔ کیوں کہ مسلمانوں کی فتح سے پہلے ہی اس کتب خانہ کو خود عیسائیوں نے تباہ و برباد کر دیا تھا اور اس فعل قبیح میں عیسائیوں کے بڑے بڑے مذہبی پیشوا بھی شریک تھے۔ مسلمانوں نے جب مصر و اسکندریہ فتح کیا تو اس کا وہاں نام و نشان تک باقی نہ تھا۔

علامہ شبلیؒ کا یہ مقالہ اس قدر جامع، مدلل اور محققانہ تھا کہ ساری علمی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ اس بیش قیمت تحریر نے مسلمانوں کا سر فخر سے بلند کر دیا اور مورخین یورپ کو تسلیم کرنا پڑا کہ مسلمانوں پر یہ الزام واقعتاً سراسر غلط تھا۔

علامہ شبلیؒ نے اس غلط اور بے سرو پا الزام کی تردید میں تاریخ اور نظریہ تاریخ سے نہایت دیانتداری سے کام لیا ہے اور اصل واقعہ کی چھان بین میں حق تحقیق ادا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مقالہ بہت مقبول ہوا۔ انگریزی میں اس کا خلاصہ شائع ہوا۔ بعد میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ آج بھی اپنے موضوع پر یہ مقالہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک مقالہ میں علامہ شبلیؒ نے کتب خانوں کی اجمالی تاریخ لکھی ہے اور عہد اسلامی کے اکثر کتب خانوں کا تعارف، ان کا انتظام اور ان کا طریقہ کار لکھا ہے اور ان کتب خانوں کی اہم کتابوں کا ذکر کر کے یہ دکھایا ہے کہ مسلمانوں کے دور حکومت میں جس کثرت سے کتب خانے قائم تھے۔ اس کی نظیر کہیں اور ملنی مشکل ہے، علامہ شبلیؒ نے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کی یادگاروں کو محفوظ رکھنے اور ان کے حالات و واقعات لکھنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا، جو ان کی رواداری اور وسیع النظری کا ثبوت ہیں۔ یہ تاریخی مقالہ ۱۸۹۲ء میں حیدر آباد کے مشہور رسالے حسن میں شائع ہوا اور رسالہ کے دستور کے مطابق علامہ شبلیؒ کو ایک اشرفی انعام میں ملی۔

ایک مقالہ میں عہد اسلامی کے شفاخانوں کی اجمالی تاریخ قلم بند کی ہے۔ علامہ شبلیؒ

جب اینگلواورینٹل کالج میگزین کے ایڈیٹر بنائے گئے توانھوں نے یہ اعلان کیا کہ اسلامی تہذیب وتمدن کے متعلق مختلف عنوانات پر تحقیقی وتاریخی مضامین لکھے جائیں تاکہ مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کی ایک جھلک مرتب شکل میں سامنے آجائے۔ یہ مضمون اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ (۳۰) اس میں پبلک ورکس کے ایک خاص پہلو شفاخانوں کا ذکر ہے۔ تاریخ کے صفحات میں بکھرے ہوئے اس مواد کو اکٹھا کرکے عہداسلامی کے شفاخانوں کا مرقع تیار کیا گیا ہےاور ثابت کیا گیا ہے کہ عہداسلامی عوامی، رفاہی اورانسانی ہمدردی کے کاموں میں کسی سے کبھی پیچھے نہیں رہا۔ بعض شفاخانوں کے انتظام وانصرام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ موجودہ دور کے شفاخانوں سے کسی طرح کم نہ تھے اور حکومت ان کی پوری دیکھ بھال کرتی تھی۔

ایک مقالہ میں علامہ شبلی نے ان تہذیبی وتمدنی ترقیوں کا ذکر کیا ہے جو مغل حکمرانوں کی کوششوں کی وجہ سے ہندوستان میں ہوئیں۔ مقالے کا آغاز عہد مغلیہ سے قبل ہندوستان کے تہذیبی وتمدنی اورمعاشرتی وسیاسی صورت سے کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بابر سے عالمگیر تک ہندوستانی تہذیب وتمدن میں جو تبدیلی اور ترقی رونما ہوئی ان کی نشاندہی کی گئی اور ضروریات زندگی مثلاً زمین کی پیمائش، پیداوار، آراضی کا بندوبست، صنعت ومصنوعات، ترقی حیوانات اور ان کی افزائش، عمارات اور شاہراہیں، رہن سہن، لباس اور دیگر ایجادات واختراعات کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ جن سے ثابت ہوجاتا ہے کہ مسلمانوں کے ذریعہ ہندوستان میں بڑے انقلابات رونما ہوئے۔

ایک مضمون میں مسلمانوں کی علمی بے تعصبی کا ذکر ہے جو کلکتہ کے اخبار بھارت متر کے ایڈیٹر کے ایک ناروا مضمون کے جواب میں علامہ شبلی نے لکھا تھا، بھارت متر کے ایڈیٹر نے ملا مسیح کی رامائن پر تبصرہ کرتے ہوئے مسلمانوں پر الزام لگایا کہ یہ رامائن گمنامی کے پردے میں اس لئے پڑی رہی کہ مسلمانوں نے اسے پسند نہیں کیا۔ ضمناً یہ بھی لکھا کہ مسلمان ہندوؤں کے لٹریچر سے ہمیشہ بے خبر رہے۔ جن لوگوں نے کچھ توجہ دی وہ تفریحاً تھی۔ عہداکبری میں جو کچھ ہوا وہ بہت محدود تھا اور دارشکوہ کو ہندوؤں کے ادب سے دلچسپی لینے کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھونا پڑا وغیرہ۔ علامہ شبلی نے ان الزامات کی تردید کی اور تاریخ کی معتبر کتابوں سے مسلمانوں کی علمی

بے تعصبی، علم پروری، ادب نوازی، رواداری، فراخدلی اور ہندوؤں کے زبان وادب سے دلچسپی کے سیکڑوں واقعات ثبوت میں پیش کر کے ثابت کیا کہ علمی بے تعصبی میں دنیا کی کوئی قوم مسلمانوں کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

انھوں نے یہ بھی لکھا کہ ملا مسیح اور ان کی رامائن کا ذکر تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ اس کی عدم مقبولیت کا سبب مسلمانوں کا تعصب نہیں بلکہ ملا مسیح کی کم درجہ کی شاعرانہ صلاحیت تھی۔ علامہ شبلی نے اس سلسلہ میں یہ مثال بھی دی ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ میں گبروں کے قصے لکھے اور صولت ترکستانی نے صولت فاروقی میں حضرت عمرؓ کی فتوحات نظم کیں مگر آج صولت ترکستانی کا کوئی نام بھی نہیں جانتا اور فردوسی کا شاہنامہ بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

اس مجموعہ کا آخری مضمون ''میکنکس اور مسلمان'' ہے۔ اس میں علامہ شبلی نے مسلمانوں کی مکینکل ترقی کا ذکر کیا ہے اور دکھایا ہے کہ ماضی میں مسلمان علمی و عملی ترقی اور ایجادات واختراعات میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اس مضمون کا مقصد بھی غالباً مسلمانوں کے اندر عزم وحوصلہ پیدا کرنا تھا کہ ان کے اسلاف سائنسی علوم میں ایسے بلند مقام پر فائز تھے کہ یورپ نے بھی ان سے خوشہ چینی کی۔

علامہ شبلی کے یہ تاریخی مقالات اس لائق ہیں کہ انھیں آج بھی فخر کے ساتھ مورخین یورپ کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ یہ مقالات علامہ شبلی کی بلند مورخانہ بصیرت کے نمونے ہیں۔ ضرورت ہے کہ انہیں انگریزی میں منتقل کیا جائے۔

مقالات شبلی جلد ہفتم۔ فلسفیانہ

پروفیسر خورشید الاسلام نے لکھا ہے کہ ''شبلی پہلے یونانی ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔'' [تنقیدیں ص ۳۵] ان کا یہ جملہ بے حد مشہور ہوا۔ انہوں نے یہ جملہ شبلی کی فلسفیانہ موشگافیوں اور نکتہ آفریں مزاج کی بنیاد پر لکھا تھا باوجود اس کے ایک فلسفی کی حیثیت سے علامہ شبلی نے جو خدمات انجام دیں، اس کی طرف نسبتاً کم توجہ دی گئی۔ حالانکہ وہ ایک بڑے فلسفی تھے اور نہ صرف فلسفہ اسلام بلکہ فلسفہ یونان سے بھی بخوبی واقف تھے۔ فلسفہ اسلام کا انھوں نے بڑی گہرائی

اور باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا، قلیل مدت حیات، کمزور صحت اور دوسرے مشاغل علمی نے انھیں موقع نہیں دیا کہ وہ اس کی طرف بھرپور توجہ دیتے تاکہ ہم انھوں نے جو فلسفیانہ مضامین لکھے، وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ اگر وہ منصوبہ بند طریقے سے فلسفہ کی طرف متوجہ ہوتے تو اپنے دوسرے علمی، ادبی اور تاریخی کارناموں کی طرح مثالی کارنامہ انجام دیتے۔

علامہ شبلی نے وقتاً فوقتاً جو فلسفیانہ مقالات سپرد قلم کیے، مولانا سید سلیمان ندوی نے انھیں مقالات کی ساتویں جلد میں یکجا کر دیا ہے۔ یہاں ان مضامین کا جائزہ اور اس کی روشنی میں علامہ شبلی کے فلسفے میں بلند مقام و مرتبہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

بعض مستشرقین نے یہ الزام عائد کیا ہے کہ فلسفے میں مسلمانوں نے ارسطو کی کورانہ تقلید کے سوا کچھ نہیں کیا۔ اسی طرح ایک اور مستشرق نے لکھا کہ مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے۔ پروفیسر رینان نے اپنے ایک لکچر میں کہا کہ اسلام اور علم دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔(۳۱)

یہ اور اس طرح کے دوسرے الزامات سے زچ ہو کر علامہ شبلی نے ان کی پردہ دری کے لیے ایک سلسلہ مضامین کا آغاز کیا اور پہلا مضمون فلسفہ اسلام اور یونان کے نام سے لکھا۔ اس میں پہلے فلسفہ کی ابتدائی تاریخ قلم بند کی، پھر قدیم فلسفہ کی کتابوں سے ثابت کیا کہ فلسفہ میں ابتدا ہی سے مسلمانوں کے دو گروہ تھے۔ ایک ارسطو کا ہم نوا اور دوسرا مخالف۔ مخالفین نے نہ صرف ارسطو کا رد لکھا بلکہ فلسفہ میں اس کے مہمات مسائل میں قابل قدر اضافہ بھی کیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے خاص طور پر ابوالبرکات بغدادی، شیخ الاشراق اور امام رازی کی کاوشوں کی تفصیل پیش کی ہے۔

علامہ شبلی نے اپنے مضمون میں ان تمام مسائل کی بھی تفصیل پیش کی ہے جو خاص مسلمانوں نے ایجاد کیں اور ان کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جو مسلمانوں نے فلسفہ میں اضافہ کیں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمانوں سے پہلے اس کی باقاعدہ تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ امام غزالی پہلے شخص ہیں جنھوں باضابطہ فلسفہ کی تعلیم و تدریس کا آغاز کیا اور اس کو بڑی وسعت دی۔

اسی سلسلہ میں انھوں نے ایک طویل مضمون میں یونانی منطق کی غلطیاں دکھلائیں اور وضاحت سے لکھا کہ حکمائے اسلام نے یونانی منطق پر کیا کیا اعتراضات کئے، حتی کہ وہ مسائل جو

مسلمات میں شمار ہوتے تھے انھیں غلط اور غیر ضروری ثابت کیا۔

ایک اور مضمون میں اجرام فلکی پر بحث کی اس سلسلے میں یونانیوں کے خیالات نقل کر کے ان کی بے وقعتی اور بے سروپائی دکھلائی اور ابن رشد کی تہافتہ الفلاسفہ سے بحث کرتے ہوئے وہ تمام دلائل نقل کئے ہیں جو یونانیوں کی تردید کے لیے کافی ہیں۔

ایک دوسرے مضمون فلسفہ اسلام اور فلسفہ قدیم وجدید میں تفصیل سے بحث کی ہے اور خاص طور سے جسم کی حقیقت اور عناصر اربعہ کی حقیقت، ماہیئت اور اس کے لوازمات کی وضاحت کی ہے۔ ایک اور مضمون میں علم کی حقیقت پر فلسفیانہ بحث کی ہے، اس میں احساس کے مدارج، تصور کی تعریف اور یونانیوں کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔

اس سلسلہ کا ان کا ایک اہم مضمون جذب یا کشش ہے۔ اس میں انھوں نے نیوٹن کی تھیوری پر بحث کی ہے اور پھر تفصیل سے دکھلایا ہے کہ یہ خیال پہلے سے موجود تھا۔ حکمائے اسلام نے اس کو مزید وسعت دی۔ علامہ شبلی نے ان حکماء کا نام اور ان کی کاوشوں کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے فلسفہ کے اس مسلمہ مسئلہ کو وسعت دی۔ اس سلسلہ میں ثابت بن مرہ کا انھوں نے خاص طور سے ذکر کیا ہے۔

علامہ شبلی کی فلسفیانہ کاوشوں کے سلسلے کا اہم مقالہ ''مسئلہ ارتقا اور ڈارون'' ہے۔ ڈارون کا نظریہ تھا کہ انسان کی اصل بندر ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اس سلسلہ میں پہلے اس کی حقیقت کا جائزہ لیا ہے پھر ڈارون کے نظریہ اور اس کے اصولوں پر نظر ڈالی ہے اور آخر میں حکمائے اسلام کے موقف کی وضاحت کی ہے۔

علامہ شبلی کا ایک مضمون ''ڈاکٹر برٹن اور تاریخ فلسفہ اسلام'' ہے۔ اس مضمون میں پہلے انھوں نے ڈاکٹر برٹن کا تعارف کرایا ہے پھر ان کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے حکمائے اسلام کی کاوشوں کی تعریف کی ہے۔ البتہ خاص فلسفہ اسلام پر ڈاکٹر صاحب نے جو کتاب لکھی تھی وہ جرمن زبان میں تھی اور اس پر جو مضمون شائع ہوا اس حصے کی بحث سے مضمون نگار نے قطع نظر کر لیا تھا۔ علامہ شبلی نے اس پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے یہ شعر درج کیا ہے:

جس میں نامہ بندھا تھا دلبر کا

وہی پر گر پڑا کبوتر کا

اس سے علامہ شبلی کی تاریخ فلسفہ اسلام سے دلچسپی اور گہرے مطالعے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ایک اور مضمون میں فارسی شاعری میں فلسفہ کا ذکر سحابی نجفی کے حوالہ سے کیا ہے اور دکھلایا ہے کہ سحابی نجفی نے فلسفہ کے مہمات مسائل کو اپنے شاعری میں باندھا ہے۔ان مباحث کی علامہ نے کسی قدر تفصیل قلم بند کی ہے۔

اس حصہ کے آخری مقالہ میں ندوہ کے سالانہ اجلاس اور اس کی علمی نمائش کا ذکر ہے، ظاہر ہے اس کا تعلق فلسفہ سے نہیں، معلوم نہیں کن وجوہ سے اسے اس حصہ میں شامل کیا گیا ہے۔

علامہ شبلی کے ان فلسفیانہ مقالات سے جہاں فلسفہ سے ان کی بڑھی ہوئی دلچسپی کا پتہ چلتا ہے، وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کی نظر فلسفہ کے رموز و نکات پر بڑی گہری تھی۔وہ نہ صرف اس کی تاریخ سے بخوبی واقف تھے بلکہ یونانی اور اسلامی فلسفہ کی باریکیوں اور نزاکتوں کا بھی انھیں علم تھا، ان مضامین سے جو بات سب سے زیادہ واضح طور پر سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ فلسفہ سے شبلی کی دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے خاص طور سے حکمائے اسلام نے فلسفہ میں بڑے اضافے کئے اور اسلامی فلسفہ کو قابل فخر بنایا۔

مقالات شبلی جلد ہشتم۔قومی واخباری

''مقالات شبلی'' کی یہ آخری جلد ہے۔اس میں علامہ شبلی کے قومی واخباری مضامین، تجاویز، رپورٹ اور متفرق تحریریں یکجا کی گئی ہیں۔مقالات کے گذشتہ حصے کسی خاص موضوع سے متعلق تھے مگر اس میں مختلف موضوعات ہیں اور دراصل یہ جلد علامہ شبلی کے بعض اہم افکار و خیالات اور ان کے مستقل علمی منصوبوں کی آئینہ دار ہے اور مقالات کے گذشتہ حصوں کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔اس کے مندرجات حسب ذیل ہیں:

[۱] صیغہ اشاعت الاسلام [۲] نومسلم راج پوت اور حفاظت اسلام [۳] حفاظت واشاعت اسلام [۴] نومسلموں کو دوبارہ ہندو ہوجانے سے بچانے کے لئے تمام برادران اسلام

کی خدمت میں فریاد [۵] کارروائی انجمن وقف علی الاولاد [۶] وقف اولاد کی کارروائی کہاں تک پہنچی [۷] اوقاف اسلامی [۸] وقف اولاد [۹] موریل متعلق نماز جمعہ [۱۰] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مفصل ومستند سوانح عمری مرتب کرنے کی تجویز [۱۱] ایک اور آفتاب علم غروب ہوا [۱۲] ابن رشد [۱۳] المامون [۱۴] اشاعت کتب قدیمہ [۱۵] انگریزی قرآن مجید کا ترجمہ اور ندوۃ العلماء [۱۶] مجلس علم کلام [۱۷] ایک اہم تجویز [۱۸] اثبات واجب الوجود [۱۹] ندوۃ العلماء کا گیارہواں سالانہ اجلاس اور علمی نمائش [۲۰] ندوۃ العلما کیا کررہاہے [۲۱] ندوہ کی نئی زندگی کا آغاز [۲۲] خاتونان قوم کی عزت اوریادگار [۲۳] زندہ زبیدہ [۲۴] دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سنگ بنیاد کا جلسہ اور جلسہ سالانہ ندوۃ العلماء [۲۵] دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سنگ بنیاد کا عظیم الشان جلسہ [۲۶] ایک مذہبی مدرسہ اعظم کی عمارت کے لئے تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے درخواست [۲۷] جلسہ دستار بندی ندوۃ العلماء [۲۸] دارالاقامہ کے کمروں کی تیاری [۲۹] مصر کی یونیورسٹی [۳۰] بھوپال میں ندوۃ العلماء کا وفد [۳۱] ندوۃ العلماء کا نیادور [۳۲] مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی [۳۴] مولانا عبدالباری کی شہادت [۳۵] اسٹرائک کا سبب کون تھا [۳۶] اصلاح ندوہ اور ہمدرد [۳۷] جلسہ دہلی کے متعلق ایک عام غلط فہمی کی تردید [۳۸] دارالعلوم ندوہ کی ایک اور خصوصیت [۳۹] علمی گروہ [۴۰] مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ [۴۱] لیڈروں کا قصور یا لیڈر بنانے والوں کا [۴۲] مسئلہ آرمینیا [۴۳] اضلاع سرحدی کا دورہ [۴۴] حضور نظام کی چالیسویں سالگرہ [۴۵] مولانا حالی کی ذرہ نوازی [۴۶] ہائے نواب محسن الملک۔

ان مضامین کو مولانا سید سلیمان ندوی نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے [۱] مذہبی [۲] تعلیمی [۳] سیاسی [۴] متفرق۔

سہولت کے پیش نظر ان مضامین کو مندرجہ ذیل عنوانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

[۱] اشاعت وحفاظت اسلام

[۲] ندوۃ العلماء

[۳] تجاویز

[۴] سیاسیات

[۵] وفیات

[۶] متفرقات۔

۱-اشاعت وحفاظت اسلام

آریوں کی مسلسل کوششوں سے ۱۹۰۸ء میں ارتداد کا ایک بڑا فتنہ اٹھا اور متعدد مقامات پر نومسلم دوبارہ ہندو ہوگئے ۔اس فتنے کے مقابلہ کے لئے متعدد علماء میدان میں آئے۔ان میں سب سے اہم نام علامہ شبلی کا ہے۔وہ اس واقعے سے تڑپ اٹھے اوراس کے سدباب کے لیے پیہم کوششیں کیں۔رائے بریلی اور شاہ جہاں پور وغیرہ کا خود دورہ کیا۔راج پوتانہ میں معتمد اشخاص بھیجے۔آریوں کے حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ندوہ میں ہندی اور سنسکرت کی تعلیم کا انتظام کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے متعدد مضامین لکھے جو اس حصہ مقالات میں شامل ہیں۔

اس کے لئے انھوں نے صیغہ اشاعت وحفاظت اسلام کے قیام پر زور دیا۔ایک مضمون لکھ کر برادران اسلام کی خدمت میں نومسلموں کو دوبارہ ہندو ہونے سے بچانے کے لئے فریاد کی۔جس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ حفاظت اسلام کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے۔جس میں ملک کے تمام صوبوں کے نمائندے ہوں۔ایک سکریٹری ہو جو تمام کارروائی پر نظر رکھے، واعظ مقرر کئے جائیں جو دو-دو، چار-چار مہینے ایک-ایک گاؤں میں رہ کر لوگوں کو اسلامی تعلیمات اور احکام سکھائیں۔واعظوں کے تیار کرنے کا بھی انتظام کیا جائے۔جابہ جا مکاتب قائم کئے جائیں۔جن میں قرآن اوراردو کی تعلیم دی جائے۔دیہاتوں میں جو مکاتب قائم ہیں ان میں مسلمان اساتذہ مقرر کرائے جائیں۔دینیات کا ایک ایسا نصاب تیار کیا جائے جو انگریزی خواں طلبہ کے لئے مفید ہو اورایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو آریوں سے مناظرہ کرے اور وہ جماعت بھاشا اور سنسکرت سے بھی واقف ہو۔آریوں کے مہمات عقائد کے رد میں رسالے لکھے جائیں۔

علامہ شبلی نے اپنے ان مقاصد کے حصول کے لئے اولاً احباب ومعاصرین کو خطوط لکھے پھر اخبارات ورسائل میں مضامین لکھے جو مقالات کی اس جلد میں شامل ہیں۔اشاعت

اسلام کے سلسلے میں علامہ شبلی نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ:

''ہمارے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ہم بے کس بن کر صرف دوسروں کے حملہ سے اپنے آپ کو بچائیں۔ اسلام اس لئے آیا تھا کہ تمام دنیا پر اپنے آپ کو پیش کرے۔ اس لئے ضرور ہے کہ ہم دوسری قوموں میں اپنے واعظ اور داعی بھیجیں، جو اسلام کی تبلیغ کریں۔ یہ قطعی ہے کہ اگر صحیح طور سے مذہب اسلام دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کیا جائے تو ہزاروں لاکھوں اشخاص نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ میں بھی اسلام بے تکلف قبول کر سکتے ہیں۔''(۳۲)

۲- ندوۃ العلماء

تحریک ندوہ برپا ہوئی تو چونکہ وہ علامہ شبلی کے فکروخیال کی ترجمان تھی، اس لئے وہ پورے طور پر اس سے وابستہ ہو گئے اور وہ تمام کام انجام دیے جو کسی تحریک کے بانی اور روح رواں انجام دیتے ہیں۔ اس کی بیش تر تفصیلات اس جلد میں شامل ہیں۔

مثلاً ''ندوہ کیا کر رہا ہے'' کے عنوان سے مضمون لکھ کر ندوہ کے فکروخیال اور اس کے مقاصد اور اس کی سرگرمیوں کی تفصیلات پیش کیں۔ دو مضامین میں ندوہ کے سالانہ اجلاس کی روداد پیش کی ہے۔ ندوہ میں ایک نمائش منعقد کی گئی تھی اس کی ایک ایک چیز کی تفصیل قلم بند کی ہے۔ حکومت کی طرف سے ندوہ کو زمین الاٹ کی گئی تو اسے ندوہ کی نئی زندگی سے تعبیر کیا۔ اس میں ندوہ کی ضروریات کے ساتھ حکومت کا شکریہ بھی ادا کیا ہے۔ اسی طرح نواب بہاول پور کی والدہ نے ندوہ کو دارالاقامہ کے لئے پچاس ہزار روپۓ عنایت کئے تو ایک مضمون بعنوان خاتونانِ قوم کی عزت اور یادگار لکھا۔ جس میں تاریخ اسلام کی اہم خواتین کے ذکر کے ساتھ ان کا ذکر کیا، شکریہ ادا کیا اور تمام خواتین سے تحریک ندوہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی اپیل کی۔ اسی طرح نواب صادق محمد خاں کی جدہ مکرمہ نے پچاس ہزار روپۓ دیے تو ان کا شکریہ ایک مضمون ''زندہ زبیدہ'' لکھ کر ادا کیا۔ ایک مضمون میں ندوہ کے سنگ بنیاد اور اس کے جلسہ کی روداد ہے۔ ایک اور مضمون میں مدرسہ اعظم یعنی ندوہ کی عمارت کے لئے مسلمانوں سے درخواست کی ہے۔

کئی مضامین اصلاً ندوہ کے سالانہ اجلاسوں کی روداد ہیں۔ ندوہ میں جو سربرآوردہ شخصیتیں آئیں ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ایک مضمون میں اپیل ہے کہ دارالاقامہ کے کمرے تعمیر کئے جارہے ہیں لوگ اپنے اپنے ناموں سے بنوائیں۔ندوہ کا جو وفد بھوپال گیا تھا اس کی تفصیل بھی ان کے قلم سے اس حصہ میں شامل ہے۔

ندوہ پر جو اعتراضات ہوئے علامہ شبلی نے چند ایک کے جوابات لکھے ہیں۔خاص طور سے مولوی بشیرالدین (ف:۲۴/اگست ۱۹۲۷ء) کے اعتراضات کا جائزہ لے کر ان کے خیالات کی بے وقعتی دکھلائی ہے۔مولوی بشیرالدین نے تحریک ندوہ کو علی گڑھ کا مخالف قرار دیا تھا۔علامہ شبلی نے اس کے جواب میں لکھا ہے کہ مرحوم سرسید احمد خاں بھی تحریک ندوہ کے پرزور حامی تھے۔

ماہنامہ الندوہ کے ایک مضمون کو لے کر مولوی عبدالکریم صاحب کی معطّلی عمل میں آئی، اس پر ہنگامہ ہوا۔اس کے تمام الزامات علامہ شبلی پر عائد کر دیے گئے،مولوی عبدالباری صاحب نے اس کی شہادت بھی پیش کی ، دو مضامین میں اس کا ذکر ہے۔ پہلے میں عبدالکریم صاحب کی معطّلی اور دوسرے میں گواہی کا جائزہ لے کر دکھلایا ہے کہ معطّلی ارکان ندوہ نے کی تھی،اس میں محض مجھے کیوں بدنام کیا جارہا ہے؟ اور مولوی عبدالباری تو سرے سے اجلاس میں موجود ہی نہ تھے تو ان کی شہادت کیا معنی رکھتی ہے۔اس سلسلے میں اور جو غلط فہمیاں پیدا کی گئیں اور علامہ شبلی کی ذات کو مطعون کیا گیا۔اس میں اور بعض دوسرے مضامین میں ان کی تردید و وضاحت بھی ہے جو اس مجموعہ مقالات میں شامل ہیں۔

ندوہ میں علامہ شبلی کے ساتھ جو ریشہ دوانیاں اور ناروا سلوک ہوئے ،اس کی تفصیل انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ایک خط میں بڑے درد و کرب سے لکھی ہے۔

> ’’آج کل سخت نرغہ ہے۔سہارن پوری،شاہ جہاں پوری،پھلواروی،کاکوروی سب یکجا جمع ہیں۔رپورٹیں تیار ہورہی ہیں،مضامین لکھے جارہے ہیں، فرد قرارداد جرم مرتب ہورہی ہے بلکہ ہوچکی ہے۔اقرارنامہ عقائد تیار ہوگیا ہے، جس کا مجھ سے اعتراف کرایا جائے گا اوران سب کاموں کے چیف ایڈیٹر جناب شاہ صاحب ہیں۔ جناب موصوف نے یہاں مستقل قیام اختیار کیا ہے۔

یہ تمام کاغذات ارکان کے پاس بھیجے جائیں گے اور باضابطہ میرے نکالنے کی تحریک کی جائے گی۔

فردجرم بہت بڑی ہے۔خورد برد کا بھی الزام ہے۔بہاول پور کا اشتہار بھی جرائم میں شامل ہے۔گورنمنٹ سے خط و کتابت اکبرالجرئم قرار دی گئی ہے اور سب پر مستزاد الحادوزندقہ ،جن عقائد کا مجھ سے اقرار کرایا جائے گا ان میں کرامات الاولیاء حق حالانکہ میں تو کرامات الشیاطین کا بھی قائل ہوں۔ہاں! انہی جرائم میں ابوالکلام کی محبت بھی ہے۔بھائی حقیقت یہ کہ اب ان لوگوں کاظلم حد سے بڑھ گیا، کہاں تک صبر کروں۔بار بار قلم اٹھاتا ہوں اور پھر رکھ دیتا ہوں،طلبہ بے قابو ہوئے جاتے ہیں لیکن بڑی مشکل سے روکتا ہوں کہ فساد سے کیا حاصل، دیکھئے کیا انجام ہوتا ہے۔'' [مکاتیب شبلی ج ا ص ۱۶۱-۱۶۲]

چنانچہ طلبہ بے قابو ہوئے اور اسٹرائک کردی۔مخالفین نے اس کی ساری ذمہ داری علامہ شبلی کے سر ڈالی اور طرح طرح کے بے سروپا الزامات عائد کئے۔علامہ شبلی نے ایک مضمون ''اسٹرائک کا سبب کون تھا۔؟'' لکھ کر اپنے اوپر لگائے گئے بے بنیاد الزامات کا جواب دیا اور ان اسباب کی نشاندہی کی ہے جن کی وجہ سے اسٹرائک ہوئی۔

چند اور مضامین میں ندوہ کا ذکر ہے،جس میں ندوہ کی خصوصیات اور اس کی ضرورت و اہمیت واضح کی گئی ہے۔''علمی گروہ'' ایک بہت اہم مضمون اس حصہ میں شامل ہے۔کسی بھی قوم کی ترقی اس کے علمی گروہ اور جماعت سے ہوتی ہے۔علامہ شبلی نے اس کی تفصیل میں لکھ دیا ہے کہ ندوہ نے جس کام کا آغاز کیا ہے اب آثار نظر آرہے ہیں کہ وہ ان مقاصد میں کامیاب ہوگا۔

ندوہ کے سلسلے میں جو دورے کئے گئے ان کی روداد یں بھی علامہ شبلی کے قلم سے شائع ہوئی ہیں،جنہیں سید صاحب نے اس میں شامل کر دیا ہے۔علامہ شبلی کی ان تحریروں میں ندوہ کی ایک تاریخ آگئی ہے اور اصلاً یہی تاریخ ندوۃ العلماء ہے۔اس نام سے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ نے دو جلدوں میں مولانا اسحاق جلیس ندوی کی جو کتاب شایع کی ہے اس میں علامہ شبلی کی کوششوں اور کاوشوں کا بھرپور اعتراف نہیں کیا گیا ہے۔ان کی مساعی جمیلہ کا ذکر تو در کناران

سے اغماض برتا گیا ہے۔ حالانکہ علامہ شبلی تحریک ندوہ کے بانیوں میں سے ہیں۔اس کے پہلے اجلاس سے لے کر ۱۹۱۲ء تک اس کے ہر کام میں پیش پیش رہے۔ دارالعلوم ندوہ کی تعمیر و ترقی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔نصاب و نظام تعلیم انہیں کے قلم سے نکلا۔ پورے ہندوستان سے جس میں امراء و والیان ریاست سب شامل ہیں، ندوہ کا تعارف انہیں نے کرایا۔ان سے ندوہ کے لئے بڑی بڑی امدادیں حاصل کیں۔تمام اکابر علماء و رؤسا کو ندوہ بلا بلا کر ان کو ندوہ سے جوڑا۔شیخ رشید رضا کو مصر سے بلا کر ندوہ کو سب سے پہلے عالم عربی سے روشناس کرایا۔معتمد تعلیم کی حیثیت سے نظام تعلیم کو اس قدر عمدہ بنایا کہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا عبدالباری فلسفی جیسے مایہ ناز اشخاص ندوہ سے نکلے۔

ندوہ سے متعلق ان کا بڑا کارنامہ ماہنامہ الندوہ کا اجراء بھی ہے، جس نے علمی دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا، حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ندوہ کو جس معیار پر پہونچا دیا تھا ان کے بعد پھر وہ کبھی اس بلند معیار تک نہ پہنچ سکا۔

یہ تمام حقائق خود علامہ شبلی کی تحریروں مضامین، رپورٹ، خطبات اور خطوط میں جا بہ جا موجود ہیں۔اگر ان تمام تحریروں کو یکجا کر دیا جائے تو تاریخ ندوۃ العلماء کا ایک صحیح اور عمدہ مرقع سامنے آجائے گا۔واقعہ یہ ہے کہ اس کا جس قدر مطالعہ ہونا چاہیے تھا وہ اب تک نہ ہوسکا۔

۳-تجاویز

مسلمانوں کی ترقی کے لئے علامہ شبلی نے اپنی زندگی میں متعدد منصوبے بنائے اور انھیں قوم کے سامنے پیش کیا۔ ان کے لئے جدوجہد کی، اس طرح کی ان کی اکثر تجاویز اور منصوبے اس حصے میں آگئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

۱- وقف علی الاولاد کی تجویز و تحریک۔
۲- تعطیل جمعہ کے لئے جدوجہد۔
۳- دارالمصنّفین کی تجویز۔
۴- سیرۃ النبی کی تجویز۔

۵- مجلس علم کلام کی تجویز۔

۶- اشاعت کتب قدیمہ کی تجویز۔

۷- اوقاف اسلامی کے متعلق تجویز۔

۸- انگریزی ترجمہ قرآن مجید کی تجویز۔

مذکرہ تجاویز اور منصوبے جوانھوں نے اخبارات ورسائل کے ذریعہ قوم کے سامنے پیش کیں مولانا سید سلیمان ندوی نے اس حصہ میں جمع کر دیا ہے، مگر اس جمع وتدوین میں بعض تجاویز مثلاً ماہنامہ معارف کی اشاعت کی تجویز جو علامہ نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں پیش کی تھی وہ شامل نہیں، اس طرح کی بعض اور تجاویز بھی جگہ نہ پاسکی ہیں، اس لئے علامہ شبلی کی تمام تجاویز کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ چند ایک تجاویز مثلاً وقف علی الاولاد وغیرہ کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے ان کا ذکر یہاں نہیں ہے۔

۱۔علامہ شبلی علی گڑھ میں جب یورپ کی تاریخی تحقیقات سے واقف ہوئے تو ان کو اندازہ ہوا کہ مورخین یورپ خاص طور سے مستشرقین نے اسلام اور اسلامی اقدار وروایات اور مسلمان حکمرانوں پر شدید تنقید اور ان کی تنقیص کی تھی اور اسلام کی شبیہ خراب کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا، چنانچہ علامہ شبلی نے ان کے ردوابطال کا ایک جامع منصوبہ بنایا جس کے تحت اسلامی حکومتوں کی نہایت مفصل اور بسیط تاریخ لکھنا ان کی اولین ترجیح قرار پایا، مگر منصوبے کی طوالت کے پیش نظر اسے مختصر کر کے تاریخ بنوعباس لکھنے پر اکتفا کرنا چاہا، مگر یہ کام بھی طویل نظر آیا تو اسے اور مختصر کر کے صرف نامور فرماں روایان اسلام تک محدود کر دیا اور ہر طبقہ سے محض ایک ایک نام ور کا انتخاب کیا۔

علامہ شبلی جن نامور فرماں روایان اسلام کے حالات اور کارنامے قلم بند کرنا چاہتے تھے، ان کے نام یہ ہیں: خلفائے راشدین میں حضرت عمر فاروقؓ، بنوامیہ میں ولید بن عبدالملک، بنوعباس میں مامون الرشید، اندلسی بنوامیہ میں عبدالرحمٰن ناصر، بنوحمدان میں سیف الدولہ، سلجوقیوں میں ملک شاہ، نوریہ میں نورالدین زنگی، ایوبیہ میں صلاح الدین ایوبی، موحدین اندلسی میں یعقوب بن یوسف اور ترکان روم میں سلیمان اعظم (۳۳)

ان ناموروں میں سے علامہ شبلی نے اپنے منصوبے کے مطابق المامون اور الفاروق لکھی اور نہایت ہی بلند رتبہ کتابیں سپرد قلم کیں، لیکن دوسرے ناموروں پر وہ اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے قلم نہ اٹھا سکے اور پھر کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی، حتی کہ ان کے تلامذہ اور منتسبین نے بھی اعتنا نہ کیا۔ دارالمصنّفین کے قیام واستحکام کے بعد بھی اس سلسلہ کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ اردو کے دوسرے اہل قلم نے ان ناموروں پر جو کتابیں لکھیں، وہ علامہ شبلی کے بلند معیار و مذاق کے مقابلہ میں کم رتبہ ہیں۔ یقیناً شبلی کے بلند معیار و منہج پر اگر یہ کام ہوگیا ہوتا تو ہمارے سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہوتا اور مسلمان حکمرانوں کے صحیح کارناموں سے واقفیت عام ہوتی۔

۲۔ حکومت وسلطنت کے ان مشاہیر کے علاوہ علامہ شبلی علوم اسلامیہ کے بے تاج بادشاہوں اور اصل فرماں روایان مملکت علم و دانش کے حالات وسوانح بھی قلم بند کرنا چاہتے تھے، وہ لکھتے ہیں:

> ''اول اول جب مجھ کو اس (نامور فرماں روایان اسلام) کا خیال پیدا ہوا تھا تو نہایت وسیع بنیاد پر ہوا، جس طرح میں نے خلافت وسلطنت کے مختلف خاندانوں سے ہیروز انتخاب کئے تھے، ارادہ تھا کہ اسی طرح علوم وفنون کے جدا جدا خاندان قائم کئے جائیں اور جو لوگ ان خاص خاص فنون میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے ان کو اس سلسلہ کا ہیرو قرار دیا جائے مگر اتنا بڑا کام تنہا میرے بس کا نہ تھا، مجبوراً حیثیت حکومت کی قید لگا کر میں نے اس خیال کو بہت کچھ محدود کردیا بلکہ اس سلسلہ حکومت سے بہت سے خاندان چھوڑ دئے تاہم وہ خیال دل سے نہ گیا کہ فرصت ہوتو اہل کمال کا دربار بھی سجایا جائے کہ السیف والقلم توامان''۔(۳۴)

چنانچہ علامہ شبلی نے ان بے تاج بادشاہوں میں امام ابوحنیفہؒ (سیرۃ النعمان) امام غزالی (الغزالی) اور مولانا رومؒ (سوانح مولانا روم) پر معرکہ آرا کتابیں قلم بند کیں، علامہ ابن تیمیہ اور ابن رشد پر مختصر مگر جامع مضامین سپرد قلم کئے اور وہ مزید اس سلسلے کو آگے نہ بڑھا سکے، بعد میں ان کے تلامذہ نے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا، امام رازی (مولانا عبدالسلام ندوی) ابن خلدون

(مولانا عبدالسلام ندوی) سیرت عمر بن عبدالعزیز (مولانا عبدالسلام ندوی) سیرت عائشہؓ (مولانا سیدسلیمان ندوی) حیات مالک (مولانا سیدسلیمان ندوی) ابن رشد (مولانا محمد یونس انصاری فرنگی محلی)، ابن تیمیہ (مولانا محمد یوسف کوکن عمری) خیام (مولانا سیدسلیمان ندوی) وغیرہ دارالمصنفین کی مایہ ناز کتابیں دراصل اسی سلسلے کی مطبوعات ہیں، اس کو مزید بڑھایا جاسکتا تھا، تاہم دارالمصنّفین نے اپنی بساط بھراس کام کوانجام دیا۔

٣۔١٨٩٦ء میں جب علامہ شبلی مدرسۃ العلوم میں پروفیسر اور محمڈن اینگلواورینٹل کالج میگزین (اردوسیکشن) کے مدیر تھے، قوم کے سامنے اسلامی کتابوں کی اشاعت کی تجویز پیش کی، ان کا خیال تھا کہ یورپ میں قدیم اور نادر کتابوں کی تلاش وجستجو اورطبع واشاعت کے لئے متعدد انجمنیں قائم ہیں، جوبیش بہا خدمت انجام دے رہی ہیں، حتی کہ خود مسلمانوں کی نادرالوجود کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کرشائع کررہی ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ یہ کام ہم خودانجام دیں اور دنیا کو بتائیں کہ مسلمانوں نے علوم وفنون کا کس قدرگراں مایہ ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔(٣۵)

اس تجویز کو وہ خودعملی جامہ نہ پہنا سکے یہی وجہ ہے کہ یورپ کے مستشرقین جب مسلمانوں کی کوئی نادر کتاب شائع کرتے تو وہ بڑے جوش وجذبہ کے ساتھ اس کا تعارف کراتے اوراس بات کا ذکرحسرت سے کرتے کہ یہ کام ہمارا تھا۔انھیں اس پربھی افسوس تھا کہ دنیا بھر میں مسلمان پھیلے ہوئے ہیں، ریاست وحکومت کے مالک ہیں پھربھی یہ کام وہ نہیں کرتے، مقالات شبلی جلد پنجم جونادر کتابوں کے تعارف وتبصرے پر مشتمل ہے تقریباً تمام مضامین کی ابتدااسی حسرت ویاس سے ہوئی ہے، طبقات ابن سعد کی اشاعت پر لکھتے ہیں:

> ''ہم کو فیاض دلی سے اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ یورپ کو آج کل ہمارے علوم وفنون کے ساتھ جواعتنا ہے اورجس طرح وہ ہمارے قدیم خزانوں کے بیش بہا نو ادر ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیدا کررہا ہے ہم خودنہیں کرتے، بلکہ نہیں کرسکتے، مسلمانوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ آج تک یورپ نے عربی کی کون کون سی نایاب کتابیں نہایت اہتمام کے ساتھ چھاپ کرشائع کیں۔''(٣٦)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''یورپ نے ہماری یادگاروں کو زندہ کرنے میں جو کام کئے ہیں، وہ کیا کم ہیں ان ہی کی بہ دولت فن حرب کی وہ کتاب شائع ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے اس فن کے علمی اصول مرتب کئے تھے اوران کا فن جنگ موجودہ فن جنگ کا مکمل خاکہ تھا، یورپ کی بہ دولت زہراوی کی کتاب فن تشریح سے متعلق چھپ کر شائع ہوئی جس میں کئی سوآلات تشریح کی تصویریں اوران کے استعمال کے طریقے درج ہیں...... یورپ ہی کی بہ دولت تاریخ طبری، طبقات ابن سعداور تاریخ الحکماء وغیرہ کا پتہ لگا جو گویا دنیا سے ناپید ہوگئی تھیں۔'' (۳۷)

علامہ شبلی کے ایک خط سے ان اسباب کا پتہ چلتا ہے کہ آخر وہ کیوں یہ کام نہیں کر سکے، وہ لکھتے ہیں:

''مولوی سیدعلی کے کتب خانے میں عربی مطبوعات یورپ دیکھ کر سخت حیرت زدہ رہ گیا، علمی زمین نے اپنے خزانے اگل دئے ہیں کیا کہوں اپنے علماء کی بدقسمتی اوراپنی مفلسی پرافسوس آتا ہے۔'' (۳۸)

اپنی مفلسی اور علماء کی بدقسمتی پر انھوں نے جو آنسو بہائے وہ رایئگاں نہیں گئے، ان کی بدولت اس تجویز کی طرف توجہ دی گئی اور بالآخران کی خواہش پوری ہوئی، مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''قدیم عربی کتابوں کی اشاعت کی جو تجویز انھوں نے ۱۸۹۶ء میں پیش کی تھی گو وہ اس وقت پوری نہیں ہوئی، لیکن عجیب بات ہے کہ جن قلمی کتابوں کی اشاعت کا نام انھوں نے لیا تھا، ان میں سے ایک (مناقب شافعی للرازی) کے سوا سب کتابیں ان کی زندگی میں چھپ گئیں اور دائرۃ المعارف جس کے نام سے ان کو مایوسی تھی، ان کے حبیب صمیم اور بانی کار کے خلف الرشیداوران کی درس گاہ کے چند تعلیم یافتوں کے ہاتھوں اس کی ایسی کایاپلٹ ہوئی کہ اس باب میں مولانا مرحوم کے اکثر ارادے پورے ہوگئے۔'' (۳۹)

۴۔علامہ مرحوم نے اس دور میں جب انگریزی تعلیم کو کفر تصور کیا جاتا تھا، اس کی

حمایت کی، ان کا خیال تھا کہ اسلام پر یورپ کے حملے کا جواب اوراس کا دفاع انگریزی علوم حاصل کئے بغیر صحیح طور سے نہیں کیا جاسکتا (۴۱) وہ انگریزی کے ساتھ ہندی اور سنسکرت کی تعلیم بھی مسلمانوں کے لئے ضروری خیال کرتے تھے، دارالعلوم ندوہ میں انھوں نے ہندی اور سنسکرت کی تعلیم کا شعبہ قائم کیا اور اس کی تعلیم کے لئے ایک پنڈت مقرر کیا (۴۲) اس سے ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسلام اور مسلمانوں پر آریوں کی طرف سے جو حملے ہورہے ہیں ان کا جواب دیا جائے جو ہندی وسنسکرت سے واقفیت کے بغیر خاطر خواہ طور پر نہیں دیا جاسکتا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ مدارس کے طلبہ کے لئے انگریزی کی تعلیم پر کیوں زور دیتے ہیں تو انھوں نے ایک آہ سرد کھینچی اور فرمایا:

> ''دیکھ رہے ہو کہ نئی تعلیم کس تیزی سے پھیلتی جاتی ہے اسی کے ساتھ عربی زبان کی تعلیم اعلیٰ مسلمان خاندانوں سے مٹتی جاتی ہے، اب نئے تعلیم یافتوں کی مذہبی واقفیت کا مدار انگریزوں کی کتابوں اور اسلامی کتابوں کے ترجمے پر رہ جائے گا اس وقت ہمارے مذہبی علوم کی کیا حالت ہوگی، اب بھی دیکھو جب غیر مذہبی تعلیم یافتوں کو قرآن پاک کے سمجھنے کا شوق ہوتا ہے تو وہ اپنی پیاس کو سیل کے انگریزی ترجمہ سے بجھاتے ہیں، فقہ اسلامی کا مدار ہدایہ کے انگریزی ترجمہ پر رہ گیا ہے کیا یہ کام ہمارے علماء کا نہیں ہے۔'' (۴۳)

ایک صدی گذر جانے کے بعد علامہ شبلی کے ان افکار وخیالات کی معنویت اہل علم پر عیاں ہے۔ اگر ۱۰۰ سال پہلے کی پیش کردہ ان تجویزوں پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ دور اندیش شبلی کے خیالات صدفی صد درست تھے اور آج ہم جن مراحل سے گذر رہے ہیں، ان میں انگریزی، ہندی اور سنسکرت زبانوں سے واقف ہوئے بغیر اس ملک کے باشندے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا نہیں ہوسکتے۔

۵۔ علامہ شبلی کے دور میں قرآن مجید کے جتنے ترجمے یورپین زبانوں میں تھے وہ سب عیسائیوں کے قلم سے تھے۔ جس میں انھوں نے بددیانتی سے کام لیا تھا اور بے جا تاویلات و تلبیسات کی تھیں۔ ان ترجموں کی بنیاد پر وہ غلط فہمیاں پھیلا رہے تھے اور حکمراں انگریز انھیں سے

استفادہ کر کے مسلمانوں کے عائلی مسائل میں رخنہ انداز ہوتے تھے، اس لئے علامہ مرحوم کو ایک صحیح اور مستند ترجمہ قرآن کا خیال پیدا ہوا جسے انھوں نے ایک تجویز کے طور پر پیش کیا، اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ غیر مسلم قرآن مجید سے استفادہ کریں تو صحیح اور مستند ترجمہ ان کے پیش نظر رہے، علامہ کی اس تجویز کی بڑی پذیرائی ہوئی اور اسے عملی جامہ پہنانے کی کوششیں کی گئیں، نواب سید حسین بلگرامی نے اس کا ذمہ لیا، بعض رؤسا نے اس کے اخراجات کی ذمہ داری قبول کی، چنانچہ پانچ پاروں کا ترجمہ شائع ہوا۔ (۴۴) مگر پھر علامہ شبلی نے اچانک وفات پائی اور یہ کام آگے نہ بڑھ سکا، البتہ بعد کے لوگوں نے یہ کارنامہ انجام دیا، اور اس سلسلہ کی علامہ کی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں اور اب مسلمانوں کے کئے ہوئے کئی معتبر انگریزی ترجمے دستیاب ہیں۔

۶۔ علامہ شبلی نے ایک اور تجویز علم کلام سے متعلق پیش کی تھی، ان کا خیال تھا کہ جدید علم کلام نامکمل اور ناقص ہے، اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ عباسیوں کے زمانے میں جب فلسفہ اور علوم عقلیہ کا رواج ہوا تو سیکڑوں ہزاروں اشخاص کے مذہبی عقائد متزلزل ہو گئے (۴۵) چنانچہ مسلمانوں میں علوم عقلیہ اور فلسفہ کے ماہرین پیدا ہوئے اور انھوں نے اس سیلاب کو روکا، موجودہ دور میں جب کہ یورپ کی تحقیقات عام ہو رہی ہیں اور جدید خیالات قوم میں پھیل رہے ہیں علماء میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے یورپ کا فلسفہ اور سائنس حاصل کیا ہو (۴۶) اس لئے ضروری ہے کہ ایک کمیٹی ''مجلس علم کلام'' بنائی جائے، جس میں بقول علامہ شبلی:

> ''قدیم علماء اور جدید تعلیم یافتہ دونوں گروہ کے لوگ ممبر ہوں، قدیم علماء اس بات کا فیصلہ کریں کہ جو عقائد اور مسائل فلسفہ کے خلاف بیان کئے جاتے ہیں ان میں سے کون سے مسائل درحقیقت اسلام کے اصل عقائد ہیں اور کون سے نہیں، جدید تعلیم یافتہ گروہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ جن چیزوں کو فلسفہ کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت فلسفہ کے مخالف ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو فلسفہ کی تحقیقات کہاں تک یقینی اور قطعی ہے۔'' (۴۷)

اس کمیٹی میں انھوں نے قدیم وجدید تعلیم یافتہ دونوں گروہ کو شامل کیا تھا، جس میں مفتی عبداللہ ٹونکی، مولانا حمیدالدین فراہی اور مولوی عبدالقادر بی اے شامل تھے۔ (۴۸)

اس سلسلے میں انھوں نے مذکورہ اشخاص سے خط وکتابت کی اور اسے ایک مجلس کی شکل دینے کی کوشش کی ۔علامہ اقبال کے علاوہ کسی اور کے رکنیت قبول کرنے کا ذکر نہیں ملتا۔ یہ کام اس سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔البتہ خود علامہ شبلی نے علم الکلام کی اردو میں ترتیب وتدوین کے لئے بڑی جدوجہد کی اور اس کا ایک وسیع اور مہتم بالشان علمی منصوبہ بنایا، جس کی تفصیل الغزالی کے ذکر میں آچکی ہے۔

علامہ شبلی نے تقریباً سوسال پہلے یہ منصوبہ بنایا تھا، موجودہ دور میں یہ کام اور زیادہ اہمیت کا حامل ہوگیا ہے، سائنسی تحقیقات کا یہ دور عروج ہے، روزنت نئے انکشافات ہورہے ہیں، اس لیے علامہ شبلی کے دور کے مقابلے میں آج مجلس علم کلام اور اس کے مقاصد کا حصول وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔

۷۔سیرت نبوی کی تالیف کی تجویز کا مفصل ذکر سیرۃ النبی کے ذیل میں آچکا ہے۔البتہ یہاں یہ ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے سیرت کا جو منصوبہ بنایا تھا اس میں ایک جلد (پنجم) میں مستشرقین کے اعتراضات اور ناروا الزامات کا ردوابطال کرنا تھا، وہ سپرد قلم نہ ہوسکا، سیرۃ النبیؐ میں اگرچہ جابجا مورخین یورپ کے اعتراضات کی تردید کی گئی ہے تاہم علامہ شبلی کے اس خیال کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ اس جلد کو قلم بند کیا جائے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی زندگی میں اس کا کسی کو خیال نہیں آیا، البتہ ان کی وفات کے بعد دارالمصنّفین کے ایک اہل قلم کارکن ابوعلی اثری مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں اس اہم کام کے لئے مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمیداللہ کا نام پیش کیا (۵۹) مگر اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ تھا کہ مستشرقین کی تردید کی کوشش سے آپ ان کی اہمیت بڑھاتے ہیں اور سرفرازی کرتے ہیں، وہ جس کے مستحق نہیں۔ان کے لغو اعتراضوں سے اعتنا نہ کرنا ہی بہتر جواب ہے۔ (۶۰) اس لئے وہ بھی اس کی طرف توجہ نہ کرسکے، غالباً شبلی کے اس نقطۂ نظر کے مطابق سیرۃ النبیؐ پر اب تک کوئی کام نہیں ہوا۔

۸۔صحافت کے میدان میں مسلمانوں کا اپنا کوئی اخبار نہیں تھا، اس کا احساس سب سے پہلے علامہ کو ہوا، چنانچہ انھوں نے اس کے لئے بڑی تگ ودو کی۔۱۹۱۲ء میں سید میر جان نے

لکھنؤ سے مسلم گزٹ جاری کیا جو دراصل علامہ شبلی ہی کی تمام تر کوششوں کا نتیجہ تھا، اس کی تفصیل حیات شبلی میں موجود ہے (۶۱) ہندوستان میں مسلمانوں کا اب تک کوئی آزاد اخبار نہیں ہے جو ان کے خیالات کی ترجمانی کر سکے، مولانا شبلی کی بصیرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو اس زمانہ میں اس کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ انھوں نے سید میر جان کو نہ صرف مشورہ دیا بلکہ اس کی ذمہ داری بھی قبول کی، مولوی وحید الدین سلیم کو علی گڑھ سے بلا کر ایڈیٹر بنایا، ان کی کوششوں سے بہت جلد مسلم گزٹ مقبولیت کے آسمان پر چمک اٹھا مگر قوم کی بدمذاقی سے علامہ شبلی کی یہ کوشش بارآور نہ ہوسکی (۶۲) ایک ایسا اخبار جو مسلمانوں کے مسائل کو واضح اور مسلم کاز کی ترجمانی کرے جاری کر کے علامہ شبلی کی ایک خواہش کی تکمیل کی جا سکتی ہے۔

۹۔ ۱۱رفرور ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نے الہلال کلکتہ میں دارالمصنّفین کی تجویز قوم کے سامنے پیش کی۔ اسے وہ اپنا آخری میدان عمل اور زمرہ مصنفین کی دائمی خدمت خیال کرتے تھے۔ (۶۵) دارالمصنّفین کا بنیادی مقصد اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا۔ بلند پایہ کتابوں کی تصنیف وتالیف وترجمہ اور ان کے طبع واشاعت کا انتظام کرنا تھا۔ (۶۶) بلا شائبہ مبالغہ یہ ادارہ تقریباً ایک صدی سے اپنے مقاصد کے حصول میں سرگرم ہے۔ دوسو سے زائد بلند پایہ اور معرکہ آرا کتابیں اپنے مصنفین سے لکھوا کر شائع کر چکا ہے۔ اس کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ آج قومی سرمائے میں سب سے قیمتی علمی ذخیرے کا اضافہ دارالمصنّفین نے کیا ہے اور سب سے زیادہ اہل قلم اور مصنفین اسی کے زیر اثر پیدا ہوئے۔ بلا شبہ یہ سب علامہ شبلی کا فیضان ہے۔ (۶۷)

دارالمصنّفین نے سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، تابعین، تبع تابعین، تاریخ اسلام، تاریخ ہند، شعر وادب، سوانح، مکاتیب، سفرنامے، غرض مختلف النوع موضوعات پر گراں قدر کتابیں شائع کیں۔ اس ادارے نے حتی المقدور زمانہ کی رفتار سے ہم آہنگ ہو کر نئی ضرورتوں اور نئے تقاضوں پر علمی کام کیا، مالی وسائل کی کمی، مناسب افراد کی نایابی کے باوجود اس ادارہ نے جو علمی ذخیرہ قوم کے سامنے پیش کیا اس کی مثال شاید ہی مل سکے، تاہم بہت سے کام ایسے بھی ہیں جو وہ انجام نہ دے سکا۔ مثلاً سیرۃ النبی پر مولانا سید سلیمان ندوی کے بعد کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا۔ تاریخ اسلام کی چار جلدوں کے بعد یہ سلسلہ رک گیا۔ تاریخ اندلس حصہ اول کے بعد بقیہ حصے شائع

نہ ہوسکے۔ تاریخ ہند پر کوئی مبسوط اور مدلل کتاب بھی نہ لکھی جاسکی۔ شبلی کے سلسلہ نامور فرمارویان اسلام کا ایک حصہ بھی سپرد قلم نہ ہوسکا۔ ناموران اسلام اور حکمائے اسلام پر جس قدر کام ہونا چاہئے تھا وہ بھی نہ ہوسکا۔ ایسا محض مالی دشواریوں، اہل علم اور ارباب دولت کی بے توجہی کی وجہ سے ہوا۔ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ دارالمصنّفین جو علم وفن کا سب سے بڑا ادارہ ہے، قوم کی بدمذاقی کی وجہ سے اپنے عزائم کی تکمیل شایان شان طریقہ سے نہ کرسکا۔ قومی ترقی کا سارا دارومدار قوموں کی علمی، دماغی اور ذہنی ترقی پر منحصر ہوتا ہے، علامہ شبلی نے اس کام کے لئے یہ ادارہ قائم کیا تھا مگر قوم کے صاحب ثروت افراد اس ادارہ حکمت و دانش کو خاطرخواہ ترقی دینے میں موثر کردار ادا کرنے سے قاصر رہے۔

مقالات کی اس جلد میں علامہ شبلی کی ایک اہم تجویز جو رسالہ المعارف کی اشاعت کے سلسلے میں پیش کی تھی وہ درج نہیں ہے۔ یہ علامہ شبلی کی سب سے پہلی تجویز ہے جو مولوی سراج الدین صاحب مصنف سیرۃ الفاروق کے ''سرمور گزٹ، ناہن'' میں چھپی تھی۔ چونکہ سرمور گزٹ کے علاوہ یہ کہیں دستیاب نہیں، بلکہ سرمور گزٹ بھی عام طور سے دستیاب نہیں، اس لئے مکمل اشتہار یہاں درج کیا جاتا ہے۔

ایک ماہوار رسالہ

المعارف

کا اشتہار

اس رسالے کے جو مقاصد واغراض ہیں، ان کی زیادہ توضیح کے لئے مناسب ہوگا کہ اس کی تجویز کی ابتدائی تاریخ بیان کی جائے۔ ایک مدت سے اکثر مجھ کو یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ اسلامی تاریخ میں بہت سے ایسے کارنامے اور چھوٹے چھوٹے دلچسپ واقعات ہیں جن کے لئے کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی جاسکتی۔ ان کو قوم اور ملک کے سامنے لایا جائے تو کس پیرائے میں لایا جائے۔ مثلاً مسلمانوں کے کتب خانے، رسدگاہیں، سفرنامے، تحقیقات طبی، تمدن ومعاشرت اس قسم کے اور بہت سے مضامین ہیں جن کے متعلق تفصیلی معلومات کا سرمایہ موجود نہیں اور جس قدر موجود ہے اس پر الگ الگ کتابیں نہیں لکھی جاسکتیں۔

اس بنا پر خیال ہوا کہ ایک ماہواری رسالے سے یہ کام لیا جائے، چونکہ ملک میں اس قسم کا مذاق اتنا عام نہ تھا کہ صرف اس محدود عنوان پر کوئی ماہوار رسالہ اشاعت پا سکتا، اس لئے یہ تجویز عمل میں نہ آسکی۔ مصر و روم کے سفر میں اس ارادے کو تحریک ہوئی کہ ان ممالک میں جہاں قدیم اسلامی تاریخ کے ذخیرے ڈھونڈھتا رہا، یہ بھی دیکھتا تھا کہ مسلمانوں کی موجودہ تعلیم و تربیت کا کیا نقشہ ہے۔ بہت سی باتیں خود تحقیق کیں اور اکثر اخبارات اور علمی رسالے دیکھے، جن سے یہ امید ہوئی کہ معلومات کا یہ سلسلہ آئندہ بھی قائم رہ سکتا ہے۔ یعنی ان ملکوں میں جو تربیت اور طرز تعلیم ہے اور جو کچھ اس میں اصلاحیں اور ترقیاں ہوتی رہتی ہیں، وہ وقتاً فوقتاً ان اخبارات و رسالوں کے ذریعہ سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ اس طرح اگر مسلمانوں کی قدیم تاریخ کے ساتھ جدید تاریخ کو بھی شامل کر لیا جائے تو مضمون وسیع ہو جائے گا اور اس کی بنا پر ایک مستقل رسالہ کا جاری کرنا بے جا نہ ہوگا۔

ان باتوں پر مرا ارادہ راسخ نہ ہوا تھا لیکن خوش قسمتی سے بعض غیر مترقب اسباب پیدا ہو گئے، جن کے بعد مجھ کو کسی حالت منتظرہ کا انتظار نہ رہا۔ مسٹر آرنلڈ جو ہمارے کالج میں فلاسفی کے پروفیسر ہیں، انگریزی کے سوا یورپ کی کئی زبانیں جانتے ہیں اور چونکہ ایک مدت سے دعوت اسلام پر وہ ایک بہت بڑی کتاب لکھ رہے ہیں، اس لئے ان زبانوں میں جس قدر تصانیف، اسلام اور تاریخ اسلام کے متعلق ہیں، ان کا بہت بڑا حصہ ان کی نگاہ سے گزر چکا ہے۔ صاحب موصوف سے جب میں نے اپنے خیالی رسالے کا تذکرہ کیا تو انہوں نے نہایت آمادگی سے اس کی اعانت کا وعدہ کیا اور اجازت دی کہ ان کا نام رسالہ کے ایڈیٹروں میں شامل کیا جائے۔ ان کے ساتھ ہمارے کالج کے سکنڈ ماسٹر میر ولایت حسین صاحب نے بھی ایڈیٹری قبول کی اور اس طرح مجھ کو اس کام میں دونوں بازو مل گئے اور رسالے کو دو سرپرست ہاتھ آ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل یورپ نے اور علوم و فنون کے ساتھ علم تاریخ کو اس بلند رتبہ پر پہونچا دیا ہے کہ کوئی قوم گو اپنی ہی تاریخ لکھنی چاہے یورپ کی تصنیفات سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔

جس قسم کے مضامین اس رسالے میں وقتاً فوقتاً شائع ہوں گے ان کی تفصیل اس طرح ہے:

[۱]مسلمانو کی علمی اور عملی ترقیاں۔

[۲]اسلامی تاریخانہ مسائل کی تحقیقات اور یورپ کے مصنفین نے جہاں ان کے متعلق غلطی کی ہے ان کی اصلاح۔

[۳]مشہور مصنفین اسلام کی سوانح عمریاں۔

[۴]عربی فارسی اور اردو زبان کی انشا پردازی اور علم اللسان کی تحقیقات۔

[۵]مصر وروم و ہندوستان کی موجودہ تعلیم وتربیت وتصانیف۔

[۶]یورپ اور مصر و بیروت کے میگزینوں میں جو آرٹکل کسی حیثیت سے اسلام کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں ان کے ترجمے۔

کسی حال میں اس رسالے کو پالیٹکس اور مذہبی بحثوں سے سروکار نہ ہوگا۔ یہ رسالہ ۳۲ صفحوں میں ہوگا اور خط خوبصورت اور ۲۶x۲۰ کے آٹھویں حصے پر بہت صاف چھپوایا جائے گا۔ قیمت سالانہ مع محصول ڈاک دو روپیہ آٹھ آنہ ہے۔ چھپائی وغیرہ کے اخراجات ادا کرنے کے بعد جو توفیر ہوگی وہ اسی رسالے کی وسعت اور ترقی دینے یعنی ان میگزینوں اور کتابوں کے بہم پہونچانے میں صرف ہوگی جو رسالے کی زیادہ ترقی کا سبب ہوں۔ قیمت چونکہ پیشگی لی جائے گی اس لئے قیمت کے وصول کا آسان طریقہ ہے کہ جن لوگوں کے نام پرچہ روانہ کیا جائے تین یا چھ مہینے کی قیمت کا حساب لگا کر ویلو پے اے بل روانہ کیا جائے اور جب یہ مدت ختم ہو چکے تو پھر اخیر پرچہ اسی طرح ویلو پے اے بل بھیجا جائے۔

رسالہ کا پہلا پرچہ پہلی مارچ کو شائع ہوگا جو صاحب خریداری کی درخواستیں بھیجیں زرنقد ہرگز نہ بھیجیں بلکہ اس میں ویلو پے اے بل بھیجنے کی اجازت ہو۔

المشتہر شبلی نعمانی

پروفیسر مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ (ممالک مغربی وشمالی)

[سرمور گزٹ، ناہن، مورخہ ۳ر فروری ۱۸۹۳ء صفحہ ۷، ۸]

علامہ شبلی المعارف جاری نہ کر سکے۔تقریباً ایک سال بعد انہیں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کے اردو حصے کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا، جسے وہ کئی برس[۱۸۹۷ء] تک بخوبی نکالتے رہے۔

ندوۃ العلماء سے وابستگی کے زمانہ میں ماہنامہ الندوہ جاری کیا۔جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ندوہ کے بعد وہ اعظم گڑھ آئے اور دارالمصنّفین قائم کیا تو انہیں پھر ایک علمی رسالہ کا خیال آیا۔ چنانچہ اس کا ایک خاکہ مرتب کیا،جس میں اس نام اور اس کے اغراض ومقاصد کی تفصیل بھی ہے۔وہ خاکہ یہ ہے:

۱۔نام : معارف

۲۔چیف ایڈیٹر: شبلی

۳۔اسٹاف: مولوی سلیمان،مولوی عبدالماجد،مسٹر حفیظ،مولوی عبدالسلام

۴۔تعداد صفحات،تقطیع وکاغذ: ۲۰x۲۹،ضخامت ۴۰ صفحے،قیمت ۳ر روپے

تنوعات مضامین: فلسفہ،تاریخ قدیم وجدید،سائنس

ادبیات : شعر،اردو شاعری کی تاریخ اور اسالیب۔

اقتباسات : مجلّات علمیہ یورپ اور مصر وبیروت

فن تعلیم : کتب نادرہ کا ذکر اور ان کے اقتباسات یا ان پر اظہار رائے

تنقید : کتب یا علوم جدیدہ پر

مصر سے المقتطف،الہلال،المنار اور بیروت سے المقتبس منگوائے جائیں۔بہ قیمت یورپ کے علمی پرچے منگوائے جائیں۔[قلمی یادداشت محفوظہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ]

۴-سیاسیات

علامہ شبلی گو عملاً سیاسی نہ تھے،تاہم سیاسیات سے بخوبی واقف تھے اور اس پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ہندوستان کی سیاست اور جدوجہد آزادی میں کانگریس کے حامی اور ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار رہے۔مسلم لیگ اور اس کے نظریات سے انھیں اختلاف رہا جس کا ذکر انھوں نے اپنی متعدد نظموں اور بعض مضامین میں کیا ہے۔مقالات کے اس حصے میں ان کے تین اہم سیاسی مضامین [۱] مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ [۲] لیڈروں کا قصور ہے یا لیڈر بنانے والوں کا [۳]

مسئلہ آرمینیا شامل ہیں جو سیاسی مسائل و معاملات پر ان کی گہری نظر کے عکاس ہیں۔

پہلا مضمون مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ ان کا انتہائی اہم اور معرکۃ الآراء مضمون ہے۔ یہ دراصل ان کی سیاسی فکر کا نمائندہ مضمون ہے۔ یہ ۱۹۱۲ء میں تنسیخ تقسیم بنگال کے زمانہ میں لکھا گیا اور بقول سید سلیمان ندوی اس نے سیاست کا رخ پلٹ دیا۔

اس میں علامہ شبلی نے مسلم لیگ اور سرسید احمد خاں کے سیاسی نقطۂ نظر پر سخت تنقید کی ہے اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ان کا نقطۂ نظر درست نہیں چونکہ علامہ شبلی ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے، اس لئے یہ دلائل اس کی تائید کی ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل باتیں بہ تفصیل لکھی ہیں۔

۱- قومی جدوجہد کے لئے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہئے اور کانگریس کی حمایت کرنی چاہئے۔

۲- یہ خیال غلط ہے کہ کانگریس میں شامل ہونے سے مسلمانوں کی شناخت اور ان کا وجود ختم ہو جائے گا۔

۳- مسلمانوں کو سیاست سے دور رہنا ان کے لئے مضر ہے، اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان عملاً سیاست میں حصہ لیں۔

۴- مسلم لیگ کا نظریہ سیاست درست نہیں، اس کی اصلاح ہونی چاہئے اور اسے کانگریس کی طرح عوامی مسائل سے بھی دلچسپی لینی چاہئے۔

۵- حکومت کی نازبرداری نہیں کرنی چاہئے بلکہ حکومت کو دکھا دینا چاہئے کہ اسے لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے رایوں پر نہیں۔ علامہ شبلی نے ان نکات پر تفصیل سے دلائل کے ساتھ بحث کی ہے اور اس کو قومی جدوجہد اور کامیابی کا راز بتایا ہے۔

بلاشبہ یہ ایک اہم اور وقیع مقالہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر خوب بحث و مباحثہ ہوا۔ فیض آباد اور امرت سر میں تحریک برپا ہوئی، شبلی پر تنقیدیں ہوئیں۔ بعض تنقیدوں کا علامہ شبلی نے جواب بھی دیا، لیکن بالآخر مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ شبلی کا ہم خیال نہ ہو سکا اور مسلم لیگ کے سحر میں گرفتار رہا، جس کا نتیجہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کی شکل میں سامنے آیا۔ گو علامہ شبلی ان نتائج کو

دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہے تاہم اشاروں اشاروں میں انھوں نے جس خدشے کا ذکر کیا تھا وہ وقوع پذیر ہوکر رہا۔

اپنے مضمون میں علامہ شبلی نے جن نکات پر بحث کی تھی۔آج ایک صدی گذر جانے کے بعدان کی معنویت اورصداقت کھل کرسامنے آچکی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ برصغیر کے تناظر میں صحیح سیاسی موقف وہی تھا جس کی نشاندہی شبلی کی بصیرت نے ایک صدی قبل کی تھی۔موجودہ دور میں ان کی معنویت کے جائزے میں ممکن ہے بعض کی افادیت ثابت نہ ہوسکے تاہم مجموعی طور سے آج بھی قوم پرستوں کے لئے شبلی کے خیالات دلچسپ اور قابل غور وفکر ہیں۔

دوسرے مضمون میں انھوں نے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ لیڈر جو چاہتے ہیں کرگزرتے ہیں اور بعض لیڈر بننا نہیں چاہتے پھر بھی انہیں لیڈر بنایا جاتا ہے،اس لئے لیڈروں کا قصور نہیں بلکہ لیڈر بنانے والوں کا قصور ہے۔علامہ شبلی کا یہ خیال انگریزوں کے دورظلمت میں تھا آج کے جمہوری دور میں بھی کم وبیش یہی صورت حال ہے۔

تیسرا مضمون آرمینیا پر ہے جو دراصل علامہ شبلی کے اتحاد اسلامی کے نقطۂ نظر کا ترجمان ہے۔۱۸۹۵ء میں آرمینیاں میں ترکی کے خلاف ارمنوں نے بغاوت کی،انگریزوں نے ارمنوں کو شہ دی اوران کو بھڑکایا اور پھراس واقعہ کی تمام تر ذمہ داری ترکوں کے سرڈال دی اورترکوں پرطرح طرح کے الزامات عاید کیے۔علامہ شبلی نے اس کے جواب میں یہ مضمون لکھا اور دکھایا کہ یہ سب انگریزوں کا کیا دھرا ہے۔یہ مسئلہ اب بھی زندہ ہے۔حالانک اب نہ وہ ترکی رہااورنہ آرمینیا۔آرمینیا نے آذربائیجانی مسلمانوں کاقتل عام کرکے ایک ایک کوآرمینیا سے باہرکردیا۔ یورپ وامریکہ اس کے خلاف ایک لفظ بولنے کے روادارنہیں،جبکہ ترکی نے اس وقت آرمینیا کے خلاف جوکارروائی کی تھی اسے قتل عام سے تشبیہ دیتے ہیں۔ترکی کو یورپ کا حصہ تسلیم کرنے کے شرائط میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ ترکی اسے قتل عام تسلیم کرے۔ابھی سال دوسال پہلے فرانس نے اسے قتل عام قراردیا تھا۔اس کے علاوہ مختلف ممالک میں مختلف سطحوں پراس مسئلہ کی بازگشت اب بھی سنائی دیتی رہتی ہے۔اس سے اندازہ لگایاجاسکتا ہے کہ آرمینیا پر علامہ شبلی نے کیوں قلم اٹھایا تھا۔

اس کے بعد اس مضمون، بعض نظموں اور ترکوں سے شبلی کی محبت کی وجہ سے انگریزی حکومت ان سے بدگمان ہوئی یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی عرصہ تک جاسوسوں کے نرغے میں رہے اور آخر میں جب ان کے فکر وخیال اور اتحاد اسلامی کی لے بہت تیز ہوگئی تھی اور انگریز انھیں قید ہی کرنے والے تھے کہ وہ خود قید حیات سے آزاد ہوگئے۔غرض علامہ شبلی عملاً سیاسی نہ ہونے کے باوجود ایک بڑے سیاسی رہنما تھے۔

۵-وفیات

اس حصہ میں علامہ کے دو وفیاتی نوٹ شامل ہیں۔ پہلا اپنے استاد مولانا فاروق چریا کوٹی کے انتقال پر لکھا تھا اور دوسرا نواب محسن الملک کی موت پر۔ یہ مختصر وفیاتی نوٹ بڑے جامع ہیں اور ان سے مرحومین کی خدمات کا پورا مرقع سامنے آجاتا ہے۔جس وقت یہ لکھے گئے تھے، وفیات لکھنے کا عام رواج نہ تھا۔اسی کو سامنے رکھ کر مولانا سید سلیمان ندوی نے وفیات نگاری کا آغاز کیا اور اس سلسلہ نے اس قدر ترقی کی کہ آج اردو میں وفیاتی ادب کا ایک بڑا ذخیرہ تیار ہوگیا ہے۔

علامہ شبلی کی بعض اہم کتابوں پر بڑی تنقیدیں ہوئیں۔مثلاً مولانا عبدالماجد دریابادی نے الکلام پر کئی قسطوں میں تنقید لکھی۔اسی طرح المامون پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے تنقید کی۔ علامہ شبلی اس طرح کی تنقیدوں کے جواب کے قائل نہ تھے، تاہم اخبار آزاد کے ایڈیٹر کے اصرار پر المامون پر تنقید کا جواب لکھا جو اس حصہ میں شامل ہے۔

علامہ شبلی کے پاؤں کا حادثہ ہوا تو متعدد شعراء نے رباعیاں لکھیں، مولانا حالی نے بھی ایک قطعہ لکھ کر بھیجا، علامہ شبلی نے ایک مضمون ''مولانا حالی کی ذرہ نوازی'' میں اظہار تشکر پیش کیا تھا۔اسے بھی شامل کیا گیا ہے۔غرض مقالات کی یہ جلد بڑی اہم ہے اور علامہ شبلی کے فکر وخیال اور ان کی تجویزوں اور منصوبوں کو سمجھنے کے لئے اس جلد کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔

مقالات شبلی کو موضوعات کے لحاظ سے مرتب کیا گیا، وہ مقالات کی ترتیب وتدوین کا ایک عمدہ طریقہ ہے۔البتہ علامہ شبلی نے جن موضوعات پر کثرت سے مضامین لکھے تھے، مثلاً تحریک ندوہ، نصاب تعلیم، فلسفہ اسلام وغیرہ ان کے انتخابات اسی طرح شایع کئے جاسکتے تھے جس

طرح انتخابات شبلی اور اسلام اور مستشرقین شایع ہوئے۔اسی طرح مقالات شبلی کی اشاعت کے بعد جومضامین دریافت ہوئے، انہیں علاحدہ نہ سہی ضمیمہ کے طور پر شامل کرنا چاہئے تھا،مگر ایسا نہ ہوسکا۔

حوالے

(۱) حیات شبلی ص۱۹۶

(۲) علامہ شبلی نعمانی۔رسائل شبلی ص۴۔۶ رحمانی پریس دلی ۱۸۹۸ء

(۳) مقالات شبلی ج ا ص ۳۷۔

(۴) ایضاً،ص۶۵۔

(۵) ایضاً،ص۴۷۔

(۶) فکر ونظر علی گڑھ (شبلی نمبر) ص۱۱۳، جون ۱۹۹۶ء۔

(۷) مقالات شبلی ج ا،ص۸۰۔

(۸) ایضاً،ص۱۸۶۔

(۹) ایضاً

(۱۰) ایضاً،ص۱۸۵-۲۲۰۔

(۱۱) مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر،ص۲۔

(۱۲) مقالات شبلی ج ۲،ص۵۔

(۱۳) ایضاً،ص۲۹-۳۰۔

(۱۴) ایضاً،ص۹۱۔

(۱۵) مقالات شبلی ج ۳،ص۱۶۳۔

(۱۶) ایضاً،ص۹۳۔

(۱۷) ایضاً،ص۱۰۱۔

(۱۸) ایضاً۔

(۱۹) ایضاً،ص ۱۲۱-۱۲۵۔

(۲۰) ایضاً،ص ۱۲۷۔

(۲۱) ایضاً،ص ۱۷۷۔

(۲۲) مقالات شبلی ج ۴ص ۴

(۲۳) ایضاً ج ۴ص ۱۳

(۲۴) ایضاً ج ۴ص ۸۱

(۲۵) ایضاً ص ۱۸۹

(۲۶) ایضاً ص ۱۹۰

(۲۷) مقالات شبلی ج ۵ص ۶۲

(۲۸) ایضاً ص ۱۳۰-۱۳۱

(۲۹) مقالات شبلی ج ۶ص ۱

(۳۰) ایضاً ج ۴ص ۱۷۷

(۳۱) مقالات شبلی ج ۷ص ۱۔

(۳۲) مقالات شبلی ج ۸ص ۱۰۔

(۳۳) المامون ص ۸-۹ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۱۹۹۲ء

(۳۴) سیرۃ النعمان دیباچہ، ص ۷۔ مکتبہ اعزازیہ دیوبند (ب۔ت)

(۳۵) محمڈن اینگلواورینٹل کالج میگزین، مئی ۱۸۹۶ء ص ۲۱۶

(۳۶) مقالات شبلی ج ۴ص ۱

(۳۷) ایضاً ج ۴ص ۶۷

(۳۸) مکاتیب شبلی ج ۱، ص ۱۳۲

(۳۹) مقالات شبلی ج ۸ص ۶-۷ دارالمصنّفین اعظم گڑھ، طبع دوم ۱۹۷۲ء

(۴۱) ایضاً ص ۴۱۶

(۴۲) ایضاً ص ۴۲۱

(۴۳) ایضاً ص۲۰-۲۱

(۴۴) مقالات شبلی ج ۸ص ۴۸-۵۲

(۴۵) مقالات شبلی ج ۸ص ۵۳

(۴۶) ایضاً ص ۵۴

(۴۷) ایضاً ص ۵۴و۵۵

(۴۸) ایضاً ص ۵۵

(۵۹) ماہنامہ الرشاد مئی ۱۹۸۳ء ص ۴۹

(۶۰) ایضاً جون، جولائی ۱۹۸۳ء

(۶۱) حیات شبلی ص ۶۱۱-۶۱۴

(۶۲) ایضاً

(۶۵) مکاتیب شبلی ج ۲ص ۱۹۳

(۶۶) تعارف دارالمصنّفین، مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۶۷) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات' مطبوعہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔

خطباتِ شبلی

یہ علامہ شبلی کے ان خطبات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مختلف علمی و تعلیمی کانفرنسوں اور جلسوں میں دئے تھے۔ اسے ۱۹۴۱ء میں مولانا عبدالسلام ندوی نے مختلف مقامات سے جمع کر کے دارالمصنّفین سے شائع کیا۔ ابتک اس کے مندرجہ ذیل ایڈیشن نکل چکے ہیں:

[۱] ▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع اول ۱۹۴۱ء ۱۶۴ص

[۲] ▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع دوم ۱۹۶۵ء ۱۶۴ص

[۳] ▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع سوم ۱۹۹۰ء ۱۶۴ص

[۴] ▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۲۰۰۸ء ۱۶۸ص

اس کے سرورق پر مرتب کی حیثیت سے مولانا سید سلیمان ندوی کا نام لکھا ہوا ہے حالانکہ مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم سے اس پر جو مقدمہ ہے اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس کے اصل مرتب وہی ہیں۔(۱)

علامہ شبلی کی جامع کمال شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کی خطابت کا خداداد ملکہ بھی ہے۔ وہ بڑے زبردست مقرر اور خطیب تھے۔ انہوں نے اس کی طرف توجہ نہ دی، ورنہ اس میدان میں بھی ان کا کوئی حریف مقابل نہ ہوتا۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ:

> ''مولانا شبلی نعمانی جن اوصاف وخصوصیات کا مجموعہ تھے، ان میں ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ ان میں زورتحریر کے ساتھ قوت تقریر کا خداداد ملکہ بھی پایا جاتا تھا۔ اگرچہ ان کی زندگی کے ابتدائی دور میں اس ملکہ کا اظہار نہیں ہونے پایا۔ چنانچہ ان کی زندگی کے ابتدائی دور کے خطوط میں کسی موقع پر تقریر کرنے

کا تذکرہ انہوں نے نہیں کیا ہے لیکن علی گڑھ جانے کے بعد جب ان کے پبلک زندگی کا آغاز ہوا تو اس ملکہ خداداد نے پوری نشو ونما حاصل کی اور وہ علی گڑھ کالج کی سوسائٹیوں اور کانفرنسوں کے جلسوں میں تقریر کرنے لگے۔اس کے بعد ندوۃ العلماء قائم ہوا تو اس کے جلسوں میں بھی ان کی تقریروں نے خاص طور پر اہمیت حاصل کی اور وہ ہندوستان کے بے مثل اور بے نظیر خطیب اور مقرر تسلیم کئے جانے لگے۔''(۲)

مولانا عبدالسلام ندوی نے خطابت شبلی کے نشو ونما کو علی گڑھ سے جوڑا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ تقریر وخطابت کا یہ ملکہ ان کے اندر ابتداء ہی سے پایا جاتا تھا۔علی گڑھ جانے سے پہلے ان کا ایک محبوب مشغلہ مسلکی مناظرے تھے جس میں کوئی بھی شخص بغیر قوت تقریر کے کامیابی نہیں حاصل کرسکتا۔حیات شبلی کی صراحت کے مطابق علامہ شبلی نے متعدد مناظرے کئے اور کامیاب رہے۔

منطقی استدلال خیالات میں ترتیب، جوش وقوت، جزئیات بیانی، مناظرانہ تقریروں کی خوبیاں ہیں۔ان کے بغیر کوئی شخص کامیاب مقرر ومناظر نہیں ہوسکتا۔مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کے مناظروں کے ذکر میں ان کی ان خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔(۳)

حال ہی میں علی گڑھ جانے سے پہلے کی ان کی ایک تقریر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ [۵/اگست ۱۸۸۲ء] میں پروفیسر اصغر عباس صاحب کو ملی ہے جسے انہوں نے ایک تمہید کے ساتھ کانفرنس گزٹ علی گڑھ [اکتوبر ۲۰۱۱ء] میں شائع کرادیا ہے۔یہ تقریر خطبات شبلی میں شامل نہیں ہے اور شبلی کے علی گڑھ جانے سے پہلے کی ہے۔

مئی ۱۸۸۲ء میں سید محمود الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔چونکہ یہ ہائی کورٹ کے پہلے ہندوستانی جج تھے اس لئے مسلمانان اعظم گڑھ نے ۳۱/جولائی ۱۸۸۲ء کو ایک تہنیتی جلسہ اعظم گڑھ میں منعقد کیا جس کی صدارت راجہ سلامت شاہ [۱۸۳۵-۱۹۱۲ء] نے کی۔یہ وہی راجہ سلامت شاہ ہیں جن کے اجداد نے ۱۶۶۵ء میں شہر اعظم گڑھ کو آباد کیا تھا۔اس تہنیتی جلسے میں اعظم گڑھ، محمد آباد اور مئو کے رؤسا اور عمائدین نے شرکت کی۔اس موقع پر علامہ شبلی نے جو اس جلسہ کے سکریٹری تھے، ایک تقریر کی۔یہی تقریر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپی ہے چونکہ یہ

بالکل نادر تقریر ہے، اس لئے یہاں نقل کی جاتی ہے۔

''آج میں گورنمنٹ کا ضرور ممنونِ احسان ہوں۔ مگر گورنمنٹ کا احسان آج کے موقع پر کچھ زیادہ ذکر کرنے کے لائق نہیں کیوں کہ میرا یقین ہے کہ گورنمنٹ نے ہمیشہ نہایت راستی سے اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ جب ہم لوگ کسی منصب کی لیاقت پیدا کریں گے تو وہ کبھی ہم کو اس سے محروم نہ رکھے گی۔ پس اس کا یہ احسان ہمیشہ سے ہے اور اس نے کوئی نئی حالت نہیں پیدا کی ہے۔ میں آج اس بات کا زیادہ ذکر کروں گا کہ مسلمانوں نے وہ لیاقت پیدا کر لی ہے جس کے مدتوں سے منتظر تھے اور اس لیے میں اس نامور شخص سید محمود کو مبارک باد دوں گا اور حضور جناب لفٹنٹ گورنر بہادر کا شکریہ ادا کروں گا کہ انہوں نے سید صاحب کی لیاقت کا پورا پورا اندازہ کیا اور جو منصب کہ ان کے شایانِ شان تھا ان کو عطا فرمایا۔ گو مجھ کو تسلیم ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کی رفتار تیز ہوتی جاتی ہے اور ان کا بخت خفتہ اب کروٹیں لینے لگا ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اب بھی بہت سے مسلمان اپنے کہنہ خیالات کی گہری تاریکی سے نہیں نکلے اور ہنوز وہ بے ہودہ تقلید اور راہ ورسم عام سے وابستہ ہیں۔ گورنمنٹ نے ان کو ترقی کے زینہ تک پہنچا ہی نہیں دیا تھا بلکہ اپنا ہاتھ بڑھا کر ان کو اوپر لینا چاہا مگر وہ اپنے انہیں بے ہودہ خیالات کے دباؤ سے جگہ سے ہل بھی نہ سکے۔ سید محمود صاحب ہی مسلمانوں میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس بات کو نہ صرف خیالی بلکہ عملی طریقہ میں ثابت کر دکھایا کہ مسلمانوں کی ترقی اب ان کے ہاتھ میں ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ سید محمود صاحب کی تقرری سے ترقی کا جو خیال مسلمانوں کے رگ وریشہ میں دوڑ گیا ہے اور جس قدر کہ اس موجودہ نتیجہ کو دیکھ کر وہ میدان ترقی میں نہایت تیزی کے ساتھ بڑھ جانے کے لیے آمادہ ہو گئے ہیں۔ اس قدر تحریک ان مجلسوں اور سوسائٹیوں سے بھی نہیں حاصل ہوئی ہے جو اس وقت تک اس غرض کے لیے گورنمنٹ یا مصلحانِ قوم کی طرف سے منعقد

ہوتی رہی ہیں۔ اگر گورنمنٹ کا بھی اس تقرری سے یہی مقصود ہے تو غالباً کوئی دوسری پالیسی اس کی ہم سری نہیں کر سکتی اور یقیناً مسلمانوں کے مردہ اور افسردہ دلوں کے ابھارنے کے لیے اس سے بہتر کوئی آلہ نہیں ہے۔ مسلمان تو مغاک جہالت میں لمبی نیند لے رہے ہیں یہ توقع کہ وہ ایک خفیف تحریک سے بیدار ہو جاویں گے، بالکل بے سود ہے۔ سید محمود کی تقرری میں اکبر کی پالیسی کی چمک بھی موجود ہے جس کا منشا یہ ہے کہ پولٹیکل معاملات کے قصر عالی شان کی بنا ہندوستانی ارکان پر قائم کی جاوے۔ خوشامد اور بات ہے مگر مما لک مغربی وشمالی کے عام باشندے اس بات کو ضرور حسرت وافسوس کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ جس مجموعی جلسہ کے ہاتھ میں لاکھوں کی جانیں ہوں ان میں ہماری قوم کا ایک شخص بھی موجود نہ ہو۔ اس امر کی نسبت ایک مطیعانہ شکایت ضرور دلوں میں بلکہ بعض زبانوں پر بھی موجود تھی۔ سید محمود کی تقرری سے صرف یہی مطلب نہیں پورا ہوا بلکہ خاص مسلمانوں کی ایک دوسری شکایت کا بھی سد باب ہو گیا۔ جیسا کہ مسلمانان کلکتہ کی عرض داشت میں ذکر کیا گیا ہے۔ مسلمان اس بات کو بھی دل میں رکھتے تھے کہ مقدمات شرعیہ میں پوری تحقیقی موشگافی صرف ایک مسلمان شخص ہی سے ممکن ہے۔ پس سید محمود کی تقرری صرف ایک خیالی خوشی کا باعث نہیں ہے بلکہ اس کا اثر واقعات پر بھی ایک وسیع اور معتد بہ اثر ہے۔ اخیر میں اپنے بیان کو ان فقروں پر ختم کروں گا ''سید محمود تو مبارک، تجھ کو تیرا عہدہ مبارک، تو اپنے کو ایسا ثابت کر کہ گورنمنٹ تجھ سے بہتر کوئی شخص انتخاب نہ کر سکے۔ دیکھ ہوشیار رہ تیری رفتار میں لغزش نہ آئے۔ تجھ پر ہزاروں نگاہیں بلند ہیں۔''

شاید یہ تقریر خود علامہ شبلی نے اس زمانہ میں لکھ کر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو اشاعت کے لئے بھیجی تھی، اس لئے کہ اس میں خطابت کا رنگ کم اور تحریر کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ بہرحال اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں، ایک یہ کہ علامہ شبلی علی گڑھ جانے سے پہلے بھی خطیب تھے اور شہر

کی اہم مجالس وتقریبات میں شریک ہوتے اور تقریریں کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ملک کے مسلمانوں کے احوال سے بخوبی واقف تھے۔ یہ جلسہ اور یہ تقریر دونوں اس کے شاہد ہیں۔اس تقریر میں مسلمانان کلکتہ کی ایک عرضداشت کا بھی ذکر آیا ہے گویا مسلمانوں کے معاملات پر ان کی اس وقت بھی نگاہ تھی۔

علی گڑھ سے وابستگی کے بعد ان کی تقریروں کے رنگ میں بنیادی تبدیلی، غور وفکر اور انداز بیان کی پیدا ہوئی لیکن یہاں بھی وہ اس حیثیت سے ممتاز رہے کہ ان کی تقریریں علی العموم علمی انداز کی ہوتی تھیں۔ایک مرتبہ انہیں میلاد میں تقریر کی دعوت دی گئی تو انہوں نے جواباً لکھا کہ ''مولود کا بیان میں اچھا کیوں کر کر سکوں گا۔میری تقریر لکچر ہوتی ہے نہ کہ وعظ۔(۴) یہی وجہ ہے کہ ان کے متعدد خطبات پر مقالے کا گمان ہوتا ہے۔مثلاً علماء کے فرائض، قدیم عربی نصاب کے نقائص، قدیم وجدید تعلیم، تحفظ اسلام وغیرہ ان کی اسی طرح کی تقریریں ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ اگر ان خطبات کی نشاندہی نہ کی جائے تو انہیں علمی مضامین ہی خیال کیا جائے گا۔قوت، جوش، متانت، وقار، سنجیدگی، برجستگی، دلائل کی مضبوطی کے جوہر ان کی تحریروں کا بنیادی وصف ہیں جوان کی خطابت میں بھی پائے جاتے ہیں۔مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ان کی خطابت کی اس خوبی کا ذکر کیا ہے۔ندوہ کے جلسہ دہلی کی روداد مولانا آزاد کے قلم سے شایع ہوئی۔اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''یہ قدرت آج صرف انہیں [شبلی] کو حاصل ہے کہ جس موضوع پر چاہتے ہیں ایک مرتب اور مدون تصنیف حاضرین کو سنا دیتے ہیں۔ان کا لکچر بلحاظ ترتیب مطالب اور حسن استدلال ایک مکمل رسالہ ہوتا ہے، جس کو اگر قلم بند کر دیا جائے تو نظر ثانی کی بھی ضرورت نہ ہو اور بلا تامل رسائل شبلی میں ایک اضافہ ہو جائے۔'' [ماہنامہ الندوہ لکھنو، اپریل ۱۹۱۰ء ص ۱۱]

یہی وجہ ہے کہ وہ علی گڑھ کی تعلیمی کانفرنسوں، تحریک ندوہ کے جلسوں کلکتہ اور الہ آباد یونیورسٹی کے پروگراموں میں چھا جاتے۔ان کی اس خوبی کے متعدد واقعات اہل قلم نے لکھے ہیں۔ان کے ایک خطبے کی روداد، ضیاءالدین احمد برنی نے سپرد قلم کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''نواب بڈھن کی محل سرائے کی ایک تقریر یاد رہ گئی ہے۔اس موقع پر صحن اور دالان کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔علامہ کھڑے ہوکر تقریر فرمارہے تھے۔تقریر سے قبل ہم میں سے بہت سوں کا خیال تھا کہ چوں کہ علامہ صوفی منش بزرگ نہیں ہیں،اس لیے تصوف جیسے موضوع پر ان کی تقریر بالکل خشک ہوگی۔لیکن جب انہوں نے تقریر ختم کی تو سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور میں نے کم سے کم یہ محسوس کیا کہ علامہ تو چھپے رستم ہیں۔معلوم ہوتا تھا کہ جنید یا بایزید بسطامی کے پایہ کا کوئی درویش ہے جو تصوف کے رموز ونکات کے دریا بہائے چلا جارہا ہے۔تقریر کے بعد جس عقیدت مندی سے حاضرین نے ان کے ہاتھ چومے وہ سماں آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔''(۵)

آہستہ آہستہ ان کی خطابت کا جوہر اس قدر چمکا کہ جلسوں اور کانفرنسوں اور میلاد کی مجلسوں میں وہ مدعو کئے جانے لگے۔ ہندوستان میں علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد سے پہلے جلسوں اور کانفرنسوں کے وہ محبوب خطیب ومقرر تھے۔علی گڑھ،لکھنو،دہلی، پٹنہ،مظفر پور، کلکتہ،ڈھاکہ، مدراس کون سا شہر تھا جہاں انہوں نے اپنی شعلہ بیانی اور طلاقت لسانی کے جوہر نہ دکھائے ہوں۔

خطبات شبلی میں ان کے اسی طرح کے ۱۶؍خطبے شامل ہیں جومختلف جلسوں کی روداددوں اور رپورٹوں میں شائع ہوئے تھے۔ چونکہ وہ تقریریں لکھ کرنہیں کرتے تھے اوران کی بعض تقریر مختصر نویسوں نے قلم بند کی ہیں اورآج کی طرح اس زمانہ میں تحفظ اور ریکارڈنگ کا نظام بھی نہ تھا، اس لئے خطبات کے حرف بہ حرف ہونے میں شبہ کیا جاسکتا ہے،تاہم خیالات اور موضوعات کی ہم آہنگی کی وجہ سے اور بعض خطبات میں طرز ادا، جوش بیان اور برجستگی کی بنا پر دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ یہ انہیں کے خزانہ عامرہ کے لعل و گہر ہیں۔اس مجموعہ میں ان کے مندرجہ ذیل خطبات شامل ہیں:

۱۔ چھوٹے کم درجہ اسکولوں کا قیام

۲۔ اسلامی علوم وفنون کی تاریخی ترتیب

۳۔ ایجوکیشنل کانفرنس کی سالانہ رپورٹ پر ریمارک

۴۔ قدیم عربی نصاب کے نقائص

۵۔ علماء کے فرائض

۶۔ مجوزہ دارالعلوم

۷۔ شاہ امانت اللہ صاحب غازی پوری کی وفات

۸۔ اسکولوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام

۹۔ قدیم وجدید تعلیم

۱۰۔ تعصب اور اسلام

۱۱۔ سنگ بنیاد دارالعلوم

۱۲۔ ندوۃ العلماء کی ضرورت

۱۳۔ تحفظ اسلام

۱۴۔ تحفظ مذہب

۱۵۔ اسلام بحیثیت ایک مکمل مذہب کے۔اسلام کی بہترین جمہوریت

۱۶۔ حقوق نسواں

ان کے ان خطبات سے جہاں ان کے نظریہ تعلیم وتربیت پر روشنی پڑتی ہے وہیں اسلام کے تحفظ اور نشر واشاعت کا جو خاکہ ان کے ذہن میں تھا جس کا ذکر ان کے مقالات (جلد ہشتم) میں بھی ہے، اسے انہوں نے خطبات میں بھی بیان کیا ہے۔دارالعلوم ندوۃ العلماء سے انہیں کس قدر دلچسپی تھی اس کے لئے انہوں نے کیا کیا کیا، اس کا ایک خاکہ بھی ان خطبات میں آ گیا ہے۔بنظر غائر دیکھا جائے تو نہ صرف ان سے ان کے نظریات کی وضاحت ہوتی بلکہ اس دور کے مسلمانوں کی علمی و تعلیمی صورت حال بھی سامنے آجاتی ہے۔یہاں ان کی تقریر کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے تاکہ اندازہ ہوسکے کہ ان کی تقریریں کس انداز کی ہوتی تھیں اور جو باتیں اوپر کہی گئیں ان میں کس قدر صداقت ہے۔یہ اقتباس اجلاس ندوہ ۱۹۱۲ء کے خطبے تحفظ اسلام سے لیا گیا ہے۔وہ فرماتے ہیں:

''حضرات!

میں نے اسلام کی تاریخ جہاں تک مجھ سے ہو سکا نہایت غور و فکر کے ساتھ پڑھی ہے۔ میں تیرہ سو برس کی وسیع مدت کا ایک حد تک واقف کار ہوں کہ تمام ممالک اسلامیہ میں مسلمانوں کی حالت مختلف زمانوں، میں مختلف سلطنتوں میں، مختلف دوروں میں کیا رہی ہے، مگر میں آپ کو صحیح شہادت دیتا ہوں کہ مجھ کو نہیں معلوم ہے کہ مسلمانوں پر کوئی وقت اور کوئی زمانہ آج سے زیادہ مشکل، شاق اور آج سے زیادہ تباہ کنندہ گزرا ہو۔ مجھ کو معلوم ہے کہ ایک زمانہ ایسا مسلمانوں پر گزرا ہے۔ چھٹی اور ساتویں صدی میں جبکہ تاتاری اٹھے اور وہ ایک طرف سے پامال کرتے ہوئے شام تک پہونچ گئے۔ مورخوں کا بیان ہے کہ [۹۰] لاکھ مسلمان قتل کر دئے گئے اور پیوند خاک کر دئے گئے، ایسا سخت زمانہ بھی گذرا ہے، سیکڑوں سلطنتیں تباہ ہو گئیں، سیکڑوں خاندان برباد ہو گئے، بغداد جو کہ ام دین اور تمام مسلمان جس کو بنت العرب کہتے تھے۔ اس کی یہ کیفیت ہو گئی کہ جو لوگ سفر میں گئے ہوئے تھے جب وہ واپس آئے تو ان کو اپنا محلّہ نہیں ملتا تھا، گھروں کا کیا ذکر ہے، یہ حالت گزری ہے۔ ایسا زمانہ تھا جب کہ شیخ سیدی کو یہ کہنا پڑا:

اے محمد گر قیامت سر بروں آری زخاک   سر بروں آر و قیامت درمیانِ خلق بیں

خون فرزندان احمد مصطفے شد ریختہ (۲)

غرض ان کے افکار و خیالات کو سمجھنے کے لئے ان خطبات کا مطالعہ ضروری ہے۔ حیرت ہے کہ ہمارے نقادوں نے ان خطبات کو کیوں کر نظر انداز کیا؟۔

خطبات کے مرتب مولانا عبدالسلام ندوی نے اسے نامکمل قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ترتیب کے وقت مذکورہ خطبات ہی دستیاب ہو سکے تھے۔ البتہ اس کی اشاعت ۱۹۴۱ء کے بعد مولانا شبلی کے کئی خطبات اور دریافت ہوئے۔ بعض ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ اور فکر و نظر اسلام آباد میں شائع ہوئے اور کئی ایک کو باقیات شبلی کے مصنف نے جمع کر دیا ہے۔ اس کی تفصیل غیر مدون تحریروں کے ضمن میں آئندہ آئے گی۔ خطبات کی جدید اشاعت میں ان کا

اضافہ ضروری تھا ممکن ہے اب بھی کچھ خطبات ایسے ہوں جو دریافت ہوجائیں اس کے لئے تلاش وجستجو بھی ضروری ہے۔ بہر حال علامہ کے ان خطبات کا مطالعہ ان کے افکار وخیالات کی تفہیم کے لئے ضروری ہے۔

حوالے

(۱) دیباچہ خطبات شبلی ص ۶۔ دارالمصنّفین اعظم گڑھ طبع جدید ۲۰۰۸ء

(۲) ایضاً ص ۵

(۳) حیات شبلی ص ۱۰۳

(۴) مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۲۲۴ دارالمصنّفین اعظم گڑھ۔ طبع جدید ۲۰۱۱ء

(۵) عظمت رفتہ ص ۲۶۵۔۲۶۶

(۶) خطبات شبلی ص ۱۰۰

ساده

باب ہفتم

مکتوبات شبلی

مکتوبات شبلی

تاریخ ادب اردو میں مرزا غالب (ف: ۱۸۶۹ء) سے پہلے بھی بعض خطوط کا سراغ ملتا ہے۔ (۱) لیکن مرزا غالب نے اسے ایک مستقل فن بنا دیا۔ ان کی اس اختراع سے اردو نثر کو بقائے دوام ملا اور سلاست، سادگی، روانی، رعنائی اور برجستگی کے جوہر اردو نثر میں پیدا ہوئے۔ صحیح یہ ہے کہ خطوط نگاری میں غالب کا کوئی حریف مقابل نہیں۔ غالب کے بعد جس نے اس فن کو آب و تاب بخشی اور درجہ کمال تک پہونچایا وہ علامہ شبلی کی شخصیت ہے۔ دراصل غالب اور شبلی دونوں اپنے عہد کے اردو کے بڑے مکتوب نگار ہیں اور دونوں نے مکتوباتی ادب کا بڑا قیمتی ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ عود ہندی اور اردوئے معلیٰ اگر غالب کی یادگار ہیں تو مکاتیب شبلی اور خطوط شبلی، شبلی کی یادگار ہیں۔ زبان کے لحاظ سے، ادبی لطافت کے اعتبار سے، اپنے عہد کی مصوری کے لحاظ سے، علمی، تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے مکاتیب کا یہ سرمایہ اردو کا بڑا قیمتی ذخیرہ ہے۔ غالب کے خطوط سے شبلی کے خطوط تک، نثری ادب نے ارتقا کی جو منزلیں طے کی ہیں، ان کی آواز بازگشت بھی شبلی کے خطوط میں سنائی دیتی ہے۔ دراصل شبلی کے خطوط غالب کی مکتوب نگاری کی ترقی یافتہ شکل ہیں۔ غالب کی مکتوب نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے مکاتبہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ان کی اس خوبی اور جدت کا ذکر کرتے ہوئے شبلی نے لکھا ہے کہ:

> ''آثار الصنادید جس زمانہ میں نکلی، اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد دلی کے مشہور شاعر مرزا غالب نے اردو کی طرف توجہ کی۔ یعنی مکاتیب وغیرہ اردو میں لکھنے شروع کیے اور چوں کہ وہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے، اپنا کوچہ الگ نکال کر رہتے تھے، اس لیے انہوں نے تمام ہم عصروں کے برخلاف مکاتبہ کو مکالمہ

کر دیا۔مکاتیب میں وہ بالکل اس طرح ادائے مطلب کرتے تھے جیسے دوآدمی سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں ۔اس کے ساتھ بہت سے خطوط میں انسانی جذبات مثلاً رنج وغم ،مسرت وخوشی ،حسرت و بے کسی کونہایت خوبی سے ادا کیا ہے ۔اکثر جگہ واقعات کو اس بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے ۔اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہیں کہ اردو انشا پردازوں کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سرسید مرحوم تھے ،اس کا سنگ بنیاد دراصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔''(۲)

مرزا غالب کی مکتوب نگاری پر ہماری زبان میں بہت کچھ لکھا گیا ہے ۔کئی کتابیں اور تحقیقی مقالات شائع ہو چکے ہیں ۔سیکڑوں مضامین میں غالب کی مکتوب نگاری پر مفصل نقد وتبصرہ لکھا گیا ہے ،لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب شبلی کے مذکورہ متن کی دراصل تشریح و تعبیر ہیں ۔ یہ اصلاً اپنے عہد کے سب سے بڑے مکتوب نگار کے احساسات ہیں ،جس نے ماضی قریب کے سب سے بڑے مکتوب نگار کا اعتراف کمال ہے ۔

ایک قدم اور آگے بڑھ کر دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ شبلی نے غالب کی مکتوب نگاری کی جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے تقریباً وہ تمام خوبیاں خود ان کے مکتوباتی ادب کا حصہ ہیں اور اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو شبلی کے خطوط غالب سے زیادہ زندگی کے ترجمان ہیں اور ان سے معاشرتی زندگی کی عکاسی زیادہ بہتر طور پر ہوتی ہے لیکن اس تجزیے میں عہد و ماحول کا بڑا دخل ہے جس میں غالب کو بہر حال فوقیت حاصل ہے ۔

شبلی کے خطوط میں اثرات غالب صاف اور نمایاں طور پر نظر آتے ہیں ۔ بلکہ کہیں کہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شبلی نے غالب کے خطوط سامنے رکھ کر خط لکھا ہے ۔مثلاً مولوی محمد سمیع کے نام اس خط میں غالب کا تتبع صاف ظاہر ہو رہا ہے :

''بھئی کچھ سنا ہے ۔(محمد سمیع) خیر تو ہے ۔ہاں !ایک تازہ واقعہ ہے ،میاں شبلی کا انتقال ہو گیا۔(محمد سمیع) ارے سچ نہیں جھوٹ ہوگا ،ابھی ہفتہ بھی نہیں ہوا ان کا ایک خط میرے نام آیا تھا۔(مولوی محمد عمر صاحب) لو تم نے آج سنا ہے ،اجی

اس کوتو کئی دن ہوئے۔انہوں نے جو کتابیں بھیجی تھیں اس کی رسید بھی تو میں نے اسی وجہ سے نہیں دی۔(محمد سمیع)اناللہ۔افسوس ابھی مرنے کے کوئی دن نہ تھے۔(حمید)ہاں!واقعی سخت رنج ہے،مگر تقدیر سے کس کا زور چلتا ہے۔(اور دبی زبان سے)ارے میاں چلو قصہ پاک ہوا،آئے دن کی حکومتوں سے ناک میں دم آ گیا۔ بھلا روئداد خیر ایک بار کا کام تھا لکھ بھی لیا۔اب روز روز مدرسہ میں لڑکوں کو مسودہ لکھاتے پھرو،اس پر طرہ یہ کہ ہفتہ وار مدرسہ کی رپورٹ لکھ کر ان کے پاس بھیجتے رہو،اچھی خاصی بیگاری بھگتا کرو۔(عبدالغفور)ارے میاں!خیر مرنا تو سب کے لیے ہے،ہاں ان کے خط کا جواب رہ گیا،مگر یہ بھی کوئی زبردستی ہے،جی نہ چاہے تو مفت کی محنت کون گوارا کرے۔(حافظ علی حسن)لو اب کی ان کو خط لکھتے لکھتے رہ گیا۔امتحان کا حال لکھنا تھا اور جو کچھ ہو آدمی تو مزے کا تھا۔دو گھڑی کیفیت رہتی تھی۔(مولوی محمد عمر صاحب)بھئی کیا کہئے دل لگی ہی جاتی رہی اور تو کس کام کا آدمی تھا مگر ہاں ذرا جی بہل جایا کرتا تھا۔(مولوی احمداللہ)اجی!جی کیا بہلتا تھا،دنیا بھر کی شکایتیں ہوا کرتی تھیں،کبھی ان کی نقل کی،کبھی ان کا خاکہ اڑایا اور اس کے سوا ان کا کام ہی کیا تھا،چلو اچھا ہوا۔''(۳)

غالب کے مکاتبہ کو مکالمہ بنانے کی جس خوبی کا شبلی نے اعتراف کیا تھا اور جسے انہوں نے غالب کی انفرادیت قرار دیا ہے،کیا اس خط میں اس کا پرتو پورے طور پر نمایاں نہیں ہے؟۔ ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو جس میں غالب کا رنگ قطعی طور پر محسوس ہوتا ہے۔:

''بھئی سب نے خط نہ لکھنے کی قسم کھالی ہے یا کسی منت پر روزہ سکوت رکھا ہے۔ آخر بات کیا ہے؟ مولوی محمد عمر صاحب الگ دم بخود ہیں،تم جدا خاموش ہو، مہدی نے اعظم گڑھ پہونچنے کی رسید تک نہیں لکھی۔والد قبلہ کو کام سے کہاں فرصت۔اس مہنگی میں بھائی مولوی محمد سعید صاحب کی دو سطریں اگرچہ صرف مطلب کی ہیں غنیمت معلوم ہوئیں۔کیا سنسان کا عالم ہے گویا ان تلوں میں تیل

ہی نہ تھا۔ خیر شکایت کیوں کیجئے، دوسرے پر زور کیا، جب گھر بار چھوٹے، عزیز آشنا چھوٹے تو غربت میں کوئی کیوں کسی کا ساتھ دے۔ لو صبر آ گیا۔'' (۴)

خطوط نگاری سے جس قدر دلچسپی غالب کو تھی اور جس قدر وہ جواب لکھنے کا اہتمام کرتے تھے اور جس طرح اپنے احباب، معاصرین بالخصوص شاگردوں کے خطوط کے وہ منتظر رہتے تھے، شبلی بھی اسی قدر خطوط کے دلدادہ تھے۔ اسی اہتمام سے جوابات لکھتے بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر اپنے شاگردوں کے خطوط تحریر نہ کرنے پر رنجیدہ ہوتے اور اس کا برملا اظہار کرتے۔ کئی خطوط میں اس ناگواری کا ذکر ہے۔ کئی اور باتوں میں بھی دونوں میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ مثلاً مرزا غالب اپنے خطوط کی اشاعت کے حق میں نہ تھے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اردو کے جو خطوط آپ چھاپا چاہتے ہیں یہ بھی زائد بات ہے، کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا، ورنہ تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپہ مرے خلاف طبع ہے۔'' (۵)

بالکل یہی خیال شبلی کا ہے۔ وہ شیخ رشید الدین انصاری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میرے خطوط بالکل بدمزہ ہوتے ہیں، ان کو کیا جمع کرتے ہو، مجھ کو خود مزہ نہیں آتا تو اوروں کو کیا آئے گا۔'' (۶)

لیکن پھر دونوں یعنی غالب و شبلی اپنے اردو خطوط کی اشاعت پر راضی ہو گئے۔ مرزا غالب لکھتے ہیں:

''اجی منشی ممتاز علی کیا کر رہے ہیں، رقعے جمع کیے نہ چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطہ میں ان کی بڑی خواہش ہے۔ میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں، وہ سب یا ان سب کی نقل بہ طریق پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں۔'' (۷)

اسی طرح شبلی مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''سید سلیمان میرے کچھ خطوط جمع کر رہے۔ کیا آپ کے پاس بھی میرے کچھ

ہفوات غلطی سے محفوظ ہوں گے۔''(۷)

غالب تو احباب و معاصرین کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے اور ان کے خطوط کے دونوں مجموعے ان کی زندگی ہی میں شائع ہو کر ان کی شہرت و ناموری کا باعث ہوئے مگر شبلی اپنے شاگرد خاص سید سلیمان ندوی کے اصرار سے کسی طرح اس کی طرف متوجہ ہوئے مگر ان کے خطوط کی اشاعت کا موقع بہر حال ان کی وفات کے بعد آیا۔ مکاتیب کی دونوں جلدیں، عطیہ فیضی (ف: ۱۹۶۷ء) اور زہرا بیگم کے نام کے خطوط شبلی، سب کے سب شبلی کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔ تاہم یہ خطوط بہر حال شبلی کی جامع کمالات شخصیت اور ادبی کمالات کا نمونہ ہیں۔

غالب کو ہندوستانی شہروں میں کلکتہ سے عشق تھا۔ اس کی تمام تفصیلات ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی کتاب ''غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ'' میں قلم بند کر دی ہیں۔ (۹) غالب کے یہ اشعار کلکتہ کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں　　اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب　　وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر　　طاقت ربا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے

اسی طرح شبلی بمبئی پر ہر متاع کہنہ و نو نثار کرتے ہیں:

نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نورا　　طراز مسند جمشید و فرتاج خسرو را
بہ ہر سو از ہجوم دلبران شوخ و بے پروا　　گذشتن از سر رہ مشکل افتاد است رہرو را
بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نہ خواہی یافت　　کنار آب چو پاٹی و گلگشت اپالو را

جس طرح غالب کلکتہ کا مختلف پیرائے میں ذکر کرتے ہیں، اسی طرح شبلی بھی بمبئی پر سو-سو جان سے مرتے ہیں۔ (۱۰)

غالب اور شبلی کے خطوط میں طرز ادا اور اسلوب نگارش میں بڑی مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی ہے، زندگی کے نشیب و فراز میں بھی دونوں بڑی حد تک مماثل نظر آتے ہیں۔ اس کی تفصیل طوالت کے سبب قلم انداز کی جاتی ہے۔ البتہ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ شبلی کے خطوط غالب کے مقابلہ میں بہت سی باتوں میں انفرادیت کے حامل ہیں۔ مثلاً شبلی محض ادیب و شاعر اور

انشا پرداز نہ تھے بلکہ محقق، مورخ اور نقاد بھی تھے، عالم اسلام کی بیداری کے خواہاں تھے، انگریز دشمن اور محبّ وطن تھے، ہندو مسلم اتحاد اور جذباتی ہم آہنگی کے علم بردار تھے، ماہر تعلیم اور علوم اسلامیہ پر مجتہدانہ نگاہ رکھتے تھے، اردو میں علم الکلام اور تاریخ ادبیات ایران کے زبردست پارکھ تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیرت نگار رسول اعظم تھے۔ ان کی یہ تمام جہتیں ان کے خطوط میں موجود ہیں۔ اسی بنیاد پر پروفیسر خورشید الاسلام نے ان کے خطوط کو ''قومی اعمال نامہ'' قرار دیا ہے۔ (۱۱)

علامہ شبلی کے خطوط کی ترتیب و تدوین کا کام مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کی زندگی ہی میں شروع کیا تھا، البتہ وہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ سید صاحب نے ان خطوط کو دو حصوں میں مکاتیب شبلی کے نام سے شائع کیا ہے۔

مکاتیب شبلی حصہ اول

اس میں علامہ شبلی کے وہ خطوط شامل ہیں، جو انہوں نے اپنے معاصرین اور بزرگوں کے نام لکھے تھے۔ اس کی تفصیلی فہرست یہ ہے:

[۱]	سر سید احمد خان	۳۔ خط
[۲]	نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خان	۳۔ خط
[۳]	شیخ حبیب اللہ صاحب	۴۔ خط
[۴]	شیخ عجیب اللہ صاحب	۳۔ خط
[۵]	ماموں	۳۔ خط
[۶]	مسٹر محمد اسحٰق صاحب، بی اے، ایل ایل بی	۲۶۔ خط
[۷]	مولوی حکیم محمد عمر صاحب	۳۔ خط
[۸]	مولوی محمد سمیع صاحب	۵۷۔ خط
[۹]	مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی	۱۱۸۔ خط
[۱۰]	پروفیسر عبد القادر صاحب	۳۰۔ خط
[۱۱]	منشی محمد امین صاحب	۳۱۔ خط

[۱۲] مولانا ابوالکلام صاحب آزاد ۴۰۔خط

[۱۳] مولوی عبدالماجد صاحب بی اے ۲۱۔خط

[۱۴] ابوالکمال سید عبدالحکیم صاحب دسنوی ۷۔خط

[۱۵] مولانا سید عبدالحیٔ صاحب ناظم ندوہ ۴۔خط

[۱۶] مولوی سید نواب علی صاحب پروفیسر بڑودہ کالج ۵۔خط

[۱۷] مولانا محمد علی صاحب ناظم ندوہ ۲۔خط

[۱۸] ملا عبدالقیوم صاحب حیدرآبادی ۳۔خط

[۱۹] شیخ رشیدالدین صاحب انصاری ۳۔خط

[۲۰] حکیم غلام غوث صاحب بہاول پوری ۴۔خط

[۲۱] چودھری سید نظیرالحسن صاحب رضوی ۲۔خط

[۲۲] طلبائے دارالعلوم ندوہ ۱۔خط

[۲۳] مولانا مفتی عبداللہ صاحب مہتمم ۱۔خط

[۲۴] منشی سید افتخار عالم صاحب مارہروی ۲۔خط

[۲۵] سید محمد محسن خان بلگرامی ۲۔خط

[۲۶] احمد مرتضٰی صاحب نذر سررشتہ دار ریاست ٹونک ۲۔خط

[۲۷] منشی شرف الدین صاحب رام پوری ۱۔خط

[۲۸] مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی ۱۔خط

[۲۹] مولوی عبدالغنی صاحب بہاری ۱۔خط

[۳۰] مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارنپوری ۱۔خط

[۳۱] ایڈیٹر صاحب جرائد اسلامیہ ۱۔خط

[۳۲] مولوی عبداللہ بلوچی ۱۔خط

[۳۳] مہتمم صاحب دارالاخبار انجمن اسلامیہ مظفرنگر ۱۔خط

[۳۴] ایڈیٹر صاحب الناظر لکھنؤ ۱۔خط

[۳۵] مسٹر شاکر صاحب ایڈیٹر رسالہ ادیب الہ آباد ۱۔خط
[۳۶] مولوی ظفر علی خان صاحب ایڈیٹر زمیندار ۱۔خط
[۳۷] جرائد اسلامیہ ۱۔خط
[۳۸] فاطمہ خانم ۳۔خط
[۳۹] جناب حامد حسن صاحب نعمانی ۱۔خط
[۴۰] مولوی حسین عطاء اللہ صاحب حیدر آبادی ۲۔خط
[۴۱] مولوی حامد حسن صاحب قادری ۳۔خط
[۴۲] نواب وقار الملک صاحب ۱۔خط
[۴۳] ماسٹر محمد شفیع صاحب ۱۔خط: میزان ۴۰۲

یہ حصہ ۱۹۱۶ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ اس وقت سے اب تک شائع ہو رہا ہے۔ اب تک اس کے درج ذیل ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں:

[۱] ۱۹۱۶ء ▪ دار المصنّفین، اعظم گڑھ، طبع اول، ۲۶۰ص
[۲] ۱۹۲۸ء ▪ دار المصنّفین، اعظم گڑھ، طبع دوم، ۳۴۹ص
[۳] ۱۹۵۶ء ▪ دار المصنّفین، اعظم گڑھ، طبع سوم، ۳۴۹ص
[۴] ۱۹۶۶ء ▪ دار المصنّفین، اعظم گڑھ، طبع چہارم، ۳۵۰ص
[۵] ۲۰۱۰ء ▪ دار المصنّفین، اعظم گڑھ، ۳۶۷ص

مکاتیب شبلی حصہ دوم

اس میں علامہ شبلی کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے احباب اور تلامذہ کے نام لکھے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

[۴۴] مولانا حمید الدین صاحب بی اے ۷۷۔خط
[۴۵] مولانا سید سلیمان ندوی ۸۲۔خط
[۴۶] مولوی مسعود علی ندوی ۳۳۔خط

[۴۷]	مولوی ضیاء الحسن صاحب ایم اے ندوی	۱۰۔خط	
[۴۸]	مولوی عبدالسلام ندوی	۸۔خط	
[۴۹]	مولوی عبدالباری ندوی	۸۔خط	
[۵۰]	مولوی حاجی معین الدین ندوی	۲۔خط	
[۵۱]	مولوی سید ابوظفر ندوی	۹۔خط ضمیمہ۔ جلد اول	
[۵۲]	صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں	۱۴۔خط	
[۵۳]	مولوی ریاض حسن خاں، رئیس رسولپور ضلع مظفر پور	۲۳۔خط	
[۵۴]	ایم مہدی حسن صاحب	۹۷۔خط	
[۵۵]	اڈیٹر رسالہ زمانہ کان پور	۱۔خط	
[۵۶]	شیخ حبیب اللہ صاحب (مولانا کے والد)	۳۔خط	فارسی
[۵۷]	چچا کے نام	۱۔خط	”
[۵۸]	مسٹر مہدی حسن صاحب (مولانا کے منجھلے بھائی)	۳۔خط	”
[۵۹]	مولوی حکیم محمد عمر صاحب	۳۔خط	”
[۶۰]	مولوی حمید الدین صاحب	۲۔خط	”
[۶۱]	مولوی محمد عمر صاحب	۸۔خط	”
[۶۲]	مولوی محمد سمیع صاحب	۱۱۔خط	”
[۶۳]	جناب اکبر صاحب	۱۔خط	”
[۶۴]	جناب فرحت احمد صاحب	۱۔خط	”
[۶۵]	ہز ہائینس آغا خان	۱۔خط	”
[۶۶]	نامعلوم الاسم	۱۔خط	عربی
[۶۷]	صفی الملک حسام الملک نواب سید علی حسن خاں	۱۔خط	”
[۶۸]	مولوی سید عبدالحیؒ صاحب ناظم ندوۃ العلماء	۱۔خط، میزان: ۳۸۲	

مکاتیب شبلی حصہ دوم کے اب تک مندرجہ ذیل ایڈیشن دارالمصنّفین سے شائع ہو چکے ہیں:

[۱] ۱۹۱۷ء ▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع اول، ۲۹۴ص

[۲] ۱۹۲۷ء ▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع دوم، ۲۶۱ص

[۳] ۱۹۳۲ء ▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع سوم، ۲۷۷ص

[۴] ۱۹۷۱ء ▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع چہارم، ۲۶۲ص

[۵] ۲۰۱۲ء ▪ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع جدید، ۲۲۷ص

مکاتیب شبلی کے ان دونوں حصوں میں ۵۵ رمکتوب الیہ کے نام، ۴۸۷ راردو خطوط۔ ۱۰ رمکتوب الیہ کے نام، ۳۳ رفارسی خطوط اور ۳ رمکتوب الیہ کے نام ۳ رعربی خط شامل ہیں۔ خطوط شبلی کے دوسرے مجموعے اور غیر مدون خطوط کا ذکر غیر مدون تحریروں کے باب [۸] میں ہے۔ اس کی بنیاد پر اگر یہ کہا جائے کہ اردو کی تاریخ میں شبلی سے بڑا مکتوب نگار اور کوئی نہیں تو غالباً مبالغہ نہ ہوگا۔

مکتوبات شبلی کے موضوعات

علامہ شبلی نے ۳۲ ربرس تک مسلسل قوم وملت کے مسائل سے دلچسپی لی اور علم وادب، تحقیق وتدقیق اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ انتہائی سرگرم اور مصروف زندگی گذاری۔ اس لئے ان کے خطوط قومی زندگی کا آئینہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان خطوط کو ڈاکٹر شمس بدایونی نے قومی روزنامچہ قرار دیا ہے۔ (۱۲) سہولت کے پیش نظر ہم اسے مندرجہ ذیل موضوعات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ احوال شبلی

اس میں خود علامہ شبلی کی زندگی کے مختلف پہلوان کے قلم سے موجود ہیں۔ ان کی تصنیفی کوششوں اور کاوشوں کا ذکر ہے۔ حتی کہ ان کے سنہ تصنیف واشاعت کا بھی ان سے پتہ چلتا ہے۔ علی گڑھ اور ندوہ کے لئے انہوں نے جو جدوجہد کی اس کی تفصیل بھی اس میں آ گئی ہے۔ ان کے مطالعہ میں جو کتب ورسائل آئے اور جن کا ذکر انہوں نے کیا ہے اگر ان کا اشاریہ تیار کیا جائے تو ایک گراں قدر کتاب تیار ہو جائے گی۔ بلکہ اس دور کی اہم کتب ومصادر کا حال بھی معلوم ہو جائے گا۔ مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اعجاز خسروی کا ایک عجیب وغریب نسخہ ہاتھ آیا، امیر کی وفات کے دس برس بعد کا لکھا ہوا ہے، نہایت صحیح اور سرتاپا محشیٰ ہے اور کمال یہ کیا ہے کہ لفظی رعایت میں، ایک لفظ کے کئی ٹکڑے میں بھی کوئی رعایت ہے تو اس قدر ٹکڑا سرخ ہے۔ مثلاً باغ کی رعایت میں بو کا لفظ آ گیا ہے تو بو کو سرخ لکھا ہے۔ تمام کتاب میں یہ التزام ہے۔ اس قدر دیدہ ریزی شاید خود مصنف نے کی ہو۔'' (۱۳)

سر سید احمد خاں (ف: ۱۸۹۸ء) کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''کتابیں یہاں بہت ہیں اور نادر ہیں، لیکن کہاں تک لکھوائی جاسکتی ہیں۔ امام غزالی کی تصنیفیں یہاں موجود ہیں۔ بوعلی سینا کی شاید کل تصنیفیں مل سکتی ہیں۔ امام غزالی کے خطوط بھی موجود ہیں۔ خیر جو ممکن ہوگا کیا جائے گا۔'' (۱۴)

شبلی کی خانگی اور نجی زندگی، گھریلو حال احوال، قرض اور اس کی ادائیگی، بھائیوں کا حال، والدین سے تعلقات، جائداد اور گھریلو مشکلات کی تمام تفصیلات بھی اس میں آ گئی ہیں۔ اپنی ذات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب روپیہ اور دولت کی قدر مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں۔ میں کچھ ابراہیم ادہم یا بایزید نہیں ہوں۔ میرا رواں رواں دنیا کی خواہشوں سے جکڑا ہے، لیکن دنیا کو سلیقہ کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے جوڑ توڑ، سازش، درباداری، خوشامد، لوگوں کی جھوٹی آؤ بھگت نہیں ہوسکتی اور بغیر اس کے کامیابی معلوم۔'' (۱۵)

ندوہ میں ان کے خلاف جو ریشہ دوانیاں ہو رہی تھیں اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں اس کمیٹی سے خارج رکھا گیا ہوں۔ رسالہ میں مجھ کو دخل نہیں تو کیا مجھ سے دعا گوئی اور طبل نوازی کا کام لینا مقصود ہے۔ مجھ کو یہ پسند نہیں کہ ایک مذہبی مجلس میں شریک ہو کر جوڑ توڑ کروں۔ اپنا اثر بڑھاؤں اور مخالف کو شکست دوں۔ اس جنت سے دوزخ بھلی۔ اس مردی سے نامردی بہتر۔ ہم مسلمانوں کی فطرت خدا نے بالکل تباہ کر دی ہے۔ آپ کیا کریں گے اور کوئی کیا کرے

گا۔جس کا جی چاہے سکریٹری، مددگار ناظم وغیرہ وغیرہ بن لے اور اس عزت پر اترالے، باقی کام ہونا یہ تو قسمت ہی میں نہیں، پھر کیا فائدہ۔''(۱۶)

۲۔قوم وملت

قوم وملک کے نمایاں عصری مسائل کا ذکر اس میں آ گیا ہے۔قوم کی پستی وزبوں حالی کے ذکر کے ساتھ ان کا مداوا، سازشیں، ریشہ دوانیاں اور پھر ملک وملت کے بہی خواہوں کی کوششوں اور کاوشوں کی متعدد تفصیلات اس میں موجود ہیں۔کانگریس مسلم لیگ اور دیگر سیاسی جماعتوں کی جدوجہد کا ذکر بھی اس میں ملتا ہے۔اپنی قوم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پولیٹکل معاملات میں جو طوائف الملو کی پیدا ہو گئی ہے سخت قابل نفرت ہے۔ وزیر حسن اور امیر علی کا کیا مقابلہ ہے۔قوم حقیقت میں سر سید مرحوم کے وقت میں بھی اندھی تھی اور اب بھی ہے۔''(۱۷)

سیاسی مسلک اور سر سید احمد خاں سے اختلاف کے متعلق لکھتے ہیں:

''رائے میں ہمیشہ آزاد رہا۔سر سید کے ساتھ سولہ برس تک رہا لیکن پولیٹکل مسائل میں ہمیشہ ان کا مخالف رہا اور کانگریس کو پسند کرتا تھا اور سر سید سے بارہا بحثیں کیں۔''(۱۸)

۳۔تعلیم

مولانا شبلی کی زندگی کا بڑا حصہ تعلیم وتعلم میں گذرا۔علی گڑھ سے پہلے بھی اعظم گڑھ میں انفرادی طور پر وہ درس وتدریس کا فریضہ انجام دے چکے تھے۔پھر علی گڑھ کے ۱۶رسال کے فرائض تدریس اور آخر میں ندوہ کے معتمد تعلیم اور درس وتدریس اور نصاب تعلیم وغیرہ کی تمام کیفیات ان خطوط میں موجود ہیں۔تعلیم کے سلسلہ میں انہوں نے جو کوششیں کی، نیشنل اسکول کا قیام، دارالعلوم کا قیام، نصاب تعلیم، قدیم وجدید تعلیم کا نظریہ، قدیم نصاب کی کمیاں وخامیاں قدیم صالح اور جدید نافع کے فوائد وغیرہ کی تفصیلات، تعلیمی مباحث وغیرہ ان کے خطوط میں موجود ہیں بلکہ ان خطوط کے مطالعہ کے بغیر شبلی کے نظریہ تعلیم کا صحیح ادراک ممکن نہیں۔ چند

اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''افسوس کہ عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے اور جو قدیم طریقہ تعلیم تھا اس میں یورپ کا ذرا پرتو نہیں۔ جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے لیکن دونوں کے حدود جدا جدا رکھے گئے ہیں اور جب تک یہ دونوں ڈانڈے نہ ملیں گے اصل ترقی نہ ہو سکے گی۔ یہی کمی تو ہمارے ملک میں ہے، جس کا رونا ہے۔'' (۱۹)

نیشنل اسکول اعظم گڑھ اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آج اعظم گڑھ سے خط آیا، اسکول اچھی حالت میں ہے۔ گورنمنٹ نے منظور کیا ہے کہ عمارت کے لئے تین ہزار دیں گے بشرطیکہ تین ہزار کمیٹی دے۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ دینا چاہئے اور میں بھی مناسب رقم دوں گا۔

مدرسہ اپنی آمدنی سے چل رہا ہے بحث یہ ہے کہ ہماری قومی قوت سرائے میر پر صرف ہو یا اعظم گڑھ پر، دونوں کے برداشت کے قابل نہیں ہے، کم سے کم یہ کہ دونوں کی جداگانہ پوزیشن قائم ہونی چاہئے اور ان کا باہمی تعلق۔

کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کو مرکز بنا کر اسی کو دین و دنیا دونوں تعلیم کا مرکز بنایا جائے۔ یہیں خدام دین بھی تیار ہوں، مذہبی اعلیٰ تعلیم بھی دلائی جائے، گویا گروکل ہو۔ تم اپنی رائے لکھو۔ ندوہ میں لوگ کام کرنے نہیں دیتے تو اور کوئی دائرہ عمل بنانا چاہئے۔'' (۲۰)

۴۔ علمی وادبی مسائل

شبلی کے عہد کے علم و ادب اور تحقیق و تصنیف کے متعدد مسائل کا ذکر ان خطوط میں موجود ہے۔ اردو ادب، فارسی ادب اور عربی ادب کے علاوہ ترکی اور انگریزی ادب کی بھی بعض باتیں اس میں آ گئی ہیں۔ مستشرقین کی علمی خدمات، ان کا نقطۂ نظر، اسلام دشمنی، سیرت و شریعت میں ان کی غلط بیانی، دشنام طرازی اور بے ہودہ گوئی وغیرہ کا ذکر بھی مکاتیب کا حصہ ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام ایک خط ملاحظہ ہو:

''غزل دیکھی، بعض شعر بہت اچھے ہیں، مثلاً چوں آشنا نگہے کرد، الخ۔ جو الفاظ بے کار اور بھدے ہیں ان پر خط کھینچ دیا ہے۔''ضیائے شمع تر اشب چراغ ویرانہ'' محض شمع ہونا چاہئے اور ضرورت ہی ہو تو ضیاء کے بجائے فروغ ہونا چاہئے۔ دیدہ مخمور کے بجائے نرگس مخمور ہونا چاہئے۔ انداز ناز جانانہ، یادنہیں کہ انداز کے جو معنی اردو میں ہیں فارسی میں بھی آئے ہیں۔'' بہ قلب خویش '' قلب کا لفظ بہت بھدا ہے۔ بہ وصف لشکری ''ی'' بالکل ناجائز ہے۔ محض لشکر کہتے، عروض کی رو سے بھی جائز ہے۔'' (۲۱)

سیرت کے متعلق انگریزوں کی کتابوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انگریزی کتابوں سے جس قدر اقتباسات ہورہے ہیں ان سے کذب وافترا کا عجیب منظر سامنے آجاتا ہے۔ مرگولوس پروفیسر اکسفورڈ سب سے بڑا عربی عالم ہے۔ اس کی لائف آف محمد دیکھنے کے قابل ہے۔ لکھتا ہے کہ عبدالمطلب مطلب کے غلام تھے۔ کعبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف سو برس پہلے کی عمارت ہے وغیرہ۔'' (۲۲)

مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' آپ جو طرحیں اختیار کرتے ہیں، وہ مقید اور محدود ہوتی ہیں۔ آپ کو قافیہ، ردیف کے نباہنے کے لئے شعر کہنے ہوتے ہیں۔ طرحیں ایسی لیجئے کہ جو خیال دل میں بے تکلف بندھ جائے یا ایسا شگفتہ ہو کہ جو شعر نکلے خواہ مخواہ رواں اور برجستہ ہو۔'' (۲۳)

۵۔ انجمن اور ادارے

ان خطوط کا ایک اہم موضوع ہندوستان اور عالم اسلام کے متعدد علمی و ادبی انجمنوں اور تعلیمی اداروں کا ذکر ہے۔ اس میں علی گڑھ کالج، ندوہ، انجمن ترقی اردو، ترکی کے کالج، مصر کے کالج، بعض انگریزوں کے کالج وغیرہ کا ذکر آیا ہے، جامعہ عثمانیہ کا قیام اور نصاب تعلیم، مدینہ

یونیورسٹی کا قیام اور نصاب تعلیم وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔ندوہ کے ایک اجلاس کی روداد اس طرح سناتے ہیں:

''اب کی متعصب مولویوں سے پالی لڑنی پڑی۔ جلسہ انتظامیہ میں نائب سکریٹری ندوہ نے جو اپنے آپ کو سکریٹری کہتے اور لکھتے ہیں، تجویز پیش کی کہ شبلی الگ کر دیا جائے یعنی اس کا عہدہ ہی توڑ ڈالا جائے۔ یاران قدیم علی گڑھ نے طعنہ دیا کہ اور مولویوں میں گھسو۔ میں نے کہا میں نے یہ سمجھ کر میدان میں قدم رکھا تھا۔ بہرحال یہ لوگ نہ ہوتے تو ندوہ کی حاجت ہی کیا تھی۔ یہ لوگ میرے دعوے کے لئے بیان تحریری ہیں۔''(۲۴)

۶۔حکومتیں

مکاتیب شبلی کا ایک موضوع حکومتوں کا ذکر ہے۔ ہندوستان کی انگریزی حکومت، عالم اسلام کی حکومتیں، یورپ کی بعض حکومتیں، ہندوستان کی دیسی ریاستیں بھوپال اور حیدرآباد وغیرہ۔ غرض اس وقت کی حکومتوں کا حال احوال بھی مختصراً سہی اس میں مضمر ہے۔

اس وقت ملک کے کیا حالات تھے ان کے ایک خط سے اسکی جھلک سامنے آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میری نظموں کی ضبطی کا بہت بڑا اثر پڑا۔لفٹنٹ گورنر صاحب سے ایک پارٹی میں سامنا ہو گیا پہلے تو کہا مزاج مقدس، پھر شکایت آمیز وطعن آمیز فقرے کہے۔ ابھی تک میں ان سے مل نہ سکا اور جاسوسوں نے سب نظمیں ان کو پہنچائیں اور معنی سمجھائے۔ چیف سکریٹری صاحب بھی مجھ سے شاکی تھے۔''(۲۵)

۷۔احباب ومعاصرین

شبلی نے اپنے متعدد خطوط میں اپنے معاصرین، بزرگوں اور تلامذہ کا بھی ذکر کیا ہے اور اس انداز سے کیا ہے کہ ان کی شخصیت کے نمایاں خدوخال اجاگر ہو گئے ہیں اور ان کی علمی و ادبی اور ملی کوششوں کا ذکر آ گیا ہے۔مولوی محمد امین زبیری (ف: ۱۹۵۶ء) جنہوں نے شبلی کی

وفات کے بعد ان کی شخصیت کو ملیامیٹ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''بھئی! سچ پوچھئے تو

اے بادصبا ایں ہمہ آوردہ تست

واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ اور ندوہ کو ریاست (بھوپال) سے جو فوائد پہونچ رہے ہیں اس کی سنگ بنیاد آپ ہیں۔فجزاک اللہ خیرا۔''(۲۶)

مولوی ظفر علی خاں (ف:۱۹۵۶ء) ایڈیٹر زمیندار کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ظفر علی ملے تھے وہ بڑی امیدیں دلاتے ہیں لیکن وہ غیر معتدل جوش اور خوش اعتقادی ہیں۔ان کا اصرار ہے کہ تم اور حمید مدینہ یونیورسٹی کے لئے چلے جاؤ ،ان کا خیال ہے کہ خود وہاں سے طلبی ہوگی۔''(۲۷)

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے متعلق لکھتے ہیں:

''ایک ہمارے روشن خیال شروانی ہیں جن کو میں اپنا امام کہتا ہوں۔ان کا یہ حال ہے کہ انگریزی کے نام سے ان کو لرزہ آتا ہے۔بڑی مشکل سے مسلمانوں کے پھسلانے کی تجویز پر راضی ہوئے تو عمل درآمد میں حیران ہیں، حالانکہ تمام طالب علموں کو انگریزی پڑھانا مقصود نہیں، نہ میرا یہ خیال ہے،صرف اس قدر مقصود ہے کہ دو چار لڑکے انگریزی بھی پڑھیں ۔اتنی ذرا سی بات ان کے نزدیک اتنی عظیم الشان ہے جس قدر محسن الملک کی فرضی یونیورسٹی ...... ان ہمتوں پر کوئی کیا کمر باندھے۔''(۲۸)

مہدی افادی کی تحسین ملاحظہ ہو:

''مدت ہوئی البشیر میں قاموس الاسلام کے عنوان سے ایک مضمون دیکھا۔ نیچے مہدی حسن کے دستخط تھے،حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزا پوری ہیں یا نذیر احمد اور آزاد کی روحوں نے ایک قالب اختیار کر لیا ہے۔کئی دن تک دیکھتا اور احباب کو دکھاتا رہا۔دو تین ہفتے ہوئے وہی برق ایک اور افق پر چمکی، جو پہلے

سے زیادہ خیرہ کن اور ہوش ربا تھی، مصمم ارادہ ہوا کہ اب کہ ضرور مبارک باد لکھوں۔'' (۲۹)

سچی بات یہ ہے کہ ان کے خطوط میں احباب، معاصرین، تلامذہ بلکہ بزرگوں کے بارے میں اس قدر تفصیلات مکاتیب شبلی میں موجود ہیں وہ کسی ایک کتاب میں مشکل ہی سے ملیں گی۔

۸۔ علمی منصوبے

علامہ شبلی نے علم و تحقیق، تصنیف و تالیف، قوم و ملت کی ترقی اور اسلام کی سربلندی کے لئے نہ صرف کوششیں کیں بلکہ عملی جدوجہد کے لئے متعدد منصوبے اور حکمت عملیاں تیار کیں۔ مثلاً سیرۃ النبی ﷺ کی تصنیف، مجلس علم الکلام، ندوہ کے منہاج و مقاصد، دارالمصنّفین کی تعمیر و تشکیل اور اس کے مقاصد کی تعیین، تعطیل جمعہ، وقف علی الاولاد کی تحریک، اشاعت و حفاظت اسلام کی منصوبہ بند کوشش، قدیم کتب و مصادر کی اشاعت وغیرہ غرض ان کے عزائم اور منصوبوں کے تمام خط و خال ان خطوط کا بنیادی حصہ ہیں۔ ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''میں آج کان پور روانہ ہوتا ہوں۔ نومسلموں پر آریہ جو جال ڈال رہے ہیں، وہ سخت خطرناک درجہ تک پہونچ گیا ہے۔ اس غرض سے تمام اضلاع میں دفاعی انجمنیں اور دیہات میں مکاتیب قائم کرنا مقصود ہے، لیکن چونکہ گرمی سخت ہو رہی ہے اس لئے یہ دورہ مختصر ہوگا۔'' (۳۰)

اپنے سلسلہ کلامیہ کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:-

''میں علماء کی سطح کو بلند کرنا چاہتا ہوں اس کے لئے زینے درکار ہیں، الغزالی پہلا زینہ ہے دوسرا تاریخ الکلام پھر اصلی سطح یعنی الکلام جدید ہے، جو زیر تصنیف ہے۔...... اگر الغزالی میں کھل کھیلتا تو علماء برسوں بلکہ قرنوں کے لئے ہاتھ سے نکل جاتے اور مجھ کو ان سے کٹ کر الگ ہونا منظور نہیں۔'' (۳۱)

تالیف سیرت کا عزم ملاحظہ ہو:

ہر حالت میں کام جاری رکھوں گا، اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو

انشاءاللہ دنیا کو ایک ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہوسکتی۔(۳۲)

۹۔ادب وانشاء

مکاتیب شبلی نہ صرف شبلی اور قوم وملت کے مسائل، عزائم، منصوبوں کا ایک خاکہ ہے بلکہ ادب وانشا کا ایک بہترین نمونہ بھی ہے۔ شبلی کا شاندار ادبی اسلوب جس قدر اس میں واضح ہے ان کی بہت سی کتابوں میں بھی اس قدر نمایاں نہیں۔اپنے شعری مجموعوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بوئے گل کی نسبت تمام اہل نظر کی رائے ہے کہ دستہ گل اور اس میں، جذب و سلوک کا فرق ہے۔ واقعی دونوں کے شان نزول اسی قدر مختلف ہیں جس قدر دونوں کے جوش وسرمستی میں فرق ہے۔ایک شعر میں خود یہ راز کھل پڑا ہے:

یا جگر کاوی آں نشتر مژگاں کم شد   یا کہ خود زخم مرا لذت آزار نماند

لیکن مولانا حالی سب سے مختلف الرائے ہیں وہ بوئے گل کو حال بتاتے ہیں اور دستہ گل کو قال۔ بہ بیں تفاوت الخ۔''(۳۳)

یوں تو علامہ شبلی کے خطوط ادب وانشاء کے مرقعے ہیں۔ ان میں دلآویزی کی وہی کیفیت پائی جاتی ہے، جو روایتی غزلوں میں ہوتی ہے تاہم اس کے عناصر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مہدی افادی[ف: ۱۹۲۰ء] مولانا ابوالکلام آزاد[ف: ۱۹۵۸ء] عطیہ فیضی اور مولوی محمد سمیع کے خطوط میں زیادہ نمایاں ہیں۔مہدی افادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مدت ہوئی البشیر میں قاموس الاسلام کے عنوان سے ایک مضمون دیکھا، نیچے مہدی حسن کے دستخط تھے، حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزاپوری دوست ہیں یا نذیر احمد وآزاد کی دوروحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے۔کئی دن تک دیکھتا اور احباب کو دکھلاتا رہا۔

دودن تین ہفتہ ہوئے وہی برق ایک اور افق پر چمکی، اس سے زیادہ ہوش ربا اور خیرہ کن تھی۔ مصمم ارادہ ہوا کہ اب کی ضرور مبارک لکھوں لیکن حیدرآباد کی

مصائب آمیز زندگی کسی دلی جوش کے اظہار کا موقع کہاں دیتی ہے۔غرض وہ چوٹ زخم کا چور بن کر دل میں رہ گئی۔آج آپ کا بھیجا ہوا البشیر پہنچا اور وہ چوٹ ابھر آئی ،زیادہ کیا کہوں خدا آپ کو،آپ کے دست قلم کو،آپ کی صنعت گری طبع کو قائم رکھے،بخدا مجھ کو خوشی سے زیادہ آپ پر رشک آتا ہے۔''(۳۴)

مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ایک خط کا انداز نگارش ملاحظہ:

''ان باتوں سے کام نہیں چلتا۔اگر آپ اس موقع پر نہ آئے تو میں قیامت تک کلکتہ نہ آؤں گا، بلکہ بعد قیامت بھی۔میرے برابر کا کمرہ بالکل خالی اور آپ کے لئے محفوظ ہے۔اکثر احباب آرہے ہیں۔

دیر ویراں سہی کعبہ مرا آباد رہے
یعنی مومن ہوں چلا جاؤں گا میں یاد رہے

(۳۵)

۱۰۔کتابیں

علامہ شبلی کی علمی جستجو حد انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور وہ ہمہ وقت تحقیقات وتدقیقات اور تصنیفات کے لئے کتابوں کی تلاش وجستجو میں سرگرداں رہتے۔اس لئے مکاتیب میں مختلف موضوعات کی سیکڑوں کتابوں کا ذکر ہے۔بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اردو کے مکتوباتی ادب میں کسی ایک مکتوب نگار کے یہاں کتابوں سے اس قدر دلچسپی اور ان کا ذکر شاید ہی مل سکے۔یہاں اس طرح کے چند اقتباسات مکاتیب شبلی سے نقل کئے جاتے ہیں:

[۱]عمر بھر میں کبھی آپ مجھ کو اس قدر خوش نہ کر سکے اور نہ کر سکیں گے جس قدر لغت اسدی کے بھیجنے سے لیکن فوراً قیمت لکھئے،ورنہ مسرت میں کمی آجائے گی۔آپ پر بار ڈالنا مقصود نہیں بلکہ صرف سراغ رسانی کا احسان کافی ہے۔

[مکاتیب شبلی ج ا ص ۲۱۲]

[۲] الہ آباد کی نمائش میں ایک اور اضافہ ہوا یعنی دیوان فیضی بھی ہوگا اور وہ اوائل دسمبر میں پہنچ جائے گا۔ میرے پاس اطلاع آ چکی ہے۔ افسوس ہے اس زمانہ میں میاں اسحاق کا کتب خانہ معمور ہوگا ورنہ ممکن تھا کہ زیادہ مطالعہ کا موقع ملتا۔ تذکرہ خطاطاں اور کنز اللغتہ کا ابتک انتظار ہے۔ [مکاتیب شبلی ج اص ۲۶۱]

[۳] ہومر کی قیمت ۲۱ رفرنگ یا ۱۱۹ رقرش ہے۔ ایک پونڈ کے ۱۰۰ رقرش ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو خودخواہش ہوتو مفصلہ بالا رقم جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال کے پاس بھیج دیجئے۔ [مکاتیب شبلی ج اص ۵۶]

---

[۴] آمدم برسر مطلع حصہ دوم کے لئے جو کتابیں درکار ہیں ان میں چند وہ کتابیں ہیں جو میری کتابوں میں ہیں اور ماموں صاحب کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ تفسیر کبیر تمام و کمال، نووی شرح مسلم، نصب الرایہ، تخریج ہدایہ، فتح القدیر، ہدایہ، شرح مسلم، موطاء امام محمد، میری کتابوں سے لیجئے اور میزان الاعتدال، معانی الآثار، زیلعی، ہدایہ، مقدمہ ابن الصلاح ماموں صاحب سے لے کر بذریعہ برن کمپنی روانہ فرمائیے۔ [مکاتیب شبلی ج اص ۵۶]

---

[۵] معجم الادباء [یاقوت حموی] کی جو جلدیں عربی زبان میں چھپی ہوں، ان کو ویلو بھیج دیجئے...... موسیٰ بن عقبی مشہور مورخ ہے۔ اس کے مختصر حالات تمام رجال کی کتابوں میں ملیں گے۔ فرصت ہوگی تو اس کا اور مدینۃ العلوم کا حال نقل کرا کر بھیج دوں گا۔ [مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۲۳]

[۶] میری کتابوں میں ایک قلمی کتاب فارسی زبان میں میخانہ نام ہے، چھوٹی تقطیع ہے اور شعرائے فارسی کا تذکرہ ہے اور موضوع صرف وہ شعرا ہیں جنہوں نے کوئی ساقی نامہ لکھا ہے۔ اس کو حسب ذیل پتہ سے بھیجو۔

[مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۵۵]

۱۱۔تاریخ وسنہ

شبلی کے ان خطوط سے عہد شبلی کی متعدد تاریخوں کا تعین کیا جا سکتا ہے مثلاً روم پر روس کا حملہ کب ہوا۔ مسجد کان پور کا سانحہ کب پیش آیا۔انگریزوں نے ترکی کے ساتھ کب کون سا معاملہ کیا۔ یورپ کی بعض جنگوں کا بھی ذکر اس میں آ گیا ہے۔ ندوہ کے لئے کب کیا کوششیں ہوئیں۔علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے کب کون سی جد وجہد ہوئی۔دارالمصنّفین کب قائم ہوا،۔نیشنل ہائی اسکول اعظم گڑھ کی بنیاد کب ڈالی گئی۔دنیا کے دیگر ممالک میں کون سی تحریکیں اٹھیں وغیرہ۔

ان موضوعات ومباحث سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مکاتیب شبلی واقعی قومی اعمال نامہ ہیں ان کے مطالعہ و جائزے کے بغیر، ہم عہد شبلی کی تاریخ سے پوری طرح واقف نہیں ہو سکتے۔مستقبل کی تعمیر میں بھی یہ خطوط معاون ہو سکتے ہیں۔

افسوس کہ اس قدر اہم ذخیرے کے مطالعہ کی مثبت انداز میں کوئی کوشش نہیں کی گئی اور جن لوگوں نے اس کا مطالعہ کیا وہ ان باتوں کو نظر انداز کر کے علم نفسیات کے زعم میں شبلی کی کردار کشی کے مرتکب ہوئے اس کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ شبلی کے خطوط کا جس قدر مطالعہ اوراستفادہ ہونا چاہئے تھا نہ ہوسکا۔

غالب کے خطوط کی عمارت جن بنیادوں پر قائم ہے،مکاتیب شبلی ان کی ترقی یافتہ شکل ہے۔وہی انداز بے ساختگی، وہی سادگی، بات میں بات کہنے کا وہی انداز،محبت اور دلجوئی کا وہی لب ولہجہ،غرض مکاتیب شبلی اپنی نثری خصوصیات اورطرز تحریر کے لحاظ سے بھی خطوط نگاری کے ارتقا کے غماز ہیں ۔مولانا سید سلیمان ندوی نے شبلی کی خطوط نگاری کے مندرجہ ذیل خصوصیات و امتیازات لکھے ہیں:

۱۔ نہایت مختصر لکھتے تھے۔کبھی صرف ہاں، ناں پر اکتفا کرتے تھے۔مفصل اور طویل سوالوں کا جواب بھی ایک دو فقروں میں دیتے تھے۔اس قسم کے سیکڑوں خطوط میرے پاس ہیں لیکن میں نے ان کو قصداً اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا۔میری مرحوم بیوی (خدا اس کو غریق رحمت

کرے) مولانا کے خط کو تار کہتی تھی۔ نمونہ کے طور پر اس قسم کے تار مہدی حسن صاحب کے خطوط میں نظر آئیں گے۔

۲- لیکن درحقیقت مختصر نویسی کوئی ایسی خوبی کی بات نہیں ہے اصل خوبی یہ ہے کہ اختصار لفظ کے ساتھ معنی میں پوری وسعت موجود ہو۔ یہی خصوصیت مولانا کی انشاء پردازی اور بلاغت کی جان ہے، وہ انہیں ایک دو فقروں میں جو کچھ کہہ جاتے ہیں ہم صفحوں میں ان کو نہیں کھپا سکتے۔ وہ چند لفظوں میں جو جادو پھونک دیتے ہیں اس زمانہ کے سامری سیکڑوں منتروں میں وہ روح پیدا نہیں کر سکتے، ضرورت تھی کہ اس مسئلہ کو مثالوں سے واضح کرتے لیکن اس خوف سے کہ یہ مختصر دیباچہ مطول نہ ہو جائے، اس کو ارباب ذوق کے ذوق سلیم پر چھوڑ دیتے ہیں۔

۳- آداب والقاب کی پروا نہیں کرتے تھے، اکثر بلا تمہید مطلب شروع کر دیتے تھے (قدماء کا یہی طرز تھا) جس کا بڑا خیال کیا اس کو صرف ایک دو لفظ القاب کے لکھ دیے۔

۴- خطوط کے جواب نہایت پابندی کے ساتھ اور نہایت جلد بلکہ اسی دن لکھتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ خط لکھا اور آنے جانے کا حساب لگا کر جو دن مقرر کیا اسی دن جواب آ گیا۔ بیماری تک میں بھی وہ اس وضع داری کو نباہتے تھے، بہت مجبور ہوتے تو دوسروں سے لکھا دیتے۔ چنانچہ مکاتیب کی دونوں جلدوں میں اس قسم کے خطوط ملیں گے۔

۵- ابتداءً مولانا کا خط شکستہ تھا پھر خوشخط نستعلیق لکھنے لگے تھے، آخر میں شکستہ اور نستعلیق مل کر ایک عجیب خوش سواد خط پیدا ہو گیا تھا، یہ خط اس قدر خوب صورت اور حسین تھا کہ بیسیوں سلیقہ شعار اشخاص نے اس کی نقلیں کیں اور بہت سے اس میں کامیاب ہوئے، چنانچہ ندوہ کے طلبہ مولانا کے شاگردوں اور بعض دوستوں نے یہ مشق بہم پہنچائی ہے کہ بہت مشکل سے ان میں تمیز ہو سکتی ہے۔

۶- تمام مکاتیب پڑھ کر یہ اندازہ ہوگا کہ مولانا ہر شخص سے اس کے مذاق اور تعلقات کے مطابق گفتگو کرتے تھے۔ شاگردوں کے خطوط میں علمی واصلاحی مشورے نظر آئیں گے۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں کے خطوط میں زیادہ تر فارسی شاعری، نوادر کتب اور ندوہ کے متعلق باتیں ہیں۔ پرفیسر عبدالقادر سے ادب وتاریخ کے مباحث پر گفتگو ہے۔ مولانا حمید الدین صاحب

سے تفسیر اور سیرت پر مکالمات ہیں۔ مسٹر عبدالماجد سے تفریعات کی باتیں ہیں۔ مسٹر مہدی حسن صاحب مصنف دائرہ ادبیہ کے خطوط میں محاسن ادبی اور لطافت شعری پر گل فشانیاں ہیں۔ (۳۶)

سید صاحب نے مختصراً یہ خصوصیات بیان کی ہیں اور اپنے عہد میں جس نقطۂ نظر سے خطوط کا مطالعہ کیا تھا، ان پر روشنی ڈالی ہے، حالانکہ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ان میں اور بھی متعدد خوبیاں ملیں گی۔

سید صاحب نے مکاتیب کی دونوں جلدوں کی ترتیب اشخاص کے لحاظ سے کی ہے، یعنی کسی ایک شخصیت کے تمام خطوط یکجا تاریخی ترتیب سے جمع کئے ہیں۔ اس سے ہر شخص سے تعلقات کی نوعیت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے اور فی الواقع یہ ایک عمدہ ترتیب ہے لیکن اس سے بھی بہتر ترتیب تاریخی ہے جو تاریخ وار خطوط سے مرتب کی جاتی ہے حالانکہ اردو میں اسطرح کے کم کام ہوئے، تاہم اس سے خطوط نگار کی زندگی کے تمام ادوار اور اس کے ذہنی ارتقا کی پوری کیفیت سامنے آجاتی ہے۔ یہ کام اب تک باقی اور شبلی شناسوں پر قرض ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے خطوط کی جمع آوری کا کام شروع کیا تو بقول ان کے ہر طرف سے خطوط کی بارش شروع ہوگئی اور ہزاروں خطوط جمع ہو گئے، مگر انہوں نے محض ان کا ایک انتخاب شائع کیا۔ تاریخی ترتیب میں ان تمام خطوط کی بڑی اہمیت ہے، مگر افسوس کہ اس کا کچھ سراغ نہیں ملتا کہ وہ کہاں گئے۔ ان کی تلاش و جستجو اور ترتیب و اشاعت ضروری ہے۔

ادبی تنقیدی اور لسانی اعتبار سے بھی مکاتیب شبلی کا جائزہ اب تک نہیں لیا جا سکا ہے۔ حالانکہ اگر اس لحاظ سے اس کا مطالعہ کیا گیا ہوتا تو ان کی اہمیت و افادیت پورے طور پر واضح ہو کر سامنے آجاتی۔ اسی طرح ان خطوط کی روشنی میں شبلی کی خودنوشت کی ترتیب کا کام بھی کیا جانا مفید اور ادبی کام ہوگا۔

مطالعات شبلی کے سلسلے میں ہمارے اہل قلم نے جو کوتاہی برتی ہے وہ مکاتیب شبلی سے ان کی عدم دلچسپی سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ باوجود اس کے مکاتیب شبلی کی اہمیت کبھی کم نہ ہوگی اور جب ہم ذہنی تحفظات سے بلند ہو کر محض قومی دردمندی اور ادبی و تنقیدی شعور سے کام لینا سیکھ جائیں گے تو شبلی کے یہ خطوط ہماری پوری رہنمائی کریں گے۔

خطوطِ شبلی

یہ علامہ شبلی کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے بمبئی کی دو ممتاز خواتین عطیہ بیگم فیضی [۱۸۷۷-۱۹۶۷ء] اور زہرا بیگم فیضی [۱۸۶۶-۱۹۴۰ء] کے نام لکھے تھے۔ انہیں مولوی محمد امین زبیری [۱۸۷۰-۱۹۵۸ء] و منشی سید یوسف قیصر نے مرتب کر کے ۱۹۲۶ء میں شمسی مشین پریس آگرہ سے شائع کیا۔ اس پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن تنہا محمد امین زبیری کا مرتب کردہ ہے۔ اسے تاج کمپنی لاہور نے شایع کیا ہے۔ اس پر بھی سنہ اشاعت درج نہیں۔ امین زبیری کے دیباچہ پر ۱۲ر مئی ۱۹۳۵ء کی تاریخ درج ہے، ظاہر ہے اس کے بعد ہی شایع ہوا ہوگا۔ البتہ طبع اول کے بارے میں صراحت ہے کہ ۱۹۲۶ء میں شایع ہوا۔

ان دونوں اشاعتوں میں قدرے تفاوت ہے۔ پہلے ایڈیشن میں کل ۱۰۰ر خطوط ہیں جبکہ دوسرے ایڈیشن میں ۸۱ر۔ گویا پہلے ایڈیشن کے ۱۹ر خط نکال دئے گئے ہیں۔ پہلے ایڈیشن میں صرف مولوی عبدالحق کا مقدمہ ہے، جبکہ دوسرے میں مرتب کا دیباچہ بھی شامل ہے۔ ان دونوں اشاعتوں کے بعد خطوطِ شبلی کی کسی اشاعت کا علم نہیں۔

طبع اول متوسط تقطیع کے ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں علامہ شبلی کے کل ۱۰۰ خطوط شامل ہیں۔ جس میں ۵۵ر خطوط عطیہ بیگم فیضی کے نام اور ۴۵ر خطوط زہرا بیگم فیضی کے نام ہیں۔ عطیہ فیضی کے نام کے خطوط ۱۷ر فروری ۱۹۰۸ء سے ۲۸ر مئی ۱۹۱۱ء کے درمیان اور زہرا بیگم فیضی کے نام کے خطوط ۲۸ر فروری ۱۹۰۸ء سے ۱۳ر جون ۱۹۱۴ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔

ان خطوط میں دیرینہ مراسم، اصلاح زبان، ندوہ کے مسائل و مقاصد اور اس کی اہمیت کے ذکر کے ساتھ شعر و ادب کے نکتے بالخصوص فارسی ادب کے بعض مباحث، مولانا شبلی کی بعض فارسی اور اردو غزلوں کے اشعار شامل ہیں۔ تصنیفات و تالیفات شبلی کا بھی ذکر آ گیا ہے، لیکن اس میں جو سب سے اہم چیز شبلی کے قلم سے نکلی ہے وہ تعلیم نسواں اور اس کے مسائل ہیں۔ عورتوں کی علمی و تعلیمی ترقی کے سلسلے میں علامہ شبلی جو انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے اور جن بنیادوں پر چاہتے تھے وہ تمام خیالات تقریباً اس میں موجود ہیں۔ مجموعی طور سے یہ مکاتیب شبلی کی دونوں جلدوں کی

طرح متنوع خیالات پر مشتمل ہیں۔اور انہی کی طرح تخاطب میں مکتوب الیہ کے ذہن ومزاج اور ان کی سطح کا بڑا خیال رکھا گیا ہے،اس میں ادب وانشا کی رعنائی وگل کاری بھی پائی جاتی ہے۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ یہ ادب و انشاء کے بڑے دلآویز مرقعے ہیں۔ یہاں مختلف موضوعات کے چند اقتباسات بطور نمونہ بلاتبصرہ نقل کئے جاتے ہیں تا کہ ان میں شبلی کے قلم سے بے ساختہ جو چیزیں نکل گئی ہیں ان کا پورے طور پر اندازہ ہو جائے۔

املا اور صحت زبان

[۱]''آپ بعض الفاظ کو ملا کر لکھتی ہیں۔ یوں نہ لکھئے۔مثلاً ''قبول ہو'' کو آپ ''قبولھو''لکھتی ہیں۔ یہ املا بالکل نامانوس ہے۔''

[خطوط شبلی،ص۹۰ بنام زہرا بیگم]

[۲]''آپ اکثر یہ محاورہ لکھا کرتی ہیں ''اپنا ہاتھ بتاتی ہے''۔لیکن یہ محض غلط محاورہ ہے۔نہ لکھا کیجئے۔ [خطوط شبلی،ص۹۷ بنام زہرا بیگم]

''ہاتھ بتاتی ہے'' کے موقع پر زور دکھاتی ہے یا جلوہ دکھاتی ہے بولتے ہیں۔

[خطوط شبلی،ص۹۷ بنام زہرا بیگم]

[۳]''آپ کی عبارت میں بعض محاورے بمبئی کے مخصوص ہیں۔آئندہ بچئے مثلاً یہ لفظ ''کتابیں برابر مل گئیں''۔''برابر ملنا'' بالکل غلط ہے۔''بہن کا مال ان کو دے دیا''۔ مال کا لفظ ایسی چیزوں کے متعلق نہیں بولتے۔یہ لکھنا چاہئے تھا کہ ''ان کی چیزیں ان کو دیدیں۔'' [خطوط شبلی ص۳۰]

[۴]''رضا دینا'' آپ لوگ ''اجازت دینے'' کے معنی میں لکھتے ہیں اور یہ عام غلطی ہے۔ڈاکٹر نے رضا دی'' غلط ہے۔اجازت دی لکھنا چاہئے۔

[خطوط شبلی ص۳۴]

[۵]''چٹکیوں میں اڑاتی ہیں'' رکیک اور اوچھا محاورہ ہے اور جس موقع پر تم نے لکھا ہے اس کے لئے بالکل خلاف تہذیب ہے۔ یہ محاورہ سرے سے کبھی نہ لکھا

کرو۔ میں تم کو بار بار ٹوکتا ہوں ممکن ہے کہ تم کو گراں گذرے لیکن جی نہیں مانتا کہ تمہاری اردو کے روشن چہرے پر داغ رہنے پائیں بس دو چار بار کی اور کسر ہے۔'' [خطوط شبلی ص ۲۶]

[۶]''میں نے پہلے خط میں لکھا تھا کہ ''چٹکیوں میں اڑانا'' ایسے موقع پر نہیں بولتے، بلکہ یہ نہایت بازاری محاورہ ہے۔ اور اپنے کسی بڑے کی نسبت کبھی نہیں بولنا چاہئے، لیکن میں نے یہ نہیں لکھا کہ ایسے موقع پر کیا بولتے ہیں، ایسے موقع کے لئے عام محاورہ تو ''بالا بتانا ہے'' لیکن بزرگ کی نسبت یہ محاورہ بھی موزوں نہیں۔ یوں کہنا چاہئے ''ٹالتی ہیں''۔ ایک اور محاورہ غلط تھا ''ڈاکٹر کہتے ہیں سو رہو''۔ ''سو رہو'' کے بجائے ''لیٹے رہو'' لکھنا چاہئے۔'' [خطوط شبلی ص ۳۷]

خواتین کے مسائل

[۱]'' ہم پرانے لوگ آزادی سے بے پردہ مجامع عام میں عورتوں کا تقریر کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن آپ تو اس میدان میں آ چکیں اس لئے اب جو کچھ ہو کمال کے درجہ پر ہو۔'' [خطوط شبلی ص ۳۱]

[۲]''نصاب تعلیم کے متعلق میں سرے سے اس کا مخالف ہوں کہ عورتوں کے لئے الگ نصاب ہو یہ ایک اصولی غلطی ہے جس میں یورپ بھی مبتلا ہو رہا ہے۔ کوشش ہونی چاہئے کہ ان دونوں صنفوں میں جو فاصلہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ کم ہوتا جائے نہ کہ اور بڑھتا جائے اور بات چیت رفتار گفتار، نشست و برخاست ء مذاق زبان سب الگ ہو جائیں یونہی تفرقہ بڑھتا رہا تو دونوں مختلف نوع ہو جائیں گے۔ امریکا کی ایک لیڈی نے اس پر ایک عمدہ کتاب لکھی ہے شاید تمہاری نظر سے گذری ہو۔ البتہ بعض چیزیں مثلاً رضاعت، پرورش اولاد وغیرہ مضامین عورتوں کے نصاب میں اضافہ ہونے چاہئیں۔ اس حالت میں اردو کا پورا لٹریچر جو کچھ کم نہیں ہے۔ عورتوں کے قابو میں آ جائے گا۔ سرسید، حالی، آزاد

اور تمہارے حقیر دوست کی تصنیفات ناقدری کے قابل نہیں۔''

[خطوط شبلی ص ۴۶-۴۷]

[۳] ''عورتوں کے متعلق تمہاری رائے ہے کہ وہ دینوی اور معاشی علوم کم پڑھیں اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں۔ لیکن یاد رکھو مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کئے اس بل پر کئے کہ عورتیں ان کی دست نگر تھیں۔ تم عورتوں کا بہادر اور دیو پیکر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو لیکن یہ تو پرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان چھوئی موئی اور روئی کا گالا ہونا چاہئے۔ جمال اور حسن نزاکت پر موقوف نہیں۔ تنومندی، دلیری، دیو پیکری اور شجاعت میں بھی حسن و جمال قائم رہ سکتا ہے۔ مردنما عورت زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ اعتراض صحیح ہے کہ موجودہ طرز تعلیم سے بچے خاندان سے اجنبی ہو جاتے ہیں، لیکن خاندان سے زیادہ چسپیدگی بھی کوئی مفید چیز نہیں مہمات امور رک جاتے ہیں۔ (خطوط شبلی ص ۵۳)

[۴] ''عورتوں کی دیو پیکری پر تم نے اس قدر طولانی تحریر لکھی لیکن میری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ تو مسلم ہے کہ صحت کے لئے تندرستی کے لئے جسم کی موزونی کے لئے جامہ زیبی کے لئے مردانہ ورزشیں مفید ہیں۔ جو کچھ بحث ہے یہ ہے کہ عورتوں کے زنانہ حسن میں فرق آتا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اس سے جمال اور دوبالا ہو جاتا ہے یہ صرف میری رائے نہیں بڑے بڑے اہل نظر کا یہی فیصلہ ہے۔'' (خطوط شبلی ص ۵۵)

[۵] ''امین الرشید (ہارون الرشید کا بیٹا) کی تمام کنیزیں مردانہ کپڑے پہنتی تھیں اور ہتھیار لگاتی تھیں، تیموریوں کے ہاں حرم کا چوکی پہرہ تر کی عورتوں سے متعلق تھا مردانہ ہتھیار لگاتی تھیں۔ آج بھی حیدر آباد میں زنانہ پلٹن ہیں جو محلات میں پہرہ دیتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک عورتیں نازک بنی رہیں گی مرد ان کو پورے حقوق نہ دیں گے۔'' (خطوط شبلی ص ۵۶)

[۶]''تم کو خط لکھ چکا تھا کہ ایک پولندہ آیا جس میں سلسلۂ تعلیم نسواں کی چھ ریڈریں آئیں۔ ابتدائی حیثیت سے مجھ کو بہت پسند ہیں ۔ ہر پہلو کا لحاظ رکھا ہے۔تم بھی منگوا کر دیکھو۔اور پسند ہوتو وہاں استعمال کرو۔

(خطوطِ شبلی ص ۶۷-۶۸)

[۷]''عورت کا حال مردوں کے ساتھ کے پرچہ میں دیکھ کر ہم کیوں گھبرائیں گے خود قرآن مجید میں ایک سورۃ کا نام نساء ہے یعنی عورت ۔عربی بیوگرافیوں میں عموماً مردوں کے ساتھ عالمہ عورتوں کا حال تفصیل سے ہوتا ہے۔اکثر بڑے بڑے علماء نے علم حاصل کیا ہے لیکن وہ پردہ میں بیٹھ کر پڑھاتی تھیں۔''

(خطوطِ شبلی ص ۸۳)

[۸]''عورت کو اگر مرد سے حقیقی شکایت ہے تو قاضی کے سامنے خلع یعنی علیحدگی کی درخواست کرسکتی ہے اور قاضی دونوں میں تفریق کراسکتا ہے۔''

(خطوطِ شبلی ص ۱۱۲-۱۱۳)

تذکرہ کتب

[۱]''آج دیوان اور سوانح مولانا روم بھیجتا ہوں۔نواب بیگم صاحبہ [نازلی بیگم] کو دو، جناب نواب صاحب کی خدمت میں جب پہنچوں گا تو تمام تصنیفات جو مل سکیں گی خود ہدیہ دوں گا۔'' (خطوطِ شبلی ص ۲۸)

[۲]''موازنہ انیس و دبیر'' اگر دیکھ سکو تو دیکھا کرو۔اس سے اردو میں بہت بصیرت ہوسکتی ہے۔کیا ایک نسخہ اس کا بھیج دوں۔

آزاد کی ''سخندان پارس'' کا حصۂ دوم جو اب شائع ہوا ہے، دیکھنے کے قابل ہے۔'' (خطوطِ شبلی ص ۳۲)

[۳]''زہرا صاحبہ نے قرآن مجید مترجم چاہا تھا، ان کو بھیج دیا ہے۔کیا تم کو بھی قرآن مجید سے خاص لگاؤ ہے، اگر ہو تو ایک اور نسخہ بھیج دوں۔''

(خطوط شبلی ص ۴۳)

[۴] ''خیام کے نسخے مختلف ہیں۔ میرے پاس فوٹو والا ہے۔ یعنی جس میں ایک قلمی نسخہ سے فوٹو لیا گیا ہے۔ تمہارا نسخہ الگ ہوگا۔ اس لئے رباعیوں کی ترتیب مختلف ہوگی۔ بہرحال اصل رباعیوں کا پتہ لگا کر ترجمہ درست کرونگا اور پتہ نہ لگا تو تم کو لکھوں گا کہ اصل رباعیاں بھی لکھو۔ (خطوط شبلی ص ۳۹)

[۵] ''آج مطبع نول کشور سے اطلاع آئی کہ حافظ اور خیام وہاں بھی نہیں، اس لئے بہتر ہے کہ آپ وہیں مرزا محمد ملک الکتاب محلّہ عمر کھاڑی مکان نمبر ۱۲۹۰ سے منگوالیں۔ (خطوط شبلی ص ۴۳)

[۶] ''زیب النساء کا حال جن کتابوں میں ہے وہ بمبئی میں نہیں مل سکتیں میں لکھنؤ پہنچ کر بھیجوں گا۔ بہت تحقیق کے ساتھ۔

اردو میں جن لوگوں نے لکھا ہے خصوصاً پنجاب میں جو کتاب اس کے حال میں چھپی ہے وہ محض بازاری گپ ہے۔'' (خطوط شبلی ص ۷۲-۷۳)

[۷] ''ہمایوں نامہ تلاش کر رہا ہوں۔ زہرا صاحب کے لئے غالب کا اچھا ایڈیشن بہم پہنچایا ہے۔'' (خطوط شبلی ص ۷۳)

[۸] ''زیب النساء کے مضمون کے متعلق آپ نے بہت صحیح لکھا کہ بے مزہ ہے لیکن واقعیت اسی قدر بے مزہ ہوتی ہے۔

اشعب نے ایک دفعہ بہت جلدی سے نماز ادا کی۔ ایک شخص کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا ''اتنی جلدی نماز پڑھتے ہو'' اس نے کہا بے ریا کی نماز اتنی ہی مختصر ہوتی ہے۔

شعرالعجم کی پہلی جلد خشک اور بے مزہ ہے۔ اس لئے نہیں بھیجی دوسری جلد بھی عنقریب آتی ہے۔ وہ بھیج دوں گا۔'' (خطوط شبلی ص ۷۳-۷۴)

[۹] ''میرے مضامین عالمگیر اور الجزیہ کا ترجمہ گجراتی میں ایک شخص نے کیا۔ ایک جلد میرے پاس بھی بھیجی ہے، آپ پڑھ سکتی ہیں تو ایک نسخہ آپ کو بھی بجھوا

دوں۔''   (خطوط شبلی ص ۸۷-۷۹)

[۱۰]''شعرالعجم کا پہلا حصہ آپ کے کام کا نہیں، یعنی دلچسپ نہیں۔اس لئے دوسرا حصہ بھیجتا ہوں اس میں خواجہ حافظ کا حال دیکھئے گا، مشکل یہ ہے کہ لائٹ لٹریچر، علمی لٹریچر نہیں بن سکتا۔اس لئے جب علمی باتیں لکھی جاتی ہیں تو کتاب عام پسند نہیں رہتی۔   (خطوط شبلی ص ۲۸)

[۱۱]''الہ آباد سے ایک پرچہ ''ادیب'' نام بڑے آب وتاب سے نکلتا ہے۔وہ مشہور لوگوں کے حالات اور فوٹو بھی چھاپتا ہے اور چاہتا ہے کہ جناب [نازلی] بیگم صاحبہ جنجیرہ کے حالات اور فوٹو چھاپے۔اگر پسند کریں تو مختصر حالات مجھ کو لکھ کر بھیج دیں۔''   (خطوط شبلی ص ۷۵)

ذکر ندوہ

[۱]''ندوہ کے کاغذات انگریزی زہرا صاحبہ کو دے آیا تھا کہ تم کو دیدیں۔ندوہ کا مقصد اسلام کی حمایت اور علوم دینی کا بقا ہے لیکن نہ اس طرح کہ جو پرانے خیال کے مولوی چاہتے ہیں۔پس گویا ندوہ مذہبی تعلیم کی اصلاحی صورت ہے۔''اس مسئلہ پر مفصل گفتگو کرنا ہے تب اس کے مقصد کی اہمیت معلوم ہوگی۔شکر ہے کہ اب گورنمنٹ نے بھی اس طرف توجہ ظاہر کی ہے۔''
(خطوط شبلی ص ۲۸-۲۹)

[۲]''یہ راز کی بات ہے لیکن تم سے کہتا ہوں کہ والدہ صاحبہ نواب بہاول پور نے ندوۃ العلما کی عمارت کے لئے پچاس ہزار روپے عنایت کئے خود ان کا انجینئر آیا۔وہی نقشہ وغیرہ بھی تیار کرے گا اور اس کی نگرانی میں عمارت بنے گی۔انشاء چند روز کے بعد یہ خبر مشتہر ہوگی۔''   (خطوط شبلی ص ۳۰)

[۳]''ندوہ میں جدید اسٹاف انگریزی اور ادب کا قایم ہوا اور ۷/جون سے کھل جائے گا۔دو گریجویٹ ملازم رکھے گئے اور ایک ادیب عرب۔اب علما کا

گروہ بھی انگریزی داں بن کر نکلے گا اور یہی میری اصلی آرزو ہے۔

[۴] ''تم کہتی ہو کہ میں ''بہت بد ہمت ہوں'' میری زندگی کے دو حصے ہیں۔ پرائیویٹ اور پبلک، اگر پبلک کا کام میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میری ہمت کا اندازہ کرسکتیں۔تم کو کیا معلوم ہے کہ مجھ کو کیا مشکلات ہیں۔تم کو کیا معلوم ہے کہ میں اگر عوام کی مرضی کا کسی حد تک لحاظ نہ رکھوں تو ایک نہایت مفید تحریک فوراً برباد ہو جائے۔'' (خطوط شبلی ص ٦٦)

[۵] ''ندوہ کی جھنجھٹ اور شاعری، ساتھ چلنے کی چیزیں نہیں ہیں۔لیکن بہر حال چارہ بھی نہیں۔ندوہ فرض مذہبی ہے اور شاعری فرض طبعی، کس کو چھوڑوں۔پھر انہیں پر موقوف نہیں ''یک دل وصد ہزار سودا۔'' (خطوط شبلی ص ۱۰۴)

[٦] ''پراسپکٹس بھیجتا ہوں، جس سے حالات معلوم ہوں گے۔فارسی یہاں نہیں پڑھائی جاتی، اس لئے جو لڑکا پہلے سے فارسی نہ پڑھا ہو یہاں نہیں رہ سکتا۔یہ ممکن ہے کہ یہاں کوئی پرائیویٹ انتظام کر دیا جائے۔کھانا دو وقتہ گوشت ملتا ہے لیکن سر دست مکان کی سخت تکلیف ہے۔ذرا سا بورڈنگ ہے اور ۹۴ لڑکے رہتے ہیں۔جدید عمارت زیر تعمیر ہے۔'' (خطوط شبلی ص ۱۱۱)

عطیہ وزہرا کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل

[۱] ''جو خط ضائع ہو گیا، اس میں میں تم سے ایک پرائیویٹ بات پوچھنا چاہتا تھا یعنی یہ کہ تم نے اپنی زندگی کا ایم [مقصد] کیا قرار دیا ہے۔کیا ریفارمیشن یا اشاعت تعلیم یا تصنیف و مضمون نگاری۔ان میں سے پہلے مقصد کے سوائے جس کا میں اہل نہیں ہوں باقی تمہارے مقصد میں تم کو کافی مدد دے سکتا تھا۔اس کے متعلق اور تفصیل لکھنی تھی۔لیکن ابھی اس کی اس لئے ضرورت نہیں کہ ابھی یورپ جانا ہے۔'' (خطوط شبلی ص ۳۵)

[۲] ''تمہاری اسکیم کیا ہے۔کب سے کب تک وہاں رہو گی۔بمبئی میں کب تک

قیام رہے گا۔ پھر کہاں کہاں کا ارادہ ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یورپ نے آپ کوہم لوگوں کی سطح سے بہت بالاتر کر دیا ہے۔'' (خطوطِ شبلی ص۴۲)

[۳] ''عطیہ! تم کو معلوم ہوگا کہ فرانس میں سب سے پہلی اکاڈیمی ایک لیڈی نے قائم کی تھی۔تم کو بھی یہ موقع ہے۔خود علمی مذاق ہے اوراہل مذاق بمبئی میں جمع ہوسکتے ہیں۔'' (خطوطِ شبلی ص۴۷)

[۴] ''اگر آپ کو آپ کے لٹریری مذاق میں میں کچھ مدد دے سکتا ہوں تو مطلع فرمایئے یعنی دلچسپ اور پڑھنے کے قابل کوئی کتاب یا کتابوں کی فہرست یااور کوئی اطلاع یا کوئی قلمی نسخہ۔اس کے سوا آپ کااور جو مذاق ہوآ گہی دیجئے گا۔'' (خطوطِ شبلی ص۸۹)

فارسی زبان وادب

[۱] ''میں شعرالعجم میں حافظ سے فارغ ہوکر خسرو کے حالات اور ریویولکھ رہا ہوں پہلا حصہ مطبع میں جا چکا ہے۔ولایت سے آجاؤ اور موقع ہوتو تم کو فارسی کا پورا استاد بنادوں۔'' (خطوطِ شبلی ص۳۶)

[۲] ''بار بار جی چاہتا ہے کہ تم کو اس طرح فارسی پڑھادوں کہ فارسی شاعری اور فارسی زبان کا ایک ایک نکتہ ذہن میں آجائے۔تاج گنج کی صناعیوں سے ایک گنوار بھی لطف اٹھاتا ہے لیکن وہ بات حاصل نہیں ہوسکتی جو ایک انجینئر اور ماہر فن کو ہوتی ہے۔''بوئے گل'' بھی اگر تم سمجھ کر پڑھ لوتو فارسی لٹریچر کی ادائیں کسی قدر معلوم ہو جائیں لیکن یہ کیوں کر ممکن ہے میں عرش[جزیرہ] تک پہونچ نہیں سکتا،تم عرش سے اتر نہیں سکتیں۔'' (خطوطِ شبلی ص۴۰)

[۳] ''فارسی آموزی کا ذکر بار ہا ہو چکا لیکن محض آرزو اور تمنا سے کیا حاصل۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ کبھی کبھی کوئی بات لکھ دیا کروں سب جمع ہو جائیں گی تو ایک اچھا سلسلہ منضبط ہو جائے گا۔

سب سے پہلا مرحلہ زبان کا ہے یعنی زبان محاورہ اور روزمرہ سے مزہ لینا اور لطف اٹھانا۔ اول تو زبان اور محاورہ سے واقف ہونا چاہئے پھر یہ کافی نہیں ہے بلکہ اس سے طبیعت کو لطف اٹھانا شرط ہے۔ مثلاً خواجہ حافظ کا مصرعہ ہے:

واں شوخ دیدہ بیں کہ سر از خواب بر نہ کرد

اس مصرعہ کے لفظی معنی صرف اس قدر ہے کہ: اس شوخ دیدہ نے آنکھیں نہیں کھولیں یعنی بیدار نہیں ہوا۔ اب تم نے قرینہ سے اس کا مفہوم سمجھ لیا، یا قیاس کر لیا کہ ''سر از خواب بر کردن'' کے معنی نہ جاگنے کے ہیں تو اس سب سے کچھ فائدہ نہیں۔ معنی سمجھ لینا اور چیز ہے اور لطف اٹھانا اور چیز ہے۔ گانا سب سنتے ہیں اور معمولی طور سے سمجھتے بھی یعنی جو شخص گانا سن کر بے تاب ہو جاتا ہے اور تڑپ جاتا ہے اصل میں گانا اس کے لئے ہے۔ یہ بات زیادہ مشق اور زیادہ مصروفیت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ مثلاً خواجہ حافظ کے اشعار میں جہاں جہاں زبان اور محاورہ ہے، ان پر کوئی شخص نشان کر دے۔ ان کو تم پڑھو اور بار بار پڑھو [معنی سمجھ کر] رفتہ رفتہ ایک خاص لذت پیدا ہونی شروع ہو گی جس طرح کسی نشہ یا معجون سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اس وقت معلوم ہوگا کہ تمہارا ایک حاسہ بڑھ گیا ہے۔ مثلاً داغ کا شعر ہے:

بات کرنی تک نہ آتی تھی تمہیں

یہ ہمارے سامنے کی بات ہے

ممکن ہے کہ اس شعر اور محاورہ کو ہر شخص سمجھ لے لیکن جس شخص کو اردو زبان کا چسکا ہے اور ذوق ہے وہ اس محاورہ پر تڑپ جائے گا۔ اس بنا پر تم کو بھی پہلے اسٹڈی زبان فارسی کرنی چاہئے۔ اس کے بعد مضامین اور خیالات کا نمبر ہے۔

(خطوط شبلی ص ۵۱)

[۴] '' آج جی چاہتا ہے کہ ''بوئے گل'' کے بعض اشعار لکھوں اور تم کو اس کا مطلب سمجھاؤں تا کہ رفتہ رفتہ فاسی اشعار کے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔

ذوقِ نظر بہ لذت کاوش نہ می رسد

داغم ازیں کہ دل نہ تواں کرد دیدہ را

ذوقِ نظر، دیدار کا لطف، کاوش، محبوب کے دیکھنے سے جو دل کو بے تابی اور تڑپ ہوتی ہے۔ داغم، یعنی مجھ کو رنج ہے یا افسوس ہے۔ نمی رسد، یعنی برابر نہیں یا اس کو نہیں پہنچتا۔

اب یہ مطلب ہوا کہ دیدار میں بھی ایک لطف ہے اور دل کی بے تابی اور تڑپ میں بھی ایک لطف ہے۔ لیکن دیدار کا لطف دل کی تڑپ کے لطف کے برابر نہیں ہوسکتا۔ اس لئے مجھ کو افسوس ہے کہ آنکھوں کو دل نہیں بنایا جا سکتا۔ یعنی کاش اگر آنکھیں دل بن جاتیں تو دونوں لطف ساتھ حاصل ہوسکتے۔

چشمش بہ سوے ما نگہِ ناتمام کرد

ساقی بجام ریخت مئے نارسیدہ را

نارسیدہ شراب، جو خوب پختہ اور نشہ آور نہ ہو۔ اس کو نارسیدہ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی آنکھوں نے میری طرف دیکھا لیکن خوب آنکھ بھر کر نہیں دیکھا بلکہ یوں ہی سی اچٹتی نگاہ ڈال دی تو گویا ساقی نے جام میں شراب ڈالی لیکن شراب خام تھی خوب تیار نہیں ہونے پائی تھی۔

با ما بہ ہر معاملۂ بدگماں نہ بود

خوش بود آں کہ راز محبت عیاں نہ بود

صاف ہے

از لذتِ ادائے ستم می تواں شناخت

کیں جور از تو بودہ واز آسماں نہ بود

آسماں بھی ظلم کرتا ہے اور محبوب بھی کرتے ہیں لیکن فرق یہ ہوتا ہے کہ آسمان کے ظلم میں لطف نہیں ہوتا اور محبوب کے ظلم میں لذت اور مزا ہوتا ہے۔ اس بنا پر شاعر کہتا ہے کہ جب ہم پر ظلم ہوتا ہے اور یہ نہیں معلوم کہ کس نے ظلم کیا

تو ہم یوں پہچان لیتے ہیں کہ اگر ظلم میں لذت ملی تو محبوب کا ظلم ہے۔

صد حرف راز بود نہاں در نگاہ من

شادم کہ کار ہا صنمے نکتہ دان نہ بود

میں خوش ہوں، کار یعنی معاملہ، صنم یعنی محوب، نکتہ داں جو بات کی تہ کو پہنچ جاے، مطلب یہ ہے کہ میری نگاہ میں سیکڑوں راز چھپے ہوئے ہیں یعنی محبت، شوق، حسرت آرزو، شکایت، گلہ وغیرہ لیکن غنیمت یہ ہوا کہ محبوب نکتہ داں نہ تھا ورنہ میری نگاہ ہی سے سمجھ جاتا کہ اس کے دل میں کیا کیا خیالات ہیں۔''

(خطوط شبلی ص ۵۶-۵۹)

موسیقی

[۱]''گانے کے ذکر پر ایک بات یاد آئی جو مدتوں سے دل میں تھی لیکن کہنے کو جرأت نہ تھی۔ میں نے تم سے ایک دفعہ خواجہ حافظ کے شعر سنے۔ تم کو خدا نے خوش آواز عطا کی ہے اور نہایت مؤثر آواز ہے۔ لیکن افسوس ہوا! تم کو ہندوستانی موسیقی سے واقفیت نہیں اس لئے تم بالکل بے سرا گا رہی تھیں۔ موسیقی کی معمولی معلومات ضرور ہیں ورنہ بے لطفی پیدا ہوتی ہے۔ بارہا تم سے گانا سننے کو جی چاہا لیکن رک گیا کہ تمہاری کٹکری اور تانیں بے قاعدہ تھیں۔ بمبئی میں اس فن کو لوگ مطلق نہیں جانتے یہاں تک کہ جن کا یہ پیشہ ہے وہ بھی محض جاہل ہیں۔''

(خطوط شبلی ص ۴۸)

[۲]''گانا میں خود نہیں جانتا لیکن سمجھ سکتا ہوں یعنی جو گانا خلاف فن موسیقی ہوگا میں بتا سکوں گا کہ خلاف قاعدہ ہے۔ گرام فون میں پیارے صاحب کے جو گانے بند ہیں ان کو۔ پلیٹ پر گانوں کے نام بھی ہوتے ہیں مثلاً دادرا، جنجوڑی وغیرہ ان سے اندازہ ہو سکے گا کہ گانے میں کس قسم کے سر اور تان اور کٹکری ہیں یوں بے قاعدہ گانے میں کتنی ہی عمدہ آواز ہو بے کار ہو جاتی ہے البتہ میں رواں طور پر مثنوی یا اور

اشعار کے پڑھنے کا طرز بتا سکوں گا جو عام صحبتوں کے قابل ہے۔''

(خطوط شبلی ص۵۲)

[۳]''اگر بالفرض تم کبھی لکھنؤ آؤ تو موسیقی کو ایسے لوگوں سے سیکھ سکتی ہو جن سے سیکھنا شرم میں داخل نہ ہو۔ بے شک پیارے صاحب وغیرہ سے سیکھنا شرم کی بات ہے۔'' (خطوط شبلی ص۵۴)

[۴]''تم نے اچھا کیا کہ ایک عمل کام ہاتھ میں لیا۔ خالی خیالات سے کچھ فائدہ نہیں۔'' (خطوط شبلی ص۵۴)

[۵]''ہندوستانی موسیقی پر فارسی میں بہت عمدہ کتابیں ہیں لیکن وہ چھپی نہیں ہیں۔ میرے پاس قلمی نسخے ہیں لیکن اب وہ ندوہ میں وقف کر دیے گئے۔ اردو زبان میں جو عمدہ کتاب یہاں مل سکتی ہیں منگوا کر بھیج دیتا ہوں۔''

(خطوط شبلی ص۸۰)

[۶]''موسیقی پر ایک مختصر سی تصنیف بازار سے منگوا کر بھیجتا ہوں۔ مفصل ایک کتاب ہے، جس کا نام ''قانون موسیقی'' ہے اس میں تمام باتیں نہایت تفصیل سے ہے۔ نول کشور کے ہاں چھپی ہے۔'' (خطوط شبلی ص۸۱)

مصوری

[۱]''مسٹر ہاول پرنسپل آف آرٹس اسکول کلکتہ کی کتاب متعلق صنعت ہائے ہندوستان، آپ نے دیکھی ہوگی۔ اس کو جہانگیر کا مجموعہ تصاویر ہاتھ آ گیا ہے۔ اس سے اس نے دو پرندوں کی تصویریں نقل کی ہیں جو اس کے دربار کے مصور منصور نقاش نے بنائی تھیں۔ یہ تصویریں نہایت حیرت انگیز ہیں اور خود مصنف نے ان کی بہت داد دی ہے۔ اس کتاب میں اور تصویریں بھی ہیں اور ان سے مختلف ہیں جو آج کل جہانگیر وغیرہ کے نام سے بکتی پھرتی ہیں۔ یہاں دلی کا ایک مصور ہے۔ فوٹو گرافر ہے اور دستی تصویر بھی کھینچتا ہے۔ اس کے پاس پرانے

مصوروں کے چربے اور خاکے موجود ہیں۔'' (خطوط شبلی ص ۶۳)

[۳] ''قطعاً وہ تصویر ہندو کے ہاتھ کی تھی۔ تیموریوں کے زمانہ میں کس کی مجال تھی کہ ایسی تصویر بناتا۔ موسیقی کی کتاب بھجوادوں گا۔'' (خطوط شبلی ص ۷۹)

[۴] ''تصویروں میں بیماری کی تصویر فرضی ہے، اس قسم کی تصویر ہاتھ سے بنا کر لوگوں نے فوٹو کر کے شائع کرنا شروع کیا ہے۔ یہ تصویر شاہجہاں کی قرار دی ہے۔ عورت کی تصویر کسی چینی مصور کی ہے۔ چینی مصوروں کی تصویریں شاہنامہ وغیرہ میں میں بہت دیکھی ہیں۔ مسلمان بھی اس کی تقلید کرتے تھے۔ بہر حال یہ کسی چینی شخص کی یا چینی مصور کی نقل ہے۔ اس پر جو شعر لکھے ہیں ان میں سے چند شعر زلالی کے ہیں جو اکبر و جہانگیر کے زمانہ کا شاعر ہے۔ زیب النساء کی کوئی صحیح تصویر میں نے نہیں دیکھی۔'' (خطوط شبلی ص ۸۰)

[۵] ''ہندو متعصب مصوروں نے اب یہ کارروائی شروع کی ہے کہ سلاطین تیموریہ کی ذلیل یا نفرت آگین تصویریں ہاتھ سے کھینچتے ہیں پھر ان کا فوٹو لیتے ہیں۔ مثلاً وہ تصویر کہ داراشکوہ کا سر کٹا ہوا اورنگ زیب کے سامنے لایا گیا ہے۔ اسی طرح کی یہ تصویر ہے جو آپ نے بھیجی۔ یہ شاہجہاں کی تصویر بیان کی جاتی ہیں کہ وہ بیکسی کے عالم میں بستر مرگ پر پڑا ہے۔ جس کو آپ مصور کا نام سمجھتی ہیں وہ شاہ جہاں کا لفظ ہے، غور سے دیکھیں تو سمجھ میں آتا ہے۔''

(خطوط شبلی ص ۸۱)

خطابت

[۱] ''میری اسکیم یا تجویز جو آپ کے متعلق ہے وہ یورپ سے آنے کے بعد قابل اظہار ہوگی۔ یعنی میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لکچرار بن جائیں جو انگریز اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں۔ لیکن اردو میں، تاکہ ہم لوگ بھی سمجھ سکیں۔ آپ میں ہر قسم کی قابلیت موجود ہے، صرف مشق کی

ضرورت ہے۔ہم پرانے لوگ آزادی سے بے پردہ مجامع عام میں عورتوں کا تقریر کرنا پسند نہیں کرتے لیکن آپ تو اس میدان میں آ چکیں، اس لئے اب جو کچھ ہو کمال کے درجہ پر ہو۔'' (خطوط شبلی ص ۳۰-۳۱)

[۲]''اردو تقریر میں اصل مضمون کی خوبی سے زیادہ طرز ادا کی خوبی کا لحاظ ہونا چاہئے۔بمبئی کے جلسہ میں مسز نائیڈو اگرچہ نہایت عمدہ بولیں، ڈلیوری بھی اچھی تھی، لیکن تصویر کی طرح غیر متحرک رہیں۔تقریر میں تمام اعضا کو زبان کا ساتھ دینا چاہئے۔'' (خطوط شبلی ص ۳۶)

دیگر موضوعات

[۱]''آج کل یہاں مسلم لیگ کا اجلاس تھا۔تمام ہندوستان کے لال بجھکڑ جمع تھے۔ان کی تجویزوں اور خیالات پر ہنسی آتی ہے۔'' (خطوط شبلی ص ۴۹)

[۲]''اب تمہارے خطوط ایسے ہوتے ہیں کہ احباب کو مزے لے لے کر سناتا ہوں اور لوگ سر دھنتے ہیں۔ پالی ٹیکس کے متعلق تمہارے پچھلے خط کے اقتباسات (کوٹیشن) میں نے حیدر آباد اور الہ آباد بھیجے۔''

(خطوط شبلی ص ۵۲)

[۳]''جو سخت حادثہ پیش آیا اس کے متعلق کیا کوئی لکھ سکتا اور کیا کہہ سکتا ہے۔ آپ لوگوں کی دین و دنیا سب ان ہی سے وابستہ تھی۔صبر کی تلقین کرنا آسان ہے لیکن کیا کوئی تلقین کرنے والا خود بھی ایسے موقع پر صبر کر سکتا ہے۔آپ تو پھر تجربہ کار اور روزگار دیدہ ہیں۔عزیزی عطیہ کی حالت پر اور بھی زیادہ رنج ہوتا ہے۔'' (خطوط شبلی ص ۹۹)

[۴]''مدرسۃ البنات کے حالات پڑھ کر خوش ہوئی لیکن عطیہ سے کہئے کہ ڈرل کی ضرورت نہیں۔ کچھ تو مردوں کے لئے رہنے دیں۔ یہ مردوں کی وحشیانہ خصوصیت ہے۔اس میں مساوات کی کیوں خواہش ہے۔'' [خطوط شبلی ص ۱۰۷]

[۵] ''مسئلہ وقف علی الاولاد اب بہت کچھ کامیابی کی حد تک آ گیا ہے۔ وہاں بھی کوشش کرنی ہے۔'' (خطوطِ شبلی ص۱۱۴، بنام زہرا بیگم)

خطوطِ شبلی کا مقدمہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے قلم سے ہے اور یہی وہ مقدمہ ہے جس سے شبلی شکنی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ بابائے اردو کو ان خطوط میں خلوص اور محبت کی بو محسوس ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مقدمہ میں ان خطوط کے بے سیاق وسباق ایسے اقتباسات نقل کئے جس سے شبلی کے پاک دامن کو داغدار کیا جا سکے۔ انہوں نے صاف لفظوں میں علامہ شبلی کو اکل کھرا اور تنک مزاج لکھا۔ (۳۷) یہی نہیں بلکہ ان کی کتابوں کے بارے میں اسی مقدمہ میں لکھا ہے کہ انہیں ''ابھی سے لونی لگنی شروع ہوگئی ہے۔ زمانے کے ہاتھوں کوئی نہیں بچ سکتا۔ وہ بہت سخت مزاج ہے مگر آخری انصاف اسی کے ہاتھ ہے۔ ان کی بعض کتابیں لوگ ابھی سے بھولتے جاتے ہیں اور کچھ مدت کے بعد صرف کتاب خانوں میں نظر آئیں گی۔'' (۳۸)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بابائے اردو نے کس قدر غیر سنجیدہ اور بے تکی بات لکھی تھی۔ یہ اصلاً شبلی شکنی کی امین زبیری اور مولوی عبدالحق کی ایک منصوبہ بند کوشش تھی۔ وہ خطوطِ شبلی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''خانگی خطوں میں اور خاص کر ان خطوں میں جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے جو دوسری تصانیف میں نہیں ہوتی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے۔ تکلف کا پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے اور مصلحت کی دراندازی کا کھٹکا نہیں رہتا گویا انسان اپنے سے خود باتیں کر رہا ہے جہاں اندیشہ لائم نہیں ہے۔ یہ دلی خیالات اور جذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے۔'' (مقدمہ خطوطِ شبلی ص۵-۶)

لیکن جب خود ان کے نجی خطوط کی اشاعت کا موقع آیا تو ان کی رائے بدل گئی اور لکھا کہ:

> ''نجی خط سب شائع کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ کاتب بے تکلفی میں کچھ کا کچھ لکھ جاتا ہے۔ وہ صرف مکتوب الیہ کے لئے ہوتا ہے، منظر عام پر لانے کے لئے نہیں ہوتا۔ لیکن اسے کوئی نہیں دیکھتا۔'' (مکتوبات عبدالحق ص۳۰۶-۳۰۷)

مولوی عبدالحق کا یہ خط اگرچہ ''خطوط شبلی'' کی اشاعت دوم [۱۹۳۵ء) کے ۱۳/سال بعد (۷/نومبر ۱۹۴۸ء) کا ہے، تاہم اس سے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے خطوط شبلی کے مقدمہ میں قصداً شبلی کی شخصیت کو مجروح کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہی نہیں انہوں نے کتاب کی ترتیب میں بھی دیانت داری نہیں برتی۔ زہرا فیضی کے خطوط سے پہلے عطیہ کے نام کے خطوط شامل کتاب کئے۔ حالانکہ تعلق کا آغاز انہیں سے ہوا اور عمر میں بھی وہ بڑی تھیں۔ اسی طرح بعض خطوط کی ترتیب اپنے مقصد کے حصول کے لئے تبدیل کردی اور انہیں کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ [ادیب شبلی نمبر ص ۲۷۹] عطیہ کی دوسری بہن نازلی بیگم کے نام کے خطوط حاصل کئے اور نہ شامل، حالانکہ وہ اب تک جنجیرہ میں محفوظ ہیں۔

اس مقدمہ میں مقدمہ نگاری کے لحاظ سے بھی متعدد کمیاں ہیں حالانکہ بابائے اردو، اردو کے ممتاز ترین مقدمہ نگار تھے۔ (۳۹) اور ملک میں ان کے مقدموں کی دھوم تھی۔ باوجود اس کے انہوں نے اس طویل مقدمہ میں خطوط کے موضوع اور ان کے سطور اور بین السطور میں محض خلوص ومحبت کی نشاندہی کی۔ خطوط کی دریافت، املا اور طرز تحریر پر کسی قسم کی اطلاع فراہم نہیں کی۔ مقدمہ میں خطوط کے اقتباسات نقل کرنے میں بھی ترتیب زمانی کا لحاظ نہیں رکھا اور جو افسانہ سنایا اس کے دلائل میں تقدیم وتاخیر کا بھی خیال نہیں کیا۔ درمیان سے اقتباسات نقل کرکے کچھ کا کچھ مفہوم نکالا۔ دوسرے لفظوں میں ایمانداری اور دیانت سے کام نہیں لیا اور اگر وہ ایسا کرتے تو یقیناً وہ فرضی داستان نہ سنا پاتے جو انہوں نے سنائی۔ بہرحال اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ شبلی کو عطیہ اور ان کی بہنوں سے تعلق خاطر نہ تھا، بے شبہ تھا۔ مگر تعلقات کی نوعیت اور اس کا مفہوم ومقصود مولوی عبدالحق اور ان کے ہم نواؤں نے بالقصد غلط بیان کیا۔

فیضی خاندان سے علامہ شبلی کا تعلق سفر قسطنطنیہ کے زمانہ میں قائم ہوا۔ عطیہ فیضی کے والد حسن علی آفندی سے ان کی ترکی میں ملاقات ہوئی اور انہوں نے اس اجنبی شہر میں شبلی کا بڑی خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ علامہ شبلی نے سفرنامہ میں ان کا اور ان کی خاطر مدارات کا ذکر کیا ہے۔

[سفرنامہ روم ومصر وشام ص ۱۰۸ طبع جدید ۲۰۱۰ء]

حسن علی آفندی علامہ شبلی کے علم وفضل سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کا ذکر انہوں نے

اپنے ذاتی خطوط میں کیا جیسا کہ عطیہ فیضی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے۔

یہ خانوادہ محض تاجر نہیں تھا بلکہ ذی علم اور ہوش مند گھرانہ تھا۔ بدرالدین جی طیب اسی خانوادے کے ایک فرد تھے۔ حسن آفندی کی اہلیہ اور عطیہ فیضی کی والدہ امیر النساء (۱۸۴۹ - ۱۹۰۹ء) ادیبہ، ناول نگار اور شاعرہ تھیں۔ امیر تخلص کرتی تھیں۔ ایک ناول ''نادر بیان'' اور دعائیہ نظموں کا مجموعہ ''آمین'' ان کی یادگار ہے۔ اسی طرح زہرا بیگم بھی بڑی ذی علم تھیں۔ ان کے مضامین تہذیب نسواں، خاتون اور عصمت دہلی میں شائع ہوتے تھے۔ ایک ڈرامہ مآل خاتون لکھا۔ پہلی لیڈیز کانفرنس علی گڑھ کی صدارت انہی نے کی تھی۔ نازلی بیگم کا سفر نامہ ''سیر یورپ'' ان کی علمیت کے اظہار کے لئے کافی ہے۔ اسی خاندان کی جدید تعلیم یافتہ اور ممتاز خاتون عطیہ فیضی تھیں جو ترکی میں پیدا ہوئیں، اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ترکی، انگریزی، فارسی سے اچھی طرح واقف تھیں، تعلیم کے لئے انگلینڈ گئیں، جہاں اقبال کا ان کا ساتھ رہا۔ ایسے ذی علم، ہوش مند گھرانہ سے کون ہوگا جو ربط و تعلق کو اہمیت نہ دے اور شبلی تو عظمتوں کے قدرداں تھے جہاں جہاں نظر آئی وہیں وہیں رک گئے۔

علامہ شبلی نے جو خطوط لکھے ان میں بنیادی مقصد بہرحال عطیہ کی شخصیت کی تعمیر ہی تھا جیسا کہ اوپر درج اقتباسات سے صاف ظاہر ہے۔ عطیہ فیضی نے جو علمی کام کئے اس میں شبلی کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ ڈاکٹر محمد یامین عثمان نے اس کا بڑا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''علامہ (شبلی) نے عطیہ بیگم کی شخصیت کے علمی پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی بھرپور کوششیں کیں۔ انہوں نے اپنے تعلقات کے تمام عرصے میں عطیہ بیگم کی کسی نہ کسی طرح علمی رہنمائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس طرح علامہ شبلی جیسی نادر روزگار ہستی کے والہانہ التفات اور توجہ نے عطیہ بیگم کی فکر کو بھی جلا بخشی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے مکاتیب میں علامہ نے عطیہ بیگم سے جن منصوبوں کا ذکر کیا، وہ کم و بیش تمام کے تمام عطیہ بیگم کی جانب سے عملی صورت میں ہمارے سامنے آئے۔ شبلی نے عطیہ بیگم کو تعلیمِ نسواں کے لیے کام کرنے کی راہ دکھائی اور اپنے بعض مکاتیب میں نسائی تعلیم کے نصاب کے حوالے سے بھی ان سے

مباحث کیے اور ہم دیکھتے ہیں کہ آگے چل کر عطیہ بیگم نے اپنی والدہ کی یاد میں ایک ''مدرسہ یادگار امیرا'' قائم کیا جہاں بچیوں کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور جسے دیکھ کر علامہ راشدالخیری نے بھی اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ اسی طرح شبلی نے خواہش ظاہر کی تھی کہ عطیہ بیگم ان پارسی خواتین کی طرح اسپیکر یا لکچرار بن جائیں جو ممتاز ہو چکی ہیں۔ یہ خواب شبلی کے اس دنیا سے رخصت ہونے سے قبل ہی پورا ہوا جب ۱۹۱۴ء میں پیرس کی سوربون یونیورسٹی میں عطیہ بیگم نے موسیقی ہند پر ایک لکچر دے کر جامعہ سوربون جیسی درس گاہ میں لیکچر دینے والی پہلی مسلم خاتون کا اعزاز حاصل کیا اور اس کے بعد تو انہوں نے موسیقی پر درجنوں لکچر دیے۔ (تین کتابیں: 1-Indian Music 2-The Music of India 3-Sangit of India لکھیں۔) یقیناً ان کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں علامہ شبلی کی ترغیبات و تربیت محفوظ رہی ہوں گی جنہوں نے باقاعدہ مثالیں دے کر ایک مرتبہ انہیں تقریر کے فن کی باریکیوں سے آگاہ کیا تھا۔ پھر اہل علم سے ملاقاتوں کے دوران علامہ شبلی سے قریبی روابط کا حوالہ بھی یقیناً عطیہ بیگم کے لیے ایک اعزاز ہی رہا ہوگا۔

[مباحث، لاہور جنوری تا جون ۲۰۱۲ء ۳۲۱]

یہیں نہیں علامہ شبلی نے انہیں ایک رسالہ جاری کرنے کا مشورہ دیا تھا جس پر زہرا بیگم نے عطیہ سے کہا تھا ''خدا جانے اپنے زعم میں ہم کو کیا سمجھتے ہیں''۔ چنانچہ عطیہ فیضی نے ایک پندرہ روزہ رسالہ معین نسواں جاری کیا۔ غرض عطیہ کی شخصیت کی تعمیر کا جو خواب شبلی نے دیکھا تھا وہ کسی قدر پورا ضرور ہوا۔

یہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ مولوی عبدالحق کو خانوادہ عطیہ کی علمی حیثیت اور خواتین کے سلسلے میں ان کی مساعی کا کوئی کام اور ان کی کوششوں کا کوئی پہلو نظر نہیں آیا۔ دراصل انہوں نے بالقصد خطوط شبلی اور شبلی شناسی کو غلط راہ پر ڈالا۔ ڈاکٹر ابن فرید لکھتے ہیں:

''بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ''خطوط شبلی'' کے مقدمے میں چیدہ چیدہ

اقتباسات کے ذریعے ذہن کو ایسی راہ پر لگایا کہ شبلی کی ''پبلک لائف'' اور ''پرائیویٹ لائف'' کے سلسلے میں متجسسانہ کوششیں شروع ہو گئیں۔ یہ شکوک و شبہات زیادہ خطرناک شکل نہ اختیار کرتے اگر جدید تنقید کے بعض اصولوں کو کور ذوقی کے ساتھ منطبق کرنے کی کوشش نہ کی جاتی اور شبلی کی زندگی کے تاریک گوشوں کو نمایاں کر کے پیش کرنے اور نفسیات کے بعض اصولوں کا بے اصولی کے ساتھ استحصال (Exploitation) کرنے کی سعی نہ کی جاتی۔''

[ادیب علی گڑھ، شبلی نمبر ص ۲۶۸]

اس قصہ کا آغاز منشی محمد امین زبیری مہتمم صیغہ تاریخ بھوپال نے کیا انہی نے بابائے اردو سے پہلے مقدمہ لکھوایا پھر خود ان کی رنگین زندگی (بھوپال ۱۹۴۶ء) کا فرضی مرقع تیار کیا۔(۴۰) ان دونوں تحریروں اور خطوط شبلی کی روشنی میں ڈاکٹر وحید قریشی نے شبلی کی حیات معاشقہ (طبع اول ۱۹۵۰ء-لاہور) سپرد قلم کی جس میں نفسیاتی مطالعے کے نام پر شبلی کی کردار کشی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی اور ایسا افسانہ گھڑا کہ جس کی علمی دنیا میں دوسری مثال ملنی مشکل ہے۔اس کے بعد شیخ محمد اکرام نے شبلی نامہ میں ''وادی گل'' لکھ کر اس کو حقیقت کا جامہ پہنانے کی کوشش کی۔حتیٰ کہ انہوں نے دستۂ گل کی غزلوں کے معنی و مفہوم بھی عطیہ سے منسوب کر دئے حالانکہ شبلی کی عطیہ سے ملاقات اور خط و کتابت ہی دستۂ گل کی اشاعت کے بعد ہوئی تھی۔خود عطیہ لکھتی ہیں:

''۱۹۰۹ء[صحیح ۱۹۰۸ء] کا ذکر ہے کہ جب مولانا اپنے پیر کے علاج کے لیے بمبئی تشریف لائے۔ بھائی قلعے میں ٹھہرے تھے۔ہمشیرہ کے نام ایک خط لکھا اور اس میں ظاہر کیا کہ میں آپ دونوں بہنوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ہم مولانا کے ہاں بڑے شوق سے گئے، کیونکہ والد نے اپنے خطوں میں ان کی قابلیت کا بہت کچھ ذکر کیا تھا۔اور ہمیں بھی ان سے ملنے کا بہت شوق تھا۔مولانا پردے کے پابند تھے اور پرانی وضع قطع کے بزرگ تھے۔ ہمارے لئے برآمدے میں دو چوکیاں رکھوادی تھیں اور آپ دروازے کے آڑ میں بیٹھے۔ میں نے کہا مولانا معاف فرمائیے۔منہ تو گنہ گار چھپاتے ہیں۔خدانخواستہ گنہ گار نہ تو آپ ہیں نہ

ہم، اگر آپ باہر تشریف نہیں لاسکتے تو خدا حافظ۔ یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔
تھوڑی سی دیر کے بعد مولانا آہستہ آہستہ باہر آئے۔ ان کے پیر میں بندوق کی
گولی کی چوٹ لگی تھی اور بہت سنبھل کر رک رک کر چلتے تھے۔
(بحوالہ شبلی معاصرین کی نظر میں ص ۱۷۷-۱۷۸)

اس قدر واضح ہونے کے باوجود شیخ محمد اکرام نے تصورات کی طویل داستان گھڑ دی۔
ڈاکٹر ابن فرید نے صحیح لکھا ہے کہ وہ محقق نہیں تھے۔ (ادیب شبلی نمبر ص ۲۹۱)

ان تحریروں کا اثر یہ ہوا کہ مخالفت اور موافقت میں متعدد مضامین سپرد قلم کئے گئے اور شبلی کے جرم محبت کو آشکارا کرنے کا ایک لایعنی سلسلہ قائم ہو گیا۔ حتیٰ کہ خود عطیہ کو بھی منشی امین زبیری نے بدگمان کیا۔ ضیاء الدین احمد برنی نے لکھا ہے کہ:

''وہ بہت دنوں سے شبلی پر ایک سطر لکھنے کی روادار نہیں ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے
کہ امین زبیری مرحوم نے شبلی کے چند خطوط انہیں دکھائے تھے جن میں ان پر
کچھ چھینٹے سے پھینکے گئے تھے۔ وہ خطوط میری نظر سے نہیں گذرے اور اس
لئے میں ان کی نسبت کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس دن سے وہ شبلی سے ناراض ہیں۔''
(ادیب شبلی نمبر ص ۲۸۴)

اور وہ بدگمان ہو بھی گئیں اور اس بدگمانی کا انہوں نے برملا اظہار بھی کیا۔ (۴۱) حد تو یہ ہے کہ یہ خطوط انہیں کے نام تھے اور ان کا مفہوم امین زبیری نے ان پر واضح کیا۔ بہر حال پانی حد سے گذر جانے کے بعد مایہ ناز محقق ڈاکٹر ابن فرید (پ: ۲۸/اکتوبر ۱۹۲۵ء - ۹/مئی ۲۰۰۳ء) نے ان سب تحریروں کا مطالعہ و تجزیہ ''شبلی چوں بہ خلوت می رود'' کے عنوان سے ادیب علی گڑھ کے شبلی نمبر میں پیش کیا۔ اس محققانہ مقالہ میں معترضین کے ایک ایک اعتراض کا اس قدر مدلل جواب لکھا کہ ان کی سازش کی قلعی کھل گئی اور واضح ہو گیا کہ یہ محض دشنام طرازی تھی۔

اس موضوع پر ایک اور کتاب شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں (طبع اول دہلی: ۱۹۸۶ء) سید شہاب الدین دسنوی نے لکھی ہے۔ ان کے علاوہ عبداللطیف اعظمی نے ''شبلی کے منتقد اور معتقد'' لکھ کر شبلی پر عائد الزامات کے جھالے کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ (۴۲) لیکن حقیقت یہ

ہے کہ ڈاکٹر ابن فرید کا مقالہ اپنے موضوع پر حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے۔انہوں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ مولوی عبدالحق، امین زبیری، ڈاکٹر وحید قریشی اور شیخ اکرام خطوط شبلی کا پس منظر سمجھنے سے قاصر رہے۔اس کی انہوں نے متعدد مثالیں بھی دی ہیں۔ان کے خیالات کی خطوط شبلی ہی کے دوسرے اقتباسات سے تردید بھی کی ہے۔طرز تخاطب اور انداز گفتگو جس پر مذکورہ اہل قلم نے بڑی حاشیہ آرائی کی ہے، اس کا صحیح مفہوم واضح کیا۔ان کا خیال ہے کہ علامہ شبلی دراصل عطیہ کے ذریعہ خواتین میں ایک انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عطیہ سے دلچسپی لی۔اس دلچسپی کی اصل محرک بھی عطیہ ہی تھیں اور وہ شبلی سے تعلق پیدا کر کے تاریخ میں ہمیشہ کے لئے اپنی جگہ بنانا چاہتی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس دور میں شبلی کے علاوہ علامہ اقبال اور سر عبدالقادر سے بھی ربط پیدا کیا۔علامہ اقبال کے خطوط، شبلی سے بھی زیادہ رنگین ہیں۔ادب وانشاء کے لحاظ سے نہیں بلکہ ''شیریں گفتاری'' کے لحاظ سے۔آخر اقبال کی حیات معاشقہ کیوں نہیں لکھی گئی۔؟ یہ سوال اپنی جگہ، حقیقت یہ ہے کہ شبلی کے کسی خط سے واضح نہیں ہوتا کہ ان کا دامن داغدار تھا۔اس کے برعکس ایک اعلیٰ مقصد کا حصول واضح ہوتا ہے۔جیسا کہ ان کے خطوط کے اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے غرض ڈاکٹر ابن فرید نے تحقیق و تنقید کا حق ادا کر دیا۔(۴۳) اس کا یہ اثر ہوا کہ شیخ اکرام نے شبلی نامہ کو یادگار شبلی بنا دیا۔اعتراضات کے متعدد پہلو اپنی کتاب سے نکال دئے اور ان نئے مباحث کا اضافہ کیا جن سے شبلی کی عظمت کا اظہار ہو سکے مگر چونکہ یا گار شبلی کی بنیاد شبلی نامہ پر تھی اس لئے باوجود کوشش کے زہر ہلاہل قند نہ بن سکا۔ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی ڈاکٹر ابن فرید کے مقالے کے بعد ایک خط لکھ کر اپنی نارسائیوں کا اعتراف کیا۔(۴۴) اور پھر اپنی کتاب شبلی کی حیات معاشقہ کو اپنی تصنیفات کے زمرہ ہی سے خارج کر دیا۔اور جہاں تک ممکن تھا اپنی ہی کتاب کو لاہور اور اس کے قریب کے کتب خانوں سے غائب کرا دیا۔(۴۵) ۲۰۰۹ء میں ٹی اینڈ ٹی پبلشر لاہور نے بلا اجازت اس کتاب کو دوبارہ شائع کیا تو انہوں نے برہمی کا اظہار کیا۔[روشنائی کراچی نمبر ۳۳، اپریل-جون ۲۰۰۸ء ص ۱۷۵] ۱۷/اکتوبر ۲۰۰۹ء کو انہوں نے لاہور میں وفات پائی۔اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔

ماہنامہ ادیب علی گڑھ شبلی نمبر کی اشاعت (۱۹۶۰ء) کے وقت بابائے مولوی عبدالحق بھی پشیمان تھے۔ انہوں نے عبداللطیف اعظمی کے نام ایک خط میں لکھا کہ ''رہی یہ بات کہ میں مولانا شبلی کا مخالف ہوں تو یہ بالکل غلط ہے۔ مولانا کے علم وفضل کا تہ دل سے قائل ہوں اور انہیں اردو زبان کے بڑے ادیبوں اور محسنوں میں شمار کرتا ہوں۔'' (۴۶) البتہ منشی امین زبیری سجدہ سہو کے لئے زندہ نہیں رہے۔ بہر حال شبلی شکنی مہم کے جتنے پہلوان تھے یکے بعد دیگر سب میدان تحقیق میں ڈھیر ہو گئے۔ لیکن وہ اوران کے ہم نوا ان نقصانات کا ازالہ نہ کر سکے جو ان کی اس ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے قوم کو اٹھانا پڑا۔

علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمہ کی وفات پہلی جنگ عظیم کے آغاز (۱۹۱۴ء) میں ہوئی۔ اس وقت ہندوستان میں جدو جہد آزادی کے لئے جن اصول ونظریات کی قوت درکار تھی، وہ شبلی کے نقطہ نظر میں تھی، یعنی اتحاد واتفاق، جذباتی ہم آہنگی اور وطن دوستی کے افکار و خیالات۔ (۴۷) آزادی اور تقسیم وطن کے بعد ان نظریاتی قوتوں کی ضرورت اور بڑھ گئی تھی، ایسے حالات میں جبکہ شبلی کے نظریات قومی سطح پر ہمارا طاقت ور اسلحہ ثابت ہوتے، شبلی ناشناسوں کی وجہ سے قوم ان سے خاطر خواہ استفادہ نہ کر سکی۔

شبلی کے سیاسی نقطہ نظر کی ترجمانی امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے حصے میں آئی۔ اس زاویے سے دیکھا جائے اور مولانا آزاد کی قومی، ملی اور سیاسی خدمات پیش نظر ہوں تو شبلی شکنی کے نقصانات بے حد افسوس ناک ہو جاتے ہیں۔

یہ نقصانات اپنی جگہ مگر خطوط شبلی کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور یہ اعتراف بھی حقیقت کا اعتراف ہے کہ اگر عطیہ وزہرا کے نام کے یہ خطوط شائع نہ ہوتے تو ہمارا ادبی ذخیرہ ان لازوال ادب پاروں سے محروم رہ جاتا۔ اردو کے مکتوباتی ادب کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی کوئی بھی شخص ان خطوط سے صرف نظر نہ کر سکے گا اور محمد امین زبیری کی اس کوشش کو بھی کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بدولت ادب عالیہ کے یہ نمونے شائع ہوئے۔ ورنہ شبلی کے شاگرد خاص مولانا سید سلیمان ندوی کی احتیاط انہیں کبھی جلوہ گر نہ ہونے دیتی اور ان کی یہ احتیاط بھی کچھ بے معنی نہیں تھی۔

مکاتیب شبلی اور خطوط شبلی کے علاوہ شبلی کے خطوط کا ایک اور مجموعہ ''خطوط شبلی بنام آزاد'' جناب محمد حسنین نے اصل متن کے ساتھ ۱۹۸۸ء میں اردو اکیڈمی پٹنہ سے شایع کیا۔ چونکہ اس کے بیشتر خطوط مکاتیب شبلی میں شامل ہیں، اس لئے اس کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔ اسی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام کے خطوط بھی علاحدہ ''خطوط مشاہیر'' (لاہور: غیر مورخہ) میں شامل ہیں۔ مذکورہ مجموعوں کے علاوہ علامہ شبلی کے جو متفرق خطوط رسایل وجراید میں شایع ہوئے ان کا ذکر باب ہشتم [نوادرات شبلی] میں آئندہ صفحات میں آرہا ہے۔

مطبوعہ مکاتیب شبلی کے کئی انتخابات بھی شایع ہوئے۔ اس میں ''انتخاب مکاتیب سرسید، شبلی و آزاد'' از شیخ عبداللہ [لاہور: ۱۹۵۸ء] ایک اہم انتخاب ہے۔ اس میں علامہ شبلی کے ۴۴ خطوط شامل ہیں۔ ۴ر خط ''مکتوبات مشاہیر'' مرتبہ: لطیف احمد [الہ آباد، غیر مورخہ] میں بھی شامل ہیں۔ اس میں ایک خط جو قاضی خلیل احمد کے نام ہے وہ کسی اور مجموعہ مکاتیب میں شامل نہیں۔

شبلی کے ۱۸ر اہم خطوط جو خواجہ حسن نظامی کے نام تھے، خواجہ صاحب کے مرتب کردہ مجموعہ ''اتالیق خطوط نویسی'' (مطبوعہ دہلی: ۱۹۱۱ء) میں شامل ہیں۔ جو ادب انشاء کا بہترین نمونہ ہیں۔

علامہ شبلی کے مکتوبات واقعی قومی اعمال نامہ ہیں اور ہماری ملی تاریخ کے اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حوالے

(۱) ماہنامہ معارف فروری ۲۰۰۶ء ص ۱۱۹

(۲) مقالات شبلی، ج ۲ ص ۵۹۔۶۰

(۳) مکاتیب شبلی، ج ا ص ۶۲۔۶۳

(۴) ایضاً ص ۵۷

(۵) غالب۔ اردوئے معلیٰ، ص ۳۷۵

(۶) مکاتیب شبلی، ج ۲ ص ۳۲۴

(۷) ذکر غالب، از مالک رام، ص ۱۶۹

(۸) مکاتیب شبلی، ج اص ۱۷۹

(۹) غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ۔ ڈاکٹر خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۲۰۰۸ء

(۱۰) مکاتیب شبلی ج اص ۱۷۱

(۱۱) خورشید الاسلام، تنقیدیں، ص ۵۲

(۱۲) ایضاً و ماہنامہ معارف فروری ۲۰۰۶ء ص ۱۱۹

(۱۳) مکاتیب شبلی ج اص ۱۸۹

(۱۴) مکاتیب شبلی ج اص ا

(۱۵) ایضاً ج اص ۷

(۱۶) ایضاً ج اص ۱۴۵

(۱۷) مکاتیب شبلی ج اص ۲۹۲

(۱۸) ماہنامہ معارف نومبر ۱۹۲۳ء

(۱۹) خطوط شبلی ص ۲۹

(۲۰) مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۴۶۔۴۷

(۲۱) ایضاً ج اص ۱۲۵

(۲۲) مکاتیب شبلی ج اص ۲۲۰-۲۲۱

(۲۳) مکاتیب شبلی ج اص ۱۳۷

(۲۴) مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۲۲۲

(۲۵) ایضاً ج ۲ ص ۱۲۴

(۲۶) مکاتیب شبلی ج اص ۲۳۶

(۲۷) مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۴۲

(۲۸) ایضاً ج اص ۱۲۶

(۲۹) ایضاً ج ۲ ص ۲۱۸

(۳۰) ایضاً ج اص ۲۳۸

(۳۱) ایضاً ج۲ص۱۳۱

(۳۲) ایضاً ج۱ص۲۴۲

(۳۳) ایضاً ج۱ص۲۲۱

(۳۴) ایضاً ج۲ص۱۷۱،طبع جدید۲۰۱۲ء

(۳۵) ایضاً ج۱ص۱۶۲،طبع جدید۲۰۱۲ء

(۳۶) مقدمہ مکاتیب شبلی ج۱،ص۸-۱۰

(۳۷) خطوط شبلی ص۲۳

(۳۸) خطوط شبلی ص۲۶

(۳۹) ملاحظہ ہو مقدمات عبدالحق۔کوہ نور پریس دہلی ۱۹۶۷ء

(۴۰) نگار لکھنؤ۔اکتوبر ۱۹۴۵ء ص۳۱۷۔۳۱۹

(۴۱) ادبی دنیا لاہور۔جون ۱۹۴۶ء ص۲۱۱۔۲۱۳

(۴۲) ادیب علی گڑھ۔شبلی نمبر ص۶۹۔۹۹

(۴۳) ادیب علی گڑھ شبلی نمبر ص۲۶۸۔۳۰۳

(۴۴) جزیرہ کی بازیافت ص۳۵

(۴۵) شبلی کی حیات معاشقہ ص۶۔۷

(۴۶) ادیب شبلی نمبر ۱۲۔۱۵

(۴۷) علامہ شبلی۔مسلمانوں کی پولٹکل کروٹ۔مشمولہ مقالات شبلی جلد ہشتم۔دارالمصنّفین اعظم گڑھ

بابِ ہشتم

نوادرات شبلی

غیر مدون تحریریں

علامہ شبلی نعمانی کی بلند پایہ تصنیفات وتالیفات، مضامین ومقالات ،خطوط وخطبات اور شعروادب کا سرمایہ جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، اس لائق ہے کہ دنیا کے کسی مصنف، محقق، مورخ اور ادیب وانشاء پرداز کے مقابلہ میں فخر سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ علامہ شبلی کی متعدد تحریریں غیر مدون ہیں جو متعدد کتب ورسائل کے اوراق میں منتشر ہیں۔ ان کا ذکر اور نشاندہی اس لئے ضروری ہے کہ علامہ شبلی کی شخصیت اور افکار وخیالات پر داد تحقیق دینے والوں کے لئے ان کا مطالعہ بھی ویسا ہی ضروری ہے جس طرح ان کی مطبوعہ تصانیف، مدونہ کتب ورسائل اور مضامین ومقالات کا مطالعہ ضروری ہے۔

لیکن ان کے ذکر سے پہلے یہاں یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ جس طرح علامہ شبلی عظمت کے نشاں ہیں اسی طرح ان کے لائق تلامذہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی بھی قابل فخر ہیں کہ ان کی وفات کے بعد دارالمصنّفین سے ان کی تحریروں کی اشاعت کا سامان کیا۔ بالخصوص مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنے استاذ کی ایک ایک تحریر جمع کی۔ ان کو سلیقے سے ترتیب دے کر شائع کیا۔ اس لائق رشک کارنامے پر علمی دنیا ان کی ہمیشہ شکر گذار رہے گی۔ البتہ اس سلسلہ ترتیب وتدوین میں ان کا طریقہ کار واضح نہیں ہے۔ مثلاً انھوں نے مکاتیب شبلی کی دونوں جلدیں مرتب کرتے وقت متعدد خطوط بوجوہ شامل نہیں کئے۔ (۱) پھر وہ خطوط کیا ہوئے اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ ممکن ہے دارالمصنّفین کے کسی گوشے میں محفوظ ہوں۔

اسی طرح انہوں نے مطبوعہ مکاتیب میں متعدد مقامات پر نقطے لگا کر اصل عبارتیں

حذف کردیں۔ اگرچہ بہت سی جگہوں پر سمجھ میں آجاتا ہے کہ کون سا لفظ یا جملہ حذف کیا گیا ہے تاہم کچھ مقامات ایسے بھی ہیں جن کا سمجھنا اب دشوار ہے۔ یہ کام اگرچہ انھوں نے مصلحتاً کیا ہوگا لیکن اس سے شبلی کے بعض خیالات کے سمجھنے میں دشواری اور شکوک وشبہات پیدا ہوئے۔

مکاتیب کے سلسلے میں انھوں نے ان خطوط کو جو عطیہ فیضی اور زہرا فیضی کے نام تھے انہیں حاصل کیا اور نہ شائع۔ مکاتیب شبلی میں ان کی عدم شمولیت کی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ ان خطوط کے بارے میں جو رائے مولوی عبدالحق، امین زبیری، وحید قریشی اور شیخ محمد اکرام کی تھی وہی شاید ان کی بھی ہو۔ ورنہ وہ انھیں نظر انداز نہ کرتے، حالانکہ یہ واقعہ نہیں۔ اگر ان خطوط کو خواجہ حسن نظامی، مہدی افادی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام خطوط کے ساتھ شامل اشاعت کردئے گئے ہوتے تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ بہت سے اعتراضات پیدا ہی نہ ہوتے۔ مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی علامہ شبلی کو اعظم گڑھ آنے کی اطلاع دیتے ہیں، اس کے جواب میں علامہ شبلی لکھتے ہیں:

کیا واقعی آپ جلوہ فرما ہوں گے اور کیا درحقیقت:

میرے ویرانے میں ہوجائے گی دم بھر چاندنی

نامہ والا بار بار پڑھتا ہوں اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں:

سچ سچ بتا یہ حرف انہیں کے قلم کے ہیں

[مکاتیب شبلی ج ا ص ۱۱۵]

مولوی عبدالحق اور امین زبیری کی آنکھوں سے دیکھا جائے تو یہ خط عطیہ فیضی کے نام ہونا چاہئے۔

مکاتیب شبلی میں ان خطوط کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ شبلی اور سلیمان سے حسد رکھنے والوں نے ''شبلی کی رنگین زندگی'' اور ''شبلی کا جرم محبت اور سید سلیمان ندوی'' جیسی تحریریں لکھیں اور شبیہ شبلی کے بگاڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ حالانکہ اب وہ خطوط محمد امین زبیری ہی کی بدولت سب کے ہاتھوں میں ہیں، اس سے شبلی کے بارے میں کسی قسم کی عدم ثقاہت کا اندازہ نہیں ہوتا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کے فارسی اور اردو کلام کو کلیات شبلی کے نام سے

مرتب کر کے شائع کیا۔ جس کی تفصیلات گذشتہ صفحات میں پیش کی جا چکی ہیں، اس میں بھی وہ ترتیب و تدوین کے اصولوں کو پوری طرح برت نہ سکے۔ مثلاً انھوں نے مجموعہ نظم شبلی، دستہ گل اور بوئے گل جسے علامہ شبلی نے ندوہ کی معتمدی کے زمانہ میں بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔ کلیات شبلی میں ضم کر کے ان کا وجود ختم کر دیا۔ اگرچہ ان مجموعہ ہائے کلام کی غزلیں کلیات میں شامل ہیں تاہم جو بات دستہ گل اور بوئے گل کے ناموں میں تھی وہ کلیات میں کہاں۔ اور پھر کلیات میں بھی انہیں باقی رکھا جا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں کلیات میں غزلیں اور بعض قصیدے شامل نہیں کئے گئے، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ان کی تفصیل قلم بند کی جا چکی ہے۔

اسی طرح انھوں نے ''رسائل شبلی'' جو علامہ شبلی کے تاریخی اور معرکہ آراء تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے اور جسے خود علامہ شبلی نے ۱۸۹۸ء میں شائع کیا تھا، اسے دوبارہ شائع نہیں کیا۔ بلکہ ایک وسیع منصوبے کے تحت شبلی کے تمام مقالات کو آٹھ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جو اگرچہ شبلی شناسی کے باب میں ان کا بڑا کارنامہ ہے، تاہم اس سے کم از کم یہ نقصان ضرور ہوا کہ رسائل شبلی کا وجود مٹ گیا اور اس پر شبلی نے جو شاندار دیباچہ لکھا ہے، اس سے بھی اہل علم محروم ہو گئے۔ حالانکہ رسائل شبلی میں شامل مقالات کے علاوہ جو مضامین و مقالات رسائل و جرائد میں منتشر تھے محض ان کو مرتب کرنے کی ضرورت تھی۔ اور پھر مقالات کی جو جلدیں شایع کی گئیں انہیں بھی بہتر شکل میں پیش نہیں کیا گیا۔ حالانکہ چوتھی، پانچویں اور چھٹی جلدوں کی اشاعت پر ادیب شہیر مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس کی طرف مسلسل توجہ دلائی۔ جلد چہارم پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''رفقائے دارالمصنفین اس گذارش کو معاف کریں کہ ان کی تھوڑی سی محنت اور توجہ اس مجموعہ کو اس سے کہیں بہتر حالت میں پیش کر سکتی تھی۔ مجموعہ میں اصل شے ترتیب ہوتی ہے۔ مجموعہ تو ایسا ہونا چاہئے کہ حسن ترتیب اس کی جان ہو مگر یہ مجموعہ افسوس ہے بہترین ترتیب سے محروم ہے۔ بہترین ترتیب نوعیت مضامین کے لحاظ سے ہو سکتی تھی یعنی مذہبی، تاریخی وغیرہ۔ یہ نہ سہی تو یہ مقالات کم از کم تاریخ وار درج ہوتے۔ افسوس ہے کہ اتنی توجہ بھی نہ کی گئی۔ بعض کے آخر

میں صرف سنہ ہجری درج ہے۔ بعض کے سنہ ہجری اور عیسوی، دونوں میں تقدیم و تاخیر شروع سے آخر تک برابر مسلسل ہے۔ شروع میں ایک مختصر دیباچہ بھی ضروریات میں سے تھا، اس میں یہ بتایا جاتا کہ یہ مجموعہ تنقیدات مصنف کی زندگی کے فلاں دور کا ہے۔ مصنف میں تنقید نگاری کی فلاں فلاں خصوصیات تھیں وقس علی ہذا۔'' [صدق۔۱۰/اگست ۱۹۳۵ء۔ بحوالہ تبصرات ماجدی ص ۳۸۵]

مولانا عبدالماجد دریابادی نے حصہ پنجم اور حصہ ششم پر بھی اسی قسم کا اعتراض کیا ہے، بلکہ ان کے لب ولہجہ سے مایوسی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ وہ درخواست ہے جو سلسلہ مقالات کی تقریباً ہر جلد پر ریویو کے وقت بزرگان دارالمصنّفین سے کرنی پڑتی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قبول کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا۔''

[صدق۔ مورخہ ۱۲/اگست ۱۹۳۷ء۔ بحوالہ تبصرات ماجدی ص ۳۸۹]

بہر حال مولانا سید سلیمان ندوی نے شبلی کی تحریروں کی ترتیب وتدوین کا جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس میں ترتیب وتدوین کی معمولی کمیاں راہ پا گئی ہیں۔ جس کا مفصل جائزہ اوراق گذشتہ میں جابجا آچکا ہے۔ یہاں شبلی کی ان تحریروں کا ذکر کیا جاتا ہے جو مولانا سید سلیمان ندوی کی تحقیق وتدوین کے دائرے میں کسی وجہ سے نہ آسکیں اور متفرق طور پر ان کے عہد میں یا ان کے بعد شایع ہوئیں۔

[ا] مضامین ومقالات

آٹھ جلدوں پر مشتمل مقالات شبلی میں شامل مضامین ومقالات کے علاوہ مندرجہ ذیل مضامین بعد میں دستیاب ہوئے:

ا- علمائے اسلام [علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۴/اپریل ۱۸۸۳ء]

۲- وہ غلطی زیادہ خطرناک ہے جو انسان کو اپنی نسبت آپ ہو۔
[علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۱/جولائی ۱۸۸۳ء]

۳- مولوی خدا بخش خاں عظیم آبادی کا کتب خانہ۔
[ماہنامہ معارف، اکتوبر ۱۹۳۴ء]

۴- رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ اپریل ۱۹۰۳ء
[علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲ مئی ۱۹۰۳ء]

۵- رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ مئی ۱۹۰۳ء
[علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۳/ جون ۱۹۰۳ء]

۶- رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ جون ۱۹۰۳ء
[علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۵/ جولائی ۱۹۰۳ء]

۷- رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ جولائی ۱۹۰۳ء
[علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۹/ اگست ۱۹۰۳ء]

۸- رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ اگست، ستمبر ۱۹۰۳ء
[علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۶ م/ اکتوبر ۱۹۰۳ء]

۹- رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ دسمبر ۱۹۰۳ء
[ماہنامہ معارف اکتوبر ۱۹۶۷ء]

۱۰- اعلان متعلق انجمن ترقی اردو [علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۶/ جون ۱۹۰۳ء]

۱۱- دارالعلوم ندوہ کا درجہ تکمیل [علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۷/ جولائی ۱۹۰۹ء]

۱۲- ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس دہلی میں کیا ہوگا اور کیا کیا ہونا چاہیے۔
[علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۹/ فروری و ۲/ مارچ و ۹/ مارچ ۱۹۱۰ء]

۱۳- یادداشت متعلق قانون وقف اولاد
[علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۹/ جولائی ۱۹۱۱ء]

۱۴- عورت اور اسلام [علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۰/ دسمبر ۱۹۱۱ء]

۱۵- مولانا شبلی کے روزنامچہ کے چند اوراق [ماہنامہ معارف ستمبر ۱۹۱۸ء]

۱۶- موجودہ زمانہ میں تاریخ کا فن [رسالہ عبرت نجیب آباد۔ جنوری ۱۹۱۶ء]

۱۷- رپورٹ متعلق کتب خانہ رام پور [ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۳۴ء]

۱۸ رپورٹ صیغہ ترجمۃ القرآن [روداد ندوہ ۱۹۱۲ء]

۱۹- غضاری رازی [ادبی دنیا لاہور، ستمبر- اکتوبر ۱۹۶۶ء]

ان مضامین اور رپورٹوں کے علاوہ بھی ان کی تحریریں علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور معاصر رسایل و جراید میں مل سکتی ہیں۔ بہر حال یہ تحریریں مقالات کی آٹھ جلدوں میں شامل نہیں۔ ان کی شمولیت اس لئے ضروری ہے کہ عموماً اہل علم یہ خیال کرتے ہیں کہ شبلی کے تمام مضامین ومقالات اس میں آ گئے ہیں۔ حالاں کہ مذکورہ تحریروں میں بعض ایسے مباحث بھی ہیں جو ان کی اور تحریروں میں شامل نہیں۔

[۲] خطبات شبلی

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ایک جلد میں علامہ شبلی کے خطبات دار المصنّفین سے شائع کئے گئے ہیں ۔ یہ ترتیب مولانا عبدالسلام ندوی کی ہے۔ اس میں ۱۶ خطبات شامل ہیں۔ اس کی اشاعت کے بعد مندرجہ ذیل خطبات شبلی دستیاب ہوئے۔

۱- تقریر [رسالہ تہنیت بخدمت حاجی غلام حسین] مطبع مصطفائی بمبئی۔ ۱۳۳۱ھ

۲- تقریر [محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس] اجلاس ۱۸۸۶ء

۳- تقریر [محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس] اجلاس ۱۸۸۹ء

۴- تقریر [محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس] اجلاس ۱۸۹۹ء

۵- حقوق نسواں، فکر ونظر اسلام آباد۔ جولائی، ستمبر ۱۹۸۸ء

۵- علم کلام [ماہنامہ معارف اعظم گڑھ] اکتوبر ۱۹۶۹ء

۶- شبلی کی پہلی غیر مدون تقریر، کانفرنس گزٹ علی گڑھ۔ اکتوبر ۲۰۱۱ء

ندوہ کے جلسوں اور سالانہ اجلاسوں میں علامہ شبلی پابندی سے شریک ہوتے اور تقریریں کرتے تھے۔ ندوہ کی رودادوں میں یہ تمام تقریریں محفوظ ہیں۔ ان کو بھی خطبات شبلی میں شامل کر کے محفوظ کرنا ضروری ہے۔

[۳]   مکاتیب شبلی

مکاتیب شبلی کی دونوں جلدوں میں کل ۴۸۷ خطوط شامل ہیں جب کہ مندرجہ ذیل خطوط ان میں شامل نہیں۔

۱-	خطوط شبلی	۱۰۰/خط	
۲-	خطوط مشاہیر	۲۱/خط	
۳-	باقیات شبلی	۷۶/خط	
۴-	خطوط شبلی بنام آزاد	۱۸/خط	
۵-	مکتوبات مشاہیر	۱۵/خط	
۶-	خطوط شبلی بنام نواب مزمل اللہ خاں	۴/خط	
۷-	خط بنام نظام حیدرآباد	۱/خط	
۸-	مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام، ۸ خط		
۹-	مکتوب شبلی بنام شاکر میرٹھی	۱/خط	
۱۰-	حکیم اجمل کے نام	۱/خط	[معارف ج ۵۰ ش ۶]
۱۱-	حافظ احمد علی خاں شوق کے نام	۱/خط	[″]
۱۲-	غیر مطبوعہ خطوط نقوش مکاتیب نمبر	۱۴/خط	
۱۳-	سرسید کے نام مشاہیر کے خطوط	۷/خط	
۱۴-	نامہ شبلی بنام مولانا شاہ محمد علی	۱/خط	
۱۵-	خطوط شبلی بنام وقار الملک	۱۳/خط	[نقوش خطوط نمبر]
۱۶-	نامہ شبلی بنام مولوی بشیر الدین صاحب	۲/خط	[معارف دسمبر ۱۹۱۹ء]
۱۷-	نامہ سرسید و شبلی	۲/ط	[معارف اگست ۱۹۱۹ء]
۱۸-	مکاتیب شبلی بنام مرزا سلیم وکیل	۶/خط	[ایضاً جنوری ۱۹۵۶ء]
۱۹-	علامہ شبلی کے غیر مطبوعہ مکاتیب	۴/خط	[ایضاً مئی ۱۹۳۰ء]

۲۰-	غیر مطبوعہ خطوط	۱/خط [ادیب شبلی نمبر ۱۹۶۰ء]
۲۱-	مکتوب بنام نواب وقار الملک	۱/خط [خطوط وقار الملک]
۲۲-	بنام ملا عبدالقیوم	۱/خط [مجلّہ نظامیہ حیدرآباد ۱۹۴۰ء]
۲۳-	بنام مولوی مسیح الزماں	۲/خط [حیات مسیح، مظفر حسین ۱۹۱۱ء لکھنو]
۲۴-	بنام منشی امیر احمد	۱/خط [خطوط منشی امیر احمد۔ ۱۹۱۰ء]
۲۵-	بنام خواجہ حسن نظامی	۱۸ خط [اتالیق خطوط نویسی۔ دہلی ۱۹۱۱ء]
۲۶-	نامعلوم	۳ خط [محفوظہ سرسید اکیڈمی علی گڑھ]
۲۷-	بنام احسن اللہ خاں ثاقب	۶ خط [گوہرین نامہ، اعظم گڑھ ۱۳۴۱ھ]
۲۸-	بنام سرسید احمد خاں	۲ خط [اردو ادب، ش ۱، ۱۹۷۰ء]
۲۹-	بنام قاضی محمد خلیل	۱ خط [مکتوبات مشاہیر]
	میزان	۳۳۱ خطوط

یہ ۳۳۱ وہ خطوط ہیں جو ایک نظر میں سامنے آگئے ہیں۔ اگر تلاش و تفحص سے کام لیا جائے تو مزید خطوط دریافت ہو سکتے ہیں۔ اس میں چند خطوط بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام کے وہ خطوط جو انھوں نے مکاتیب شبلی کی اشاعت کے وقت احتیاطاً روک لئے تھے اور جنھیں بعد میں ان کے پوتے محترم پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی نے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ [ستمبر ۱۹۷۱ء] میں شائع کرا دیے۔

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولوی بشیر الدین اٹاوہ اور مفتی شیر علی کے نام کے خطوط سے علامہ شبلی کی شخصیت اور ان کی کاوشوں کے کئی اہم پہلو واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔ بہرحال یہ خطوط اس قدر اہم ہیں کہ ان کو نظر انداز کر کے شبلی کی پوری شخصیت اور ان کے بعض علمی و تعلیمی کاموں کی اہمیت اجاگر نہیں ہو سکتی۔

[۴] کلام شبلی

علامہ شبلی کے مجموعہ ہائے کلام اور ان کی شاعری کا ذکر آچکا ہے۔ ۱۹۲۵ء میں کلیات شبلی

کی اشاعت کے بعد بھی بعض نظمیں اور غزلیں دستیاب ہوئیں۔جس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔مولانا شبلی مرحوم کی ایک ناتمام غیر مطبوعہ نظم ۔(ماہنامہ معارف۔اکتوبر ۱۹۲۵ء)

۲۔ غزل شبلی نعمانی [ادبی دنیا لاہور دسمبر ۱۹۶۶ء]

۳۔ نظم [شبلی کی علمی وادبی خدمات ص ۳۰۵]

۴۔ کلام شبلی [ایضاً ۳۴۰-۳۴۱]

[۵] دیباچہ ومقدمہ

علامہ شبلی نے کئی کتابوں پر مقدمے ودیباچے لکھے ہیں ۔ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اپنے مضمون نوادر شبلی [اورینٹل کالج میگزین۔ لاہور] میں اس طرح کی شبلی کی تین تحریروں کی نشاندہی کی ہے۔

۱- تقریظ تاریخ النوائط۔ [مطبوعہ ۱۹۰۴ء] مصنفہ نواب عزیز جنگ ولا، احمد عبدالعزیز [پ: ۲۸ر دسمبر ۱۹۶۰ء ر ف: ۱۷/۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء]

۲- دیباچہ: تاریخ تمدن۔ترجمہ: (History of Civilization in Europe By:Henry Thomas Buckle) مترجم منشی محمد احمد علی کاکوروی مطبوعہ ۱۹۰۹ء لکھنو

۳- ادیب الٰہ آباد پر تبصرہ۔مطبوعہ ادیب الٰہ آباد۔اگست ۱۹۱۰ء

۴۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے اپنے مضمون ''علامہ شبلی شخصیت،افکار اور کچھ نئی باتیں'' [مطبوعہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مئی ۲۰۰۸ء] میں علامہ شبلی کی ایک غیر مدون تحریر ''نوشتہ شمس العلما مولانا شبلی نعمانی'' کا ذکر کیا ہے،جو مکاتیب امیر مینائی مرتبہ احسن اللہ خاں ثاقب میں چھپی ہے۔

۵۔ اسی طرح شریف احمد حکمی بنگلوری کی کتاب دستور نامہ فارسی اور رحلہ ابن بطوطہ مترجمہ مولوی حیات حسین رضوی غیر مطبوعہ [محفوظہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ] پر علامہ شبلی کی تقریظ ان کے قلم سے ہے۔

۶۔ سرسید احمد خاں کے سفر نامہ پنجاب پر بھی علامہ شبلی نے فارسی میں دیباچہ

لکھا ہے۔

۷۔ سید افتخار عالم مارہروی نے حیات النذیر پر علامہ شبلی سے تبصرہ لکھوا کر کتاب میں شامل کیا ہے۔ان کے علاوہ بھی شبلی نے یقیناً اور کتابوں پر مقدمے اور دیباچے لکھے ہوں گے ان کے تلاش وتحقیق کی ضرورت اور افادیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔

ہماری ادبی تاریخ میں منظوم تقریظ اور دیباچوں کا ایک عرصہ تک رواج رہا ہے۔علامہ شبلی نے خود اپنی کتابوں سیرۃ النعمان اور الفاروق پر منظوم دیباچے لکھے جو کلیات میں شامل ہیں۔ انہوں نے حکیم عبدالرحمٰن حیرت جھنجھانوی [۱۸۲۸ء-۱۸۸۶ء] کی مثنوی شمامہ مشام افروز [مطبع تہذیب آفاق مرادآباد۔۱۳۰۳ھ] پر بھی منظوم تقریظ لکھی ہے۔ یہ ان کی اب تک کی دستیاب واحد منظوم تقریظ ہے،اس لئے اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

اے کہ نقد ہنرے می خواہی　　نخل فن را ثمرے می خواہی
اے وایں نامہ زیبا بنگر　　نو عروسے ست تماشا بنگر
ثانیش نیست زائباز مگوی　　طرز اوبین وزاعجاز مگوی
بیش ازیں اوج ہنر تاچہ بود　　سخن ایں ست دگر تاچہ بود
لفظ را شمع تجلی بنگر　　واں تنو مندی معنی بنگر
عبدرحمں کہ جہان معنی ست　　شاعر مرتبہ دان معنی ست
سخنے گفت وچہ خوش گفت نگر　　خامہ اش تاچہ گہر سفت نگر
بردہ است از مدد فکرِ رسا　　پایہ فن زکجا تابہ کجا
نظم اشعار چہ آراستہ است　　زلف گفتار چہ آراستہ است
نثر او ہیچ کم از پروین نیست　　علم وفن رابہ ازیں آئین نیست
غیر ازو کیست کہ با طبع بلند　　صید معنی ہمہ آرد در بند
بہ ازیں گر روشے جوئے نیست　　ساحری ہست وسخن گوئی نیست
مدح او در سخنے کے آید　　آخر از ہم چومنے کے آید
چوں باوجش نہ رسید پیک خیال　　تاچہ آید زمن بے پر و بال

تو اگر فکرِ رسائے داری ناخنے عقدہ کشائے داری
بنگر ایں نامہ کہ خود دریابی ہمہ گنجینہ گوہر یابی
من ناشاد چہ دیگر گویم تا ابد باد چہ دیگر گویم

[شمامہ مشام افروز۔ص ۱۳۱]

مذکورہ بالا منظوم ومنثور دیباچوں اور تقریظات کی روشنی میں شبلی کی مقدمہ/دیباچہ نگاری کا بھی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔علامہ شبلی کی تحریروں کے دریافت کا سلسلہ جاری ہے۔اس طرح کی اب تک جو تحریریں دریافت ہوئی ہیں،ان پر چند مضامین بھی لکھے گئے ہیں۔ان کی فہرست یہ ہے:

۱۔علامہ شبلی کی دو غیر مطبوعہ تحریریں۔امتیاز علی خاں عرشی۔ماہنامہ معارف۔اکتوبر ۱۹۳۴ء
۲۔شبلی کے بارے میں چند غیر مطبوعہ اطلاعات۔محی الدین قادری زور
[صبا حیدرآباد شبلی نمبر] ۱۹۵۸ء
۳۔دو نایاب تحریریں۔عطا کاکوی۔تحقیقی مطالعے،پٹنہ۔۱۹۶۵ء
۴۔شبلی وحالی کی بعض غیر مدون تحریریں۔احمد نواز ملک۔صحیفہ لاہور۔جنوری ۱۹۷۰ء
۵۔علامہ شبلی کی نادر تحریریں۔محمد حنیف شاہد۔صحیفہ لاہور۔جنوری ۱۹۷۰ء
۶۔باقیات شبلی۔محمد حنیف شاہد۔صحیفہ لاہور۔اکتوبر ۱۹۷۰ء
۷۔ایک تاریخی تحریر۔شرف الدین اصلاحی۔معارف اعظم گڑھ۔اگست ۱۹۸۹ء
۸۔نوادر شبلی۔ڈاکٹر معین الدین عقیل۔
اورینٹل کالج میگزین لاہور۔جلد ۵۶ شمارہ ۱۔مسلسل نمبر ۲۲۴

علامہ شبلی کی مذکورہ بالا غیر مدون تحریروں کے اجمالی جائزے سے یہ بات واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ شبلی کی تحریروں کا ایک بڑا ذخیرہ اب بھی غیر مدون اور رسایل وجرائد میں منتشر ہے اور یہ غیر مدون ذخیرہ اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔واقعہ یہ ہے کہ یہ شبلی شناسی کا ایک اہم اور ضروری حصہ ہے۔اس کے بغیر شبلی کی شخصیت اور فکر پورے طور پر واضح نہیں ہوسکتی۔

غیر مطبوعہ تحریریں

علامہ شبلی کی غیر مدون تحریروں کے علاوہ کئی غیر مطبوعہ تحریریں بھی ہیں۔ان میں بیشتر تعداد خطوط کی ہے۔مولانا سید سلیمان ندوی نے جب مکاتیب شبلی کی تدوین واشاعت کا اعلان کیا تو ان کے بقول ہر طرف سے خطوط کی بارش ہونے لگی اور کئی ہزار خطوط جمع ہو گئے۔جس میں اشاعت کے لئے انہوں نے ۴۸۷ر خطوط کا انتخاب کیا اور دو جلدوں میں شائع کیا۔اس انتخاب میں انہوں نے کن اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے، مقدمہ مکاتیب شبلی میں اس کی وضاحت موجود ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے صرف ان خطوط کو انتخاب کیا ہے جن سے یا تو مولانا کے ذاتی سوانح کا کوئی واقعہ ظاہر ہوتا ہے، یا ان میں کسی علمی، اصلاحی اور قومی مسئلہ کا ذکر ہے، یا انشا پردازی کا ان میں کوئی نمونہ موجود ہے۔ان ہی اصولہائے ثلاثہ کی رہبری سے ہزاروں خطوط کے انبار سے یہ چند دانے چھانٹ کر الگ کئے گئے ہیں، ورنہ ایک سچے مومن کے نزدیک تو قرآن کی سب سورتیں برابر ہی ہیں۔''
>
> (مکاتیب شبلی جلد اول طبع جدید دیباچہ ص ۱۲)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ شبلی کے ہزاروں خطوط غیر مطبوعہ ہیں۔راقم نے کتب خانہ دارالمصنّفین میں دو جلدوں میں عکسی پیپر میں چسپاں ان خطوط کو دیکھا ہے لیکن اس میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں ایک دوسرے میں ملے ہوئے ہیں۔ان کے نشاندہی کے لئے جو فرصت اور سہولت ضروری ہے راقم ان سے محروم رہا، اس لئے ان سے خاطر خواہ استفادہ نہ کر سکا۔بہر حال خیال یہ ہے کہ وہ خطوط جو سید صاحب نے شائع نہیں کئے وہ دارالمصنّفین میں محفوظ ہیں۔ان کی

ترتیب وتدوین ایک اہم اورضروری کام ہے۔

اسی طرح چند خطوط شبلی نظامی بک ڈپو بدایوں میں محفوظ ہیں جو غالبًا مولانا شبلی نے بعض کتابوں کی طباعت واشاعت کے سلسلے میں لکھے تھے۔ یہ چند سطری خطوط بھی کم اہمیت کے حامل نہیں ان سے کم ازکم بعض تاریخوں کی تعیین کی جاسکتی ہے۔ راقم نے بعض ذرائع سے انہیں حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ان کی قیمت ادا کرنے کا متحمل نہ ہوسکا۔

اسی طرح میرے دوست عبدالبر اثری نے میری کتاب متعلقات شبلی پر تبصرہ کرتے ہوئے چند خطوط شبلی کا ذکر کیا ہے، جو قلعہ مروڈ جنجیرہ کی نمائش میں لگے تھے اور جو غالبًا اب تک شائع نہیں ہوئے۔ امکان یہ ہے کہ یہ خطوط نواب صاحب جنجیرہ یا عطیہ فیضی کی ہمشیرہ نازلی بیگم کے نام ہوں گے، جن سے علامہ شبلی کے گہرے مراسم اور خط وکتابت تھی۔ نواب صاحب کی دعوت پر وہ دو تین بار جنجیرہ گئے۔ ان خطوط کی اشاعت سے سوانح شبلی کے ایک شاخسانے کے بعض عقدے بھی حل ہوسکتے ہیں۔ راقم نے ان کے حصول کے لئے بھی متعدد کوششیں کیں مگر اس لئے ناکام رہا کہ موجودہ نواب جنجیرہ اور ان کے وارثین جنجیرہ میں نہیں رہتے اور قلعہ کی لائبریری ان کی اجازت کے بغیر دیکھی نہیں جاسکتی۔

راقم کو علامہ شبلی کی جو غیر مطبوعہ تحریریں دستیاب ہوئی ہیں، وہ کئی لحاظ سے بڑی اہم ہیں اور اسی اہمیت کے پیش نظر انہیں یہاں درج کیا جاتا ہے۔

ا۔ اوپر گذر چکا ہے کہ علامہ شبلی نے جنجیرہ کے کئی سفر کئے۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء میں انہیں انجمن اسلام جنجیرہ میں لکچر کے لئے مدعو کیا گیا۔ چنانچہ وہ ۱۲/اکتوبر کو جنجیرہ پہونچے۔ ۱۳/اکتوبر کو لکچر دیا یہ کس موضوع پر تھا اس کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔ ۱۴/اکتوبر کو انہوں نے انجمن اسلام جنجیرہ اور اس کے بورڈنگ ہاؤس کا معائنہ کیا اور کتاب الرائے میں اپنے تاثرات قلم بند کئے۔ چونکہ یہ تاثرات اب تک کہیں شائع نہیں ہوئے اور اس میں تعلیم کے سلسلے میں بڑی مفید باتیں ہیں اس لئے اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے:

> ''مجھ کو یہ معلوم کرکے نہایت خوشی ہوئی کہ ایسے چھوٹے سے اور دورافتادہ مقام میں جیسا کہ یہ جزیرہ ہے، ایک انجمن قائم ہے۔ جس نے اپنا مقصد مسلمان

بچوں کا تعلیم دلوانا قرار دیا ہے اور اس غرض سے اس نے ایک بورڈنگ ہوس [ہاؤس] کھولا ہے، جس میں تقریباً ۲۳ بچے مقیم ہو کر اسکول میں تعلیم پاتے ہیں۔ مسلمانوں میں اشاعت تعلیم کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں کہ ہر جگہ اسلامی بورڈنگ کھولے جائیں اور سرکاری مدارس میں تعلیم دلائی جائے۔

انجمن نے اس مقصد کے لئے دو برس کی قلیل مدت میں آٹھ ہزار روپئے جمع کئے، جو ایک صریح اور بین کامیابی ہے۔ ۱۳/اکتوبر ۱۹۰۹ء کو میں نے بورڈنگ ہوس [ہاؤس] اور طلبہ کو دیکھا۔ چونکہ انجمن نے مجھ سے لکچر دینے کی خواہش کی تھی اور وقت کم تھا اس لئے میں طلبہ کی طریق ماند و بود کو نہ دیکھ سکا۔ وہ صاف ستھرے نظر آتے تھے اور ان کی صورتوں سے زندہ دلی اور ہوشیاری محسوس ہوتی تھی۔

ایک ایسا بورڈنگ جس کے کارکن ایسے مستعد ہوں، اور جس کو ہز ہائنس جیسا روشن خیال والیٔ ملک اور ہر ہائنس جیسی تعلیم یافتہ رئیسہ ہات آئے، ہر قسم کی ترقی کی صحیح امید کرسکتا ہے۔ خاکسار

شبلی نعمانی [۱۴/اکتوبر ۱۹۰۹ء]

۲۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے علامہ شبلی کے تعلقات اور خط و کتابت کی داستان خاصی طویل ہے۔ حبیب شبلی کی حیثیت سے ان کا ذکر حیات شبلی [مولانا سید سلیمان ندوی] سے صدر یار جنگ [ڈاکٹر شمس تبریز خاں] تک متعدد کتب و رسائل میں آیا ہے۔ علامہ شبلی کی ان سے طویل خط و کتابت رہی ہے۔ مکاتیب شبلی میں ان کے نام ۱۱۸/خطوط شامل ہیں۔ باقیات شبلی میں ۱۵/خط۔ نقوش لاہور کے خطوط نمبر حصہ اول [اپریل۔ مئی ۱۹۶۸ء] میں ۹/خط۔ معارف ستمبر ۱۹۷۱ء میں ۸/خط۔ کل ۱۵۰ خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں ان کا ایک اور خط دریافت ہوا ہے۔ یہ خط میرے کرم فرما محبّ گرامی جناب عطاء خورشید صاحب کو کسی کتاب کے درمیان ملا۔ چنانچہ انہوں نے حق بہ حقدار رسید کے مطابق مجھے اس کا عکس عنایت کیا۔ شبلی کا یہ خط بہت اہم ہے۔ اس سے جہاں ندوہ کے انتظام سے متعلق چند باتیں معلوم ہوتی ہیں، وہیں علامہ کے ایک صاحبزادے جو بچپن ہی میں انتقال کر گئے ان کی تاریخ پیدائش کی بھی تعیین ہوتی ہے، اس لئے

اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

[ا]

''مکرمی!

متعدد خطوط رسالہ (الندوہ) کے متعلق لکھ چکا ہوں۔ ان کے جواب کا انتظار ہے۔ آج مولوی مسیح الزماں صاحب کا خط آیا کہ رسالہ بلا تامل نکالنا چاہئے۔

ہاں! ایک بات خاص غور طلب ہے۔ مولوی مسیح الزماں صاحب کا ایک خط سابقاً آیا تھا کہ اب دارالعلوم کو کسی انتظام کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کا انتظام سال بھر کے لئے منشی اطہر علی صاحب نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ آج کے خط میں وہ لکھتے ہیں کہ اب خوبی انتظام میں کیا کمی رہے گی۔ منشی صاحب نے کل انتظام ہاتھ میں لیا ہے۔ یہ الفاظ انہوں نے تعریض کے پیرایہ میں لکھے ہیں۔ یہ بھی لکھا تھا کہ منشی جی کی طرف سے انتظامات کی ایک اسکیم بھی شائع ہوئی ہے۔ یہ کیا معاملات ہیں۔ منشی جی کو نئے انتظامات کیا پھر دیدئے ہیں۔ اگر زاید اختیارات دئے گئے ہیں تو واقعی مضر ہے۔

میرا مذاق اگرچہ الارواح جنود مجندۃ کے موافق بالکل آپ کے مذاق کے موافق ہے، لیکن ایک خاص بات میں سخت اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ آپ نیک طبع واقع ہیں، اس لئے آپ میں حسن ظن بہت ہے اور میں بالطبع سیی الظن واقع ہوا ہوں۔ منشی جی کی نسبت میرا ہمیشہ سے خیال ہے کہ وہ نہایت خود پرست اور خودی پسند ہیں یا نادان دوست ہے۔ بہرحال ندوہ جس قدر منشی صاحب کے ہاتھ میں جائے گا خراب ہوگا۔ میں نے پہلے آپ کو لکھا تھا کہ میں ندوہ میں آتا ہوں، پھر رک گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گھر میں حمل کے آثار تھے۔ اب خدا کے فضل سے جمعہ کے دن لڑکا پیدا ہوا۔ زچہ کی حالت میں چھوڑ کر آنا ممکن نہیں ،لیکن بہرحال شوال میں آنا ہی پڑے گا۔

آپ ذرا زور کے ساتھ کارروائی کیجئے۔ مکان ندوہ کا بدلنا ضرور ہے۔ اور اس کی

صرف یہی تدبیر ہے کہ ایک دلال خاص اس کام پر مقرر کر دیا جائے۔ یاد رکھئے کہ ندوہ کی بڑی ذمہ داری ہے اور سہل انگاری سے پوری نہیں ہوسکتی۔ مرد ہو کر میدان میں آنا چاہئے۔

والتسلیم

شبلی

۵/اکتوبر ۱۹۰۳ء

۳۔ علامہ شبلی کے احباب کی جب کبھی فہرست تیار کی جائے گی تو حاتم وقت نواب سر مزمل خاں مرحوم رئیس بھیکم پور کا نام سرفہرست ہوگا۔ نواب صاحب ایسا مخلص، بے ریا اور پاک باز دل لے کر دنیا میں آئے تھے جس سے اسلاف کی یادیں تازہ ہو جاتی تھیں۔ وہ اپنے عہد کے غالبًا سب سے بڑے فیاض، سخی اور قومی ہمدردی کا نمونہ تھے۔ سرسید احمد خاں کی گود میں کھیل کر جوان ہوئے۔ علامہ شبلی کے بڑے والہ و شیدا تھے۔ تحریک ندوہ میں اسی اخلاص کی بدولت ہر موقع پر شبلی کے مونس و غمخوار رہے اور ان کا ہر طرح سے تعاون کیا۔ شبلی کی وفات کے بعد ان کی یادگار دارالمصنّفین سے بھی آخر دم تک اخلاص کا معاملہ کرتے رہے۔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی ''دارالمصنّفین اپنی ۲۴ ربرس کی عمر میں حیدر آباد اور بھوپال کی سرکاروں کے علاوہ اگر کسی محسن کے فیض سے مستفید ہوا ہے تو وہ بھیکم پور کے رئیس کی ذات تھی۔ دارالمصنّفین کی مسجد پانچ ہزار کے خرچ سے بنوائی اور اس کے لئے دری کا فرش اور پردے بنوا کر بھیجے۔'' [یاد رفتگاں ص ۱۸۴]

علامہ شبلی کے بعض مکاتیب میں ان کا ذکر ہے۔ ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کی ان سے مسلسل خط و کتابت رہی۔ مگر افسوس کہ ان کے نام کے خطوط محفوظ نہیں رہے۔ ۴ رخطوط جو ان کے لائق فرزند محترم نواب رحمت اللہ خاں شروانی [مرحوم] کے ہاتھ آئے، انہوں نے اسے نواب صاحب کی وفات [۲۸ رستمبر ۱۹۳۸ء] اور زمانہ کم سنی سے اب تک سینہ سے لگا کر محفوظ رکھا۔ راقم ان کا سراپا ممنون ہے کہ انہوں نے میری گذارش پر ان خطوط کے عکس فراہم کئے۔ ان خطوط سے دونوں بزرگوں کے گہرے مراسم، طرز فکر اور ملی و تعلیمی مسائل سے گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ پہلے تینوں خطوط پر تاریخیں درج ہیں۔ لیکن چوتھے خط پر تاریخ درج نہیں لیکن اس کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شبلی کے آخری دور کا ہے۔ جس میں اختلافات ندوہ کی طرف اشارہ اور

سیرۃ نبویؐ کی تالیف کا ذکر ہے۔ بقیہ تفصیل اصل خط سے ملاحظہ فرمائیں:

[۲]

نمبر ۳۶۸ دفتر انجمن اردو

۴؍جولائی ۱۹۰۳ء حیدر آباد

مکرمی! کیا اب تک انجمن اردو اس قابل نہیں ہوئی کہ آپ اس کی طرف توجہ فرمائیں۔

والتسلیم

شبلی ۴؍جولائی ۱۹۰۳ء

---

[۳]

نمبر ۹۵۰ دفتر انجمن اردو

۲۰؍ستمبر ۱۹۰۳ء حیدر آباد

مکرم ما!

چونکہ اب حساب بنگال بنک سے جاری ہو گیا ہے اور چونکہ اب مصنّفین کے انعام وصلہ کی ضرورت پیش ہے اس لئے درخواست ہے کہ بقیہ رقم موعودہ عنایت ہو۔

شبلی

---

[۴]

اعظم گڑھ

مکرمی!

والا نامہ مجھ کو عین ریل میں ملا جبکہ میں گھر آنے کے لئے اسٹیشن پر تھا۔ جو صدمہ آپ کو پہنچا اس سے نہایت افسوس ہوا۔ واقعی ایک ایسے رفیق و مونس کا جدا ہونا سخت جانگداز ہے۔ یہ کہنا کہ خدا نعم البدل عطا کرے اگر چہ رسماً جائز

بلکہ معمول ہے، لیکن میں اس کو مرحوم کی روح کی دلشکنی خیال کرتا ہوں۔ خدا آپ کو صبر جمیل عطا کرے۔

شبلی

۲۱؍جنوری ۱۹۰۵ء

---

[۵]

جناب من! تسلیم

آپ کا ہر خط ایسا ہوتا ہے کہ برسوں کی محنت اور جانفشانی کی داد مل جاتی ہے۔

مجھ کو معلوم ہے کہ نکتہ چین آپ پر اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن ان بیدردوں سے کوئی نہیں کہتا کہ پھر آپ سے بہتر آدمی کیوں نہیں ڈھونڈھ لاتے میں بالکل آپ کی سی حالت میں مبتلا ہوں، جس حلقہ میں ہوں۔ اس کے نزدیک ندوہ کو سر تا پا مجھ سے نقصان پہونچ رہا ہے۔ خیر ان باتوں کا کیا علاج۔

افسوس ہے سیرت نبوی کے شروع کرنے کا اس وقت موقع آیا جب آنکھوں میں پانی آچلا ہے اور لکھنے پڑھنے سے معذوری ہوتی جاتی ہے۔ ورنہ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ سیرت نبوی لکھنے کا حق ادا ہوتا، لیکن یہ ضرور ہے کہ میں اپنی تمام محنت اور قوت کو قربان کر دیتا۔

لیکن قوم کی خوش مذاقی سنیے! ایک بڑے حضرت فرماتے ہیں کہ تواریخ حبیب اللہ کے بعد کوئی شخص سیرت پر کیا قلم اٹھا سکتا ہے۔

سیرت نبوی کے متعلق بہت سے موقعے آئیں گے لیکن ابھی آپ کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔ رسید واپس ہے۔

شبلی نعمانی

نواب سر مزمل اللہ خاں کا مذاق شعر و ادب بڑا پختہ تھا۔ فارسی کے صاحب دیوان شاعر

تھے۔ مذاق کی ہم آہنگی کے سبب علامہ شبلی اپنا فارسی کلام کبھی کبھی ان کو بھیجا کرتے تھے۔ ایک غزل جوانہوں نے ''فکر تازہ'' کے عنوان سے نواب صاحب کو بھیجی تھی ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی محترم نواب رحمت اللہ خاں شروانی نے عنایت کی ہے۔ وہ یہ ہے:

من کہ در سینہ دلے دارم و شیدا چہ کنم
میل با لالہ رخان گر نکنم تاچہ کنم

من نہ آنم کہ بہ ہر شیوہ دل از دست دہم
لیک با آں نگہ حوصلہ فرسا چہ کنم

ہست چل سال کہ بیہودہ نگہ داشتمش
گر نہ برسنگ زنم شیشہ تقوی چہ کنم

ساغر بادہ و طرف چمن و لالہ رخے
چوں بہ ایں ہا فتدم کار بفرما چہ کنم

دل متاعے ست گراں مایہ بہ کس نتواں داد
رایگان گر برد آں ترک بہ یغما چہ کنم

مایۂ تقوی سی سالہ فراہم شدہ است
ارمغانش بہ نگارے بدہم یا چہ کنم

شاہد و بادہ و طرف چمن و جوش بہار
شبلیا خود تو بفرما کہ بہ ایں ہاچہ کنم
شبلی

۱۵/اپریل ۱۹۰۷ء

۴۔ حکیم مولوی قیام الدین بخت جون پوری[۱۸۶۵ء-۱۹۴۸ء] آنریری مجسٹریٹ جون پور، بڑے عالم فاضل شخص تھے۔ ان کے نام علامہ شبلی کے تین خط جناب محمد عرفان جون پوری [محلّہ میر مست، جون پور] کو ان کے خانوادے سے ملے تھے۔ جس کا انہوں نے عکس فراہم کیا ہے۔ اس علمی تعاون کے لئے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔

[۶]

جناب مکرم زاد مجد کم

حاشا وکلا آپ کی نسبت مخالفت اور تنگ خیالی کا وہم بھی نہیں۔ مگر کثرت کار سے خط دعوتی غلطی سے نہ روانہ ہوا۔ اس فروگذاشت کو براہ کرم معاف فرمائیں۔ آپ کی توجہ کا شکریہ۔ عنوان حسب موقع آپ خود تجویز کر سکتے ہیں۔

والسلام

شبلی نعمانی

۱۹ر نومبر ۱۹۰۸ء

[۷]

مکرمی!

والا نامہ سفر میں ملا۔ آج ہی دفتر میں لکھا ہے، وہاں سے کاغذات بھیجیں گے۔ جس قدر کوشش فرمائیے گا، قوم اور دین پر اس کا احسان ہوگا۔

شبلی

از بمبئی

ار نومبر ۱۹۰۹ء

---

[۸]

جناب من

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کو معلوم ہوگا کہ ارکان انتظامیہ ندوہ کی میعاد ممبری ختم ہوگئی ہے۔ اور ۴۸ ارکان کے انتخاب کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے ابتک لوگوں

کے نام انتخاب کر کے دفتر میں نہیں بھیجے ہیں، اسلئے امور ذیل گذارش ہیں

ا۔آپ ۴۸ شخصوں کے نام پیش کر سکتے ہیں۔

۲۔فہرست ارکان سابق مرسلہ مولوی عبدالحئی صاحب آپ کے پاس موجود ہوگی اس کو پیش نظر رکھ کر جو بزرگ قابل افتخار ہوں ان کے نام انتخاب کیجئے۔ یہ انتخاب یا ان بزرگوں کی قابلیت علمی یا وجاہت دنیوی کے لحاظ سے ہو یا اس لحاظ سے ہو کہ ان لوگوں نے زمانہ ممبری میں عمدہ کارگذاری اور ہمدردی کا اظہار کیا۔

۳۔جدید ارکان انتخاب کیجئے یعنی ہر صوبہ کے مشاہیر اور ذی اثر اشخاص کو لیجئے، مثلاً مدراس میں مولانا عبدالسبحان، نواب غلام احمد خاں، بمبئی میں قاضی کبیرالدین، مولوی رفیع الدین بیرسٹر، حاجی یوسف شبانی، کلکتہ میں مولوی شمس الہدیٰ، مولوی یوسف، پنجاب میں مسٹر محمد شفیع، شیخ غلام صادق، بابو نظام الدین ممالک متحدہ میں بہت سے لوگ ہیں، جن کو آپ خود بھی جانتے ہیں۔

۴۔آپ خود اپنا نام بھی پیش کر سکتے ہیں۔

۵۔مدت نامزدگی بہت کم رہ گئی ہے اس لئے فوراً دفتر میں منتخب اشخاص کے نام بھیج دیجئے۔

۶۔دستورالعمل کی رو سے انتخاب ارکان کا جو جلسہ ہوگا اس میں صرف زبانی ووٹ [رائے] لی جائے گی۔ تحریری ووٹ کافی نہیں، اس لئے جب جلسہ کی تاریخ کی اطلاع دی جائے تو جلسہ میں آپ کو خود تکلیف فرمانا چاہئے یا بہ صورت مجبوری وہاں کے کسی معزز صاحب کو بھیجنا چاہئے۔

۷۔انتخاب ارکان کے لئے ووٹ دینا ارکان انتظامی پر محدود نہیں بلکہ ہر ممتاز شخص ووٹ دے سکتا ہے۔ صرف یہ شرط ہے کہ .... بھیج کر ندوہ کا عام ممبر بن جائے اور موقع انتخاب پر موجود ہو۔

عمائدین حضرات ذیل قابل انتخاب ہیں۔

مولوی لطف اللہ مفتی عدالت العالیہ حیدرآباد دکن، مولانا عبدالجبار غزنوی،

مولوی عبداللہ صاحب غازی پوری، مولوی ثناء اللہ امرتسری، ابوبکر شہاب عرب
حیدرآباد مولوی حمید الدین پروفیسر عربی یونیورسٹی الہ آباد
شبلی نعمانی

۱۰رجنوری ۱۹۱۱ء

ان کے علاوہ بھی علامہ شبلی کی غیر مطبوعہ تحریریں نواب حیدرآباد اور ریاست بھوپال وغیرہ کے ذخیروں میں ملنے کی امید ہے۔

مذکورہ بالا غیر مدون اور غیر مطبوعہ تحریروں کی جمع وتدوین نئے معیار و مذاق کے مطابق اس لئے ضروری ہے کہ علامہ شبلی کے بعض افکار وخیالات کی ان سے وضاحت ہوتی ہے۔ علامہ شبلی کی فکر ونظر کے مطالعے و جائزے میں بغیر مذکورہ تحریروں کے کوئی حتمی رائے قائم کرنا اصول دیانت کے بھی خلاف ہوگا۔

خاتمه

خاتمہ

علامہ شبلی کی ذات علم وتحقیق سے عبارت تھی۔انہوں نے علم وادب،تصنیف وتالیف اور تحقیق وتنقید کے میدان میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دئے اور بتیس برس تک ملک وملت کو اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم،نواسنجیوں سے پرشور اور ولولہ انگیزیوں سے جس طرح بیدار رکھا اور اسلام کی عظمت اور مسلمانوں کی سربلندی کا سامان کیا،آثار شبلی کے گذشتہ اوراق دراصل اسی کی تفصیل ہیں۔

علامہ شبلی نے ہندوستان کے یگانہ روزگار علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔مولانا فاروق چریا کوٹی معقولات کے زبردست عالم اور فارسی زبان کے بلند پایہ ادیب وشاعر تھے۔ مولانا ارشاد حسین رام پوری فقہ حنفی میں بے نظیر تھے۔مولانا احمد علی محدث سہارن پوری کو فن حدیث میں دستگاہ کامل حاصل تھی اور مولانا فیض الحسن سہارن پوری بقول مولانا سید سلیمان ندوی'' اس پایہ کے ادیب تھے کہ خاک ہند نے صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو۔'' (۱)ان نابغہ روزگار اساتذہ کے فیض اور شبلی کی عبقریت نے خود شبلی کو بھی نادرہ روزگار بنادیا۔

ان کی علمی زندگی کا آغاز شعروشاعری،درس وتدریس اور مناظرے سے ہوا۔علی گڑھ سے وابستگی سے پہلے کا زمانہ (۱۸۵۷ء-۱۸۸۲ء) جس میں انھوں نے اسکات المعتدی علی انصات المقتدی اور ظل الغمام فی مسئلۃ القرأۃ خلف الامام جیسے رسالے لکھے اور گاؤں گاؤں گھوڑے پر سوار ہوکر مناظرے کئے۔مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں اس کا سبب یہ لکھا ہے کہ وہ غالی حنفی تھے اور ان کے علاقے کے اہل حدیث علماء کے زور سے خود ان کے گھرانے میں تفرقہ پڑ گیا تھا۔اس لئے انھوں نے یہ روش اختیار کی۔(۲) لیکن جوں ہی انھیں احساس ہوا کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے غیر مفید اور سود وزیاں کا مسئلہ نہیں اسے خیر باد کہہ دیا۔

شبلی کی زندگی کا دوسرا دور یا ان کے علمی کارناموں کا پہلا دور دراصل ان کی علی گڑھ کالج سے وابستگی کا زمانہ [۱۸۸۳ء-۱۸۹۸ء] ہے۔۱۸۸۳ء میں جب وہ ایم.اے.او.کالج علی گڑھ سے وابستہ ہوئے اور سرسید احمد خاں کے ربط وتعلق میں آئے، ان کے کتب خانہ سے استفادہ کیا، پروفیسر آرنلڈ سے روابط قائم ہوئے اور یورپ کی علمی تحقیقات سے باخبر ہوئے تو ان کی زندگی اور ان کے افکار وخیالات میں ایک نیا رنگ، غور وفکر کا ایک نیا انداز اور ملت کو تباہی سے بچانے کا ایک نیا عزم و حوصلہ پیدا ہوا۔ یہاں وہ نئے آفاق کی وسعتوں سے روشناس ہوئے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا نقطہ نظر بدلا، تصنیف وتالیف اور شعر وشاعری کے موضوعات میں انقلاب آیا۔ دراصل یہی وہ موقع ہے جہاں سے شبلی کی شخصیت لائق اعتنا قرار پائی اور وہ سب کی نظر التفات کا مرکز بنے۔

تاریخ اسلام کے گہرے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمان اپنی عظمت رفتہ سے ناواقف اور قابل فخر اسلاف کے کارناموں سے بے خبر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یورپ کی ہر اچھی بری ادا پر جان دیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' لکھ کر یہ کوشش کی کہ ان کو ان کی عہد گذشتہ کی بہاریں دکھلائی جائیں۔ان کا سلسلہ نامور فرمارویان اسلام جس کے تحت المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق وغیرہ مایہ ناز کتابیں ان کے قلم سے نکلیں، اصلاً اسی عظمت گذشتہ کی بازیافت کی کوشش کا حصہ ہیں۔ سیرۃ النعمان سے جہاں ان کی فقہ حنفی اور امام اعظم سے گہری وابستگی اور فقہی موشگافیوں سے دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں المامون والفاروق سے اسلام کا مکمل سیاسی ومعاشرتی نظام ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے سیاسی و اقتصادی اور معاشرتی نظام کی الفاروق سے بہتر تصویر اب تک نہ پیش کی جاسکی۔

علی گڑھ جدید تعلیم کا مسلمانوں کا پہلا مرکز تھا۔ شبلی اس سے وابستہ ہوئے تو انہوں نے مولویت کا لبادہ نہیں اتارا بلکہ وہ کسی بھی موقع پر جدید افکار وخیالات سے مرعوب ہوئے اور نہ دبے بلکہ اسلام کی درخشاں تعلیمات کو پیش کرنے میں پیش پیش رہے۔ کالج میں جلسہ سیرت کی بنا انہیں کے مبارک ہاتھوں پڑی جو آج تک تزک واحتشام کے ساتھ منعقد ہوتا ہے۔ انہیں نے درس قرآن کا آغاز کیا۔ تاریخ بدء الاسلام لکھ کر طلبہ میں عشق رسول کی قندیل روشن کی۔(۳) غرض کالج کی فضا میں مذہبی جذبات کی آبیاری بھی ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

جدید افکار وخیالات کے مطالعے اور علی گڑھ تحریک کے تجربات ومشاہدات سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی فوز وفلاح محض جدید علوم وفنون کے اکتساب میں نہیں بلکہ قدیم وجدید کے امتزاج میں ہے اور اسی امتزاج میں انھیں قوم کی ترقی کے سارے سامان نظر آئے۔ چنانچہ ان کا یہ نظریہ اس قدر راسخ تھا کہ وہ جب ۱۸۹۲ء میں روم ومصر وشام کے سفر پر گئے تو وہاں بھی وہ قدیم وجدید کے امتزاج کے نمونے تلاش کرتے رہے۔ ترکی میں ان کے فکر وخیال کا کوئی نمونہ نہیں ملا تو اس پر انہوں نے سفرنامے میں آنسو بہائے اور جب بازار مصر میں اپنے فکر ونظر کے مطابق ایک کالج دیکھنے کا موقع ملا تو انھیں اس یوسف گم گشتہ کے ملنے سے بے انتہا خوشی ہوئی اور وہ بے ساختہ پکار اٹھے کہ اسی میں قوم کی فلاح وبہبود مضمر ہے۔ چنانچہ ایک خط میں سرسید احمد خاں کو اس کی تفصیل لکھی۔(۴) وہ جس قدر تجربات ومشاہدات سے گذرتے رہے، قومی ترقی کا ان کا یہ نظریہ پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا، ان کے اسی فکر وخیال کا پرتو دارالعلوم ندوہ ہے جس کے لئے انہوں نے اپنی ساری قوت اور سب صلاحیتیں لگا دیں، دارالعلوم کی تعمیر کا آغاز کرتے ہوئے انھوں نے قوم کے نونہالوں کے لئے رو روکر دعائیں مانگیں اور بلاشبہہ ندوہ انہیں کی کوششوں کا شجر ثمر بار ہے۔

شبلی کے اس نقطۂ نظر کو چند دانش مندوں کے علاوہ قدیم وجدید دونوں طبقوں نے ناپسند کیا۔ علماء نے جدید خیالات سے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ قدیم روایات کے پاس ولحاظ سے خائف رہا۔ دوسرے لفظوں میں شبلی کا نقطۂ نظر دونوں کے لئے قابل قبول نہ رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم و جدید کی وہ کھائی جسے پاٹ کر شبلی قوم کو ایک نئی زندگی دینا چاہتے تھے، اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن آج شبلی کے اس نقطۂ نظر پر ایک صدی سے زاید کا عرصہ گذرنے کے بعد اس کی صداقت محتاج ثبوت نہیں رہی۔ اس کے متعدد مظاہر سے یہ سب پر واضح ہو چکا ہے کہ اسی پر عمل پیرا ہو کر ملت کو کامرانیوں سے ہم کنار وبامراد کیا جاسکتا ہے۔

اس نقطۂ نظر کے ساتھ شبلی ۱۶/سال علی گڑھ سے وابستہ اور سرسید احمد خاں کے ساتھ رہے۔ علی گڑھ تحریک کو بام عروج پر پہونچانے میں ان کا نمایاں حصہ ہے۔ جس کا آغاز مثنوی صبح امید سے ہوا جس میں شبلی نے سرسید اور ان کی تعلیمی تحریک کو قوم کے لئے صبح امید قرار دیا ہے۔ اس کے بعد وہ مسلسل تحریک علی گڑھ کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لئے کوشاں رہے۔ علی گڑھ تحریک

کوعلم وتحقیق اور تاریخی مطالعات کے ذریعہ استحکام شبلی نے بخشا۔ جدوجہد، علمی انہاک اور پے در پے تصنیفات اور علمی تحقیقات سے اپنی ایک علاحدہ شناخت بنائی۔ بلاشبہہ شبلی کی جامع کمال شخصیت پیرمیکدہ یعنی سرسید کے بعد سب سے زیادہ پرکشش اور جاذب نظر تھی، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پوری علمی دنیا پر چھا گئے۔

بحیثیت استاذ بھی ان کا مقام بہت بلند تھا۔ خود سرسید احمد خاں نے انہیں کالج کیلئے باعث افتخار قرار دیا تھا۔ ہمارے بزرگ پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی نے بھی ان کو ایم اے او کالج کا سب سے نامور استاذ قرار دیا ہے۔ [دھوپ چھاؤں ص ۹۸]

علی گڑھ کے ۱۶/ سالہ قیام میں درس و تدریس کے علاوہ ان کا بڑا کارنامہ تاریخی تحقیقات ہیں۔ الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ، تراجم اور حقوق الذمیین جیسے معرکہ آراء تاریخی مقالات یہیں علی گڑھ میں ان کے قلم سے نکلے۔ ان مقالات کی عظمت یہ ہے کہ شبلی نے ان میں مستشرقین کے الزامات کے ایسے مدلل اور مسکت جوابات دئے ہیں جن کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ جن تاریخی حقائق کو پیش کیا، اہل علم نے ان کی صداقت کا اعتراف اور ان کی تحقیقات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور یہ تسلیم کیا کہ تحقیق و تدقیق کا یہی انداز ہونا چاہئے۔ اس کے اثرات یہ مرتب ہوئے کہ ملک میں تاریخی تحقیقات کا ذوق پیدا ہوا۔ سرسید احمد خاں نے صیغہ ''تصحیح اغلاط تاریخی'' قائم کر کے مولانا شبلی کو اس کا سکریٹری منتخب کیا اور ان کے تاریخی مقالات کو اس سلسلے میں شامل کیا۔

علی گڑھ کالج کی وابستگی کے بالکل ابتدائی دور [۲۰/ جون ۱۸۸۳ء] میں اپنے وطن اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول قائم کیا۔ اس کا بنیادی مقصد قوم کو جدید تعلیم سے بہرہ ور کرنا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے بڑی جدوجہد کی۔ ابتدائی زمانہ قیام میں اکثر اپنی جیب سے اس کے اخراجات کی تکمیل کی۔ یہ اسکول آج شبلی نیشنل پی جی کالج کے نام سے ملک کا ایک اہم تعلیمی ادارہ ہے۔ اصلاً یہ علامہ شبلی ہی کے اخلاص کا ثمرہ ہے۔

علی گڑھ کے زمانہ قیام میں وہ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو اور آرٹس فیکلٹی کے رکن نامزد ہوئے۔ اس کے لئے فارسی کی بعض نصابی کتابیں تیار کیں۔ اس کے اجلاسوں میں اہتمام سے

شریک ہوتے۔ الہ آباد یونیورسٹی کی تاریخ کا وہ بھی حصہ ہیں۔

اردو میں مقالہ نگاری کا آغاز سرسید احمد خاں کے قلم سے ہوا اور بلاشبہ یہ تاج فضیلت انہی کے سر ہے۔ علامہ شبلی نے مقالہ نگاری کی اس روایت کو مزید ترقی دی، تحقیق وتنقید، سند وحوالہ کا اہتمام اور منطقی ترتیب واستدلال سے آراستہ کر کے مقالہ نگاری کو ایک نئی جہت عطا کی۔ آج اردو میں علم وتحقیق اور مقالہ نگاری کا جو انداز قائم ہے، وہ بلاشبہہ شبلی ہی کا فیضان ہے۔ ان کے مطالعہ وتحقیق اور اسلوب وپیش کش اور طریقہ تحقیق وتدقیق ہی کی بنیاد پر پروفیسر خورشید الاسلام نے انھیں پہلا یونانی قرار دیا تھا جو مسلمانوں میں پیدا ہوا۔ (۵)

الجزیہ، حقوق الذمیین ، کتب خانہ اسکندریہ اور الانتقاد سے جس میں مستشرقین کے بے سروپا الزامات کا جدید اصول تحقیق کے مطابق رد کیا گیا ہے، ان سے ہندوستان میں نہ صرف تاریخی تحقیقات کا ذوق پروان چڑھا بلکہ مستشرقین سے علمی محاذ آرائی کا حوصلہ بھی پیدا ہوا۔

شبلی علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین اور لکھنؤ میں ماہنامہ الندوہ کے ایڈیٹر رہے۔ ان دونوں رسالوں میں انھوں نے تقریباً سوا سو بلند پایہ مقالات لکھے جس سے اردو میں تاریخی اور تحقیقی مقالہ نگاری کی روایت کو استحکام نصیب ہوا۔ ان میں بعض کی وہ حیثیت اب باقی نہیں رہی لیکن مقالات کا ایک بڑا حصہ جس کی تفصیل مقالات شبلی کے ضمن میں گذر چکی ہے آج بھی بڑی معنویت کا حامل ہے۔

قرآن وحدیث، فقہ، تاریخ، سیرت وسوانح، تعلیم وتدریس، ادبیات کون سا موضوع و میدان ہے جس میں مولانا شبلی کے جلوہ صد رنگ سے آنکھیں خیرہ نہیں ہوتیں۔ مقالات اور خطوط وخطبات کی گیارہ جلدیں سیرۃ النبیؐ اور بعض دیگر کتب کے ضمنی مباحث سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قرآنیات پر عالمانہ، تفسیر پر مفسرانہ، حدیث پر محدثانہ، فقہ پر فقیہانہ، علم کلام پر متکلمانہ، فلسفہ پر فلسفیانہ، تاریخ پر مورخانہ، سیرت، سوانح اور تعلیم وغیرہ کے متنوع موضوعات پر مجتہدانہ نگاہ رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان موضوعات پر کام کرتے ہوئے ان سے صرف نظر ناممکن ہے۔

شبلی سرسید کی آخری سانس تک علی گڑھ سے وابستہ رہے اور ان کی وفات کے بعد اس سے علاحدہ ہوئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خود کو آخری سانس تک علی گڑھ سے ذہنی طور پر علیحدہ نہ

کر سکے۔علاحدگی کے برسوں بعد کالج کو یونیورسٹی بنانے کی تحریک برپا ہوئی تو انہوں نے اس کی پرزور حمایت کی۔اس کے وفود میں نمائندگی کی،وزیر تعلیم سے ملنے شملہ گئے اور اس کے کئی اجلاسوں میں شریک رہے اور اس کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔البتہ انہیں سرسید احمد خاں کے بعض مذہبی اور سیاسی نظریات سے اختلاف تھا اور وہ اس کا اظہار بھی کیا کرتے تھے۔یہ نظریاتی معاملہ تھا نہ کہ ذاتی۔سرسید کی وفات پر وہ جس طرح رنجیدہ ہوئے اور ان کی عظمت کے اعتراف میں جو مقالہ لکھا وہ سرسید سے ان کے والہانہ لگاؤ کا ایک نمونہ ہے۔اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا،اس لئے کہ ان کی زندگی میں انقلاب سرسید کی دین ہے۔یہیں علی گڑھ میں وہ جدید علوم وفنون،تاریخی تحقیقات اور یورپ اور مستشرقین کے اس ناروا رویے سے باخبر ہوئے جو انہوں نے اسلام کے تئیں روا رکھا تھا اور جس کی تردید وتصحیح میں علامہ شبلی نے از حد جانفشانی سے کام لیا اور ان کے تار پود بکھیرنے کی کامیاب کوشش کی اور یہی شبلی کا وہ قابل فخر کارنامہ ہے جو ان کے معاصرین کے حصے میں نہیں آیا۔

اردو میں سوانح نگاری کا فن مولانا حالی کا کارنامہ ہے،لیکن اس کو ترقی علامہ شبلی نے دی۔اس کے اصول وضوابط بیان کئے،حسن وقبح یعنی صاحب سوانح کے دونوں پہلوؤں کو بیان کرنا ضروری قرار دیا اور اسی کے مطابق سوانح عمریاں لکھیں۔حالی وشبلی کی سوانحی کتابوں میں شخصیات کی عظمت کا فرق ضرور ہے لیکن دونوں کے اپنے تقاضے ہیں۔الطاف فاطمہ نے اپنے تحقیقی مقالے میں سچ لکھا ہے کہ

> ''مولانا شبلی کی روشن اور پرجلال شخصیت اس دور کی سوانح نگاری پر کچھ اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ ان کے معاصرین کی نوشتہ سوانح عمریوں کی حیثیت ضمنی ہوکر رہ گئی ہے۔''(٦)

اسی طرح تاریخ نگاری میں اردو کے عناصر خمسہ میں کوئی ان کا ہم پلہ نہیں۔المامون والفاروق اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر جیسی تاریخی کتابوں کے علاوہ الفاروق اور سیرۃ النبی کے انھوں نے جو طویل اور شاندار تاریخی مقدمے لکھے ہیں وہ اردو ادب کی تاریخ کے مثالی مقدموں میں شامل ہیں اور اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ابن خلدون کے بعد علامہ شبلی پہلے اہل قلم ہیں جنھوں نے تاریخ نویسی کے اصول وآئین منضبط کرنے کی کوشش کی۔(٧)اسی بنیاد پر مہدی افادی نے

انہیں تاریخ کا معلم اول قرار دیا تھا۔(۸)

سرسید نے تزک جہاں گیری وغیرہ فارسی متون کی متنی تحقیق کا آغاز کیا۔ان کے رفقاء میں شبلی نے اردو میں متنی تحقیق وتدوین کا عملی نمونہ تذکرہ گلشن ہند کی تدوین کی شکل میں پیش کیا، یقیناً یہ اولیت ان کے امتیازات میں سے ہے۔

۱۸۹۶ء میں انہوں نے قوم کے سامنے نادر اسلامی کتابوں کی اشاعت کی تجویز پیش کی، ان کا خیال تھا کہ یورپ میں قدیم اور نادر کتابوں کی تلاش وجستجو اور طبع واشاعت کے لئے انجمنیں قائم ہیں، جو بیش بہا خدمات انجام دے رہی ہیں، حتیٰ کہ خود مسلمانوں کی نادرالوجود کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر شایع کر رہی ہیں۔ یہ کام ہمارا تھا، اس لیے ضروری ہے کہ یہ کام ہم خود انجام دیں اور دنیا کو بتائیں کہ مسلمانوں نے علوم وفنون کا کس قدر گراں مایہ ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔(۹)

اس تجویز کو وہ خود عملی جامہ نہ پہنا سکے۔اس کا سبب ایک خط سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مولوی سید علی کے کتب خانے میں عربی مطبوعات یورپ دیکھ کر سخت حیرت زدہ رہ گیا۔علمی زمین نے اپنے خزانے اگل دیے ہیں۔کیا کہوں اپنے علماء کی بدقسمتی اور اپنی مفلسی پر افسوس آتا ہے۔''(۱۰)

اپنی مفلسی اور علماء کی بدقسمتی پر انہوں نے جو آنسو بہائے وہ رایگاں نہیں گئے۔ان کی بدولت اس کی طرف توجہ دی گئی اور بالآخر دائرۃ المعارف حیدرآباد کے قیام اور نوادر کی اشاعت سے ان کی خواہش پوری ہوئی۔(۱۱)

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد جو ملک کی پہلی اردو میڈیم یونیورسٹی تھی اس کا ابتدائی نصاب تعلیم علامہ شبلی ہی کے قلم سے نکلا۔

۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا۔علامہ شبلی اس کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے۔چنانچہ انہوں نے تصنیف وتالیف وترجمہ کے اشاعتی منصوبے بنائے اہل علم اور ادبا وشعرا کو اس کی طرف متوجہ کیا اور اسے ایک فعال ادارہ بنا دیا۔انہیں کی کوششوں سے اخبارات ورسائل کے ایڈیٹر انجمن کے رکن بنے۔مصنّفین نے اپنی کتابیں انجمن کو مفت فراہم کیں۔بہترین کتاب کی

اشاعت پر انعام دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ترجمہ کے لئے ۱۴۰ر کتابوں کا انتخاب کیا۔اسی زمانہ میں انہیں وضاحتی کتابیات کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا۔چنانچہ ان کے مشورے سے اس سلسلہ کی پہلی کتاب محمد سجاد مرزا بیگ نے الفہرست کے نام سے مرتب کی۔[وضاحتی کتابیات،دہلی ۱۹۸۰ء ص ۲۵] علالت کے سبب ۱۹۰۵ء میں اس سے علاحدہ ہوگئے،تاہم قلیل مدت میں انہوں نے انجمن کی جو خدمت کی اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

علی گڑھ کے بعد شبلی نے حیدرآباد کا رخ کیا اور علم کلام کی طرف متوجہ ہوئے۔ان کا خیال تھا کہ ''عباسیوں کے زمانہ میں جب فلسفہ اور علوم عقلیہ کا رواج ہوا تو سیکڑوں ہزاروں اشخاص کے مذہبی عقائد متزلزل ہوگئے۔'' (۱۲) چنانچہ مسلمانوں میں علوم عقلیہ اور فلسفہ کے ماہرین پیدا ہوئے اور انہوں نے اس سیلاب کو روکا۔موجودہ دور میں جب کہ یورپ کی تحقیقات عام ہورہی ہیں اور جدید خیالات قوم میں پھیل رہے ہیں،علماء میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے یورپ کا فلسفہ اور سائنس حاصل کیا ہو۔'' اس لئے ضروری ہے کہ ایک کمیٹی مجلس علم کلام بنائی جائے۔جس میں قدیم علماء اور جدید تعلیم یافتہ دونوں شامل ہوں۔وہ لکھتے ہیں:

> ''قدیم علماء اس بات کا فیصلہ کریں کہ جو عقائد اور مسائل فلسفہ کے خلاف بیان کئے جاتے ہیں،ان میں کون سے مسائل درحقیقت اسلام کے اصل عقائد ہیں اور کون سے نہیں۔جدید تعلیم یافتہ گروہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ جن چیزوں کو فلسفہ کہا جاتا ہے وہ درحقیقت فلسفہ کے مباحث ہیں۔یا نہیں اور اگر ہیں تو فلسفہ کی تحقیقات کہاں تک یقینی اور قطعی ہیں۔'' (۱۳)

اسی فکر وخیال کے تحت علامہ شبلی نے الکلام،علم الکلام،الغزالی اور مولانا روم پر پہلی کتاب سوانح مولانا روم جیسی اہم کتابیں سپرد قلم کیں۔دراصل وہ جدید علم کلام کی تدوین نو کے ذریعہ علماء کو ایک خاص منہج پر لانے کی تدبیر کر رہے تھے۔انہوں نے لکھا ہے کہ ''میں علماء وغیرہ کو جس سطح پر لانا چاہتا ہوں اس کے لئے زینے درکار ہیں۔الغزالی پہلا زینہ ہے،دوسرا علم الکلام پھر اصلی سطح یعنی علم کلام جدید ہے۔'' (۱۴)

پروفیسر خورشید الاسلام نے سلسلہ کلامیہ کو شبلی کی غلط منطق اور ندوہ کو اس غلط منطق کا نتیجہ

قرار دیا ہے۔(۱۵) لیکن وہ شبلی کے تصور مذہب اور ملک وملت کی ترقی کے خاکے کو سمجھنے سے قاصر رہے۔حقیقت یہی ہے کہ شبلی علماء کو جس سطح پر لانا چاہتے تھے،اس میں کامیاب نہیں ہوئے اور اگر انھیں کامیابی مل جاتی تو بلاشبہہ علماء کی سیادت سے یورپ کے اعتراضات کا سد باب ہوجاتا۔

علامہ شبلی کا سلسلہ کلامیہ نامکمل رہا اور کسی قدر بے مقصد بھی۔ الکلام اور علم الکلام میں بعض تصنیفی کمیاں بھی پائی جاتی ہیں،جس پر ایک طوفان برپا کیا گیا۔حتیٰ کہ تکفیر سے بھی گریز نہیں کیا گیا،تاہم موضوع ومقصد کی اہمیت کے اعتراف کے باوجود جدید علم کلام پر کوئی دوسرا کام نہ ہوسکا۔

علامہ شبلی نے ایک صدی قبل جدید علم کلام کی تدوین نو کا منصوبہ بنایا تھا۔موجودہ دور میں یہ کام اور اہمیت کا حامل ہوگیا ہے۔ سائنسی تحقیقات کا یہ دور عروج ہے۔ روز نت نئے انکشافات ہورہے ہیں،اس لئے شبلی کی تجویز جدید علم کلام کی تدوین کا تقاضا اور بڑھ گیا ہے۔

اسی طرح اورنگ زیب عالم گیر پر عاید بے سروپا الزامات کی انھوں نے جس تاریخی شعور اور مضبوط دلائل سے تردید کی وہ ان کے مورخانہ شعور ودانش کا ایک نمونہ ہے۔دور جدید کے مورخین حیرت زدہ ہیں کہ علامہ شبلی نے اس وقت جب کہ مصادر کمیاب تھے کس طرح یہ کارنامہ انجام دیا۔

موازنہ انیس ودبیر اور شعر العجم ان کے دو عظیم الشان ادبی وتنقیدی کارنامے ہیں۔اول الذکر سے اگر موازنہ کا آغاز ہوا اور شعر وشاعری کی اصل حقیقت سمجھنے میں مدد ملی تو دوسری کتاب نے فارسی شعر وادب کو ایک نئی زندگی بخشی۔اگر موازنہ انیس شناسی کا سنگ میل ہے تو شعر العجم صحیفہ حسن وعشق،ان سے شبلی کے جمالیاتی شعور وادراک کے ساتھ اردو میں جمالیاتی،تاثراتی اور عملی تنقید کا آغاز ہوا اور اس خاص معاملہ میں مولانا حالی بھی ان سے پیچھے نظر آتے ہیں۔نظریاتی تنقید میں مولانا حالی کو اگرچہ اولیت کا شرف حاصل ہے تاہم اس دور میں عملی تنقید نگاری شبلی کے حصے میں آئی اور انفرادیت کا یہ تاج کوئی ان کے سر سے اتار نہیں سکتا۔ڈاکٹر عبادت بریلوی کا یہ تبصرہ بجا ہے کہ:

> ’’شبلی کا مرتبہ نقاد کی حیثیت سے مسلم ہے۔ان کی نظر میں وسعت اور گہرائی ہے۔جدت اور اپج ہے اور اس کے اثرات ان کی تنقید میں بھی نظر آتے ہیں۔

تنقید اور ادبی تجزیے کے میدان میں وہ کسی سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔ان کے جمالیاتی ذوق کی بلندی ہر مشکل میں حسن احساس کی صلاحیت اور فارسی ادبیات کے گہرے مطالعے نے ان کو اس مرتبے پر پہونچا دیا ہے جس پر ان کے زمانے میں کوئی نہیں پہونچ سکا۔''(۱۶)

اردو میں تقابلی ادب کا پہلا نمونہ موازنہ انیس و دبیر کی تنقیدی اہمیت اپنی جگہ، شعر العجم تنقید شعر العجم کے باوجود اپنے عہد میں بلکہ ایک صدی بعد بھی اپنا جواب نہیں رکھتی اور آج تک خود ایران میں بھی اس پایہ کی کتاب نہ لکھی جا سکی۔اردو کی یہ کتاب ہندوستان کے علاوہ ایران و افغانستان کے اہل علم وادب کی آنکھوں کا سرمہ بنی ہوئی ہے۔

علامہ شبلی کو شعر گوئی کا فطری ملکہ ودیعت ہوا تھا۔انہوں نے اردو عربی (۱۷) اور فارسی تینوں زبانوں میں داد سخن دی۔خاص طور سے فارسی شاعری میں ان کا کوئی معاصر ہم پلہ نہیں۔البتہ ان کی اردو شاعری کی طرف نقادوں نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں اردو شعراء کی صف میں جگہ نہیں ملی۔حالانکہ ان کی اردو شاعری کم رتبہ نہیں، بلکہ فکر وفن اور بعض جدید ادبی اختراعات کے لحاظ سے اس میں بڑی جاذبیت ہے۔خاص طور پر آخری دور کی مذہبی اور تاریخی نظمیں اردو شاعری کا ایک نیا باب ہیں۔شبلی کی مثنوی صبح امید (۱۸۸۵ء) اور حالی کی مثنوی مدوجزر اسلام (۱۸۷۹ء) کا موضوع ومقصد ایک ہے، بیان اور لب ولہجہ ایک، ایک ہی تحریک کے زیر اثر دونوں وجود میں آئیں، لیکن حالی کی مثنوی کو جو بقائے دوام ملا وہ صبح امید کی قسمت میں نہیں آیا۔گو کلیم الدین احمد نے صبح امید کو مدوجزر اسلام سے فن، تکنیک اور پیش کش کے لحاظ سے بہتر قرار دیا ہے۔(۱۸) ممکن ہے اس میں سچائی نہ ہو، لیکن موضوع ومقصد کی عظمت سے انکار بھی ممکن نہیں اور ایک پہلو سے صبح امید کو برتری یہ حاصل ہوتی ہے کہ مدوجزر اسلام کا بڑا حصہ مرثیہ قوم معلوم ہوتا ہے لیکن صبح امید از اول تا آخر صبح امید ہے۔

فارسی شاعری میں بھی شبلی کا سکہ قایم ہے۔حافظ کا تغزل، شعریت، شراب معرفت اور غالب کا فلسفہ شاعری شبلی کے اشعار میں ایک نئے قالب میں ڈھلا ہے اور رومانویت کے لحاظ سے تو بلاشبہہ عہد شبلی میں کوئی بھی شاعر ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا، یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں

فارسی شاعری میں جدید خیالات باندھنے کے آغاز کا سہرا شبلی کے سر ہے۔ بلکہ اصلاً یہ وہ دھارا ہے جس پر شبلی جدید فارسی شاعری کو لے جانا چاہتے تھے، مگر فارسی شعر وادب کے ذوق کے خاتمہ سے ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

ندوہ اور تحریک ندوہ، فکر وخیال کی ہم آہنگی کی وجہ سے شروع ہی سے علامہ شبلی کی توجہ کا خاص مرکز تھے۔ ندوہ ہی کے لیے انہوں نے علی گڑھ کو خیر باد کہا تھا۔(۱۹) لیکن بوجوہ حیدر آباد کی ملازمت کرنی پڑی۔ اس کے بعد وہ ندوہ سے وابستہ ہوئے۔ یہاں ان کی دلچسپی کا بنیادی سبب قدیم نصاب تعلیم کی اصلاح تھا۔ جس کے لئے وہ برابر آواز بلند کر رہے تھے۔ انہوں نے قدیم نصاب تعلیم کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ نئے زمانے اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام کوششوں کے باوجود نہ مفید ثابت ہو رہا ہے اور نہ ایسے علماء پیدا ہو رہے ہیں، جو نئے حالات کا مقابلہ کرسکیں۔ اس لئے وہ قابل اصلاح ہے۔(۲۰)

اس کے لئے انہوں نے علمی وعملی طور پر بڑی جدوجہد کی۔ علمی طور پر اس کی کمیاں اور خامیاں واضح کیں اور عملی طور پر اس کے نفاذ کے لئے تگ ودو کی۔ تمام تر کوششوں کے باوجود انہیں اپنی زندگی میں اصلاح نصاب کی کوشش میں کامیابی نہیں ملی۔ البتہ بعد میں اس پر کسی قدر عمل ضرور ہوا اور اس کے بہتر نتائج سامنے آئے۔

قدیم نصاب تعلیم کی اصلاح کے لئے آج بھی رک رک کر صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ مذاکرے اور مباحثے ہوتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کے پھونکے ہوئے اس صور سے کسی کو مفر نہیں، اگر علامہ شبلی کی اصلاحات آج بھی قبول کر لی جائیں تو یقیناً ہمارا موجودہ علمی وتعلیمی منظر نامہ بدل سکتا ہے۔ ہماری پس ماندگی کے متعدد وجوہ میں ایک وجہ یہ بھی ہے، علامہ شبلی کے تعلیمی نظریات پر عمل کر کے یقیناً اسے دور کیا جا سکتا ہے۔

علامہ مرحوم نے اس دور میں جب انگریزی تعلیم کو کفر تصور کیا جاتا تھا، اس کی حمایت کی۔ ان کا خیال تھا کہ اسلام پر یورپ کے حملے کا جواب اور اس کا دفاع، انگریزی علوم حاصل کئے بغیر صحیح طور سے نہیں کیا جاسکتا۔(۲۱) وہ انگریزی کے ساتھ ہندی اور سنسکرت کی تعلیم بھی مسلمانوں کے لئے ضروری خیال کرتے تھے۔ دارالعلوم ندوہ میں انھوں نے ہندی اور سنسکرت کی تعلیم کا شعبہ

قائم کیا اور اس کی تعلیم کے لئے ایک پنڈت مقرر کیا۔(۲۲) اس سے ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسلام اور مسلمانوں پر آریوں کی طرف سے جو حملے ہو رہے ہیں، ان کا جواب دیا جائے، جو ہندی و سنسکرت سے واقفیت کے بغیر خاطر خواہ طور پر نہیں دیا جا سکتا۔

۱۰۰ سال پہلے کی پیش کردہ ان تجویزوں پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ دور اندیش شبلی کے خیالات صدفی صد درست تھے اور آج ہم جن مراحل سے گذر رہے ہیں، ان میں انگریزی، ہندی اور سنسکرت زبانوں کے بغیر نئے زمانے کے تقاضوں سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔

علامہ شبلی کے دور میں قرآن مجید کے جتنے ترجمے یورپین زبانوں میں دستیاب تھے، وہ سب عیسائیوں کے قلم سے تھے۔ جس میں انھوں نے بد دیانتی سے کام لیا تھا اور ناروا تاویلات و تلبیسات کی تھیں۔ ان ترجموں کی بنیاد پر وہ غلط فہمیاں پھیلا رہے تھے اور حکمراں انگریز انھیں سے استفادہ کر کے مسلمانوں کے تمام مسائل میں رخنہ انداز ہوتے تھے۔ اس لئے علامہ مرحوم کو ایک صحیح اور مستند ترجمہ قرآن کا خیال پیدا ہوا۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ غیر مسلم قرآن مجید سے استفادہ کریں تو صحیح اور مستند ترجمہ ان کے پیش نظر رہے۔ علامہ کی اس تجویز کی بڑی پذیرائی ہوئی اور اسے عملی جامہ پہنانے کی کوششیں کی گئیں۔ نواب سید حسین بلگرامی نے اس کا ذمہ لیا، بعض رؤسا نے اس کے اخراجات کی ذمہ داری قبول کی، چنانچہ پانچ پاروں کا ترجمہ شائع ہوا۔(۲۳) مگر پھر علامہ شبلی نے اچانک وفات پائی اور یہ کام آگے نہ بڑھ سکا۔ البتہ بعد کے لوگوں نے یہ کارنامہ انجام دیا اور اس سلسلہ کی علامہ کی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں اور اب کئی معتبر انگریزی ترجمے دستیاب ہیں۔

ان کی زندگی کے آخری دور میں ارتداد کا فتنہ برپا ہوا اور آریوں نے بڑے منظم انداز میں مسلمانوں کے عقائد و خیالات پر حملے شروع کئے اور نومسلموں کو دوبارہ ہندو بنانے کی تحریک چلائی۔ اس کے مقابلہ کے لئے علماء میں جو شخص سب سے پہلے میدان میں آیا وہ علامہ شبلی تھے، انھوں نے ارتداد سے متاثرہ علاقوں شاہ جہاں پور اور رائے بریلی وغیرہ کا دورہ کیا۔ دیہاتوں میں واعظ بھیجے اور اپنے مضامین سے تمام اہل علم اور دردمندان قوم کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے لئے انھوں نے متعدد منصوبے بنائے اور حفاظت و اشاعت اسلام کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔(۲۴)

اس سلسلے میں علامہ شبلی نے یہ تجویز پیش کی کہ اس کے لیے ایک کمیٹی بنائی جائے، جس

میں تمام صوبوں کے نمائندے ہوں۔ تنظیم کا سکریٹری تمام کارروائی پر نظر رکھے۔ واعظ مقرر کئے جائیں جو دو-دو، چار- چار مہینے ایک ایک گاؤں میں رہ کر لوگوں کو اسلام کے احکام سکھائیں۔ واعظوں کے تیار کرنے کا بھی انتظام کیا جائے۔ جا بہ جا مکاتب قائم کئے جائیں، جن میں قرآن اور اردو کی تعلیم دی جائے۔ دیہاتوں میں جو مکاتب ہیں ان میں مسلمان مدرسین مقرر کرائے جائیں۔ دینیات کا ایک ایسا نصاب تیار کیا جائے جو انگریزی خواں طلبہ کے لئے مفید ہو۔ ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو آریوں سے مناظرہ ومباحثہ کرے اور جو بھاشا اور سنسکرت سے بھی واقف ہو۔ آریوں کے مہمات عقائد کے رد میں رسالے شائع کئے جائیں۔(۲۵) غرض منظّم انداز میں آریوں کا مقابلہ کیا جائے۔

علامہ شبلی نے اپنے مضامین میں اشاعت وحفاظت اسلام کا پورا خاکہ مرتب کر دیا ہے۔ داخلی ضرورتوں کے ساتھ خارجی ضرورتوں کو بھی انھوں نے تفصیل سے واضح کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مخالفین کے اعتراضات اور حملوں کا جواب دینا ہی کافی نہیں بلکہ آگے بڑھ کر اسلام کی سچی تعلیمات کو بھی عام کیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہمارے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ہم بے کس بن کر صرف دوسروں کے حملہ سے اپنے آپ کو بچائیں۔ اسلام اس لئے آیا تھا کہ تمام دنیا پر اپنے آپ کو پیش کرے، اس لئے ضرور ہے کہ ہم دوسری قوموں میں اپنے واعظ اور داعی بھیجیں جو اسلام کی تبلیغ کریں۔ یہ قطعی ہے کہ اگر صحیح طور سے مذہب اسلام دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کیا جائے تو ہزاروں، لاکھوں اشخاص نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ میں بھی اسلام کو بے تکلف قبول کر سکتے ہیں۔''(۲۶)

اشاعت وحفاظت اسلام کے سلسلے میں علامہ شبلی کے یہ خیالات اس وقت کے ہیں جب ملک میں کوئی قابل ذکر ملی تنظیم موجود نہ تھی۔ بعد میں جو تنظیمیں وجود میں آئیں جن کے ہاتھوں میں آج ملت کی قیادت ہے کیا ان کے دستور العمل اور عملی جدوجہد کا طریقہ کار علامہ شبلی کے افکار سے مستعار نہیں؟ درحقیقت بعد کے ہندوستان میں مسلمانوں کی جو تنظیمیں قائم ہوئیں وہ علامہ شبلی کے تخیلات کی بازگشت ہیں۔

ملک کی موجودہ صورت حال میں علامہ شبلی کے منصوبہ اشاعت اسلام کی افادیت کم نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہی طریقہ کار اپنا کر ایک بار پھر مخالفین اسلام کے عزائم کے تار پود کو بکھیرا جا سکتا ہے۔

عہد شبلی میں صحافت کے میدان میں مسلمانوں کا اپنا کوئی اخبار نہیں تھا۔اس کا احساس سب سے پہلے علامہ کو ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اس کے لئے بڑی تگ و دو کی۔۱۹۱۲ء میں سید میر جان نے لکھنؤ سے مسلم گزٹ جاری کیا جو دراصل علامہ شبلی ہی کی تمام تر کوششوں کا نتیجہ تھا۔(۲۷)

ہندوستان میں مسلمانوں کا اب تک کوئی آزاد اخبار نہیں ہے جو ان کے خیالات کی ترجمانی کر سکے۔ مولانا شبلی کی بصیرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو اس زمانہ میں اس کا خیال پیدا ہوا۔ اس کے لئے انھوں نے عملی کوشش بھی کی۔ مولوی وحید الدین سلیم کو علی گڑھ سے بلا کر ایڈیٹر بنایا۔ مضامین لکھے اور دوسروں کو بھی اس کی طرف متوجہ کیا۔ ان کی ان کوششوں سے مسلم گزٹ بہت جلد مقبولیت کے آسمان پر چمک اٹھا مگر قوم کی بدمذاقی سے علامہ شبلی کی یہ کوشش بارآور نہ ہو سکی۔(۲۸) ایک ایسا اخبار جو مسلمانوں کے مسائل کو واضح اور مسلم کاز کی ترجمانی کرے جاری کر کے علامہ شبلی کی ایک خواہش کی تکمیل کی جا سکتی ہے۔

علامہ شبلی نے مسلمانوں کے جن مسائل کے لئے تحریک چلائی۔ ان میں ایک وقف علی الاولاد بھی ہے۔ اسلام نے وقف کے دائرے میں اولاد کو بھی شامل کیا ہے۔ انگریز جج اسے تسلیم نہیں کرتے تھے اور اسے ناجائز قرار دیتے ہوئے عدالتوں میں فیصلے صادر کرتے تھے جس کی وجہ سے مسلمانوں کی متعدد جائیدادیں ان کے ہاتھوں سے نکل گئیں۔ علامہ شبلی نے اس کے خلاف تحریک چلائی اور ہندوستان کے ممتاز علماء اور قانون دانوں سے رابطہ کیا۔ خود رسالہ وقف اولاد لکھا اور ثابت کیا کہ وقف علی الاولاد جائز ہے۔ ہندوستان کے ممتاز علماء میں جس میں ہر مکتبہ فکر کے لوگ شامل تھے، ان سے تائید حاصل کی، مختلف شہروں کا دورہ کر کے رائے عام ہموار کی، حتی کہ کونسل کے مسلمان ممبروں کے ساتھ ہندو ممبروں کو بھی اس کی حمایت کے لئے آمادہ کیا۔ غرض اسے ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک مسلمہ مسئلہ بنا دیا۔ محمد علی جناح کے ذریعہ حکومت کے سامنے چالیس ہزار اشخاص کے تائیدی دستخط کے ساتھ سفارشات پیش کرائیں اور وقف علی الاولاد کا قانون منظور

کرا کے ہی دم لیا۔(۲۹)

اسی طرح انھوں نے تعطیل جمعہ کے لئے بھی ہندوستان گیر پیمانہ پر جدوجہد کی اور حکومت سے تعطیل جمعہ منظور کرائی۔(۳۰)

سیرۃ النبیؐ شبلی کا آخری عظیم الشان علمی، تحقیقی اور تصنیفی کارنامہ ہے۔اس کا آغاز انھوں نے اس عزم کے ساتھ کیا تھا کہ ''اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو انشاءاللہ دنیا کو ایک ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہوسکتی۔''(۳۱)اور واقعہ یہ ہے کہ سیرۃ النبیؐ ان کا ایسا ہی عظیم الشان کارنامہ ہے۔اس کے متعلق بعض اہل قلم نے لکھا ہے کہ اس سے بہتر کتاب اردو تو کیا عربی میں بھی نہیں لکھی گئی۔(۳۲)اس خاص معاملہ میں ان کا کوئی مدمقابل نہیں تھا بلکہ آج تک پیدا نہیں ہوا۔

مولوی محمد حسین آزاد کے بارے میں شبلی نے ایک خط میں لکھا ہے کہ وہ گپیں بھی ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔(۳۳) بلاشبہہ آزاد اردو کے بانکے انشاء پرداز تھے لیکن اسلوب نگارش کے معاملہ میں اردو ادب کی تاریخ میں شبلی کا کوئی حریف نہیں۔ان کی رنگین، دلکش اور ایجاز و اختصار کی خوبی سے لبریز نثر، جس میں بڑی رعنائی و زیبائی پائی جاتی ہے، ان کا مابہ الامتیاز ہے۔نثر میں سادگی و سلاست سرسید کا امتیاز ہے۔سادگی، شائستگی اور سنجیدگی نثر حالی کی خوبی ہے اور یہ تمام خوبیاں شبلی کی نثر میں پائی جاتی ہیں، رنگینی و رعنائی، الفاظ کی قوت، جوش، تکرار، شعریت، نغمگی، فصاحت و بلاغت، جملوں کی متانت، سنجیدگی و وقار بے شمار اوصاف سے شبلی کا اسلوب متصف ہے۔دل میں اتر جانے اور ذوق و وجدان پر اثر انداز ہوجانے کی جو کیفیت نثر شبلی میں ہے، ان کے معاصرین کی نثر میں وہ بات نہیں۔یہی وجہ ہے کہ المامون و الفاروق، خطوط شبلی اور سیرۃ النبی کے متعدد جملے ادب و انشاء کا نمونہ ہیں۔صحیح یہ ہے کہ شبلی نے نثر میں شاعری بلکہ ساحری کی ہے۔الفاروق کے متعدد اقتباسات خاص طور پر سیرۃ النبی ﷺ میں ظہور قدسی کا اقتباس ادب عالیہ کا ایسا شاہکار ہے جس کی پوری اردو تاریخ میں مشکل سے کوئی دوسری مثال مل سکتی ہے۔

علامہ شبلی محض مصنف نہ تھے بلکہ مصنف گر بھی تھے۔(۳۴) اپنے پیچھے انھوں نے اہل قلم اور مصنّفین کا ایک کارواں یادگار چھوڑا۔ علامہ حمید الدین فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی،

مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا ضیاء الحسن ندوی، مولانا عبدالباری فلسفی، مولانا عبدالماجد دریابادی، عبداللہ العمادی، مولانا اقبال سہیل وغیرہ ان کی جوہر شناسی اور تربیت کے نمونے تھے، جو بجائے خود اپنے آپ میں ایک انجمن اور ایک ادارہ تھے۔ اس سلسلے کو اور وسعت دی جائے تو مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، سید سجاد حیدر یلدرم اور مولانا ظفر علی خاں کے علمی، ادبی، ملی اور سیاسی کارنامے بھی صدائے شبلی ہی کی بازگشت تھے۔

علامہ شبلی سے ان کی زندگی ہی میں بے شمار افراد متاثر ہوئے۔ خاص طور سے انہوں نے اپنے تلامذہ میں اپنے اثرات اس طرح ثبت کئے کہ وہ ان کے امتیازات ثابت ہوئے۔ مثلاً سیرت نبویؐ کے تالیف و تدوین کے لئے مولانا سید سلیمان ندوی کا انتخاب کیا اور ان کی تربیت کی۔ سیرۃ النبیؐ کو پایہ تکمیل تک پہونچا کر اور خطبات مدراس و رحمت عالم لکھ کر انہوں نے ثابت کر دیا کہ سیرت نبویؐ کی تدوین و تکمیل کی خواہش شبلی نے ان سے بجا طور پر کی تھی۔

شعر و ادب، تاریخ و تذکرہ، تحقیق و تنقید اور کلام و عقائد کے متنوع پہلوؤں پر مولانا عبدالسلام ندوی کی کاوشیں اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی علمی، ادبی، تنقیدی خدمات، اقبال سہیل کی شاعری، مولانا محمد علی جوہر کے سیاسی کارنامے سب شبلی کے فیض تربیت کا نتیجہ تھے۔

۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نعمانی نے وفات پائی اسی دن الہلال کا آخری شمارہ شایع ہوا، سب جانتے ہیں اس کے پس پشت وہ کون سی طاقت تھی جو الہلال کو روشنی کا نقیب بنائے ہوئے تھی۔ سید طفیل احمد منگلوری نے لکھا ہے کہ ''مسلمانوں کو سیاست کے طرف لانے میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی کے شریک کار رہے۔'' (۳۵)

شبلی کا آخری علمی منصوبہ دارالمصنّفین کا قیام ہے۔ ۱۱ر فروری ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نے الہلال کلکتہ میں دارالمصنفین کے قیام کی تجویز اور اس کا خاکہ قوم کے سامنے پیش کیا۔ اپنی اور اپنے اعزہ کی قیمتی جائدادیں وقف کیں۔ اسے وہ اپنا آخری میدان عمل اور زمرہ مصنفین کی دائمی خدمت خیال کرتے تھے۔ (۳۶) دارالمصنّفین کا بنیادی مقصد اعلیٰ مصنّفین اور اہل قلم کی جماعت تیار کرنا اور بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف و ترجمہ اور ان کے طبع و اشاعت کا انتظام کرنا تھا۔ (۳۷) بلا شائبہ مبالغہ یہ ادارہ تقریباً ایک صدی سے اپنے مقاصد کے حصول میں سرگرم ہے، دوسو

سے زاید بلند پایہ اور معرکہ آرا کتابیں اپنے مصنفین سے لکھوا کر شائع کر چکا ہے۔ اس کی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ آج قومی سرمائے میں سب سے قیمتی علمی ذخیرے کا اضافہ دارالمصنّفین نے کیا ہے اور سب سے زیادہ اہل قلم اور مصنفین اسی کے زیر اثر پیدا ہوئے۔ (۳۸)

دارالمصنّفین نے سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، تابعین، تبع تابعین، تاریخ اسلام، استشراق اور مستشرقین، تاریخ ہند، شعر و ادب، سوانح، مکاتیب، سفر نامے، غرض مختلف النوع موضوعات پر گراں قدر کتابیں شائع کیں۔ اس ادارے نے حتی المقدور زمانہ کی رفتار سے ہم آہنگ ہو کر نئی ضرورتوں اور نئے تقاضوں پر علمی کام کیا۔ مالی وسائل کی کمی، مناسب افراد کی نایابی کے باوجود اس ادارہ نے جو علمی ذخیرہ قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس کی مثال شاید ہی مل سکے۔ تاہم بہت سے کام ایسے بھی ہیں جو وہ انجام نہ دے سکا، مثلاً سیرۃ النبی پر مولانا سید سلیمان ندوی کے بعد کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا۔ تاریخ اسلام کی چار جلدوں کے بعد یہ سلسلہ رک گیا۔ تاریخ اندلس حصہ اول کے بعد بقیہ حصے شائع نہ ہو سکے۔ تاریخ ہند پر کوئی مبسوط اور مدلل کتاب بھی نہ لکھی جا سکی۔ شبلی کے سلسلہ ناموران اسلام کا ایک حصہ بھی سپرد قلم نہ ہو سکا۔ ناموران اسلام اور حکمائے اسلام پر جس قدر کام ہونا چاہئے تھا، وہ بھی نہ ہو سکا۔ ایسا محض مالی دشواریوں، اہل علم اور ارباب دولت کی بے توجہی کی وجہ سے ہوا۔ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ دارالمصنّفین جو تحقیق و تصنیف کا سب سے بڑا ادارہ تھا، قوم کی بد مذاقی کی وجہ سے اپنے عزائم کی تکمیل شایان شان طور پر نہ کر سکا۔ قومی ترقی کا سارا دارو مدار علمی، دماغی اور ذہنی ترقی پر منحصر ہوتا ہے۔ علامہ شبلی نے اسی مقصد کے حصول کے لئے یہ ادارہ قائم کیا تھا، مگر افسوس کہ قوم کے صاحب ثروت افراد اس ادارہ حکمت و دانش کو خاطر خواہ ترقی دینے کے اسباب فراہم کرنے سے قاصر رہے۔ اگر آج بھی اسباب و وسائل پیدا ہو جائیں تو یقین ہے بدلے ہوئے حالات میں بھی دارالمصنّفین قوم کی ذہنی و فکری تربیت اور رہنمائی کا سامان کر سکتا ہے۔

علامہ شبلی، ندوہ میں مخالفین کی روز روز کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آ کر مستعفی ہوئے اور وطن کی طرف مراجعت کی تو انہیں دارالمصنّفین، شبلی کالج اور مدرسۃ الاصلاح جو ابتدا ہی سے ان کی توجہ کا مرکز تھا، ان سب کو ملا کر ایک وسیع جامعہ اسلامیہ کا خیال آیا مگر ان کی زندگی کی شام ہو چکی

تھی، اس لئے یہ خیال عمل میں نہ آسکا۔ تاہم یہ تینوں ادارے حتیٰ المقدور شبلی کے خوابوں کو تعبیر دینے میں سرگرداں ہیں۔

علامہ شبلی کے پیش نظر ایک علمی رسالہ معارف کا اجرا بھی تھا۔ اس کا خاکہ بھی وہ بنا گئے تھے، مگر ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اسے عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے تلامذہ مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی نے علامہ کی خواہش کے مطابق جولائی ۱۹۱۶ء میں معارف جاری کیا۔ معارف اس وقت سے اب تک بلا ناغہ شائع ہو رہا ہے۔ سیکڑوں موضوعات پر ہزاروں علمی و تحقیقی نگارشات شائع ہو چکی ہیں۔ (۳۹) جس کی برصغیر کی تاریخ میں مثال نہیں مل سکتی۔ اس کی حیثیت انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں۔ اس کی اہمیت شاعر مشرق علامہ اقبال کے اس قول سے ظاہر ہے کہ ''معارف ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔'' (۴۰)

شبلی کو عملی سیاست سے گو سروکار نہیں رہا اور نہ انھوں نے اس میدان میں قدم رکھا تاہم انہیں ملکی اور بین الاقوامی سیاست سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے انہیں ہندوستان کے فرزندان حریت کا باوا آدم قرار دیا ہے۔ (۴۱) ان کے سیاسی نظریات جس میں خاص طور پر ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کے جذبات اور ایک دوسرے کا مونس و غم خوار ہونے کا انھوں نے جو نظریہ پیش کیا اور اس دور کے مسلمان دانشوروں کے عام نقطہ نظر کے برعکس کانگریس کی حمایت کی اور مسلم لیگ کو قابل اصلاح قرار دیا۔ قوم و ملت کی ترقی اور مسلمانوں کی فوز و فلاح کے اس نظریہ کی صداقت سے آج کون انکار کر سکتا ہے۔ ان کے انہیں نظریات پر عمل پیرا ہو کر ان کے تلامذہ و مستفیدین مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں وغیرہ نے ہندوستان میں قوم و ملت کی خدمت کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا جسے ہندوستان کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

ان کا مشہور مقالہ ''مسلمانوں کی پولٹیکل کروٹ'' ہندوستان کے مسلمان سیاسی دانشوروں کے لئے منشور کا درجہ رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مقالے نے ہندوستان کی ملی سیاست کا رخ بدل دیا۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر قومی جد

وجہد کرنی چاہئے۔ یہ خیال غلط ہے کہ کانگریس میں شامل ہونے سے مسلمانوں کا تشخص اور وجود مٹ جائے گا۔ انہوں نے اس وقت یہ مشورہ دیا تھا کہ سیاست سے دور رہنا مسلمانوں کے لئے مضر ہوگا اور مسلمانوں کو سیاست میں عملاً حصہ لینا چاہئے۔ علامہ شبلی نے مسلم لیگ کے نظریہ سیاست کو نامناسب اور قابل اصلاح قرار دیا اور مسلمانوں کو مخاطب کر کے لکھا تھا کہ انگریزی حکومت کی ناز برداری نہیں کرنی چاہئے بلکہ دکھا دینا چاہئے کہ اسے جانوں پر اختیار ہے، رایوں پر نہیں۔

علامہ شبلی نے اپنے نقطہ نظر کو بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا تھا، اس پر بحث ومباحثہ ہوا اور علامہ پر سخت تنقیدیں ہوئیں اور بڑی برہمی کا اظہار ہوا۔ خاص طور پر لیگیوں میں ابال آیا، لیکن شبلی کے خیالات اس قدر مدلل تھے کہ انہیں تسلیم کرنا پڑا اور مسلم لیگ کی اصلاح کا وعدہ کیا گیا، تاہم جذبات کی رو میں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ان کا ہم خیال نہ ہوسکا۔ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بڑی دوریاں اور غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ انگریزوں نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ ملک کی آزادی میں تاخیر اور تقسیم کا ایک بنیادی سبب شبلی کے سیاسی نظریات سے قوم کا اغماز برتنا بھی ہے۔

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو قوم پرور مسلمانوں کی سیاسی خدمات علامہ شبلی کے اسی نظریہ کی دین ہے۔ سید طفیل احمد منگلوری نے سچ لکھا ہے کہ:

> ''جب سے مسلمان فرقہ وارانہ سیاست سے نکل کر عام ملکی سیاست میں داخل ہوئے، قدیم تعلیم یافتگان کا حصہ اس میں نمایاں ہوگیا، بلکہ انہوں نے ہی مسلمانوں کو فرقہ پرستی کے دلدل سے نکالنے میں خاص کام کیا جن میں سب سے اول مولانا شبلی نعمانی تھے۔'' (۴۲)

جمعیۃ علماء کا قیام مولانا شبلی کے انتقال کے بعد ہوا۔ اس سے پہلے کانگریس کی حمایت اور فرقہ وارانہ سیاست کی مخالفت کا کام ہندوستان میں مولانا شبلی ہی نے انجام دیا۔ اپنی نظموں میں انہوں نے مسلم لیگ پر جو سخت چوٹیں کیں وہ دراصل فرقہ واریت کے خلاف بلند ہونے والی ہندوستان میں پہلی آواز تھی۔

علامہ شبلی شروع ہی سے آزادی وحریت کے علم بردار رہے۔ خاص طور سے طلبہ کے اندر جذبہ حریت اور حریت فکر پروان چڑھانے میں نمایاں حصہ لیا۔ کانگریس کی حمایت ہو یا مسلم لیگ کی

اصلاح، احرار کی سرپرستی ہو یا خدام الدین کی تربیت، ان کی ان تمام کاوشوں کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کی صحیح رہبری ورہنمائی تھا۔ بلاشبہ یہ ان کی سیاست پر گہری نظر اور تدبیر مدن کا نتیجہ تھا۔

علامہ شبلی نے اپنے عہد کی عالمی سیاست سے بھی دلچسپی لی۔ اس وقت چونکہ خلافت قائم تھی اور ترکی اس کا مرکز تھا۔ اس لئے انگریز اسے تباہ و برباد کرنے کے درپے تھے۔ علامہ شبلی کو ترکوں سے ابتداء ہی سے بڑی محبت تھی۔ ۱۸۷۷ء میں روس نے ترکی پر حملہ کیا، عالم اسلام اور ہندوستان میں ترکوں کی حمایت اور تعاون کے لئے جلسے ہوئے تو علامہ شبلی نے اعظم گڑھ میں تین ہزار کی رقم جمع کی اور بمبئی جا کر ترکی سفیر حسین حبیب آفندی کے ذریعہ قسطنطنیہ بھجوایا۔ ۱۸۹۶ء میں انگریزوں کی شہہ پر آرمینیا جو ترکی خلافت کا حصہ تھا اس کے عیسائی باشندوں نے شورش و بغاوت کی، ترکی نے اس کے سد باب کی کوشش کی تو پورا یورپ چیخ اٹھا اور ترکی پر ظلم وجبر کا الزام عائد کیا۔ اصلاً وہ آرمینیا کو ترکی سے علاحدہ کرنا چاہتے تھے، علامہ شبلی نے ایک مضمون ''آرمینیا'' لکھ کر ان کے کذب وافترا کا پردہ چاک کیا اور ثابت کیا کہ شورش و بغاوت ارمن عیسائیوں نے کی، انگریز انہیں شہ دے رہے ہیں اور جھوٹا الزام ترکی پر عاید کر رہے ہیں۔ یہ مسئلہ اب تک زندہ ہے اور اس سلسلہ میں ترکوں پر آرمینیا کے عیسائیوں کی نسل کشی کا الزام ہے، حالانکہ واقعیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال ترکوں کی اسی محبت میں علامہ نے ترکی کا سفر کیا۔ جہاں ان کا بڑا اعزاز واکرام ہوا اور تمغۂ مجیدیہ سے سرفراز کیا گیا۔ جنگ بلقان کے زمانہ میں تو وہ اتنے پرجوش تھے کہ اپنی نظموں کے ذریعہ پورے ہندوستان کو سراپا غیظ وغضب بنا دیا تھا۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

ترکوں کی حمایت میں ان کے بعض مضامین اور خاص طور سے ان کی پرجوش اور سراپا رجز نظموں کی وجہ سے وہ انگریزی حکومت کی نظروں میں مشکوک ٹھہرے۔ ان پر خاص نظر رکھی جانے لگی بلکہ جاسوسوں کا پہرہ بٹھا دیا گیا۔ (۴۳) تمغۂ مجیدیہ کے استعمال کی اجازت نہیں دی گئی۔ (۴۴) پھر اسے غائب کرا دیا گیا۔ (۴۵) انہیں پین اسلام ازم اور جمال الدین افغانی کا ہم نوا اور ترکی حکومت کا ہمراز خیال کیا گیا اور بلاشبہ علامہ شبلی اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے انگریزوں کے

خلاف رہے۔ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ عالمی سیاست میں بھی وہ انگریزوں کے استعماری نقطہ نظر کے سخت مخالف رہے۔

بظاہر یہ ایک عام سی بات معلوم ہوتی مگر درحقیقت مسلم لیگ جس کی انہوں نے اپنی نظموں میں سخت ہجو کی ہے، اس کے سامنے ہندو مسلم اتحاد کا نظریہ پیش کرنا اور ظالم انگریزی حکومت کی رعایا ہونے کے باوجود ترکوں کی حمایت اور انگریزوں کی مخالفت، علامہ شبلی کی نہ صرف اسلامی حمیت وغیرت کا نمونہ ہے بلکہ جرات حق گوئی و بے باکی کی مثال بھی ہے۔

علامہ شبلی کے لازوال کارناموں کی ایک طویل داستان ہے، جو حیات شبلی کے ۹/سو صفحوں میں بھی سمانہ سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی ایسے ہوش مند عالم ودانشور تھے جنہوں نے قومی زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی ورہبری کی۔ ان کے افکار ونظریات اوران کی تصنیفات وتالیفات کی عظمت اور معنویت اب بھی باقی ہے اور قوم آئندہ بھی اس سے صرف نظر نہ کر سکے گی۔

حوالے

(۱) حیات شبلی۔ ص ۸۰

(۲) حیات شبلی ص ۱۰۹-۱۱۰

(۳) ڈاکٹر انور محمود خالد۔ اردو نثر میں سیرت رسولؐ۔ اقبال اکادمی لاہور۔ ۱۹۸۹ء

(۴) مکاتیب شبلی۔ جلد ا۔ ص ۴

(۵) خورشید الاسلام۔ تنقیدیں ص ۸

(۶) اردو ادب میں فن سوانح نگاری۔ ص ۱۱۳

(۷) سرسید اوران کے نامور رفقاء۔ ص ۱۷۲

(۸) افادات مہدی۔ ص ۱۹۲

(۹) محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڑھ۔ مئی ۱۸۹۶ء۔ ص ۲۱۶

(۱۰) مکاتیب شبلی۔ جلد ا۔ ص ۱۳۲

(۱۱) مقالات شبلی جلد ۸۔ ص ۶-۷

(۱۲) ایضاً۔ جلد ۸۔ ص ۵۳

(۱۳) ایضاً۔جلد۸۔ص۵۴

(۱۴) مکاتیب شبلی۔جلد۱۔ص۲۰۱

(۱۵) تنقیدیں ص۴۲

(۱۶) اردو تنقید کا ارتقاء۔ص۱۸۷۔علی گڑھ ۱۹۸۸ء

(۱۷) عربی کے چند شعر، رسالہ ظل الغمام میں درج ہیں۔

(۱۸) اردو شاعری پر ایک نظر

(۱۹) مکاتیب شبلی ج۲ص۱۸۲

(۲۰) حیات شبلی۔ص۴۱۲

(۲۱) ایضاً۔ص۴۱۶

(۲۲) ایضاً۔ص۴۲۱

(۲۳) مقالات شبلی۔جلد۸۔ص۴۸-۵۲

(۲۴) ایضاً۔جلد۸۔ص۱-۱۵۔وحیات شبلی۔ص۵۷۴۔۵۷۵

(۲۵) مقالات شبلی۔جلد۸۔ص۱-۲

(۲۶) ایضاً۔جلد۸۔ص۱۰

(۲۷) حیات شبلی۔ش۶۱۱-۶۱۴

(۲۸) ایضاً

(۲۹) ایضاً۔ص۵۴۶-۵۴۸

(۳۰) ایضاً۔ص۵۴۸-۵۵۲

(۳۱) مکاتیب شبلی۔جلد۱۔ص۲۴۲

(۳۲) شاہ معین الدین احمد ندوی۔معارف سلیمان نمبر ص۱۷۸

(۳۳) مکاتیب شبلی ج۲ص۲۱۲۔

(۳۴) شبلی نقادوں کی نظر میں ص۲۹

(۳۵) سید طفیل احمد منگلوری۔مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ص۳۹۱ لاہور

(۳۶) مکاتیب شبلی ۔جلد۲۔ص۱۹۳

(۳۷) تعارف دارالمصنّفین اعظم گڑھ (ب ت)

(۳۸) دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات ۔ص۳۔خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ۔۲۰۰۲ء

(۳۹) محمد سہیل شفیق ۔اشاریہ معارف اعظم گڑھ۔قرطاس کراچی ۔۲۰۰۶ء

(۴۰) اقبال نامہ۔جلد ا۔ص۸۰

(۴۱) ماہنامہ معارف ۔شذرات ستمبر ۱۹۱۶ء

(۴۲) مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ص۳۸۶

(۴۳) حیات شبلی ص۲۳۴۔طبع جدید ۲۰۰۸ء

(۴۴) ایضاً ص۱۸۶

(۴۵) ایضاً ص۲۳۴

اشاریہ وکتابیات

اشخاص

کتب ورسائل

(ب)

○○○

مقامات

(پ)

○○○

تنظیم/تحریک/ادارے
کالج/یونیورسٹی

○○○

پبلشرز/مطابع

○○○

سادہ

کتابیات

کتابیات

۱۔ آغاز اسلام ترجمہ: بدءالاسلام، مترجمہ میمونہ سلطان شاہ بانو، مطبع سلطانی بھوپال، ۱۹۱۵ء

۲۔ اسکات المعتدی علی انصات المقتدی، علامہ شبلی نعمانی، نظامی پریس کان پور، ۱۲۹۸ھ

۳۔ اشخاص وافکار، ضیاء الحسن فاروقی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۳ء

۴۔ المامون، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، طبع سوم، ۱۹۹۲ء

۵۔ اردو ادب میں طنز ومزاح، ڈاکٹر وزیر آغا، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۷۸ء

۶۔ اردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء، الطاف فاطمہ، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی

۷۔ اردو نثر میں سیرت رسول، ڈاکٹر انور خالد محمود، اقبال اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۹ء

۸۔ انٹرنس کورس فارسی، علامہ شبلی نعمانی، مطبع العلوم علی گڑھ

۹۔ اشاریہ نیا دور لکھنو، محمد اطہر مسعود خاں، رام پور رضا لائبریری، ۲۰۰۹ء

۱۰۔ انٹرمیڈیٹ کورس فارسی، علامہ شبلی نعمانی، مطبع العلوم، علی گڑھ ۱۸۹۷ء

۱۱۔ الفاروق، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء

۱۲۔ افادات مہدی، بیگم مہدی افادی، شیخ مبارک علی لاہور، ۱۹۴۹ء، طبع چہارم

۱۳۔ الغزالی، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، طبع جدید ۱۹۹۷ء

۱۴۔ الانتقاد علیٰ التمدن الاسلامی، الشیخ شبلی النعمانی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ طبع جدید

۱۵۔ الکلام، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء

۱۶۔ الجزیہ، علامہ شبلی نعمانی، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۸۹۴ء

۱۷۔ اردو میں سوانح نگاری، سید شاہ علی، گلڈ پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۶۱ء

۱۸۔ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء

۱۹۔ اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر، اوم پرکاش پرساد، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۱۹۹۰ء

۲۰۔ انشائے ماجدی، مولانا عبدالماجدی دریابادی، ادارہ انشائے ماجدی، کلکتہ، ۱۹۹۱ء

۲۱۔ از سعدی تا جامی، علی اصغر حکمت، تہران، ۱۳۳۷ھ ش

۲۲۔ اردو تنقید پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، دائرۂ ادب پٹنہ، ۱۹۸۳ء

۲۳۔ اردو تنقید کا ارتقاء، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۸ء

۲۴۔ الفاروق: ایک مطالعہ، پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی، ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ، ۲۰۰۴ء

۲۵۔ اصح السیر، مولانا عبدالرؤف دانا پوری، مطبع ستارہ ہند کلکتہ۔

۲۶۔ المیزان، نظیر الحسن فوق رضوی، مطبع فیض عام علی گڑھ، ۱۹۱۴ء

۲۷۔ الفاروق (عربی ترجمہ) سمیر عبدالحمید ابراہیم، دارالسلام ریاض، ۱۹۹۹ء

۲۸۔ الفاروق (انگریزی ترجمہ) محمد سلیم، شیخ محمد اشرف لاہور، ۱۹۵۷ء

۲۹۔ ادبی اشارے، سلام سندیلوی، نسیم بکڈپو لکھنؤ، ۱۹۴۹ء

۳۰۔ افکار سہیل، علی حماد عباسی، شبلی کالج اعظم گڑھ، ۱۹۵۷ء

۳۱۔ انتخاب مضامین شبلی، رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ دہلی، طبع دوم ۱۹۹۳ء

۳۲۔ امتحان الالباء لکافۃ الاطباء، مترجمہ حکیم بدرالدین دہلوی، ۱۹۰۰ء

۳۳۔ افکار و شخصیات، ظفر احمد صدیقی رام پور رضا لائبریری رام پور، ۲۰۰۶ء

۳۴۔ باقیات شبلی، مشتاق حسین، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۴ء

۳۵۔ برگ گل، علامہ شبلی نعمانی، مرتبہ حاجی معین الدین قدوائی، انوار المطابع لکھنؤ، ۱۹۲۳ء

۳۶۔ بوئے گل، علامہ شبلی نعمانی، مطبع احمدی علی گڑھ، ۱۹۰۹ء

۳۷۔ تاریخ التمدن الاسلامی، جرجی زیدان، الہلال مصر، ۱۹۰۴ء

۳۸۔ تاریخ بدءالاسلام، علامہ شبلی نعمانی، مطبع مفید عام، آگرہ
۳۹۔ تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، منشی تیج کمار لکھنؤ، طبع چہارم ۱۹۶۹ء
۴۰۔ تبصرات ماجدی، عبدالعلیم قدوائی، قومی کونسل، دہلی۔ ۲۰۰۹ء
۴۱۔ تنقیدیں، خورشیدالاسلام، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۶۴ء
۴۲۔ تنقید شعرالعجم، حافظ محمود خاں شیرانی، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، ۱۹۴۲ء
۴۳۔ تعارف دارالمصنفین، مولانا ضیاءالدین اصلاحی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ
۴۴۔ تنقیدی اشارے، آل احمد سرور، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۶۴ء
۴۵۔ تاریخ ہندوستان جلد ہشتم، منشی ذکاءاللہ، علی گڑھ، ۱۹۱۷ء
۴۶۔ تاریخ ادبیات در ایران، ذبیح اللہ صفا، تہران
۴۷۔ تذکرہ ماہ وسال، مالک رام، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۹۱ء
۴۸۔ تاریخ نگاری قدیم وجدید رجحانات، سید جمال الدین، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۹۴ء
۴۹۔ تردیدالموازنہ، حسن رضا، مطبع تصویر عالم لکھنؤ (ب ت)
۵۰۔ تذکرۃ الشیخین، مولانا ابوسحبان روح القدس لکھنؤ ۲۰۱۰ء
۵۱۔ جامعات میں اردو تحقیق، رفیع الدین ہاشمی، ہائر ایجوکیشن کمیشن اسلام آباد ۲۰۰۸ء
۵۲۔ جدید اردو شاعری، عبدالقادر سروری، حیدرآباد، ۱۹۳۲ء
۵۳۔ جہان شبلی، صفیہ بی، کیرالا، ۲۰۰۰ء
۵۴۔ جزیرہ کی بازیافت، ڈاکٹر سعود عالم قاسمی، فاران اکیڈمی علی گڑھ ۲۰۰۳ء
۵۵۔ حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، طبع چہارم ۱۹۸۳ء
۵۶۔ حسن البیان فی مافی سیرۃ النعمان، محمد عبدالعزیز محمدی، مطبع فاروقی دہلی، ۱۳۱۱ھ
۵۷۔ حواشی ابوالکلام آزاد، مسیح الحسن، ثمر آفسیٹ پرنٹر دہلی ۱۹۸۸ء
۵۸۔ حیات سلیمان، شاہ معین الدین احمد ندوی دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۰ء
۵۹۔ خطوط شبلی بنام آزاد، مرتبہ محمد حسنین، بہار اردو اکاڈمی پٹنہ، ۱۹۸۸ء
۶۰۔ خیام، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۴ء

۶۱۔ خطوط سرسید، سرراس مسعود، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۳۱ء
۶۲۔ خطبات شبلی، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، طبع سوم، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء
۶۳۔ خطوط شبلی، محمد امین زبیری، ظل السلطان بک ایجنسی بھوپال
۶۴۔ خطوط محمد علی، محمد سرور، مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، ۱۹۴۰ء
۶۵۔ خلاصہ حیات شبلی، عبدالرزاق قریشی، عثمانیہ بک ڈپو بمبئی
۶۶۔ دارالمصنّفین کی تاریخ اور علمی خدمات، پروفیسر خورشید نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۴ء
۶۷۔ دیوان شبلی، علامہ شبلی نعمانی، مطبع نامی کان پور غیر مورخہ
۶۸۔ دستۂ گل، علامہ شبلی نعمانی، قومی پریس لکھنؤ، ۱۹۰۸ء
۶۹۔ درد آشنا چہرے، کشمیری لال ذاکر، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۸ء
۷۰۔ دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۲۰۰۲ء
۷۱۔ دھوپ چھاؤں، پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی، علی گڑھ ۲۰۱۱ء
۷۲۔ ذکر شبلی، محمد امین زبیری، لکھنؤ، ۱۹۴۶ء
۷۳۔ رسائل شبلی، علامہ شبلی نعمانی، رحمانی پریس دہلی، ۱۸۹۸ء
۷۴۔ رحمت عالم، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۵ء
۷۵۔ رحمۃ للعالمین، قاضی سلیمان منصور پوری، شیخ غلام اینڈ سنس، لاہور
۷۶۔ ریویو سیرۃ النعمان، قزلباش، اودھ پریس لکھنؤ، ۱۸۹۳ء
۷۷۔ رسالہ وقف علی الاولاد، علامہ شبلی نعمانی، مطبع احمدی علی گڑھ ۱۹۰۹ء
۷۸۔ ریحانۃ الادب، محمد علی مدرس، تہران طبع دوم، ۱۳۴۶ھ
۷۹۔ رپورٹ کارروائی انجمن وقف علی الاولاد، علامہ شبلی نعمانی، آسی پریس لکھنو، ۱۹۱۱ء
۸۰۔ ردالموازنہ، میر افضل علی ضو، مطبع تصویر عالم لکھنؤ، ۱۹۰۸ء
۸۱۔ روداد ندوۃ العلماء لکھنو، علامہ شبلی نعمانی، آسی پریس لکھنو، ۱۹۰۷ء
۸۲۔ سفرنامہ روم ومصر وشام، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۱ء

۸۳۔ سر سید اوران کے نامور رفقا، ڈاکٹر سید عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۴ء
۸۴۔ سر سید وایم اے او کالج اور دینی ومشرقی علوم، ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی، ۲۰۰۱ء
۸۵۔ سیرۃ النعمان، علامہ شبلی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء
۸۶۔ سیر المصنّفین حصہ اول، دوم، مولوی محمد یحییٰ تنہا، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۲۸ء
۸۷۔ سیرۃ النبیؐ حصہ اول، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، طبع جدید ۱۹۹۶ء
۸۸۔ سیرۃ النبیؐ حصہ دوم، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، طبع جدید ۱۹۹۶ء
۸۹۔ سوانح مولانا روم، علامہ شبلی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۳ء
۹۰۔ سیرۃ النبی علامہ شبلی (انگریزی ترجمہ) طیب بخش بدایونی، ادارہ ادبیات دلی، ۱۹۸۳ء
۹۱۔ شبلی بحیثیت مؤرخ، اختر وقار عظیم، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۷۹ء
۹۲۔ شبلی کی علمی وادبی خدمات، ڈاکٹر خلیق انجم، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۹۶ء
۹۳۔ شذرات سلیمانی حصہ اول، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء
۹۴۔ شذرات سلیمانی حصہ دوم، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۷ء
۹۵۔ شذرات سلیمانی حصہ سوم، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۸ء
۹۶۔ شبلی نامہ، شیخ محمد اکرام، صفدر پریس لکھنؤ، ۱۹۶۵ء
۹۷۔ شبلی ایک دبستان، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، ڈھاکہ (غیر مورخہ)
۹۸۔ شعر العجم حصہ اول، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۴۰ء
۹۹۔ شعر العجم حصہ دوم، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۸ء
۱۰۰۔ شعر العجم حصہ سوم، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۶ء
۱۰۱۔ شعر العجم حصہ چہارم، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۶ء
۱۰۲۔ شعر العجم حصہ پنجم، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۶۱ء
۱۰۳۔ شعر العجم یا ادبیات منظوم ایران (اول تا پنجم)، ترجمہ: سید محمد تقی فخر داعی گیلانی، تہران
۱۰۴۔ شبلی کی علمی وادبی خدمات، ڈاکٹر خلیق انجم، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۹۰ء

۱۰۵۔ شبلی معاصرین کی نظر میں، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، اردو اکاڈمی لکھنؤ طبع اول، ۲۰۰۵ء

۱۰۶۔ شبلی نعمانی کے مقالات کا تنقیدی جائزہ، عبدالرحیم انصاری، حیدرآباد، ۱۹۹۰ء

۱۰۷۔ شبلی کا ذہنی ارتقاء، سید سخی احمد ہاشمی، مجلس یادگار ہاشمی کراچی، ۱۹۹۵ء

۱۰۸۔ شبلی بلاد اسلامیہ میں، محمد واصل عثمانی، (تفصیل درج نہیں)

۱۰۹۔ شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں، سید شہاب الدین دسنوی، انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۸۴ء

۱۱۰۔ شبلی سخنوروں کی نظر میں، محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء

۱۱۱۔ شبلی نقادوں کی نظر میں، محمد واصل عثمانی، صفیہ اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۸ء

۱۱۲۔ شبلی نقادوں کی نظر میں، ناز صدیقی، الیاس ٹریڈرس، حیدرآباد، ۱۹۷۶ء

۱۱۳۔ شبلی کی علمی و ادبی خدمات، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۰۱۲ء

۱۱۴۔ شعور و ادراک، محمد ایوب واقف، دانش محل لکھنؤ، ۲۰۰۶ء

۱۱۵۔ صبح امید (مثنوی) علامہ شبلی نعمانی، نامی پریس لکھنؤ، ۱۸۸۶ء

۱۱۶۔ ظل الغمام فی مسئلۃ القراۃ خلف الامام، علامہ شبلی نعمانی، مطبع نظامی کان پور ۱۲۹۹ھ

۱۱۷۔ علم الکلام، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۳ء

۱۱۸۔ علوم عرب ترجمہ تاریخ التمدن الاسلامی مترجم مولانا اسلم جیراج پوری، انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ

۱۱۹۔ عظمت کے نشاں [طبع دوم] ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادب کدہ، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء

۱۲۰۔ علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
خدابخش اورینٹل لائبریری پٹنہ، ۲۰۰۱ء

۱۲۱۔ علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت اور ادبی خدمات، ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی
مکتبہ فردوس، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء

۱۲۲۔ عالم گیر نامہ، کاظم شیرازی، کلکتہ، ۱۸۶۸ء

۱۲۳۔ علامہ شبلی کا نظریہ تعلیم، ڈاکٹر عبیداللہ فراہی، لکھنو، ۱۹۸۸ء

۱۲۴۔ علامہ شبلی نعمانی، معنویت کی بازیافت، ڈاکٹر شباب الدین، شبلی کالج اعظم گڑھ ۲۰۰۸ء

۱۲۵۔ علامہ شبلی کی قرآن فہمی، ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی، دارالنوادر لاہور، ۲۰۰۵ء

۱۲۶۔ علامہ شبلی اور ابوالکلام آزاد، ابوعلی اثری، محمد آباد، ۲۰۰۲ء
۱۲۷۔ عظمت رفتہ، ضیاءالدین احمد برنی، کراچی، ۲۰۰۰ء
۱۲۸۔ فتاوی علمائے ہندوستان، محمد عبدالولی آسی، آسی پریس لکھنو، ۱۹۱۰ء
۱۲۹۔ فہارس الاسفار، ضیاءاللہ کھوکھر، ندوۃ المحدثین گجرانوالہ، ۲۰۰۴ء
۱۳۰۔ فن موازنہ کا ارتقاء، سید احتشام احمد ندوی، فیض المصنّفین علی گڑھ، ۲۰۰۷ء
۱۳۱۔ کسوف الشمسین، احسن مارہروی، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۱۵ء
۱۳۲۔ کاروان ہند جلد اول، احمد گلچین معانی، مشہد۔ ۱۳۶۹ ھ ش
۱۳۳۔ کتاب نامہ شبلی، اختر راہی، مسلم اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۱ء
۱۳۴۔ کلیات شبلی، فارسی، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ طبع جدید ۲۰۰۴ء
۱۳۵۔ کاروان خیال، مولانا ابوالکلام آزاد، مدینہ پریس بجنور
۱۳۶۔ کلیات شبلی اردو، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۷ء
۱۳۷۔ کلیات نثر حالی، محمد اسماعیل پانی پتی، جلد دوم، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۸ء
۱۳۸۔ گلشن ہند، مرزا علی لطف، رفاہ عام اسٹیم پریس، لاہور، ۱۹۰۶ء
۱۳۹۔ گلزار ابراہیم مع گلشن ہند، مرتبہ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، اورنگ آباد، ۱۹۳۴ء
۱۴۰۔ مکاتیب شبلی حصہ اول، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء
۱۴۱۔ مکاتیب شبلی حصہ دوم، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء
۱۴۲۔ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، علامہ شبلی نعمانی، قومی پریس لکھنؤ، ۱۸۸۸ء
۱۴۳۔ مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۵ء
۱۴۴۔ مقالات شبلی جلد اول، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء
۱۴۵۔ مقالات شبلی جلد دوم، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۸۸ء
۱۴۶۔ مقالات شبلی جلد سوم، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء
۱۴۷۔ مقالات شبلی جلد چہارم، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، طبع سوم ۱۹۵۶ء
۱۴۸۔ مقالات شبلی جلد پنجم، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء

۱۴۹۔ مقالات شبلی جلد ششم، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۱ء

۱۵۰۔ مقالات شبلی جلد ہفتم، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۳۸ء

۱۵۱۔ مقالات شبلی جلد ہشتم، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۷۲ء

۱۵۲۔ مقالات حالی، مولانا الطاف حسین حالی، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، ۱۹۳۶ء

۱۵۳۔ مقالات یوم شبلی، حافظ نذر احمد، مسلم اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۶ء

۱۵۴۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل، سید طفیل احمد منگلوری، حماد الکتبی لاہور، (ب ت)

۱۵۵۔ مقالات شروانی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، شروانی پریس علی گڑھ، ۱۹۴۶ء

۱۵۶۔ مولانا شبلی اردو کے بہترین انشا پرداز، سعید انصاری، ناظر بکڈ پو لکھنؤ، ۱۹۳۴ء

۱۵۷۔ مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ، نیر جہاں، دہلی، ۱۹۹۸ء

۱۵۸۔ مقالات احسان، مرزا احسان احمد، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۶۸ء

۱۵۹۔ مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، عبداللطیف اعظمی، شبلی اکادمی، دہلی، ۱۹۴۵ء

۱۶۰۔ مشاہیر کے خطوط بنام مولانا سید سلیمان ندوی، ضیاءالدین اصلاحی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۴ء

۱۶۱۔ متعلقات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء

۱۶۲۔ مکتوبات سلیمانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، صدق بک ایجنسی لکھنو، ۱۹۶۷ء

۱۶۳۔ موازنہ انیس و دبیر، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، طبع جدید، ۲۰۰۴ء

۱۶۴۔ مضامین ڈار، محمد ابراہیم ڈار، ڈار پبلی کیشن بمبئی

۱۶۵۔ مآثر عالمگیری، محمد ساقی خاں مستعد، حیدر آباد، ۱۹۳۲ء

۱۶۶۔ مقدمہ رقعات عالم گیر، سید نجیب اشرف ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۳ء

۱۶۷۔ موج کوثر، شیخ محمد اکرام، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۹۹ء

۱۶۸۔ مولانا شبلی ایک مطالعہ، مفتون احمد، مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۶ء

۱۶۹۔ مطالعہ شبلی، شجاعت علی سندیلوی، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ (ب ت)

۱۷۰۔ مقالات یوم شبلی، عبیداللہ خاں، اردو مرکز لاہور، ۱۹۶۱ء

۱۷۱۔ مجموعہ نظم شبلی اردو، سید ظہور الحسن موسوی، رنگین پریس دہلی ۱۹۱۶ء

۱۷۲۔ مجموعہ کلام شبلی، مرتبہ ظفر الملک علوی، الناظر پریس لکھنؤ، ۱۹۱۸ء
۱۷۳۔ مجموعہ نظم، علامہ شبلی نعمانی، مفید عام آگرہ، ۱۸۹۳ء
۱۷۴۔ مطالعات ومشاہدات، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء
۱۷۵۔ مضامین اختر جوناگڑھی، اختر جوناگڑھی، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۸۹ء
۱۷۶۔ مضامین نو۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، علی گڑھ ۱۹۷۷ء
۱۷۷۔ نزہۃ الخواطر جلد ۸، مولانا سید عبدالحئی حسنی، طبع اول حیدرآباد، ۱۹۷۰ء
۱۷۸۔ نگاہی بتاریخ ادب فارسی در ہند، توفیق سبحانی، تہران
۱۷۹۔ یادرفتگاں، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۳
۱۸۰۔ یادگار شبلی، شیخ محمد اکرام، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۴ء
۱۸۱۔ یادایام، عبدالرزاق کان پوری، حالی اکیڈمی حیدرآباد، ۱۹۴۶ء

رسائل: خصوصی شمارے

۱۸۲۔ البصیر چنیوٹ (شبلی نمبر)۔، مدیر: عبیداللہ خاں، اسلامیہ کالج چنیوٹ، ۱۹۵۷ء
۱۸۳۔ نقوش لاہور (مکاتیب نمبر) مدیر محمد طفیل، ادارہ فروغ اردو لاہور، نومبر ۱۹۶۹ء
۱۸۴۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ (سید سلیمان ندوی نمبر)، شاہ معین الدین احمد ندوی، ۱۹۵۵ء
۱۸۵۔ فکرونظر علی گڑھ (شبلی نمبر)، مدیر: شہریار، جون ۱۹۹۶ء
۱۸۶۔ کریسنٹ لاہور (شبلی نمبر) مدیر خالد بزمی، جنوری ۱۹۷۱ء
۱۸۷۔ ادیب علی گڑھ (شبلی نمبر)، مدیر ڈاکٹر ابن فرید، ستمبر ۱۹۶۰ء
۱۸۸۔ شبلی کالج میگزین اعظم گڑھ (شبلی نمبر) مدیر ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی، ۲۰۰۸ء
۱۸۹۔ اسلام اور عصر جدید دہلی (شبلی نمبر) مدیر پروفیسر اختر الواسع، جولائی ۲۰۰۸ء
۱۹۰۔ نقوش۔ لاہور (رسول نمبر) مدیر محمد طفیل، ادارہ فروغ اردو لاہور ۱۹۸۳ء

۱۹۱۔ نقوش، لاہور (خطوط نمبر، حصہ اول) مدیر محمد طفیل، ادارہ فروغ اردو لاہور ۱۹۶۸ء

۱۹۲۔ فکر ونظر اسلام آباد (سیرت نمبر) مدیر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن، اپریل تا دسمبر ۱۹۷۶ء

۱۹۳۔ صبا حیدرآباد (شبلی نمبر) مدیر: سلیمان اریب، حیدرآباد، ۱۹۵۸ء

۱۹۴۔ غالب نامہ، دہلی (حافظ محمود شیرانی نمبر) مدیر: ڈاکٹر نذیر احمد، ۱۹۹۶ء

۱۹۵۔ خضر راہ لکھنؤ (شبلی نمبر) مدیر: حامد ندوی، مارچ ۱۹۳۰ء

۱۹۶۔ اردو ادب دہلی (شبلی نمبر) مدیر: ڈاکٹر اسلم پرویز، ۱۹۹۶ء

رسائل: عام شمارے

۱۹۷۔ ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ، مئی، جون، جولائی ۱۹۸۳ء، فروری ۲۰۰۸ء

۱۹۸۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڑھ ۱۸۹۴ء، ۱۸۹۵ء، ۱۸۹۶ء

۱۹۹۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جولائی ۱۹۱۶ء، دسمبر ۱۹۱۶ء، اکتوبر ۱۹۲۰ء، فروری ۱۹۴۰ء، ستمبر ۱۹۴۰ء، نومبر ۱۹۴۰ء، فروری ۱۹۴۷ء، دسمبر ۱۹۸۷ء، مارچ ۱۹۹۸ء، جون ۲۰۰۰ء مئی ۲۰۰۸ء

۲۰۰۔ ماہنامہ الندوہ لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۰۴ء، اکتوبر ۱۹۰۷ء، اکتوبر ۱۹۰۸ء، مارچ ۱۹۱۰ء، اپریل ۱۹۱۰ء، جنوری ۱۹۱۲ء

۲۰۱۔ دلگداز لکھنؤ، عبدالحلیم شرر، جون ۱۹۱۰ء، مئی 1918

۲۰۲۔ الناظر لکھنؤ، مارچ ۱۹۱۰ء، جنوری ۱۹۱۱ء

۲۰۳۔ المنار، مصر، جنوری ۱۹۱۲ء

۲۰۴۔ فکر ونظر اسلام آباد، اپریل ۱۹۷۶ء، اکتوبر دسمبر ۲۰۰۲ء

۲۰۵۔ الہلال، کلکتہ (مدیر: مولانا ابوالکلام آزاد) جنوری ۱۹۱۳ء، اپریل ۱۹۱۳ء، مئی ۱۹۱۳ء

۲۰۶۔ ترجمان الاسلام بنارس، مدیر: اسیر ادروی، جنوری تا مارچ ۱۹۹۵ء

۲۰۷۔ ہماہی، ہندوستان الہ آباد، ۱۹۳۶ء

۲۰۸۔ ماہنامہ برہان، دہلی، فروری ۱۹۴۴ء

۲۰۹۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۵؍اکتوبر ۱۸۸۱ء

۲۱۰۔ جامعہ دہلی، اپریل-جون ۲۰۰۵ء

۲۱۱۔ ماہ نو، کراچی۔ جنوری ۱۹۵۴ء

۲۱۲۔ اردو بک ریویو، نئی دہلی، نومبر دسمبر ۲۰۰۷ء، جنوری مارچ ۲۰۰۸ء

۲۱۳۔ نقطۂ نظر [۲۹] اسلام آباد، مدیر ڈاکٹر سفیر اختر

۲۱۴۔ کانفرنس گزٹ، علی گڑھ، مدیر: پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی، اکتوبر ۲۰۱۱ء

برادرم

آج بھوپال سے خط آیا، حضرت عائشہ کی سوانح کا بے
تقاضا ہے یعنی جلد طیار کردو۔ تم ایک مدت سے اس
باب میں مصروف ہو۔ رشید رضا کی کتاب علی ابھی تک انتظار
شادہ میں بیٹھے ہیں تم کو دیدی ہے (اس ایک وعدے پر قرض لیا جب
کے پاس روپیہ آ جاوے ادا ہو) اس لیے زیادہ تر مفصل
جواب لکھو۔ کس قدر ضخامت ہوگی۔ مختصرا تمہ لکھ لے
یا ضمیمہ؟ بیگم صاحبہ معقول معاوضہ دینگی
یہی حالت ہے کہ اور ازواج کی بھی سوانح عمریاں
لکھی جائیں تک، چونکہ جلد جاتا ہیں شائع اور تم کو
فرصت نہ ہو گی اس لیے کچھ اور انتظام کرنا پڑے گا
حضرت عائشہ کے متعلق جو بھی خاص معلومات تم نے
جمع کئے ہیں تمہارا مسودہ دیکھ کر تو رائے ظاہر کر سکتا
ہاشمی مجھ زمانے سے موقوف ہے گر پھر آگئی
ازدواج کا لکھنا کیا ہے ... مضمون بہت شکر اگر
ہو گئے۔
عبد ماجد کا دیوان نہایت پرتکلف لندن میں طبع
ترجمہ انگریزی چھپا۔ میں نے دیکھا۔ نجم الاولیا کی
نئی جلد پھر شروع ہوگی۔ اس میں حاجی کمال خاں
انگریزی۔ دلائل النبوۃ کے دو نسخے ایک وقت میں
ایک مصنف کے دونوں کے پاس دیکھیے آج ایک صفحہ
موجود ہے و ذلک من عجائب الاتفاق۔

شبلی ۳۰ جون ۱۹۱۰ء

بمبئی

ISBN : 978-93-92201-03-8